بسم اللہ الرحمن الرحیم

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد پنجم

سورۃ البقرہ آیات 196 تا 242

از رشحاتِ قلم [illegible]

حافظ قاضی عبدالرزاق بھترالوی ہزاروی

جامعہ حنفیہ غوثیہ مظہر العلوم

رحیم ٹاؤن شکریال راولپنڈی

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں

علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید اشکالات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع

تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمّی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد پنجم

(سورۃ البقرۃ آیات 196 تا 242)

از رشحات قلم

حافظ قاضی عبدالرزاق بھترالوی، حطاروی

جامعہ جماعتیہ مہر العلوم

رحیم ٹاؤن شکریال، راولپنڈی

نام کتاب .... نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن، جلد پنجم
سورۃ البقرۃ آیات 196 تا 242

تالیف حافظ قاضی عبدالرزاق بھترالوی، حطاروی

کمپوزنگ مفتی محمد محمود احمد، محلہ لطیف شاہ غازی، کھاریاں، ضلع گجرات

بار طباعت .... اول

تاریخ اشاعت ....

ناشر .... جامعہ جماعتیہ مہر العلوم رحیم ٹاؤن، شکریال، راولپنڈی

ملنے کے پتے

☆ ضیاء القرآن پبلی کیشنز اردو بازار لاہور
☆ فرید بک سٹال اردو بازار لاہور
☆ نیو مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی
☆ احمد بک کارپوریشن اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک راولپنڈی
☆ جامع مسجد غوثیہ ایف سکس ون اسلام آباد
☆ جامعہ جماعتیہ مہر العلوم رحیم ٹاؤن، شکریال، راولپنڈی
☆ مکتبہ قادریہ نزد داتا ہوٹل گنج بخش روڈ لاہور
☆ مکتبہ برکاتیہ گنج بخش روڈ لاہور
☆ جامع مسجد کنز الایمان 1-10-1 اسلام آباد

اور ہر اچھے بک سٹال سے طلب فرمائیں

فہرست

نجوم الفرقان فی تفسیر القرآن

جلد پنجم

سورۃ البقرۃ آیات 196 تا 242

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ☆ (سورہ بقرۃ آیت،۱۹۶)

﴿۱﴾

اور حج اور عمرہ اللہ کے لئے پورا کرو، پھر اگر تم روکے جاؤ تو قربانی بھیجو جو میسر آئے اور اپنا سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے، پھر جو تم میں بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو بدلہ دے روزے یا خیرات یا قربانی، پھر جب تم اطمینان سے ہو تو جو حج سے عمرہ ملانے کا فائدہ اٹھائے اس پر قربانی ہے جیسی میسر آئے، پھر جسے مقدور نہ ہو تو تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات، جب اپنے گھر پلٹ کر جاؤ، یہ پورے دس ہوئے، یہ حکم اس کے لئے ہے جو مکہ کا رہنے والا نہ ہو، اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

﴿۲﴾

اور مکمل کرو حج اور عمرہ اللہ کے لئے، پھر اگر تمہیں کہیں روک لیا جائے تو جو میسر ہو

ہدی، اور نہ منڈاؤ اپنے سروں کو یہاں تک کہ پہنچ جائے ہدی اپنی (ذبح کی) جگہ، پھر ہو جائے تم میں سے کوئی شخص مریض یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو جائے تو فدیہ دے روزے یا صدقہ یا جانور ذبح کرنے سے، پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص نفع حاصل کرے عمرہ سے حج تک تو جو میسر ہو اسے ہدی، تو جو شخص (ہدی) نہ پائے تو روزے ہیں (تمہارے ذمہ) تین دن حج کے دنوں میں اور سات جب فارغ ہو جاؤ تم، یہ دس دن مکمل ہیں۔ یہ اس شخص کے لئے ہے جو نہ ہو باشندہ حدود میقات کا اور ڈرو اللہ سے اور جان لو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

مختصر مطلب:

• حج اور عمرہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے مکمل کرو، اس میں کوئی دکھلاوا اور چرچا اور سیر وتفریح مقصود نہ ہو، خصوصاً جب حج اور عمرہ کی نیت کر لو احرام باندھ لو تو پھر حج اور عمرہ کو مکمل کرنا تم پر لازم ہے، جب جی چاہے حج اور عمرہ کو مکمل کئے بغیر چھوڑ دینا منع ہے۔ اگر حج یا عمرہ میں جانے کے لئے تمہیں روک دیا جائے تو بطور ہدی ایک جانور حرم میں بھیج دو، جس شخص کے ہاتھ وہ بھیجو اس سے ایک تاریخ مقرر کر لو کہ فلاں تاریخ یہ ہدی حرم میں پہنچ جائے گی اس دن تم احرام سے فارغ ہو جاؤ۔ اگر مرض یا سر میں تکلیف کی وجہ سے تمہیں حالت احرام میں سر منڈانا پڑے تو سر منڈالو اس کے بدلے تین روزے رکھ لو یا چھ مسکینوں کو دو وقت طعام کھلا دو یا کوئی جانور ذبح کر دو، پھر جب تم امن میں ہو اگر اس ایک سفر میں ہی عمرہ سے بھی حج تک نفع حاصل کر لو یعنی قران یا تمتع کر لو تو بطور شکر جو ہدی تمہیں میسر ہو اسے ذبح کرو۔ اگر تمہیں ہدی میسر نہ ہو تو تین دن حج کے دنوں میں روزے رکھ لو یعنی تین دن روزے یوم عرفہ (نو ذی الحج) تک مکمل کر لو، اور پھر حج سے فارغ ہو تو سات دن اور روزے رکھو، یہ کل دس دن ہو گئے۔ یعنی جو شخص ہدی ذبح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ دس دن روزے رکھے ان میں تین دن ایام حج میں اور سات دن حج سے فارغ ہونے کے بعد، قران یا تمتع

کرنے کی ان لوگوں کو اجازت ہے جو آفاقی ہوں یعنی حدود مواقیت سے باہر سے آئے ہوئے ہوں، جو آفاقی نہیں میقاتوں کے اندر اندر رہنے والے ہیں ان کے لئے قران یا تمتع کی اجازت نہیں۔ جتنے احکام بیان کر دیے ہیں ان پر عمل کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ ان احکام کی مخالفت کر کے اور اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہو کر اپنے آپ کو عذاب کا مستحق نہ بنالو، یہ یقینی طور پر جان لو کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔

ماقبل سے رابطہ:

رب تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمایا کہ آپ سے چاند کی حالتوں کے بدلنے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ یہ لوگوں کے لئے وقت کی علامتیں ہیں اور حج کے لئے۔

تو جب پہلے یہ بیان کر دیا کہ حج وقت مقررہ میں ہوتا ہے تو یہاں حج کے مسائل کی تفصیل بیان کرنی شروع فرمائی۔

اور وجہ یہ ہے کہ پہلے ذکر فرمایا "وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔

اس کے بعد حج کا ذکر فرمایا کہ اس میں بھی مال خرچ ہوتا ہے۔ عبادت کی تین قسمیں ہیں۔

"بدنی، مالی، اور بدنی و مالی کا مجموعہ"۔

بدنی عبادت، جیسے نماز اور روزہ، اس عبادت میں کسی دوسرے کو اپنا نمائندہ نہیں بنایا جاسکتا بلکہ انسان خود ہی یہ عبادت کرے خواہ کوئی عذر ہو یا نہ ہو، دوسرے کے ذمہ یہ عبادت نہیں لگائی جاسکتی۔

عبادت مالی، جیسے زکوٰۃ، اس میں عذر اور بغیر عذر کے ہر حال میں دوسرے شخص کو اپنا نمائندہ بنایا جاسکتا ہے۔

اور بدنی اور مالی کا مجموعہ عبادت حج ہے، اس میں بغیر عذر کے تو اپنا نمائندہ نہیں بنایا جاسکتا، لیکن عذر کی حالت میں اپنا بدل کسی اور کو بنایا سکتا ہے، جس کی تفصیل ان شاء اللہ بعد میں آئے گی۔

عمرہ کرنا سنت ہے:

عمرہ فرض یا واجب نہیں بلکہ سنت اور مستحب ہے، کیونکہ اس آیۃ کریمہ میں بھی "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ" کہا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کو پورا کرو، یعنی جب عمرہ کی نیت کرلی، احرام باندھ لیا تو پھر مکمل کرنا واجب ہوگا، لیکن ابتدائی طور پر واجب نہیں۔

" عن محمد بن المکندر عن جابر بن عبداللہ قال سأل رجل النبی ﷺ عن الصلوۃ والحج اواجب قال نعم وسأله عن العمرۃ اھی واجبۃ قال لا و لان تعتمر خیر لک"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کیا نماز اور حج فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، پھر اس نے عمرہ کے متعلق سوال کیا، کیا عمرہ واجب ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، ہاں البتہ تم عمرہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔

" عن ابی صالح قال قال رسول اللہ ﷺ الحج جھاد والعمرۃ تطوع "

ابوصالح کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج جہاد ہے اور عمرہ نفل ہے۔ یعنی حج فرض ہے اور عمرہ مستحب ہے۔

اعتراض: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں تو ذکر ہے۔

"قال رسول اللہ ﷺ الحج والعمرۃ فریضتان واجبتان"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج اور عمرہ فرض ہیں۔

تو کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ عمرہ واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔

جواب: **"فاما حدیث جابر فی وجوب العمرۃ من طریق ابن لھیعۃ فھو ضعیف"**

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ابن لھیعۃ سے مروی ہے، اس لئے یہ حدیث ضعیف ہے۔ ضعیف حدیث سے فرضیت اور وجوب ثابت نہیں۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

عمرہ کے ارکان وشرائط وغیرہ:

عمرہ کا احرام شرط ہے، اور طواف کرنا رکن ہے، اس کے بغیر اشیاء کوئی واجب، کوئی سنت اور کوئی مستحب ہیں۔

طوف کے زیادہ چکر فرض اور کم واجب اور سعی کرنا واجب اور سر منڈانا یا بال کٹانے واجب ہیں۔

باقی احکام عمرہ کے وہی ہیں جو حج کے لئے، جس طرح حج کے احرام کے منافی جو کام ہوں گے وہی عمرہ کے احکام کے بھی منافی ہوں گے۔

عمرہ اور حج میں فرق:

حج کا وقت مقرر ہے اور عمرہ کا وقت مقرر نہیں، حج وقت مقررہ سے رہ جائے یعنی احرام کے بعد وقت پر مقام عرفات پر نہ پہنچا تو حج فوت ہوگیا۔ لیکن عمرہ کا احرام باندھ کر جس وقت بھی مکہ مکرمہ میں پہنچ جائے عمرہ ادا ہی ہوگا۔ اس میں فوت ہونے کا کوئی احتمال نہیں۔ اور حج میں مقام عرفات میں قیام فرض ہے عمرہ میں نہیں۔

حج میں مزدلفہ میں آنا اور رمی میں کنکریاں مارنا اور منی میں ٹھہرنا واجب ہے عمرہ میں نہیں، حج میں طواف قدوم اور طواف صدر ہیں لیکن عمرہ میں نہیں۔ اسی طرح مقام عرفات میں دو نمازیں ظہر اور عصر اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھنا ہے عمرہ میں نہیں۔ آفاقی لوگوں کے لئے حج اور عمرہ کے احرام کے میقات ایک ہی ہیں۔ لیکن میقاتوں کی حدود کے اندر رہنے والے مکی کہلاتے ہیں ان کے لئے عمرہ کا احرام باندھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حرم کی زمین سے باہر جا کر احرام باندھیں، لیکن حج کا احرام حرم شریف کے کسی مقام سے بھی باندھ سکتے ہیں۔ حرم کے باہر سے احرام نہیں باندھ سکتے۔

رمضان میں عمرہ کرنا افضل ہے:

عمرہ کے لئے وقت مقرر نہیں جب چاہے عمرہ کرلے لیکن رمضان میں عمرہ کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

"عن ابن عباس عمرة فی رمضان تعدل حجة"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رمضان میں عمرہ کرنے سے حج کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔اسی وجہ سے " وکان السلف رحمنا اللہ تعالیٰ بهم یسمونها الحج الاصغر "سلف صالحین اللہ تعالیٰ ان کے طفیل ہم پر بھی رحم فرمائے عمرہ کا نام حج اصغر (چھوٹا حج) رکھتے تھے۔

فائدہ: " وقد اعتمر رسول اللہ ﷺ اربع عمرات کلهن بعد الهجرة فی ذی القعدة "

نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد چار عمرے کئے ہیں وہ تمام ذیقعد میں تھے۔تاہم رمضان کی افضلیت کے یہ منافی نہیں۔

اعتراض: بعض کتب میں ملتا ہے کہ عمرہ کرنا رجب میں سنت ہے۔اس کے متعلق سنت ہونے کا قول کیسے درست ہے؟

جواب: رجب میں عمرہ کرنا اس وجہ سے تو سنت نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے رجب میں عمرہ کیا ہو یا آپ نے رجب میں عمرہ کرنے کا حکم دیا ہو۔البتہ حضرت ابن زُبیر رضی اللہ عنہ جب کعبہ شریف کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو آپ نے ستائیس رجب کو عمرہ کیا اور بطور شکر جانور بھی ذبح کئے اور اہل مکہ کو بھی عمرہ کرنے کا حکم دیا۔

"ولاشک ان فعل الصحابة حجة ومارآه المسلمون حسنا فهو عنداللہ حسن"

اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ صحابہ کرام کا فعل حجت ہے،اور خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے،جس کام کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مکہ والے رجب میں عمرہ کرتے ہیں۔واضح ہوا کہ رجب میں عمرہ کرنا سنت صحابہ ہے۔

تنبیہ: نوذی الحج اور چار دن اس کے بعد عمرہ کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ہاں اگر وہ شخص قران کرنے والا ہو اور دیر سے پہنچے،نوذی الحج کی صبح کو پہلے عمرہ کرلے پھر مقام عرفات پر پہنچ جائے تو اس کے لئے جائز ہے کوئی مکروہ نہیں۔

میقاتوں کے اندر رہنے والوں کے لئے عمرہ کا حکم:

میقاتوں کی حدود کے اندر رہنے والے لوگوں کے لئے شوال، ذیقعد اور ذی الحج کے دس دن عمرہ کرنا منع ہے، کیونکہ یہ لوگ قریب ہونے کی وجہ سے ہر سال حج کر سکتے ہیں اور جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں اس لئے یہ حج کے مہینوں میں دور سے آنے والوں کو موقع دیں کہ وہ آسانی سے عمرہ کر سکیں۔

عمرہ کیسے کریں؟

آفاقی حضرات یعنی میقاتوں سے باہر رہنے والے میقات سے احرام باندھیں اور میقاتوں کے اندر رہنے والے حرم شریف کے باہر سے احرام باندھیں۔ پھر طواف کریں۔ پھر صفا اور مروہ کی سعی کریں۔ پھر سر منڈا لیں یا بال کٹا لیں، اس طرح عمرہ ادا ہو گیا۔

مواقیت:

وہ مقام جس سے آگے احرام کے بغیر تجاوز جائز نہیں اسے میقات کہتے ہیں، اس کی جمع مواقیت ہے۔ وہ مقامات کون سے ہیں جن سے احرام کے بغیر تجاوز منع ہے؟

"عن ابن عباس قال وقت رسول الله ﷺ لاهل المدينة ذاالحليفة ولاهل الشام الجحفة ولأهل نجدقرن المنازل ولاهل اليمن يلملم فهن لهن ولمن اتى عليهن من غير اهلهن لمن كان يريدالحج والعمرة فمن كان دونهن فمهله من اهله وكذاك وكذاك حتى اهل مكة يهلون منها (بخاری ومسلم، مشکوۃ کتاب الحج)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ والوں کے لئے ذوالحلیفہ میقات مقرر فرمایا، اور شام والوں کے لئے جحفہ اور نجد والوں کے لئے قرن المنازل اور یمن والوں کے لئے یلملم، یہ مقامات ان لوگوں کے لئے بھی ہیں اور جو ان راستوں سے دوسرے علاقوں سے حج

اور عمرہ کرنے کے ارادہ سے آئیں، جو ان میقاتوں کے اندر ہوں وہ اپنے گھروں سے ہی احرام باندھ لیں، اسی اسی طرح جو قریب ہوتے چلے جائیں، یہاں تک کہ مکہ والے (حج کے لئے) اپنے گھروں سے ہی احرام باندھ لیں۔ (البتہ عمرہ کے لئے حرم کے باہر سے احرام باندھیں)

خیال رہے کہ ہندوستان و پاکستان والوں کا میقات بھی یلملم ہے۔ اب فضائی سروس کی وجہ سے احرام ائیر پورٹ سے ہی باندھ لیا جاتا ہے، ویسے بھی قانون شرعی یہی ہے کہ احرام میقات سے پہلے باندھا جاسکتا ہے، لیکن میقات سے بغیر احرام کے تجاوز کرنا جائز نہیں۔

تنبیہ: جو شخص مکہ مکرمہ میں میقاتوں کے باہر سے آئے اس کے لئے احرام باندھنا ضروری ہوتا ہے۔ خواہ وہ حج کی غرض سے آئے یا عمرہ کے لئے آئے یا کسی اور کام کے لئے آئے یعنی تجارت وغیرہ کے لئے آئے، کیونکہ یہ حرم کا احترام ہے، البتہ وہ لوگ جو میقاتوں کے اندر ہیں ان کو بغیر احرام کے آنا جائز ہے، اور جو شخص میقاتوں سے باہر سے آئے اور حرم کے باہر اس کے عزیز و اقارب ہوں ان کو ملنے کی غرض سے آئے تو احرام کی ضرورت نہیں۔ پھر وہاں سے عمرہ کی نیت کرلے۔ لیکن راقم کا موقف یہ ہے کہ جو لوگ عمرہ کا ویزہ لگواتے ہیں وہ خواہ راستہ میں اقارب کے پاس ٹھہریں بھی احرام میں ہی رہنا چاہئے وعدہ کا تقاضا یہی ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب**

فائدہ: مکہ والوں کے لئے حرم سے باہر کہیں سے بھی عمرہ کے لئے احرام باندھنا جائز ہے لیکن تنعیم سے احرام باندھنا افضل ہے، اس لئے کہ......

"امر علیہ الصلوٰۃ والسلام عبدالرحمن بان یذھب باختہ عائشۃ الی التنعیم لتحرم منہ"

نبی کریم ﷺ نے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اپنی بہن عائشہ کو تنعیم میں لے جاؤ تاکہ وہاں سے یہ احرام باندھ لے۔

عمرہ کی فضیلت:

" عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ العمرۃ الی العمرۃ کفارۃ لمابینھما والحج المبرور لیس لہ جزاء الا الجنۃ" (نسائی ج ۲ باب فضل العمرۃ)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک عمرہ سے لے کر دوسرے عمرہ تک درمیان میں گناہوں کا کفارہ ہے۔ اور حج مبرور کی جزاء نہیں سوائے جنت کے۔

حج مبرور کی وضاحت ان شاء اللہ قریب ہی آ رہی ہے۔

یعنی ایک عمرہ کیا تو وہ پہلے گناہوں کا کفارہ ہے، پھر اس عمرہ کے بعد گناہ ہو گئے تو دوسرا عمرہ کیا تو وہ ان گناہوں کا کفارہ ہے لیکن گناہوں سے مراد صغائر گناہ ہیں۔ کبیرہ گناہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

حج مفرد کے مسائل:

حج عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے، آزاد ہو، بالغ ہو، عاقل ہو، صحت میں ہو کہ حج ادا کر سکے، اور اس کے پاس آنے جانے کا کرایہ اور وہاں کا خرچ اس کے پاس ہو اور واپس لوٹنے تک اہل وعیال کا خرچ بھی موجود ہو تو حج فرض ہوتا ہے۔

حج مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے لیکن عورت کے لئے محرم کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے، بغیر محرم کے عورت کو حج کرنا منع ہے، خواہ جوان ہو یا بوڑھی خواہ وہ اور عورتوں کی جماعت سے مل کر جائے یا مردوں کے ساتھ جائے ہر حال میں بغیر محرم کے حج کرنا سوائے پیسے ضائع کرنے اور مشقت اٹھانے کے کچھ نہیں۔ رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی عدولی کر کے کون سا نیکی کا کام کر لیا۔ جھوٹے محرم بنانا جرم پر جرم ہے۔

"عن ابی هريرة قال خطبنا رسول الله ﷺ قال يا ايها الناس قد فرض عليكم الحج فحجوا فقال رجل اكل عام يا رسول الله فسكت حتى قالها ثلاثا فقال لو قلت نعم لوجبت ولما استطعتم ثم قال ذروني ما تركتم فانما هلك من كان قبلكم بكثرة سؤالهم واختلافهم على انبيائهم فاذا امرتكم بشئ فاتوا منه ما استطعتم واذا نهيتكم عن شئ فدعوه"

(رواه مسلم. مشكوة كتاب المناسک)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا تو آپ نے فرمایا اے لوگو

تحقیق تم پر حج فرض کر دیا گیا پس حج کرو۔ ایک شخص (اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا یارسول اللہ کیا ہر سال حج فرض ہے؟ تو آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ اس شخص نے تین مرتبہ سوال کیا۔ پھر آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) واجب ہو جاتا تمہیں اس کی طاقت نہ ہوتی۔ پھر آپ نے فرمایا جب میں تمہیں چھوڑ دوں تو تم بھی مجھے چھوڑ دیا کرو بیشک تم سے پہلے لوگ انبیاء کرام سے زیادہ سوال کرنے اور اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے، جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو تم اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو، اور جب میں تمہیں کسی چیز سے روک دوں تو تم اسے چھوڑ دو۔

وضاحت حدیث: "یاایھاالناس قدفرض علیکم الحج" اے لوگو تم پر حج فرض کر دیا گیا۔

حج کب فرض ہوا؟

حضرت ابن ہمام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حج نو یا چھ یا پانچ سن ہجری میں فرض کیا گیا۔

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

"والأظهر انه عليه الصلوة والسلام اخره عن سنة خمس اوست لعدم فتح مكة و اما تاخيره عن سنة ثمان فلاجل النسئ واماتاخيره عن سنة تسع فى موقف الصديق هذا"

زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ حج پانچ یا چھ ہجری کو فرض کر دیا گیا تھا، لیکن ان سالوں میں حج نہ کیا جا سکا کیونکہ مکہ مکرمہ اس وقت کفار کے زیر تسلط تھا، لیکن آٹھ ہجری کو فتح مکہ کے بعد کچھ لوگوں نے عتاب بن اسید کی معیت میں حج کیا۔

خود نبی کریم ﷺ نے اس سال حج نہ کیا تا کہ امت کے لئے یہ جائز ہو سکے کہ جب حج کرنے کی طاقت حاصل ہو جائے تو اسی سال اگر وہ حج نہ کر سکیں تو وہ گناہگار نہیں ہوں گے۔

پھر نو ہجری میں نبی کریم ﷺ نے خود حج نہ کیا بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت لوگوں نے حج کیا۔

راقم کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت حج کرانے سے اس طرف اشارہ تھا کہ میرے بعد آپ ہی مسلمانوں کے اجماع سے منصب خلافت پر فائز ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ کے حج میں تاخیر کی عظیم وجہ یہ تھی۔

" وتاخيره عليه الصلوة والسلام ليس يتحقق فيه تعريض الفوات وهو الموجب للفور لانه كان يعلم انه يعيش حتى يحج ويعلم الناس مناسكهم تكميلاللتبليغ"

کہ عام لوگوں کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ حج کے فرض ہونے پر جلدی حج کرلیں کہ زندگی کا پتہ نہیں ہوسکتا ہے کہ موت واقع ہوجائے تو فرض کی ادائیگی نہ کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوکر نہ مرے، لیکن نبی کریم ﷺ کو اپنی زندگی کے متعلق یقین تھا کیونکہ رب تعالیٰ نے آپ کو وفات کا علم دے رکھا تھا۔لہٰذا آپ پر حج جلدی کرنا ضروری نہیں تھا بلکہ تاخیر میں فائدہ تھا کہ امت کے لئے تاخیر کا جواز ثابت ہوجائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آپ کے ساتھ حج کرنے کا وقت مل سکے تاکہ آپ احکام حج کامل طور پر لوگوں کو سکھا سکیں۔ (از مرقاۃ، ج۵، ص۲۶۳)

فائدہ: ہجرت سے پہلے اگرچہ نبی کریم ﷺ پر حج فرض نہیں تھا لیکن

" قال ابن الاثير كان عليه الصلوة والسلام يحج كل سنة قبل ان يهاجر"

ابن اثیر کہتے ہیں نبی کریم ﷺ ہجرت سے پہلے ہر سال حج کرتے تھے۔

ابن جوزی کا بھی یہی قول ہے۔اسی کو روایت حاکم کی تائید بھی حاصل ہے۔

" واخرج الحاكم بسندصحيح عن الثورى انه عليه الصلوة والسلام حج قبل ان يهاجر حججا"

حاکم نے سند صحیح سے ثوری سے روایت کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے ہجرت سے پہلے کئی مرتبہ حج کیا۔

" واماماروى الترمذى عن جابران النبى ﷺ حج قبل ان يهاجر حجتين وفى رواية لابن ماجه والحاكم ثلاثافمبنى على علمه ولاينافى اثبات زيادة غيره"

ترمذی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ ہجرت سے پہلے نبی کریم ﷺ نے دو حج کئے اور ان سے ہی ابن ماجہ نے اور حاکم نے تین حج کرنے کا ذکر کیا ہے لیکن وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علم کی بات ہے دوسرے حضرات نے اپنے علم کے مطابق ہر سال حج کرنے کا ذکر فرمایا یہ اپنے اپنے علم کی بات ہے ان میں کوئی منافات نہیں۔

ہاں البتہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج کیا جسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے، یہ دس ہجری میں تھا اس کے بعد آنے والے ربیع الاول میں آپ کا وصال ہو گیا۔ (مرقاۃ، ج۵، ص۲۶۳)

"وعن ابی هریرة قال سئل رسول الله ﷺ ای العمل افضل قال ایمان بالله ورسوله قیل ثم ماذاقال الجهادفی سبیل الله قیل ثم ماذاقال حج مبرور"

(بخاری ومسلم، مشکوة کتاب المناسک)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کون سا عمل افضل ہے تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لانا، پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا، پھر پوچھا گیا اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا حج مبرور۔

وضاحت حدیث: ایمان سب سے افضل ہے کیونکہ تمام اعمال کا دارومدار ایمان پر ہے، پھر جہاد افضل ہے۔

"لان المجاهدلایکون الامصلیاوصائما"

کیونکہ مجاہد یقیناً نماز ادا کرنے والا ہوتا ہے اور روزہ رکھنے والا ہوتا ہے۔

اس لئے نماز اور روزہ جہاد سے افضل ہیں ان کے نہ ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد حج مبرور افضل ہے۔

حج مبرور کیا ہے؟

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اصبہانی رحمہ اللہ سے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا،

حج مبرور کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔

"یرجع زاهدافی الدنیا راغبافی الاخرة"

دنیا میں زاہد ہو کر لوٹنا اور آخرت کی طرف رغبت کرنا حج مبرور ہے۔

حج مبرور کا معنی حج مقبول ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے۔

"بر اللہ عمله ای قبله کأنه احسن الی عمله بقبوله"

کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے عمل قبول کر کے اس پر احسان فرمایا ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے "بره ای احسن الیه"

واضح ہوا کہ حج مبرور وہ ہے کہ انسان خلوص سے حج کرے، ثواب کی نیت ہو، گناہوں سے محفوظ رہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے، اس کا قبول کرنا بندے پر احسان عظیم ہے۔

☆ حج اس شخص پر فرض ہوتا جو آنے جانے کا خرچ رکھے اور واپسی تک اہل وعیال کا خرچ بھی ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح ہے۔

"وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلا"

اور لوگوں پر اللہ کے لئے اس کے گھر کا حج کرنا لازم ہے جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھیں۔

عورت بغیر محرم کے حج نہیں کرسکتی:

"قال رسول اللہ ﷺ لاتسافر امرأة الا ومعهاذومحرم" (بخاری ومسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی عورت سفر نہ کرے سوائے اس کے کہ اس کے ساتھ محرم ہو۔

"عن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ قال لاتحج امرأة الا ومعهامحرم" (رواہ البزار)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی عورت بغیر محرم کے حج نہ کرے۔

عن ابن جریج قال رسول اللہ ﷺ "لاتحجن امرأة الا ومعهاذومحرم"

کوئی عورت بغیر محرم کے ہرگز حج نہ کرے۔

ہاں البتہ ساڑھے بانوے کلومیٹر سے سفر کم ہوتو عورت بغیر محرم کے حج کرسکتی ہے۔

محرم وہ ہوتا ہے جس سے شادی کرنا ہمیشہ کے لئے حرام ہو، جیسے باپ، بیٹا، ماموں، چچا، بھانجا، بھتیجا وغیرہ۔ ماموں زاد، چچازاد وغیرہ محرم نہیں ہوسکتے۔ رضاعی طور پر یا نکاح کی وجہ سے کسی سے ہمیشہ نکاح کرنا حرام ہو جائے تو اس کے ساتھ بھی حج کرنا جائز ہوگا۔ رضاعی بھائی، باپ یا سُسر اور خاوند کا بیٹا ہو ان کے ساتھ حج کرسکتی ہے لیکن بہنوئی کے ساتھ نہیں کیونکہ اس سے عارضی طور پر نکاح حرام ہے ایک بہن کے فوت ہونے یا مطلقہ ہونے پر اس کی بہن سے نکاح جائز ہے۔

عورت اپنے خاوند کے ساتھ حج کرسکتی ہے اگرچہ وہ محرم نہیں لیکن مقصد فتنہ سے عورت کو بچانا ہے وہ خاوند کے ساتھ بہتر اور کامل طریقہ سے حاصل ہے۔

احرام باندھنا:

جب کوئی شخص احرام کا ارادہ کرے، غسل کرے یا وضوء کرے، البتہ غسل کرنا افضل ہے۔ مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ دو چادریں استعمال کرے ایک ستر عورت کے لئے کمر سے باندھے اور دوسری کندھوں پر لپیٹے، سلا ہوا کپڑا شلوار، قمیص وغیرہ نہیں پہن سکتا۔ سلائی کا یہ مطلب نہیں کہ چادر کی کناری کا سلائی کرنا بھی منع ہے، یہ لوگوں میں غلط مشہور ہے۔ یہ چادریں استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اگر خوشبو میسر ہوتو وہ لگالے، اور دو رکعت نماز احرام کی نیت سے پڑھے۔

"لماروی عن ابن عباس ان النبی ﷺ صلی بذی الحلیفة رکعتین عنداحرامه"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے احرام کے وقت ذوالحلیفہ کے مقام پر دو رکعت ادا فرمائیں۔

نماز کے بعد تلبیہ پڑھے۔

"لمارویٰ ان النبی ﷺ لبّٰی فی دبر صلوته" (ترمذی،نسائی)

کیونکہ نبی کریم ﷺ نے نماز کے بعد تلبیہ پڑھا۔

ساتھ ہی حج کی نیت کرلے اگر صرف حج کا احرام باندھا ہے تو۔نیت یہ ہے کہ اے اللہ میں تیرے لئے حج کر رہا ہوں تو اسے قبول فرما اور میرے لئے حج کرنا آسان فرما۔

تلبیہ یہ ہے:

"لبیک اللھم لبیک لبیک لَاشریک لکَ اِنَّ الْحَمْدَوَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ"

خیال رہے نیت کی تکمیل ہی تلبیہ سے ہوتی ہے،صرف نیت سے احرام کافی نہیں۔

مسئلہ: احرام میں مرد جس طرح شلوار اور قمیص نہیں پہن سکتا اسی طرح سر کو پگڑی،ٹوپی وغیرہ کسی چیز سے نہیں ڈھانپ سکتا،اور جوتا وہ استعمال کرسکتا ہے جس سے اس کے پاؤں کے درمیان اوپر والا حصہ ننگا ہو۔عام طور پر ہوائی چپل ہی استعمال ہورہی ہے۔کوئی اور جوتا پہننے سے ہر طرف سے اعتراض شروع ہوجاتے ہیں،ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سیالکوٹی دیسی جوتے جو ٹخنے سے بھی نیچے ہوتے ہیں اور پاؤں کا پنجہ معمولی ان سے ڈھانکا جاتا ہے ان کا استعمال جائز ہے۔

مسئلہ: مرد احرام کی حالت میں اپنے سر کو بھی نہ ڈھانپے اور چہرہ کو بھی نہ ڈھانپے۔

"عن ابن عمر احرام الرجل فی رأسه واحرام المرأۃ وجھھا" (رواہ دارقطنی والبیھقی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مرد کا احرام اس کے سر میں ہے اور عورت کا احرام اس کے چہرے میں ہے۔

"عن ابن عباس اَنّ رجلاوقصته راحلته فمات فقال رسول اللہ ﷺ اغسلوہ بماء و سدر وکفنوہ فی ثوبیه ولاتمسوہ طیبا ولاتخمروا رأسه ووجھه فانه یبعث یوم القیامة ملبیا" (رواہ مسلم ونسائی وابن ماجه)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک شخص (احرام کی حالت میں) سواری سے گر کر فوت ہو گئے ان کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کو غسل دے دو پانی اور بیری کے پتوں سے، اور دو کپڑوں میں کفن دے دو، اور خوشبو نہ لگاؤ، اور سر اور چہرے کو نہ ڈھانپو بیشک یہ شخص قیامت کے دن تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھایا جائے گا۔

مسئلہ: عورت سلے ہوئے کپڑے پہنے گی۔ سر کو ڈھانپ کر رکھے گی۔ صرف چہرا ننگا رکھے گی۔ اگر پردہ کرنا چاہے تو سر پر ایسے ٹوپی پہن لے جس کا کچھ حصہ آگے کی طرف بڑھا ہوتا ہے (ہیٹ) اس کے اوپر کپڑا اوڑھ لے جو چہرے سے ہٹ کر رہے۔ اسی طرح عورت تلبیہ بلند آواز سے نہیں پڑھے گی اور مرد تلبیہ بلند آواز سے پڑھے گا۔

مسئلہ: احرام کی حالت میں خوشبو لگانا، بال منڈانا یا کٹانا، تیل لگانا، ناخن کٹانا منع ہے۔ البتہ غسل کرنا جائز ہے لیکن خوشبودار صابن یا میل اتارنے والے صابن کا استعمال منع رہے گا۔

مسئلہ: احرام کی حالت میں پیسوں والی تھیلی یا پیٹی کمر سے باندھنا جائز ہے۔

مسئلہ: نمازوں کے بعد اور سحری کے وقت اور کسی سوار کو ملتے وقت اور کسی بلند جگہ چڑھتے وقت یا پستی کی جانب اترتے وقت تلبیہ زیادہ پڑھے اور آواز بلند کرے، صحابہ کرام کا اسی پر عمل تھا۔

طواف قدوم:

مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلے مسجد حرام میں آئے، کعبہ شریف کو دیکھ کر "اللہ اکبر"، اور "لا الٰہ الا اللہ" پڑھے، اپنے ہاتھ کندھوں کے برابر رکھ کر دعاء کرے۔

پھر حجر اسود سے طواف کی ابتداء کرے، سب سے پہلے اگر کسی کو تکلیف دینے کے بغیر حجر اسود کو چومنا ممکن ہو تو چومے۔

"لماروی ان النبی علیه السلام قبل الحجر الاسود ووضع شفتیه علیه"

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حجر اسود کو چوما اور اس پر اپنے ہونٹ مبارک رکھے۔

لیکن حجر اسود کو چومنا مستحب ہے، کسی کو تکلیف نہ دینا واجب ہے، لہٰذا اگر کسی کو تکلیف دینے کے بغیر چومنا ممکن ہو تو چومے ورنہ ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چوم لے، اگر ہاتھ لگانا بھی ممکن نہ ہو تو اپنی چھڑی وغیرہ حجر اسود کو لگا کر چھڑی کو چوم لے، یہ بھی ممکن نہ ہو تو صرف حجر اسود کو دیکھ کر "اللہ اکبر" اور "لاالہ الااللہ" اور "الحمدللہ" اور نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھ لے۔

"قال رسول اللہ ﷺ لعمر انک رجل ایدتؤذی الضعیف فلا تزاحم الناس علی الحجر ولکن ان وجدت فرجة فاستلمه والافاستقبله وهلل و کبر"

(رواه ابویعلی واحمدواسحق بن راهویه والشافعی رحمهم الله)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا بیشک تم طاقت ور شخص ہو، کمزور لوگوں کو تکلیف نہ پہنچانا، حجر اسود پر لوگوں سے مزاحمت (بھیڑ کرنا، اژدھام کرنا) نہ کرنا، اگر جگہ کشادہ مل جائے تو حجر اسود کا استلام کر لینا (چوم لینا یا ہاتھ لگا لینا) ورنہ صرف استقبال کر لینا اور "لاالـه الااللہ" اور "اللہ اکبر" پڑھ لینا۔

"روی انه علیه السلام طاف علی راحلته واستلم الارکان بمحجنه"

نبی کریم ﷺ نے اپنی سواری پر طواف کیا اور حجر اسود اور رکن یمانی کا اپنے عصا سے استلام فرمایا۔

"عن سویدبن غفلة ان عمر قبّل الحجر والتزمه وقال رأیت اباالقاسم ﷺ بک حفیا"

(نسائی)

سوید بن غفلة فرماتے ہیں کہ بیشک حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو چوما اور لازم پکڑا اور فرمایا میں نے ابوالقاسم ﷺ کو تمہارے ساتھ اسی شفقت سے درپیش آتے ہوئے دیکھا۔

لازمی طور پر جگہ کشادہ ملنے پر آپ نے چوما۔ اور یہ یاد رہے کہ اس مقام پر "التزمه" کا معنی گلے لگانا نہیں، کیونکہ حجر اسود ایک کونے میں نصب ہے وہاں گلے لگانا ممکن ہی نہیں۔ ابوالقاسم رسول اللہ ﷺ کی کنیت ہے۔

"عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال الحجر الاسود من الجنة"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حجر اسود جنت سے آیا ہوا ہے۔
(حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے زمین پر تشریف لائے تو جنت سے حجر اسود کو بھی ساتھ لائے)۔

"عن عابس بن ربیعة قال رأیت عمر جاء الی الحجر فقال انی لأعلم انک حجر و لو لانی رأیت رسول اللہ ﷺ یقبلک ماقبلتک ثم دنامنه فقبله" (نسائی)

حضرت عابس بن ربیعہ کہتے ہیں میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ حجر اسود کے پاس آئے تو فرمایا۔ بیشک میں جانتا ہوں بیشک تو پتھر ہے، اگر میں رسول اللہ ﷺ کو تمہیں چومتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں تمہیں نہ چومتا۔ پھر آپ اس کے قریب ہوئے اور اسے چوما۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔" **انک حجر لاتضر و لاتنفع**" بیشک تو پتھر ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع دے سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تو پتھر ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وجہ اصل میں یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت قریب ہی گذرا تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ حجر اسود کو چومتے ہوئے دیکھ کر کوئی بت پرستی کو جائز نہ سمجھ لے، جہاں تک تعلق ہے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے نفع ونقصان پہنچانے کا اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت شاہد ہے۔

"قدروی الحاکم من حدیث ابی سعیدان عمر رضی اللہ عنه لماقال هذاقال له علی بن ابی طالب انه یضروینفع وذکران اللہ تعالی لمااخذالمواثیق علی ولدآدم کتب ذلک فی ورق والقمه الحجرقال وسمعت رسول اللہ ﷺ یقول یؤتی یوم القیامة بالحجروله لسان ذلق یشهدلمن یستلمه بالتوصیة"

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا "بیشک تو پتھر ہے کوئی نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ نفع ونقصان پہنچا سکتا ہے، اور آپ نے ذکر فرمایا بیشک جب اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم سے وعدہ لیا تو اسے لکھ کر اسی پتھر میں ڈال دیا۔ اور

آپ نے فرمایامیں نے رسول اللہﷺ کوفرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن حجراسودکوزبان دی جائے گی جولوگ اس کا استلام کریں گےان کے حق میں گواہی دے گا۔ (حاشیہ نسائی)

" عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ نزل الحجر الاسود من الجنة وھو اشدبیاضامن اللبن فسودته خطایابنی آدم" (رواہ احمدو الترمذی وقال ھذاحدیث حسن صحیح)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہﷺ نے فرمایا حجراسود جنت سے اترا ہے یہ دودھ سے زیادہ سفید تھا، انسانوں کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔

" وعن ابن عمر قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الرکن والمقام یاقوتتان من یاقوت الجنة طمس اللہ نورھماولولم یطمس نورھمالاضاء مابین المشرق والمغرب"

(رواہ الترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہﷺ کوفرماتے ہوئے سنا بیشک حجر اسوداور مقام ابراہیم جنت کے یاقوت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے نورکومٹادیا۔اگران کے نورکو نہ مٹایا جاتا تو یہ مشرق ومغرب کے درمیان (تمام جگہ کو) روشن کردیتے۔

طواف حطیم کے باہر سے کرے:

جہاں کعبہ شریف کا میزاب رحمت (رحمت والا پرنالہ) گرتا ہے اس کے باہر چھوٹی چھوٹی دیوار سے کچھ حصہ علیحدہ کیا ہوا ہے اسے حطیم کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ کعبہ شریف کا ہی حصہ ہے۔

" عن عائشة قالت کنت احب ان ادخل البیت فاصلی فیه فاخذرسول اللہ ﷺ بیدی فادخلنی الحجر فقال اذاارد ت دخول البیت فصلی ھھنافانماھو قطعة من البیت و لکن قومک اقتصرواحیث بنوہ" (نسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں یہ پسند کرتی تھی کہ میں بیت اللہ شریف میں داخل ہوکر نمازادا کروں، تورسول اللہﷺ نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر مجھے حطیم میں داخل کر دیا۔ پھر آپ نے

فرمایا جب تم بیت اللہ شریف میں داخل ہونے کا ارادہ کرو تو یہاں نماز ادا کرلو بیشک یہ بیت اللہ شریف کا حصہ ہی ہے، لیکن تماری قوم نے جب اسے تعمیر کیا تو چھوٹا کردیا۔

طواف قدوم میں اضطباع کرے:

اضطباع کا یہ مطلب ہے کہ کندھوں پر اوڑھنے والی چادر دائیں بغل کے نیچے سے گذارے اور بائیں کندھے کے اوپر کرے یہ سنت ہے۔

پہلے تین چکروں میں رمل کرے:

رمل کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح مجاہد میدان جنگ میں صفوں کے درمیان اپنی بہادری دکھانے کے لئے کندھوں کو ناز ونخرے سے ہلا کر چلتا ہے اس طرح یہ طواف کرنے والا بھی چلے۔

مقام توجہ: جب مسئلہ یہ ہے کہ جماعت ہو رہی ہو تو امام رکوع میں چلا گیا تو کوئی شخص رکعت کو حاصل کرنے کے لئے دوڑ کر رکوع میں آکر نہ ملے بلکہ آہستہ آہستہ چل کر آئے رکعت مل جائے تو بہتر ورنہ سلام کے بعد اپنی رکعت مکمل کرلے، کیونکہ مسجد میں دوڑنا مسجد کی تعظیم کے منافی ہے۔ لیکن مسجد حرام جس میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نماز کا ثواب حاصل ہوتا ہے اس میں ناز ونخرے اور تکبرانہ انداز پر چلنے کا کیا مقصد ہے؟ ہاں مقصد صرف یہ ہے کہ حج اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی یاد تازہ رکھنے کا نام ہے، آیئے رمل کرنے کی وجہ دیکھئے۔

"عن ابن عباس قال لما قدم النبی ﷺ واصحابه مكة قال المشركون وهنتهم حمى يثرب ولقوا منها شرا فاطلع الله نبيه ﷺ على ذلك فامر اصحابه ان يرملوا" (نسائی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو مشرکین نے کہا ان لوگوں کو یثرب کے بخار نے کمزور کردیا ہے۔ انہوں نے وہاں سے شر ہی حاصل کیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس پر مطلع فرمادیا تو آپ نے اپنے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ رمل کرو۔

جب صحابہ کرام نے رمل کیا، مجاہدین کی طرح طواف کیا تو وہ دیکھ کر کہنے لگے یہ فلاں شخص تو ہمارے فلاں سے بہادر نظر آتا ہے، اس طرح انہوں نے کئی حضرات کے نام لئے۔

اب اگرچہ کفار کو اپنی بہادری دکھانی مقصود نہیں ہوتی لیکن رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی اداء کو حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

طواف کے آخری چار چکر:

رمل صرف پہلے تین چکروں میں ہے۔ طواف کے آخری چار چکر آرام آرام سے چلے، اور طواف کے ہر چکر میں حجر اسود سے گزرتے ہوئے استلام کرے، اگر استلام نہ کر سکے تو صرف استقبال کر لے۔

"عن ابن عمر قال رمل رسول اللہ ﷺ من الحجر الی الحجر ثلاثا ومشی اربعا"

(رواہ البخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حجر اسود سے لے کر حجر اسود تک تین چکر رمل کیا اور چار چکر آہستہ آہستہ چلے۔

تنبیہ: رمل کا کوئی بدل نہیں، اس لئے اگر ہجوم ہو رمل نہ کر سکے تو رک جائے، جس وقت رمل کا موقع مل سکے اس وقت طواف کرے اور رمل بھی کرے۔

طواف قدوم کے بعد دو رکعت نماز ادا کرنا:

طواف مکمل کرنے کے بعد مقام ابراہیم کے پاس آ کر دو رکعت ادا کرے، اگر مقام ابراہیم کے پاس ممکن نہ ہو تو مسجد حرام میں جہاں بھی جگہ میسر ہو وہاں ہی ادا کر لے۔ یہ دو رکعت ادا کرنا واجب ہے۔ البتہ اوقات مکروہہ ہوں جن میں نماز ادا کرنا منع ہے تو تاخیر کرے۔ یعنی طواف کرنے میں ممانعت نہیں تاہم نماز اوقات مکروہہ کے بعد ادا کرے۔ یہی حکم عصر کے بعد اور صبح صادق کے بعد کا بھی ہے۔ کیونکہ ان دو رکعت کے واجب ہونے اور مستحب ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ لہٰذا ان اوقات سے بھی مؤخر کیا جائے۔

تنبیہ: طواف قدوم کا دوسرا نام طواف تحیۃ ہے، یہ طواف سنت ہے، واجب نہیں، یہ آفاقی لوگوں کے لئے سنت ہے، میقاتوں کے اندر رہنے والے حضرات کے لئے طواف قدوم نہیں۔

سعی کرنا:

صفا سے مروہ پر آنا ایک چکر ہے، پھر مروہ سے صفا پر آنا دوسرا چکر ہے، اس طرح صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگانا سعی کہلاتا ہے جو حج میں واجب ہے۔ نشیبی جگہ جس کو آجکل بجلی کی سبز رنگ کی ٹیوب سے واضح کیا گیا ہے اس جگہ تک مرد کو دوڑنا ضروری ہے، عورت اس جگہ بھی آہستہ آہستہ چلے، اس کے پردے کا لحاظ کیا گیا ہے۔

صفا اور مروہ کا ذکر "ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ" کے بیان میں ہو چکا ہے۔

صفا پر کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر اللہ اکبر، لاالہ الااللہ اور درود شریف پڑھے پھر دعا کرے، مروہ پر بھی اسی طرح کرے۔

پھر مکہ مکرمہ میں ہی حالت احرام میں ہی رہے جب بھی طواف کر سکے تو طواف کرے، ہر طواف کے بعد دو رکعت ادا کرے، دوران طواف دعاء کرے اور ذکر کرے، البتہ دنیاوی باتیں نہ کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

"الطواف صلوٰۃ" طواف نماز (کی طرح) ہے۔

جس طرح نماز میں کلام کرنا منع ہے، اسی طرح طواف میں بھی منع رہے گا، اور یہ بھی خیال رہے کہ آفاقی شخص کو نوافل ادا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ وہ طواف کرے۔

منیٰ میں جانا:

آٹھ ذی الحج کو صبح کی نماز مکہ مکرمہ میں پڑھ کر منیٰ میں جانا ہے۔

"عن جابر ان النبی ﷺ صلی الفجر یوم الترویۃ بمکۃ فلما طلعت الشمس راح الی منی فصل بمنی الظھر والعصر والمغرب والعشاء ثم راح الی عرفات"
(ھذہ قطعۃ من روایۃ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ آٹھ ذی الحجہ کو صبح کی نماز مکہ مکرمہ میں ادا کی جب سورج طلوع ہوگیا تو آپ منی کی طرف چلے، وہاں ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر (نو ذی الحج کو صبح کی نماز کے بعد) عرفات کی طرف چلے۔

مسئلہ: اگر آٹھ ذی الحج کو مکہ مکرمہ میں ہی رہا اور نو ذی الحج کو فجر کی نماز ادا کر کے عرفات کی طرف چلا اور منی کے راستہ سے گذرا تو جائز ہے لیکن سنت رسول اللہ ﷺ کا تارک ہوگیا۔

عرفات میں جانا:

نو ذی الحج منی میں فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد عرفات کی طرف چل پڑے۔ عرفات میں ظہر کا وقت شروع ہوتے ہی اذان ہوگی اور اقامت پھر امام ظہر کی نماز پڑھائے گا۔ پھر ساتھ عصر کی نماز کی اقامت ہوجائے گی اور عصر کی نماز امام پڑھائے گا، عصر کے لئے دوسری اذان نہیں ہوگی۔ دونوں نمازوں کے فرض ادا کئے جائیں گے، ان کے درمیان سنتیں اور نوافل ادا نہیں کئے جائیں گے۔ امام خطبہ دے گا۔

"عن جابر ان النبی ﷺ صلاهما باذان و اقامتین"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ظہر اور عصر کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں سے پڑھائیں۔

تنبیہ: دو نمازوں کو وہی لوگ جمع کریں جو وہاں کے امام کی اقتداء میں نماز ادا کریں، جو لوگ اپنی اپنی جگہ نماز ادا کریں گے وہ ہر نماز کو اپنے اپنے وقت میں ادا کریں گے، یہ لوگ سنتیں بھی ادا کریں گے۔

مقام عرفات میں ٹھہرنا فرض ہے:

نو ذی الحج کے دن کو یا آنے والی رات کو مقام عرفات سے گذر گیا تو حج ادا ہوجائے گا اگر مقام عرفات پر نہ پہنچ سکا تو حج ادا نہیں ہوگا، آئندہ سال حج قضاء کرنا پڑے گا۔

عرفات تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے سوائے بطن عرنہ کے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

"عرفات كلهاموقف وارتفعواعن بطن عرنة والمزدلفة كلهاموقف وارتفعواعن وادى محسر"

عرفات تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے سوائے بطن عرنہ کے اور مزدلفہ تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے سوائے وادیٔ محسر کے۔

مقام عرفات میں دعاء کرنا:

دعاء کرتے وقت منہ قبلہ کی طرف کرے، اور بڑی عاجزی سے دعاء کرے۔

" قال رسول الله ﷺ لكل شئ شرفاوان شرف المجالس مااستقبل به القبلة"

(رواه الحاكم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کو شرافت اور بلندی حاصل ہے، مجالس کی شرافت یہ ہے کہ منہ قبلہ کی طرف کیا جائے۔

"عن ابن عباس عن الفضل قال رأيت رسول الله ﷺ واقفابعرفة مادايديه كالمستطعم "

(اخرجه البزار)

رسول اللہ ﷺ نے مقام عرفات پر اس طرح ہاتھ پھیلا کر (عاجزی سے) دعاء کی جس طرح طعام طلب کرنے والا ہاتھ پھیلاتا ہے۔

" عن ابن عباس رضى الله عنهمار أيته عليه الصلوة والسلام يدعوبعرفة الى صدره كالمستطعم المسكين "

(رواه البيهقى)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو مقام عرفات پر دعا کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ نے اپنے ہاتھوں کو سینہ کے برابر اٹھایا ہوا ہے اور ایسے دعاء کر رہے ہیں جس طرح کوئی مسکین طعام طلب کر رہا ہو۔

مقام عرفات اگرچہ تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے لیکن جبل رحمت کے پاس ٹھہرنا نصیب ہو جائے تو یہ خوش بختی ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نماز کے بعد اسی مقام پر ٹھہرے۔

مقام عرفات میں وقتاً فوقتاً تلبیہ پڑھتا رہے۔

"لأن النبی ﷺ مازال یلبی حتی اتی جمرة العقبة"

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ جمرہ عقبہ تک پہنچنے کے وقت تک تلبیہ پڑھتے رہے۔

مزدلفہ میں آنا:

نو ذی الحج کا سورج جب غروب ہو جائے تو وہاں کا امام اور تمام لوگ آہستہ آہستہ چلیں یہاں تک کہ مزدلفہ میں آجائیں، اگر جبل قزح کے قریب جگہ مل جائے تو خوش قسمتی ورنہ مزدلفہ کے کسی مقام پر ٹھہر جائے۔ امام لوگوں کو مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور ایک اقامت سے پڑھائے۔ یعنی یہاں دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھا جائے گا، ان دو نمازوں کے درمیان بھی نوافل نہیں پڑھے جائیں گے۔

مقام توجہ: اس دن مغرب کی نماز مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے ادا نہیں کی جائے گی۔ یعنی مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے مغرب کی نماز کا وقت ہی شمار نہیں ہوگا۔ اگر راستہ میں مغرب کی نماز ادا کی تو وہ نماز نہیں ہوگی۔

مزدلفہ میں فجر کی نماز:

صبح صادق ہوتے ہی اندھیرے میں ہی امام فجر کی نماز مزدلفہ میں پڑھا دے۔ تاکہ نماز کے بعد زیادہ دیر ٹھہرنے اور دعاء کرنے کا وقت میسر ہو سکے، اندھیرے میں نماز ادا کرنے پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری و مسلم میں موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مزدلفہ میں فجر کی نماز عام معمول سے ہٹ کر سویرے اندھیرے میں پڑھائی۔

نماز کے بعد مقام مزدلفہ میں رک کر دعاء کی جائے۔ دعاء عاجزی سے ہاتھ پھیلا کر کرے جیسا کہ عرفات میں دعاء کرنے کا ذکر ہو چکا ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

" ان النبی ﷺ وقف فی ھذہ الموضع(ای المشعر الحرام)یدعو"

نبی کریم ﷺ مزدلفہ میں مشعر حرام کے پاس دعاء کرنے کے لئے ٹھہرے۔

مزدلفہ میں ٹھہرنا حج میں واجب ہے، واجب کے چھوٹ جانے سے دم (جانور ذبح کرنا) لازم آ جاتا ہے۔

مقام مزدلفہ تمام ہی ٹھہرنے کی جگہ ہے سوائے وادی محسر کے، جیسا کہ پہلے حدیث پاک کو ذکر کیا گیا ہے۔

مزدلفہ سے منی میں آنا:

صبح کی نماز کے بعد مزدلفہ میں دعاء میں مشغول رہے جب روشنی خوب ہو جائے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے مزدلفہ سے چل کر منی میں آ جائیں۔ یہ ذی الحج کی دس تاریخ ہوگئی۔

فائدہ: ضعیف حضرات اور عورتیں اگر مزدلفہ میں کچھ دیر رک کر اژدھام سے بچنے کی غرض سے رات کو ہی منی میں آ جائیں تو جائز ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اہل کے ضعیف حضرات کو رات میں ہی منی بھیج دیا تھا۔

" عن ابن عباس قال انا ممن قدم النبی ﷺ لیلۃ المزدلفۃ فی ضعفۃ اھلہ"

(بخاری،مسلم،مشکوۃ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے اپنی اہل کے جن ضعیف لوگوں کو مزدلفہ سے رات کو ہی بھیج دیا تھا میں بھی ان میں تھا۔ (کیونکہ یہ اس وقت بچے تھے)

پتہ چلا کہ ضعیف سے مراد صرف بوڑھے ہی نہیں بلکہ عورتیں اور بچے بھی مراد ہیں۔

کنکریاں مارنا:

جب منی میں پہنچیں تو سب سے پہلے جمرات کے پاس آ جائیں کنکریاں ماریں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے منی میں پہنچتے ہی بغیر ٹھہرنے کے سب سے پہلے کنکریاں ہی ماری ہیں۔

سات کنکریاں مارنی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہوں جو دوسرے کسی شخص کو تکلیف نہ دیں، مستحب یہ ہے کہ جمرۃ سے پانچ ذراع (تقریباً آٹھ فٹ) کے فاصلہ سے کنکریاں مارے اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر کنکری کو رکھ کر شہادت انگلی سے پھینک دے۔لیکن آجکل بہت سے زیادہ ہجوم ہوتا ہے، اس لئے اتنی دور سے کھڑے ہو کر کنکریاں مارے جو جمرۃ کے قریب پہنچ جائیں۔اگر بہت دور رہیں تو رمی (کنکریاں مارنے کا فعل) نہیں ہوگی۔کنکری ایک ایک کر کے مارے، اگر سات کنکریاں ایک ہی مرتبہ مار دے تو ایک ہی کنکری شمار ہوگی۔

فائدہ: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم ہوا کہ اپنے بیٹے کی قربانی کرو تو آپ اسمٰعیل علیہ السلام کو قربانی کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں تو آپ کو شیطان نے وسوسہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی، آپ نے اسے کنکریاں مار کر بھگا دیا، اسی مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں شیطان کو ایک مرتبہ تھوڑا آگے جا کر دوسری مرتبہ پھر ذرا آگے جا کر تیسری مرتبہ کنکریاں ماریں، تینوں مرتبہ اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا'' حاجی حضرات کنکریاں مار کر آپ کی یاد کو تازہ کرتے ہیں، ورنہ اب وہاں کوئی شیطان نہیں ہوتا۔

کنکریاں مارنے کا مستحب وقت:

دس ذی الحج کو سورج کے ڈھلنے سے پہلے کنکریاں مارنا مستحب ہے۔تاہم آجکل بہت زیادہ ہجوم کی وجہ سے کنکریاں مارنا سب سے مشکل کام ہے، بعض اوقات ایک دوسرے سے دھکا لگنے کی وجہ سے کئی لوگ گر کر ہجوم کے پاؤں سے روندے جانے کی وجہ سے اس دنیا سے چل بسے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص سورج کے ڈھلنے سے پہلے کنکریاں مارنے کی ہمت نہ سمجھے تو بعد میں جس وقت بھی ہمت سمجھے کنکریاں مار لے کیونکہ جان بچانا بھی فرض ہے۔ البتہ کوشش کر کے دیکھ لے کہ اگر سورج کے ڈھلنے سے پہلے کنکریاں مار سکے تو بہتر ہے۔یہ بھی یاد رہے پہلے دن صرف جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماری جائیں گی۔

قربانی کرنا:

اگر کوئی شخص مسافر نہیں اور صاحب نصاب ہے تو اس پر قربانی واجب ہوگی۔ اگر صاحب نصاب نہیں یا کوئی شخص مسافر ہے تو اس پر قربانی کرنی واجب نہیں ہوگی۔ وہ چاہے تو قربانی کرے چاہے تو نہ کرے۔ قربانی کرنا اس کے لئے مستحب ہے۔

حلق یا قصر کرنا:

قربانی کے بعد سر منڈائے یا انگلی کے پورے برابر بال چھوٹے کرادے۔ البتہ بال منڈانا افضل ہے۔

”عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ رحم اللہ المحلقين قالوا والمقصرين يارسول اللہ فلما كانت الرابعة قال والمقصرين“ (رواه البخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سر منڈانے والوں پر رحم فرمائے۔ صحابہ کرام نے فرمایا۔ ”بال چھوٹے کرانے والوں پر بھی“ تو آپ نے چوتھی مرتبہ اپنی دعاء میں بال چھوٹے کرانے والوں کو شامل کیا اور کہا کہ بال چھوٹے کرانے والوں پر بھی اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

حلق کے ساتھ احرام کی کافی پابندیاں ختم:

جب انسان نے سر منڈالیا یا بال چھوٹے کرالئے تو اس کے لئے ہر وہ چیز حلال ہوگئی جو احرام کی وجہ سے اس پر منع تھی سوائے عورتوں کے، ابھی تک زوجہ سے وطی کرنا جائز نہیں ہوا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

” حل له كل شيء الا النساء“ (اخرجه الطبرانی)

اس کے لئے سوائے عورتوں کے ہر چیز حلال ہوگئی۔

طواف زیارۃ کرنا:

طواف زیارۃ فرض ہے، دس ذی الحج کی صبح کو اس وقت شروع ہو جاتا ہے، بہتر یہی ہے کہ دس ذی الحج کو ہی طواف کرے، کیونکہ نبی کریم ﷺ سر منڈانے کے بعد مکہ مکرمہ میں تشریف لائے اور طواف زیارۃ کیا لیکن اگر دیر ہو جائے تو گیارہ اور بارہ ذی الحج کو بھی طواف کیا جاسکتا ہے۔

تنبیہ: اگر ایک شخص نے طواف قدوم کرلیا تھا اس میں رمل بھی کرلیا تھا اور طواف قدوم کے بعد صفا و مروہ میں سعی بھی کرلی تھی تو اب طواف زیارۃ میں رمل بھی نہیں کرے گا اور اس کے بعد سعی بھی نہیں کرے گا، لیکن اگر پہلے کسی وجہ سے سعی نہیں کرسکا تو اب طواف زیارۃ میں رمل کرے گا اور اس کے بعد سعی بھی کرے گا۔

طواف کے بعد دو رکعت ادا کرے اور ہر مرتبہ حجر اسود سے گذرتے ہوئے استلام کرے۔

عورتوں کا حلال ہونا:

طواف زیارۃ جب کرلیا تو اب احرام کی مکمل پابندی ختم ہوگئی، یعنی زوجہ سے جماع کرنا جو ابھی تک حرام تھا اب وہ بھی جائز ہوگیا۔

تنبیہ: اگر بارہ ذی الحج سے بھی طواف زیارۃ کو مؤخر کردیا تو اس شخص پر دم (جانور کا ذبح کرنا) لازم آجائے گا۔

گیارہ ذی الحج کو کنکریاں مارنا:

گیارہ ذی الحج کو جب سورج ڈھل جائے تو تینوں جمرات کو سات سات کنکریاں مارنی ہوں گی۔ ابتداء اس جمرہ سے کرے گا جو مسجد خیف کے قریب ہے، پھر جو اس کے قریب ہے، پھر آخر میں جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارے گا، کنکریاں مارتے ہوئے اللہ اکبر پڑھے۔ ایک جمرہ کو کنکریاں مار کر رک جائے تحمید، تہلیل کرے، ثناء پڑھے اور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھے اور اپنی حاجت کے لئے دعاء کرے اور دعاء کرتے وقت ہاتھ اٹھائے، پھر دوسرے جمرہ

کو کنکریاں مارے، البتہ تیسرے جمرہ عقبہ کو کنکریاں مار کر رکے نہیں، لیکن آجکل بہت زیادہ ہجوم کی وجہ سے رک کر تحمید و تہلیل وغیرہ اور دعاء کرنا بہت مشکل کام ہے جان بچاتے ہوئے چلتے ہوئے ذکر کرنا اور دعاء کرنا بہتر نظر آتا ہے۔

بارہ ذی الحج کو کنکریاں مارنا:

جس طرح گیارہ ذی الحج کو سورج ڈھلنے کے بعد کنکریاں ماری گئیں اسی طرح بارہ ذی الحج کو بھی ماری جائیں، یعنی تینوں جمرات کو کنکریاں مارے، ہر جمرے کو کنکریاں مار کر رک کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور دعا کرے، اور اس دن بھی کنکریاں مارنے کا مستحب وقت سورج ڈھلنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

تیرہ ذی الحج کو کنکریاں مارنا:

بارہ ذی الحج کو کنکریاں مار کر مکہ مکرمہ میں آنے کی اجازت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص رات منی میں ہی رہا تو تیرہ ذی الحج کو بھی سورج کے ڈھلنے کے بعد کنکریاں مار کر مکہ مکرمہ میں آئے، البتہ اس دن سورج کے ڈھلنے سے پہلے بھی کنکریاں مار کر مکہ مکرمہ میں آنا جائز ہے۔

البتہ یہ خیال رہے کہ تیرہ ذی الحج کو بھی کنکریاں مار کر آنا افضل ہے۔

"لماروی ان النبی ﷺ صبرحتی رمی الجمار الثلاث فی الیوم الرابع" (ابوداؤد)

کیونکہ نبی کریم ﷺ وہاں رکے، یہاں تک کہ تیرہ ذی الحج کو بھی کنکریاں مار کر وہاں سے چلے۔

اس مسئلہ کی مزید تفصیل ان شاءاللہ "فمن تعجل فی یومین فلااثم علیه ومن تاخر فلااثم علیه لمن اتقی" کی وضاحت میں آجائے گی۔

آٹھ ذی الحج کے بعد اور دس ذی الحج کے بعد اور گیارہ کے بعد آنے والی راتیں منی میں ہی گذاری جائیں، وہاں رات نہ گذارنا مکروہ ہے۔

"لماروی ان النبی ﷺ بات" (ابوداؤد)

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ راتیں منی میں ہی گذاریں۔

طواف وداع:

مکہ مکرمہ میں پہنچ کر طواف کرے، اس طواف میں رمل نہیں، اس طواف کو طواف صدر اور طواف آخر عہد بالبیت بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ "صدر یصدر" کا معنی ہے رجوع کرنا، یہ طواف بھی لوٹنے اور کعبہ شریف کو الوداع کرنے کی غرض سے آخری طواف ہوتا ہے، اسی لئے اس کے یہ نام ہیں۔ یہ طواف واجب ہے۔

مسئلہ: عورت حج میں تمام کام وہی کرے گی جو مرد کرتا ہے، البتہ چند کاموں میں عورت مرد سے مختلف رہے گی۔ عورت اپنا سر ننگا نہیں کرے گی۔ البتہ چہرہ ننگا کر سکتی ہے۔ چہرے کا پردہ کرے تو کوئی چیز سر پر ایسی استعمال کرے جس سے لٹکانے والا کپڑا اس کے چہرے سے مس نہ کرے تو یہ صورت بھی جائز ہے۔

اور عورت بلند آواز سے تلبیہ نہ پڑھے بلکہ آہستہ آواز میں پڑھے اور عورت رمل نہیں کرے گی۔ اور عورت صفا اور مروہ کے درمیان دوڑے گی نہیں۔ اگرچہ یہ سنت حضرت ہاجرہ کی ہے جو عورت ہیں لیکن آپ جب دوڑی تھیں تو اس وقت کوئی مرد وہاں موجود نہیں تھا۔ اب وہاں مرد بھی ہوتے ہیں، اس لئے عورت کے دوڑنے میں اس کی بے پردگی ہوتی ہے، لہٰذا اس کے پردے کا لحاظ کر کے اسے دوڑنے سے منع کر دیا گیا۔

اور عورت سر نہیں منڈائے گی البتہ انگلی کے پورے کے برابر لٹکے ہوئے بالوں کو نیچے سے کٹوائے۔

اور عورت سلے ہوئے کپڑے پہنے گی، چادریں استعمال نہیں کرے گی۔

مسئلہ: اگر عورت کو حیض آ جائے تو باقی تمام کام حج کے کرلے سوائے طواف کے، کیونکہ حیض کے دنوں میں عورت کو طواف کرنا منع ہے، اگر طواف زیارۃ سے پہلے حیض آ جائے تو حیض کے ختم ہونے اور طواف کرنے تک وہاں رکنا پڑے گا لیکن طواف زیارۃ اگر کر لیا اور طواف وداع رہتا تھا تو طواف وداع کئے بغیر عورت کو وہاں سے چلے آنا جائز ہے۔

مسئلہ: طواف وداع آفاقی لوگوں کے لئے واجب ہے جو میقاتوں کے اندر رہنے والے ہیں ان کے لئے طواف وداع واجب نہیں، اسی طرح اگر آفاقی شخص حج کے بعد مکہ میں ہی مقیم ہو گیا تو یہ بھی مکی کے حکم میں ہوگا۔ ہاں البتہ عارضی سکون سے مکی نہیں بنے گا بلکہ اسے طواف وداع کرنا واجب ہوگا۔

آیۃ کریمہ کا شان نزول:

" اخرج الشافعی واحمدوابن شیبه والبخاری ومسلم وابوداؤدوالترمذی والنسائی عن یعلی بن امیة قال جاء رجل الی النبی ﷺ وهوبالجعرانة علیه جبة وعلیهاخلوق فقال کیف تامرنی ان اصنع فی عمرتی قال فانزل علی النبی ﷺ فتستربثوب وکان یعلی یقول وددت انی اری النبی ﷺ وقدانزل علیه الوحی فقال عمرایسرک ان تنظرالی النبی ﷺ وقدانزل علیه الوحی فرفع عمرطرف الثوب فنظرت الیه له غطیط کغطیط البکرفلماسری عنه قال این السائل عن العمرة اغسل عنک اثر الخلوق واخلع عنک جبتک واصنع فی عمرتک ماانت صانع فی حجک"

(درمنثور)

حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مقام جعرانہ میں حاضر ہوا جبہ پہنا ہوا تھا اور اس نے خوشبو لگائی ہوئی تھی۔ اس نے عرض کیا آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں کہ میں عمرہ میں کس کس طرح عمل کروں، یعلی کہتے ہیں اتنے میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہونا شروع ہوگئی، آپ نے کپڑا اوڑھ لیا۔ یعلی کہتے ہیں میں تمنا کرتا تھا کہ کبھی نبی کریم ﷺ پر وحی کو آتے ہوئے دیکھ لوں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، کیا تم نبی کریم ﷺ پر وحی کے آنے کو دیکھنا پسند کرتے ہو؟ (آؤ میں آپ کو دکھاؤں) حضرت عمر نے کپڑے کی ایک طرف کو اٹھایا تو میں نے آپ کی طرف نظر کی آپ خراٹے لے رہے تھے، جب آپ سے وہ کیفیت جاتی رہی تو آپ نے فرمایا عمرہ کے متعلق پوچھنے والا شخص کہاں ہے، خوشبو کے اثرات کو اپنے آپ سے دھو دو اور اپنا جبہ اتار دو، اپنے عمرہ میں وہی کام کرو جو حج میں کرتے ہو۔ (یعنی طواف، سعی اور حلق یا قصر کرو)

"واخرج ابن جریروابن المنذرعن ابن عباس فی الآیة قال من احرم بحج اوعمرة فلیس له ان یحل حتی یتمهاتمام الحج یوم النحراذارمی الجمرةالعقبة وزارالبیت فقدحل وتمام العمرة اذاطاف بالبیت وبالصفاوالمروة فقدحل (درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں (کہ رب تعالیٰ نے حج اور عمرہ کو مکمل کرنے کا جو حکم دیا اس کا مطلب یہ ہے) کہ جو شخص حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے اس کے لئے احرام کھول لینا جائز نہیں یہاں تک کہ اگر احرام حج کا تھا تو دس ذی الحج کو جمرہ عقبہ کو کنکریاں مار لے اور بیت اللہ شریف کی زیارت کر لے یعنی طواف زیارت کر لے اور اگر عمرہ کا احرام تھا تو بیت اللہ شریف کا طواف اور صفا و مروہ میں سعی کرنے کے بغیر احرام کھولنا جائز نہیں۔

"وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" اور مکمل کرو حج اور عمرہ اللہ کے لئے۔

اس کے معنی میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ حکم مطلق ہے کہ حج اور عمرہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے مکمل طور پر ادا کرو، ان کے ارکان و واجبات کا کامل لحاظ کرو۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر حج یا عمرہ کے احرام کو بلا وجہ کھول نہ دو بلکہ ان کو مکمل کر کے احرام سے فارغ ہو، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں مختلف قبائل اپنی مرضی سے حج کرتے تھے جہاں چاہیں ختم کر لیں، ان کو اس طریقہ سے منع کیا گیا۔

یہی دوسرا احتمال شان نزول کی دوسری وجہ کے مطابق ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی راجح قرار دیا کہ معنی یہ کیا جائے۔

"واذا شرعتم في الفعل فاتموه"

اور جب تم حج اور عمرہ کے فعل کو شروع کرو تو پھر اسے پورا کرو یعنی مکمل کرنے سے پہلے ہی فارغ نہ ہو جاؤ۔

فائدہ: احرام سے پہلے آٹھ چیزوں پر عمل کرنا بھی اس آیۃ کا تقاضا ہے، یعنی یہ آیت ان تمام امور کو شامل ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

﴿۱﴾ ان میں سے پہلی چیز کا تعلق مال سے ہے، احرام باندھنے سے پہلے توبہ کر لے وہ توبہ اس طرح ہوگی کہ ظلم سے حاصل کیا ہوا مال واپس لوٹا دے، اور قرضے ادا کر دے، اور جن لوگوں کا خرچ اس کے ذمہ ہے واپس

آنے تک کا خرچ ان کو ادا کر کے جائے، اور لوگوں کی جو امانتیں پاس ہوں وہ ان کے حوالے کر کے جائے، اور اپنے پاس پاک وحلال مال ہو جو آنے جانے تک کافی ہو اس میں کوئی کمی نہ ہو، بلکہ اپنے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ مال رکھے تاکہ فقراء پر اور اپنے ساتھیوں پر مہربانی کر سکے، اور چلنے سے پہلے کچھ مال صدقہ کرے، اور اپنے لئے سواری خریدے، اور اگر سواری کرایہ پر لینی ہے "**فلیظھر للمکاری کل ما یحصل رضاہ فیہ**" تو کرایہ پر دینے والا شخص کامل رضاءمند ہونا چاہئے، کسی قسم کا اس پر جبر نہ ہو، اور اس سے کوئی دھوکا نہ کیا جائے۔

اسی سے واضح ہوا کہ آجکل جن قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے خواہ وہ اپنے ملک سے تعلق رکھتے ہوں یا سعودیہ سے ان پر عمل کرے، جھوٹ، فریب سے کام لے کر حج کرنے کا مقصد کیا ہے؟ جب حج ثواب کے لئے کرنا ہے تو اس میں جھوٹ اور فریب جیسے کبیرہ گناہوں کو شامل کر کے کون سا ثواب حاصل ہوگا؟

﴿۲﴾ دوسری چیز کا تعلق رفیق سے ہے۔

"**فینبغی ان یلتمس رفیقا صالحا محبا للخیر معینا علیہ**"

بہتر یہ ہے کہ اپنے ساتھ ایسا نیک دوست رکھے جو نیکیوں سے محبت رکھتا ہو اور اس کا بھی نیکیوں میں معاون ہو۔

"**ان نسی ذکرہ**" اگر یہ کوئی کام بھول جائے تو وہ یاد دلا دے۔

"**وان ذکر ساعدہ**" اور اگر اسے یاد ہو تو وہ اس کی معاونت کرے۔

"**وان جبن شجعہ**" اور اگر اس کے دل میں کوئی ڈر لاحق ہو تو وہ تسلی دے کہ گھبراؤ نہیں سفر میں مشکلات آتی رہتی ہیں۔

"**وان عجز قواہ**" اور اگر یہ عاجز آجائے تو وہ اس کو سہارا دے، ڈھارس بندھائے۔

"**وان ضاق صدرہ صبرہ**" اور اگر اسے کہیں دل تنگی ہو تو وہ اسے صبر دلائے۔

اور پیچھے رہ جانے والے بھائیوں اور احباب کو الوداع کر کے جائے، ان سے دعاؤں کی درخواست کرے، کیونکہ

"**ان اللہ تعالی جعل فی دعائھم خیرا**" بیشک اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء میں بھلائی رکھی ہے۔

﴿۳﴾ تیسری چیز گھر سے نکلنے کے ساتھ متعلق ہے۔جب وہ گھر سے نکلنے کا ارادہ کرے تو دو رکعت نماز نفل ادا کرے، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ اور "قل یاایھا الکافرون" سورۃ پڑھے۔اور دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ اور سورۃ اخلاص پڑھے "بعد الفراغ یتضرع الی اللہ بالاخلاص" اور فارغ ہونے کے بعد اخلاص اور عاجزی سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، یعنی عجز وانکساری سے دعاء کرے۔

﴿۴﴾ چوتھی چیز کا تعلق ہے گھر کے دروازہ سے، گھر کے دروازہ سے نکلتے ہوئے پڑھے۔

"بسم اللہ تو کلت علی اللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ"

"وکلما کانت الدعوات ازید کانت اولی"

جتنی زیادہ دعائیں کرے گا اتنا ہی اس کے لئے بہتر ہوگا۔

﴿۵﴾ پانچویں چیز کا تعلق سواری پر سوار ہونے سے ہے، جب سوار ہونے لگے تو یہ پڑھے۔

"بسم اللہ وباللہ واللہ اکبر تو کلت علی اللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم، ماشاء اللہ کان ومالم یشأ لم یکن، سبحان اللہ الذی سخر لنا ھذا وما کنا له مقرنین، وانا الی ربنا لمنقلبون"

﴿۶﴾ چھٹی چیز کا تعلق ہے سفر سے، رات کو سفر کرنا مسنون ہے، جب دھوپ نکل آئے تو آرام کرلے، (لیکن آجکل ہوائی جہاز اور گاڑیوں پر سفر کرنا ہوتا ہے، اس لئے ہوائی سروس کے اوقات کا حاجی کو پابند رہنا ہوگا)

سواری سے اتر کر دو رکعت نماز نفل ادا کرے اور زیادہ سے زیادہ دعائیں کرے۔

﴿۷﴾ ساتویں چیز یہ ہے کہ اگر دشمن یا کسی درندے کا خوف لاحق ہو تو آیۃ الکرسی اور کلمہ شہادت اور سورۃ اخلاص اور "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس" پڑھے۔اور یہ عرض کرے۔"تحصنت باللہ العظیم" اور یہ کہے "استعنت بالحی الذی لایموت"

﴿۸﴾ چلتے ہوئے جب بھی کسی بلند جگہ پر چڑھنا ہو تو تین مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھے۔لیکن احرام کے بعد تکبیر بھی پڑھے لیکن تلبیہ پڑھنے میں کثرت سے کام لے۔

﴿۹﴾ نویں چیز یہ ہے کہ سفر صرف حج کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو، اس میں دنیاوی غرض تجارت وغیرہ کا ارادہ نہ ہو، ہاں البتہ بہتر یہ ہے ورنہ تجارت جائز ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

﴿۱۰﴾ دسویں چیز یہ ہے کہ دوران حج اپنی زبان کو گالی گلوچ، جھگڑا فساد سے بچا کر رکھے، (اس کا ذکر بھی ان شاء اللہ آگے آئے گا) اور تمام ارکان وواجبات وسنن حج کو اچھی طرح ادا کرے۔

" ویکون غرضه فی کل هذه الامور ابتغاه مرضاة اللّٰه"

اور اس کی غرض ان تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا حصول ہو۔

"فقوله "اتموا الحج و العمرة للّٰه" کلمة شاملة جامعة لهذه المعانی"

یہ چیزیں جن کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "واتموا الحج والعمرة للّٰه" شامل ہے۔

جب بندہ حج کو اس طرح ادا کرے گا تو اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع حاصل ہوگی۔ کیونکہ آپ کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"واذابتلی ابراهیم ربه بکلمات فاتمهن" اور جب ابراہیم کو اللہ نے چند کلمات سے آزمایا تو انہوں نے ان کو پورا کیا۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا۔ "واتموا الحج والعمرة للّٰه" اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے لئے۔ تو اللہ کے بندوں نے اس کا حکم مانتے ہوئے ان کو پورا کیا۔

" فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوْا رُؤُسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ"

پھر اگر تمہیں روک لیا جائے تو جو میسر ہو ہدی، اور نہ منڈاؤ اپنے سروں کو یہاں تک پہنچ جائے ہدی اپنی (ذبح کی) جگہ۔

"احصار" کا معنی ہے روکنا، حج سے روکے جانے کی چند صورتیں ہیں۔ دشمن کی طرف سے رکاوٹ واقع ہو جائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو حدیبیہ کے مقام پر کفار نے روک لیا تھا۔

جس شخص نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا وہ مریض ہو گیا۔ ایسی مرض لاحق ہو گئی کہ اس کا حج کرنا ممکن ہی نہ رہا۔ یا اس کے پاس حج کا خرچ ہی ختم ہو گیا۔ یا عورت کا خاوند یا محرم جس کے ساتھ وہ حج کر رہی تھی وہ راستہ میں ہی فوت ہو گیا۔ ان تمام صورتوں میں محرم کو روک لیا گیا ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ بطور ہدی ایک بکری یا بھیڑ جو بھی میسر ہو بھیج دے، جس شخص کے ہاتھ بھیجے اس سے ایک دن مقرر کر لے کہ وہ فلاں دن پہنچ جائے گا اور حرم میں یہ جانور ذبح کر دے گا۔ جو دن مقرر کیا تھا اس دن یہ شخص اپنے بال منڈا کر یا بال کٹا کر احرام کھول لے، یہی مطلب ہے۔ "ولا تحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الھدی محلہ" کا کہ جب تک ہدی حرم میں نہ پہنچے اس وقت تک احرام نہیں کھول سکتا۔

خیال رہے کہ جانور بھیجنا تو ہر جگہ سے ممکن نہیں، یقیناً اس کی قیمت بھیجے گا جس سے وہ شخص جانور خرید کر حرم میں ذبح کر دے گا، ہدی کو ذبح کرنے کے لیے دنوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ جس دن بھی پہنچ جائے ذبح کر دے، البتہ حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ بھیڑ یا بکری کم از کم ہدی کی حد ہے، اگر کوئی شخص بطور ہدی گائے یا اونٹ کی رقم بھیج دے اور اس کی طرف سے مکمل ایک گائے یا اونٹ ذبح کر لئے گئے تو یہ بطریق اولیٰ (بہتر طریقہ سے) ادا ہو گی۔

قارن کا حکم:

جس شخص نے حج اور عمرہ دونوں کا ہی ایک ساتھ میقات سے احرام باندھ رکھا ہے اسے قارن کہتے ہیں، قران کی وضاحت ان شاء اللہ آگے آئے گی۔ اگر قران کرنے والے کو روک لیا گیا ہو تو وہ دو بکریاں حرم میں ذبح کرنے کے لئے بھیجے، کیونکہ اس نے دو احرام باندھ رکھے ہیں، دونوں سے آزاد ہونا ہے، اس لئے اس پر دو دم لازم آئیں گے، قران کرنے والا اگر ایک ہدی بھیجے کہ وہ حج کے احرام سے آزاد ہو جائے اور عمرہ کا احرام باقی رہے تو وہ کسی ایک سے بھی حلال نہیں ہوگا، بلکہ اس کے دونوں احرام برقرار رہیں گے۔

مسئلہ: جس شخص نے حج کا احرام باندھ رکھا تھا اگر اسے روک لیا گیا اس نے ہدی بھیج کر احرام کھول لیا تو اس پر آئندہ حج کی قضاء لازم ہوگی اور ساتھ ہی ایک عمرہ کرنا بھی لازم ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اسی طرح ثابت ہے۔ حج کی قضاء تو اس لئے لازم ہے کہ وہ شروع کی وجہ سے لازم ہو چکا تھا اور عمرہ کرنا اس لئے لازم ہے کہ اگر کسی کا حج فوت ہو جائے تو وہ وقتی طور پر عمرہ کر کے حج کے احرام سے آزاد ہو جائے، یہ بھی حج کو فوت کرنے والا ہے۔ جب حج سے روک لیا گیا ہے تو بعد میں حج بھی کرے اور عمرہ بھی۔

مسئلہ: اگر عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا تو روک لیا گیا تو ہدی کا جانور بھیج کر ذبح کے مقرر دن میں سر منڈا کر احرام کھول لے، آئندہ صرف ایک عمرہ قضاء کرے۔

مسئلہ: اگر قران کرنے والے کو روک لیا گیا اس نے دو جانور ہدی کے بھیج دیئے، پھر احرام کھول لیا تو آئندہ وہ ایک حج اور دو عمرے قضاء کرے گا۔

مسئلہ: جس شخص نے حج کا احرام باندھا ہوا تھا لیکن وہ نو ذی الحج کے دن اور اس کے بعد آنے والی رات کو صبح صادق تک مقام عرفات پر نہ پہنچ سکا تو اس پر لازم ہے کہ طواف کرلے اور سعی کرلے اور حلق کرا کے احرام سے فارغ ہو جائے، آئندہ حج کی قضاء کرے، اس پر ہدی کا جانور ذبح کرنا لازم نہیں، اور آئندہ حج کے ساتھ عمرہ کرنا بھی ضروری نہیں۔

فائدہ: عمرہ کا وقت مقرر نہیں اس لئے عمرہ فوت نہیں ہوتا، عمرہ سال میں جب بھی ادا کرے ادا ہی ہوگا، البتہ نو ذی الحج سے لے کر تیرہ ذی الحج تک یعنی پانچ دن سال کے عمرہ کرنا ان میں مکروہ ہے۔

احصار کے متعلق احادیث مبارکہ:

" عن ابن عباس قال قد احصر رسول اللہ ﷺ فحلق رأسه وجامع نسائه ونحر هديه حتى اعتمر عاما قابلا" (رواه البخاری ، مشکوة باب الاحصار)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو جب روک دیا گیا تو آپ نے سر منڈایا اور عورتوں سے جماع کیا اور ہدی کے جانور ذبح کیے، عمرہ دوسرے سال کیا۔

وضاحت حدیث: " ونحر هدیه" میں واؤ مطلقاً جمع کے لئے استعمال ہے، اس میں کوئی ترتیب نہیں پائی گئی، یعنی آپ نے ہدی کے جانور پہلے ذبح کئے، اس کے بعد سر منڈایا، اسی کے ساتھ کامل طور پر احرام سے آزادی حاصل ہوگئی، اسی ترتیب پر بخاری اور مسلم کی حدیث دلالت کر رہی ہے۔

"انه علیه الصلوة والسلام تحلل هو واصحابه بالحدیبیة لماصده المشرکون وکان محرمابالعمرة فنحرثم حلق ثم قال لاصحابه قوموافانحرواثم احلقوا"

نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ کے مقام میں احرام کھولا، کیونکہ آپ کو مشرکین نے روک دیا تھا، جبکہ آپ نے عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا۔ آپ نے ہدی کے جانور ذبح کئے، پھر سر منڈایا، پھر آپ نے صحابہ کرام کو فرمایا اٹھو جانور ذبح کرو اور سر منڈادو۔

" وعن الحجاج بن عمرو الانصاری قال قال رسول اللہ ﷺ من کسراوعرج فقدحل وعلیه الحج من قابل" (مشکوۃ باب الاحصار) وفی روایة اومرض

حجاج بن عمرو انصاری کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی کی ہڈی توڑ دی گئی یا اس میں لنگڑا پن آ گیا تو وہ احرام کھول لے اور آئندہ سال حج کرلے۔ (ایک اور روایت میں مرض کا بھی ذکر ہے)

واضح ہوا کہ کسی طرح بھی محرم کو روک دیا جائے، خواہ دشمن کے ذریعے یا مرض وغیرہ کے ذریعے وہ ہدی کے جانور ذبح کر کے احرام کھول سکتا ہے۔

" فَمَنْ کَانَ مِنکُمْ مَرِیْضاً اَوْبِہٖ اَذًی مِّنْ رَّاْسِہٖ فَفِدْیَۃٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَۃٍ اَوْنُسُکٍ "

پھر ہو جائے کوئی شخص تم میں سے مریض یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو جائے تو فدیہ دے روزے یا صدقہ یا جانور ذبح کرنے سے۔

یعنی کوئی شخص حالت احرام میں سر نہ منڈائے، اگر کوئی رکاوٹ درپیش آجائے تو بطور ہدی ایک جانور حرم شریف میں بھیج دے، اس کے ذبح کرنے کا جو دن مقرر ہو جائے اس دن سر منڈا کر احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو

جائے ،لیکن اگر کوئی شخص مریض ہو جائے یعنی اس کے سر کو شدید درد لاحق ہو جائے ، یا سر میں بہت زیادہ خارش ہوتی ہے، یا سر میں کثیر مقدار میں جوئیں پڑ گئیں لیکن اور کوئی رکاوٹ نہیں تو ایسی صورت میں وہ شخص اپنا سر منڈا کر احرام کھول لے اور فدیہ دے دے، اس کو فدیہ دینے میں اختیار ہے چاہے تو تین روزے رکھ لے اور چاہے تو چھ مساکین کو نصف نصف صاع گندم دے دے، یعنی صدقہ فطر کی مقدار ہر مسکین کو نصف صاع گندم یا کشمش یا ایک ایک صاع کھجور یا جو دے دے۔

طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضاً اَوْبِهٖ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ" مرتب ہے "وَ لَاتَحْلِقُوْا رُءُ وْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْىُ مَحِلَّهٗ" پر، پھر "فَفِدْيَةٌ" ایک حکم ہے جس کا بیان "مِنْ صِيَامٍ اَوْصَدَقَةٍ اَوْنُسُكٍ" ہے، پھر لفظ "اَوْ" تخییر کے لئے ہے کہ ان تینوں کے ادا کرنے میں اس شخص کو اختیار ہے، جس پر چاہے عمل کرلے۔

اس کی تفصیل خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمادی۔ آپ نے کعب بن عجرہ کو دیکھا کہ ان کے سر میں بہت جوئیں پڑ گئیں۔

"فقال آذابک ھوامک قال نعم قال فاحلق رأسک واطعم فرقابین ستة مساکین (والفرق ثلاثة اصوع) اوصم ثلاثة ایام اوانسک شاة" (رواہ ائمة الستة)

تو آپ نے فرمایا کیا یہ کیڑے تمہیں تکلیف دے رہے ہیں؟ تو انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ؟ یعنی تکلیف تو دے رہے ہیں تو آپ نے ان کو فرمایا کہ سر منڈادو اور چھ مسکینوں کو ایک فرق طعام کھلادو یا تین روزے رکھ لو یا ایک بکری ذبح کردو۔

یہ بھی خیال میں رہے کہ فرق تین صاع کا ہے، حدیث شریف میں طعام سے مراد گندم ہے کہ تین صاع گندم چھ مسکینوں کو نصف نصف صاع دے دی جائے۔

اسی طرح ایک صاع گندم کے بدلے ایک روزے کا حکم دیا۔ یعنی چاہے تو تین روزے بطور فدیہ رکھ لے، اور چاہے تو بکری ذبح کر لے۔

اس مسئلہ میں ایک اور مقام توجہ یہ ہے کہ صدقہ جہاں چاہے مسکینوں کو دے دے، اور روزے بھی جہاں چاہے رکھ لے، لیکن بکری یا بھیڑ کو حرم شریف میں ہی ذبح کرنا لازم ہوگا، اس لئے کہ کسی جانور کا خون بہانا کسی زمان یا مکان سے خاص ہو کر ذریعہ قربت بنے گا، جس طرح قربانی کرنا ذی الحج کے تین دنوں (دس، گیارہ، بارہ) کے ساتھ خاص ہے، اس سے آگے پیچھے قربانی نہیں ہوگی، اسی طرح ہدی کا تعلق حرم میں ذبح ہونے سے ہے، حرم کے بغیر ذبح کیا جانے والا جانور ہدی نہیں بن سکے گا اور نہ ہی اس سے فدیہ ادا ہوگا۔

تنبیہ: مذکورہ بالا مسئلہ میں تین روزے رکھنے کے لئے نہ مکان کی قید ہے اور نہ زمان کی اور نہ ہی ان کے بعد سات روزے رکھ کر دس روزے مکمل کرنے کا حکم ہے، دس روزے رکھنے کا حکم ہی علیحدہ ہے، جو آنے والے مسئلہ سے ان شاء اللہ واضح ہو رہا ہے۔

(فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا) مرضا يحوجه الى الحلق (اَوْبِهٖ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ) كجراحة وقمل (فَفِدْيَةٌ) فعليه فدية ان حلق (مِنْ صِيَامٍ اَوْصَدَقَةٍ اَوْنُسُكٍ) بيان لجنس الفدية

(بیضاوی)

والنسك بضمتين جمع نسكة وهي الذبيحة اعلاها بدنة واوسطها بقرة وادناها شاة

(شیخ زادہ)

مرض سے مراد عام ہے کوئی بھی تکلیف ہو جو سر منڈانے کی طرف مجبور کرے، سر میں تکلیف سے مراد زخم یا جوئوں کا پڑنا، اسی طرح خارش کی تکلیف واقع ہونا، سر منڈانے پر فدیہ کا حکم ثابت ہے، وہ فدیہ کیا ہے؟ اس کا بیان یہ ہے کہ وہ روزے ہیں یا صدقہ یا جانور ذبح کرنا ہے۔ جانور ذبح کرنے میں کم از کم بکری یا بھیڑ مراد ہے، اور سب سے اعلیٰ اونٹ کا ذبح کرنا ہے، اور ان کے درمیان گائے کا ذبح کرنا ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو تو مقام حدیبیہ میں روک لیا گیا تھا آپ نے وہاں ہی ہدی کے جانور ذبح کر لئے تھے تو یہ کس طرح کہنا صحیح ہے کہ ہدی کے جانور صرف حرم میں ذبح کئے جائیں۔

جواب: حدیبیہ کا کچھ مقام حرم سے باہر ہے اور کچھ حصہ حرم میں داخل ہے، جانور حرم کے حصہ میں ذبح کئے گئے تھے۔

”فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ“

پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص نفع حاصل کرے عمرہ سے حج تک تو جو میسر ہو اسے ہدی۔

”فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ“ کے معنی میں وسعت پائی گئی ہے، صرف یہ معنی نہیں کہ ”جب تم امن میں ہو جاؤ“ یعنی تم سے رکاوٹ کو اٹھالیا جائے، بلکہ اس کا ایک معنی یہ بھی ہے اور یہ معنی بھی ہے کہ جب تم امن میں ہو، یعنی تم پر کوئی رکاوٹ نہیں آئی اور نہ ہی کسی مرض میں تم مبتلا ہو۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ دونوں معانی ان الفاظ سے بیان فرمائے۔

”(فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ) الاحصار او کنتم فی حال امن وسعة“

جب تم احصار سے امن میں ہو جاؤ یا پہلے سے ہی حالت امن اور وسعت میں ہو۔

”فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ“ تو جو شخص نفع حاصل کرے عمرہ سے حج تک۔

یہ الفاظ گرامی قران اور تمتع دونوں کو شامل ہیں۔ یعنی جو شخص ایک ہی سفر میں پہلے عمرہ کرے اور پھر حج کرے تو وہ بطور شکر ہدی کا جانور ذبح کرے۔

قران کیا ہے؟

میقات سے حج اور عمرہ کا احرام ایک ساتھ باندھ لینا قران ہے۔ احرام کے بعد دو رکعت ادا کرنے کے بعد یہ دعا کرے۔

”اللھم انی اریدالحج والعمرة فیسرھمالی وتقبلھمامنی“

اے اللہ! میں حج اور عمرہ کا ارادہ کرتا ہوں وہ میرے لئے آسان فرما اور وہ دونوں مجھ سے قبول فرما۔

اسی طرح احرام تو صرف عمرہ کا باندھا تھا لیکن مکہ مکرمہ میں پہنچ کر طواف کرنے سے پہلے یا تین چکر طواف کرنے سے پہلے حج کا احرام بھی ساتھ ہی باندھ لیا تو یہ بھی قران ہے۔

قران ادا کرنے کا طریقہ:

پہلے عمرہ کا طواف کرے، سات چکروں میں سے پہلے تین چکروں میں رمل کرے اور پھر چار چکر آرام آرام سے چلے، طواف کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے، پھر حلق نہ کرائے بلکہ احرام کی پابندیاں برقرار رہیں گی، پھر حج کا طواف قدوم کرے لیکن اس میں رمل نہیں۔ پھر سعی کرے، پھر حج کے باقی فرائض و واجبات و سنن وغیرہ کو ادا کرے جو حج مفرد میں بیان کردیئے گئے۔ حج کا حلق جب کرالے گا تو پھر احرام کی پابندیوں سے آزاد ہوگا۔ سوائے جماع کرنے کے، جب طواف زیارت بھی کرلے گا تو جماع کی اجازت بھی ہوگی۔

فائدہ: بہتر طریقہ تو وہی ہے جو بیان کردیا گیا، لیکن قران کرنے والا اگر عمرہ اور حج کا طواف ایک مرتبہ ہی کرلے پھر دو مرتبہ سعی بھی ایک ساتھ کرلے تو جائز ہے۔

تمتع کیا ہے اور کیسے ادا کیا جائے؟

تمتع کا یہ مطلب ہے کہ میقات سے احرام عمرہ کا باندھے اور عمرہ ادا کرکے فارغ ہوجائے، مکہ شریف میں بغیر احرام کے رہے، جب آٹھ ذی الحج ہوجائے تو حرم شریف سے احرام باندھ کر حج کرے، حج اس طرح ادا کرے گا جس طرح حج مفرد ادا کیا جاتا ہے، البتہ یہ اب مکی کے حکم میں ہے اس لئے طواف قدوم نہیں کرے گا، اور طواف زیارت میں رمل کرے گا اور طواف زیارت کے بعد سعی کرے گا۔ اگر اس شخص نے احرام باندھنے کے بعد طواف کرلیا اور اس میں رمل بھی کرلیا اور طواف کے بعد سعی بھی کرلی تو اب طواف زیارت میں رمل نہیں کرے گا اور نہ طواف زیارت کے بعد سعی کرے گا۔

لیکن یہ خیال رہے کہ عمرہ کے بعد احرام اس وقت تمتع کرنے والا کھول سکتا ہے جب ہدی کا جانور ساتھ لے کر نہ جائے اور اگر ہدی کا جانور ساتھ لے کر جائے تو باوجود اس کے کہ اس نے میقات سے احرام صرف عمرہ کا باندھا تھا اور اب حج بھی کرنا چاہتا ہے تو یہ عمرہ کا احرام نہیں کھول سکتا بلکہ قران کرنے والے کی طرح حج سے فارغ ہو کر احرام کھولے گا۔

مقام توجہ: تمتع اس وقت ہوگا جب شوال کی پہلی تاریخ سے لے کر آٹھ ذی الحج سے پہلے تک عمرہ کا احرام باندھا تھا پھر گھر لوٹ کر بھی نہیں آیا، اور اسی سفر میں حج بھی کر لیا۔

اگر شوال سے پہلے عمرہ کا احرام باندھا تھا، یا احرام تو یکم شوال کے بعد باندھا تھا لیکن عمرہ کر کے واپس لوٹ آیا، پھر اسی سال حج بھی کر لیا تو یہ حج مفرد ہوگا، تمتع نہیں ہوگا۔

تنبیہ: قران کرنے والے اور تمتع کرنے والے نے حج کے دنوں تک یعنی حج سے پہلے عمرہ سے نفع حاصل کر لیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے دو نعمتوں سے ایک سفر میں نوازا ہے تو یہ رب تعالیٰ کی رحمت کا شکر ادا کرنے کے لئے بکری یا گائے یا اونٹ ذبح کرے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی " فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ " کا یہی مطلب ہے کہ جس نے حج کے دنوں سے پہلے عمرہ سے بھی نفع حاصل کر لیا خواہ قران کیا یا تمتع اسے جو ہدی میسر ہو وہ حرم شریف میں ذبح کرے۔

"فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ"

جو شخص نہ پائے (ہدی) تو روزے ہیں تین دن حج کے دنوں میں اور سات ہیں جب فارغ ہو جاؤ تم یہ دس دن مکمل ہیں۔

یعنی قران اور تمتع کرنے والے پر بطور شکر ھدی کا جانور ذبح کرنا لازم ہے لیکن اگر اسے ھدی میسر نہ ہو کہ وہ جانور خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا تو تین دن روزے رکھے یہ روزے نو ذی الحج تک مکمل کر لے اور سات روزے جب حج سے فارغ ہو جائے یعنی ایام تشریق کے بعد رکھے۔ اس طرح ھدی کے بدلے اس نے دس دن مکمل روزے

رکھنے ہیں۔ جب روزے ھدی کا بدل ہیں تو افضل یہ ہے کہ سات، آٹھ اور نو ذی الحج کو روزے رکھے۔ تاخیر اس لئے مستحب ہے کہ ہوسکتا ہے اسے ھدی مل جائے۔

مسئلہ: اگر تین روزے مکمل نہیں کر سکا تھا کہ ھدی کو پالیا تو ھدی کا ذبح کرنا لازم ہو گیا، کیونکہ اصل پر قادر ہو گیا۔ اصل پر جب قدرت ہو تو بدل پر عمل نہیں کرسکتا۔ اسی طرح تین روزے تو مکمل کر لئے تھے لیکن ابھی تک احرام نہیں کھولا تھا تو ھدی کو پالیا پھر بھی ھدی کا ذبح کرنا لازم ہے۔ اور اگر احرام کھول لیا یعنی سر منڈالیا اس کے بعد ھدی پالے تو ہدی کا ذبح کرنا لازم نہیں، کیونکہ روزے سے مقصد حاصل ہو گیا، کیونکہ روزے ہدی کا بدل اس لئے رکھے گئے کہ یہ احرام کھول سکے۔ جب اس نے احرام کھول لیا تو مقصد حاصل ہو گیا، اب ہدی کو ذبح کرنا لازم نہ رہا۔

(روح المعانی)

مسئلہ: قران کرنے والا یا تمتع کرنے والا ہدی نہیں پاتا لیکن روزے بھی نہیں رکھتا یہاں تک کہ دس ذی الحج آ گیا، تو اس پر ہدی ذبح کرنا واجب ہو گیا۔ اگر ہدی کے ذبح کے بغیر احرام کھول لیا تو دو جانور ذبح کرنے لازم ہو گئے ایک ہدی جو قران یا تمتع کی وجہ سے اور دوسری ہدی بطور جنایۃ (سزاء) کہ اس نے بغیر ہدی کے ذبح کرنے کے احرام کیوں کھولا ہے۔

"وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ" ای فرغتم ونفرتم من اعماله.

اس مقام پر "رَجَعْتُمْ" کا معنی فارغ ہو جانا اور اعمال حج سے لوٹنا، ذکر رجوع کا ہے مراد سبب رجوع ہے۔

"او المعنی اذا رجعتم من منی" یا معنی یہ ہے کہ جب تم منی سے لوٹ کر آؤ تو سات روزے رکھ لو۔

(روح المعانی)

مسئلہ: یہ سات روزے ایام تشریق کے بعد مکہ میں رکھے یا گھر لوٹ کر رکھے جائز ہے۔

مسئلہ: پہلے تین روزے دیر سے رکھنا بہتر ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، لیکن قران کرنے والا یا تمتع کرنے والا سمجھتا ہے کہ ہدی کا پانا تو میرے لئے ممکن نہیں تو وہ عمرہ کے احرام کے بعد تین روزے رکھ لے اسی نیت سے کہ یہ روزے میں ہدی کا بدل رکھ رہا ہوں تو جائز ہے۔

"ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ"

یہ اس شخص کے لئے جو نہ ہو باشندہ حدود میقات کا۔

"ذٰلِکَ" کا اشارہ "تمتع" مصدر کی طرف ہے جو "فَمَنْ تَمَتَّعَ" سے سمجھ میں آرہا ہے۔

یعنی قران اور تمتع سے نفع صرف وہ لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو میقاتوں کی حدود سے باہر ہوں، جو میقاتوں کے اندر اندر رہنے والے ہیں ان کو قران اور تمتع کی اجازت نہیں۔ کیونکہ وہ قریب رہنے کی وجہ سے جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں، لیکن باہر سے آنے والوں کو بار بار آنا دشوار ہوتا ہے، لہٰذا ان کو موقع دیا جائے کہ وہ قران اور تمتع کر کے زیادہ ثواب حاصل کر لیں۔ حج کے دنوں تک جب چاہیں عمرہ کر کے نفع حاصل کر لیں۔

جب میقاتوں کی حدود کے اندر رہنے والوں پر قران اور تمتع نہیں تو یقیناً ان پر یہ ہدی بھی لازم نہیں جو قران اور تمتع کی وجہ سے لازم آتی ہے۔

تنبیہ: آیۃ کریمہ میں "حَاضِر" مسافر کی ضد کے طور پر استعمال ہے، غائب کی ضد کے طور پر استعمال نہیں ہوا۔ اور مسجد حرام سے مراد بھی صرف مسجد حرام یا حرم نہیں بلکہ میقاتوں تک تمام جگہ مراد ہے۔

مطلب واضح ہے کہ میقاتوں کی حدود کے اندر جو رہنے والے نہیں وہی قران اور تمتع سے نفع حاصل کر سکتے ہیں اور ان پر ہی ہدی بھی لازم ہے۔

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ": اور ڈرو اللہ سے۔

اس مقام میں عموم پایا گیا ہے کہ "فی کل ما یأمر کم به وینها کم عنه" اللہ تعالیٰ تمہیں جن چیزوں کا حکم دیتا ہے اور جن چیزوں سے روکتا ہے ان میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس لئے حج اور عمرہ کی ابتداء سے تکمیل تک تمام احکام کو اللہ تعالیٰ کی رضاء کے مطابق ادا کیا جائے۔

"وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ": اور جان لو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کا ڈر نہیں رکھے گا، رب تعالیٰ کے احکام سے عدول کرے گا اور گناہوں میں مبتلاء ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ہوگا، اللہ تعالیٰ اسے سخت عذاب میں مبتلاء کرے گا۔ (از روح المعانی)

دم شکر اور دم جنایۃ میں فرق:

سب سے پہلے تو یہ سمجھا جائے کہ جنایۃ (احرام کے منافی کام کرنے) کی وجہ سے جو جانور ذبح کرنا لازم آتا ہے اسے ہدی کہا جاتا ہے، عذر کی وجہ سے سر منڈانے یا بال کٹانے کی وجہ سے اگر جانور ذبح کرے تو وہ بھی ہدی کے حکم میں ہے۔ اور حج یا عمرہ سے روکے جانے کی وجہ سے جو جانور ذبح کر کے احرام کی پابندیوں سے آزاد ہونا ہے وہ بھی ہدی ہے۔

اور قران اور تمتع کرنے پر بطور شکر جو جانور ذبح کرنا ہے وہ بھی ہدی ہے۔

ہدی کوئی بھی ہو وہ حرم میں ذبح کی جائے گی، بلکہ ہدی وہی ہے جو حرم میں ذبح ہو، اگر حرم میں نہ ذبح کی جائے تو اسے ہدی نہیں کہا جا سکتا۔

دم شکر یعنی قران اور تمتع کرنے پر بطور شکر جو ہدی کا جانور ذبح کرنا ہے جس طرح ضروری ہے کہ وہ حرم میں ذبح کیا جائے اسی طرح وہ جانور دس ذی الحج کو ذبح کیا جائے، دس ذی الحج سے پہلے ذبح نہ کیا جائے۔

اگرچہ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے کہ دس ذی الحج کو ذبح کرنا واجب ہے یا فقط افضل ہے، تاہم احتیاط اسی میں ہے کہ واجب ہی سمجھا جائے۔

قران اور تمتع کی ہدی کا گوشت انسان خود بھی کھا سکتا ہے اور اغنیاء اور فقراء بھی کھا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ دم شکر ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث جو مناسک حج میں مسلم نے ذکر کی ہے، اس میں یہ بھی ہے۔

"إن النبی ﷺ اکل من لحم هديه وحسامن المرقة"

بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنی ہدی کا گوشت کھایا اور اس کا شوربا پیا۔

باقی تمام وجوہ سے لازم آنے والی ہدی کو حرم میں ذبح کرنا تو ضروری ہے لیکن ان کا وقت مقرر نہیں، جس وقت بھی ذبح کر دیں جائز ہے۔

اوران ہدایا کا گوشت انسان خود بھی نہیں کھا سکتا اور نہ ہی غنی کھا سکتا ہے۔صرف فقراء کھا سکتے ہیں،خواہ وہ فقراء حرم کے ہوں یا حرم سے باہر کسی جگہ کے ہوں۔

وجہ فرق اصل میں یہ ہے کہ قران اور تمتع کی وجہ سے لازم آنے والی ہدی کا ذبح کرنا واجب ہے لیکن گوشت کا صدقہ کرنا مستحب ہے اور باقی ہر قسم کی ہدی کا ذبح کرنا بھی واجب ہے اور گوشت کا صدقہ کرنا بھی واجب ہے۔

قانون شرع یہ ہے کہ صدقات مستحبہ کو صدقہ کرنے والا اور غنی اور فقیر سب لوگ کھا سکتے ہیں،اور صدقات واجبہ کو صرف فقراء کھا سکتے ہیں،اغنیاء اور صدقہ کرنے والے نہیں کھا سکتے۔

ہدی اور قربانی میں فرق:

قربانی ہر صاحب نصاب پر لازم ہے جو دس،گیارہ اور بارہ ذی الحج کو ذبح کی جاتی ہے،اس کے لئے حرم کی کوئی قید نہیں اور نہ ہی حج یا عمرہ کے احرام سے اس کا تعلق ہے۔

ہدی کی جتنی صورتیں بیان کی ہیں وہ تمام ہی حرم میں ذبح ہوسکتی ہیں حرم سے باہر ان کا ذبح کرنا جائز نہیں اور سوائے قران اور تمتع کے وقتِ ذبح ان میں مقرر نہیں،اوران تمام کا تعلق حج اور عمرہ کے احرام سے ہے۔ہاں البتہ جانور وہی ہوں گے جو قربانی میں ہوتے ہیں۔یعنی بھیڑ،بکری،گائے،بھینس اور اونٹ کی ہی قربانی بھی ہوسکتی ہے اور ہدی بھی۔

اور جانوروں کی عمر اوران میں کسی قسم کا عیب نہ پایا جانا ہدی اور قربانی کے لئے ایک ہی حکم ہے۔

دم جنایۃ اونٹ یا گائے ذبح کرنا ضروری:

دو جنایتیں وہ ہیں جن کی وجہ سے اکیلے ہی مکمل گائے یا اونٹ ذبح کرنا لازم ہوگا۔

﴿۱﴾ طواف زیارت حالت جنابت میں کرلے،یعنی غسل کرنا اس پر واجب تھا،غسل نہ کیا یونہی طواف زیارت کر لیا تو اونٹ یا گائے ذبح کرنا لازم ہے۔

﴿۲﴾ مقام عرفات میں ٹھہرنے کے بعد لیکن سر منڈانے اور طواف زیارت سے پہلے جماع کر لیا تو اونٹ یا گائے ذبح کرنا لازم ہے۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگر مقام عرفات میں ٹھہرنے سے پہلے حالت احرام میں جماع کر لیا تو حج باطل ہو گیا۔ حاجیوں کے ساتھ چلتا پھرتا رہے ان کی طرح ہی مناسک حج کرتا رہے لیکن حج آئندہ قضاء کرے گا۔

وہ جنایات جہاں بکری کا ذبح کرنا کافی ہے:

یعنی جنایۃ کی وجہ سے جانور کا ذبح کرنا واجب ہو گیا، خواہ اونٹ ذبح کرے یا گائے یا بکری، لیکن بکری کا ذبح کرنا کافی ہے۔ وہ مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔

کامل عضو یا عضو کے اکثر حصہ پر خوشبو لگا دی تو دم لازم ہے۔ سر پر مہندی لگا دی تو دم لازم ہے، لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگر سر پر مہندی موٹی تہہ والی لگا دی تو دو جانور ذبح کرنے پڑیں گے ایک خوشبو لگانے کی وجہ سے (جو مہندی سے حاصل ہو رہی ہے) اور دوسرا مہندی سے سر کو ڈھانپنے کی وجہ سے (سر پر وسمہ لگانے میں کوئی حرج نہیں) عضو کے کچھ حصہ پر خوشبو لگانے سے صدقہ لازم ہے۔ سر یا داڑھی پر زیتون کا تیل لگانے سے دم لازم ہے۔ زخم وغیرہ پر دوا لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر ایک دن مکمل سلے ہوئے کپڑے پہن لئے یا سر کو ڈھانپ لیا تو دم لازم ہے۔ اگر دن کے کچھ حصہ میں یہ کام کیا تو صدقہ لازم ہے۔

جبہ کو کندھوں پر لٹکا دینے سے کوئی چیز لازم نہیں۔ البتہ بازو بھی اس کی آستینوں میں ڈال لئے تو سلے ہوئے کپڑے کا حکم نافذ ہوگا۔ سر اور داڑھی منڈانے سے دم لازم ہوگا خواہ چوتھے حصہ کو بھی منڈا دے تو پھر بھی دم لازم ہوگا۔

ہاں اگر چوتھے حصہ سے کم ہو تو صدقہ لازم ہے۔

اگر گردن کے مکمل بال منڈا دیئے تو دم لازم ہے کیونکہ گردن علیحدہ عضو ہے، (بال کٹانے یا منڈانے کا حکم جنایۃ میں ایک ہی ہے)۔

تنبیہ: اگر محرم کے حکم سے دوسرے محرم نے اس کا سر مونڈ دیا یا بال کاٹ دیئے تو بال کاٹنے والے یا مونڈنے والے پر صدقہ لازم ہے اور منڈ وانے والے پر دم لازم ہے۔

ہاں ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص غیر محرم سے سر منڈ والے اور پھر وہ دوسرے محرم کا سر مونڈ دے، یہ صورت جائز ہے۔ اگر محرم نے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کے ناخن کاٹ لئے تو ایک دم لازم ہے۔ اور اگر صرف ایک ہاتھ کے یا صرف ایک پاؤں کے ناخن کاٹ لئے پھر بھی ایک دم لازم ہے۔

اگر پانچ ناخنوں سے کم ناخن کاٹے یا پانچ کاٹے لیکن متفرق طور پر تو اس پر صدقہ لازم ہے۔

اگر کسی عذر کی وجہ سے مکمل عضو کو خوشبو لگا لی یا سلے ہوئے کپڑے پہن لئے یا سر منڈ الیا تو اس کو اختیار ہے، چاہے تو ایک بکری ذبح کرے، یا تین روزے رکھے، یا چھ مسکینوں کو تین صاع گندم دے دے، یعنی ہر مسکین کو نصف نصف صاع (دو دو کلو) گندم دے۔ اگر چھ مسکینوں کو طعام پکا کر کھلانا چاہے تو دو وقت صبح اور شام طعام کھلانا ہوگا۔

اگر حالت احرام میں شہوت سے بوسہ لیا یا شہوت سے زوجہ کو ہاتھ لگایا تو دم لازم آئے گا۔

اور اگر حلق کے (سر منڈانے کے) بعد اور طواف زیارت سے پہلے جماع کر لیا تو دم لازم آئے گا۔

اگر طواف قدوم بغیر وضو کے کر لیا تو صدقہ لازم ہوگا اور اگر طواف زیارت بے وضو کر لیا تو دم لازم آئے گا۔

اگر طواف وداع بے وضو کیا تو صدقہ لازم ہے اور اگر جنابت کی حالت میں کیا تو دم لازم ہے۔

طواف وداع ایام تشریق میں کرنے سے بھی دم لازم ہوگا۔ اور طواف زیارت بے وضو کرنے سے بھی دم لازم ہوگا۔

اگر صفا و مروہ کے درمیان سعی نہ کر سکا تو پھر بھی دم لازم ہوگا۔ مقام عرفات سے امام سے پہلے لوٹ آیا تو دم لازم ہوگا۔

اگر مزدلفہ میں نہ رک سکا تو دم لازم ہوگا۔

جس شخص نے کنکریاں نہ ماریں اس پر بھی دم لازم ہے۔ تین دن ہی کنکریاں نہ مار سکا تو پھر بھی ایک ہی دم

لازم ہے۔ایک دن کنکریاں نہ مار سکا تو پھر بھی ایک دم لازم ہے۔

اگر تین جمرات میں سے ایک جمرہ کو کنکریاں نہ مار سکا تو اس پر صدقہ لازم ہے۔

اگر سات کنکریاں مکمل نہ کر سکا ایک یا دو یا تین کنکریاں کم مارے تو ہر کنکری کے بدلے صدقہ لازم ہوگا۔

جس آدمی نے سر منڈانے میں تاخیر کر دی یہاں تک کہ ایام نحر (دس، گیارہ، بارہ ذی الحج) کے بعد سر منڈایا تو اس پر دم لازم ہے اور اگر ایام نحر میں سر منڈایا لیکن حرم سے باہر جا کر سر منڈایا تو پھر بھی دم لازم ہے۔

جس شخص نے عمرہ کیا اور حرم سے باہر جا کر سر منڈایا تو اس پر بھی دم لازم ہے۔تاہم عمرہ کے احرام سے نکلنے کے لئے وقت مقرر نہیں۔سعی کرنے کے بعد بال کٹوالے یا منڈالے۔خواہ دیر سے عمل کرے۔البتہ احرام کی پابندیوں سے آزاد بال کٹانے سے ہی ہوگا۔

تنبیہ: جن مقاموں پر ذکر کیا گیا ہے کہ دم لازم ہے اس سے مراد کم از کم بکری ذبح کرنا ہے۔اور جن مقاموں پر صدقہ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد نصف صاع (دو کلو) گندم فقیر کو دینا ہے۔ (مسائل حج و عمرہ ماخوذ از ہدایہ و شامی)

غیر کی طرف سے حج کرنا:

اس کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ خود حج کر کے ثواب کسی دوسرے کو پہنچائے۔

" والاصل فی هذاالباب ان الانسان له ان یجعل ثواب عمله لغیره صلوة اوصوما او صدقة اوغیرها عنداهل السنة والجماعة" (هداية)

اہل سنت و جماعت کے نزدیک یہ جائز ہے کہ وہ اپنی عبادات کا ثواب دوسرے کو پہنچائے خواہ نماز ہو، روزہ ہو، یا صدقہ وغیرہ ہو، تمام کا ثواب پہنچانا جائز ہے۔معتزلہ (دین سے پھر جانے والا گروہ) کے نزدیک جائز نہیں۔

" ان النبی ﷺ ضحی بکبشین املحین احدهما عن نفسه والآخر عن امته"

نبی کریم ﷺ نے دو دنبے سفید سیاہی مائل قربانی فرمائے ایک اپنی طرف سے اور دوسرا اپنی امت کی طرف سے۔

یعنی آپ نے اپنی قربانی کا ثواب اپنی امت کو پہنچایا۔

ابن ابی شیبہ کی حدیث میں صریح الفاظ یہ موجود ہیں۔

" اللهم عن محمدو امته فمن شهدلک بالتوحیدو شهدلی بالبلاغ"

اے اللہ محمد کی طرف سے قبول فرما، اور امت محمد (امتِ دعوت) میں سے جنہوں نے تیری وحدانیت کی شہادت اور میرے حق میں یہ شہادت دی کہ میں نے تیرا حکم پہنچادیا ہے ان لوگوں کے لئے قبول فرما۔

" روی الدارقطنی ان رجلاسأله ﷺ فقال لی ابوان ابرهماحال حیاتهمافکیف لی ببرهمابعدموتهمافقال له ﷺ ان من البربعدالموت ان تصلی لهمامع صلوتک و تصوم لهمامع صیامک"

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا یارسول اللہ میرے ماں باپ ہیں جن کی حیات میں تو میں ان کی اطاعت کر رہا ہوں، ان کی خدمت گزاری اور ان سے اچھا سلوک رکھنے میں مشغول رہتا ہوں۔

ان کی وفات کے بعد میں ان سے کس طرح حسن سلوک رکھوں گا، تو آپ نے فرمایا بیشک ان کی موت کے بعد ان سے صلہ رحمی یہ ہے کہ تم اپنی نمازوں کے ساتھ ان کے لئے بھی نماز پڑھنا اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کے لئے بھی روزے رکھنا۔ یعنی ان کو اپنی عبادات نافلہ کا ثواب پہنچانا۔

(دارقطنی)

"وروی ایضاعن علی رضی اللہ عنه انه قال من مرّعلی المقابر وقرأقل هو الله احد احدی عشرة مرة وهب اجرهاللاموات اعطی من الاجربعددالاموات"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص قبرستان سے گزرے اور گیارہ مرتبہ قل ھواللہ احد سورة

پڑھ کر ثواب فوت شدہ لوگوں کو پہنچائے تو اس شخص کو (قبرستان میں) فوت شدہ لوگوں کی تعداد کے مطابق اجر دیا جائے گا۔ (دارقطنی)

"عن انس انه سأله ﷺ فقال یارسول اللہ انا نتصدق عن موتانا ونحج عنهم وندعوهم فهل یصل ذلک الیهم قال نعم انه لیصل الیهم وانهم لیفرحون به کما یفرح احدکم بالطبق اذا اهدی الیه" (رواه ابو حفص الکبیر العکبری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ سے انہوں نے سوال کیا۔ یارسول اللہ کیا ہم اپنے فوت ہونے والے حضرات کے لئے صدقہ کریں اور ان کے لئے حج کریں اور ان کے لئے دعاء کریں کیا یہ ان تک پہنچیں گے، فرمایا ہاں بیشک انہیں پہنچیں گے اور بیشک انہیں اس سے اسی طرح خوشی حاصل ہوتی ہے جیسے تم میں سے کسی ایک کو بطور ہدیہ (کھانے کا) طشت دیا جائے تو وہ خوش ہوتا ہے۔

" وعنه ﷺ اقرؤا علی موتاکم یٰس" (رواه ابو داؤد)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے فوت شدہ لوگوں کے لئے یٰس پڑھو۔

رب تعالیٰ نے والدین کے لئے دعاء کرنے کا حکم ان الفاظ مبارکہ سے دیا۔

" وقل رب ارحمهما کما ربیانی صغیرا"

اور کہو اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسے انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔

اور رب تعالیٰ نے فرشتوں کی مومنوں کے حق میں دعاء کا ذکر فرمایا۔

" والملائکة یسبحون بحمد ربهم ویستغفرون لمن فی الارض"

اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیحات بیان کرتے ہیں اور زمین والوں (مومنین) کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔

اور ارشاد فرمایا۔

" الذین یحملون العرش و من حولہ یسبحون بحمدربھم ویؤمنون بہ ویستغفرون للذین امنوا "
حاملین عرش اوراس کے اردگرد والے فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیحات بیان کرتے ہیں
اوراس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ (از فتح القدیر)

نتیجہ: ان آیات واحادیث سے پتہ چلا کہ عبادات کے ذریعے فوت شدہ حضرات کوثواب پہنچتا ہے اورثواب پہنچانے والے کوبھی ان تمام کی تعداد کے مطابق ثواب حاصل ہوتا ہے، لہٰذا حج کا ثواب بھی دوسرے شخص کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ ایصال ثواب کی تفصیل نجوم الفرقان سورہ بقرہ کی ابتداء میں پہلے پارہ میں دیکھئے۔

دوسری صورت کسی اور کی طرف سے حج کرنے کی یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو خرچ دے کہ تو میری طرف سے حج کرآ۔اس کی پھر دوقسمیں ہیں۔نفلی حج کا بدل۔اورفرض حج کا بدل۔

نفلی حج کا بدل:

" اعلم ان الحج النفل فلایشترط فیہ العجز لانہ لم یجب علیہ"
نفلی حج کا بدل بنانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جوشخص حج کرارہا ہے وہ خود عاجز ہو یعنی بوڑھا اور بیمار ہو کہ خود حج نہ کرسکے تو کسی اور سے کرائے۔
اس لئے کہ نفلی حج کرنے یا نہ کرنے میں جب اس کو اختیار ہے تو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کے لئے "فلہ الاستنابۃ صحیحا" اس کے لئے جائز ہے کہ وہ صحیح وتندرست ہونے کی حالت میں اپنے بدلے کسی اور کو حج کرا کے ثواب حاصل کرلے۔

فرض حج کا بدل:

اگر کوئی شخص مالدار ہے کہ اس کے پاس اتنا مال ہے کہ وہ حج کرسکتا ہے لیکن بڑھاپے اور مرض کی وجہ سے وہ حج کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو کسی دوسرے کو حج کا خرچ دے کر حج کرالے۔ (از فتح القدیر)

عبادت کا بدل بنانے کا قانون شرعی:

عبادات کی تین قسمیں ہیں۔

عبادات مالیہ، جیسے زکوۃ۔عبادات بدنیہ، جیسے نماز اور روزہ۔اور مالی اور بدنی سے مرکب عبادات جیسے حج۔

عبادات مالیہ میں کسی کو نائب بنانا ہر حال میں جائز ہے خواہ اختیاری حالت ہو یا کوئی عذر اور مجبوری درپیش آئے،زکوۃ اور صدقات مالیہ کے ادا کرنے میں نائب بنانا ہر حال میں جائز ہے۔

عبادات بدنیہ میں کسی حالت میں بھی نائب بنانا جائز نہیں، مجبوری درپیش ہو یا نہ ہو،یعنی کوئی دوسرا شخص کسی کی طرف سے نماز اور روزہ ادا نہیں کرسکتا۔

مالی اور بدنی سے مرکب عبادات، جیسے حج ہے۔جب حج فرض ہوا اور انسان خود حج کرسکتا ہو کوئی ضعف اور عجز عارض نہیں تو وہ اپنا نائب نہیں بنا سکتا، ہاں اگر کوئی عذر ہو تو نائب بنا سکتا ہے۔ (ھدایہ)

حج بدل کا ثبوت حدیث پاک سے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس خثعم قبیلہ کی ایک عورت آئی۔

"فقالت یارسول اللہ ان فریضۃ اللہ فی الحج علی عبادہ ادرکت ابی شیخا کبیرا لایستوی علی الراحلۃ فھل یقضی عنه ان احج عنه فقال لھا رسول اللہ ﷺ نعم"

(نسائی، ج ۲، ص ۳)

اس نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حج فرض کیا ہے، لیکن میرے باپ بوڑھے ہیں جو سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتے کیا میں ان کی طرف سے حج ادا کروں تو ان کا حج ادا ہو جائے گا، حضور ﷺ نے فرمایا ہاں (تمہارے باپ کا حج ادا ہو جائے گا)

"عن الفضل بن عباس انه کان ردیف رسول اللہ ﷺ فجاءہ رجل فقال یارسول اللہ ان

امی عجوز کبیرة وان حملتھالم تستمسک وان ربطتھاخشیت ان اقتلھافقال رسول اللہ ﷺ ارأیت لو کان علی امک دین اکنت قاضیہ قال نعم قال فحج عن امک"

(نسائی ج ۲، ص ۳)

حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سواری پر سوار تھا کہ ایک شخص آپ کے پاس حاضر ہوئے، عرض کیا یارسول اللہ بیشک میری ماں بہت زیادہ بوڑھی ہے، اگر میں ان کو سواری پر بٹھادوں تو وہ بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھیں گی۔ اور اگر سواری پر سوار کر کے (گرنے کے خوف سے سواری پر) ان کو باندھ دوں تو خطرہ ہے کہ ان پر موت واقع ہوجائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم ادا کرتے؟ وہ شخص کہنے لگے ہاں یارسول اللہ ادا کرتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنی ماں کی طرف سے حج ادا کرو۔

حج بدل کی شرائط:

فرض حج کی ادائیگی کے لئے نائب بنانے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

﴿۱﴾ جو شخ نائب بنارہا ہے وہ عاجز ہو خود ادا نہ کر سکے اور اس کے پاس مال ہے تو وہ دوسرے کو مال دے کر نائب بنالے جو اس کی طرف سے حج کرے۔

اگر مالدار شخص خود حج کرسکتا ہو عاجز نہ ہو تو وہ نائب نہیں بنا سکتا۔ اگر ایک شخص فقیر ہے مالدار نہیں، بدن اس کا صحیح ہے وہ خود حج کرنے کی جسمانی طور پر طاقت رکھتا ہے تو وہ بھی نائب نہیں بنا سکتا، کیونکہ اس پر حج فرض ہی نہیں۔

﴿۲﴾ نائب بنانے کے لئے اور شرط یہ ہے کہ موت کے وقت تک عاجز رہے، اگر ایک شخص نے مرض کی حالت میں اپنے حج کا نائب بنایا جبکہ وہ خود حج کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ **"فان مات اجزأة وان تعافی بطل"** اگر اسی حالت میں اس پر موت واقع ہوگئی تو اس کا حج ادا ہوگیا، اور اگر صحیح ہوگیا تو اسے حج پھر ادا کرنا پڑے گا، وہ حج تو اس کی طرف سے ادا نہیں ہوا، البتہ اسے حج کے لئے خرچ ادا کرنے کا ثواب حاصل ہوگا۔

اگر کوئی شخص قید ہو تو وہ نائب کے ذریعے حج کرائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اگر اس قید کی حالت میں فوت ہو گیا تو حج اس کا ادا ہوگا، اگر قید سے آزاد ہو گیا تو اسے خود پھر حج کرنا پڑے گا۔

﴿۳﴾ اور شرط یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے حج ادا کیا جائے وہ حج کرنے کے متعلق اسے کہے۔ اگر اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے حج کرے تو اس کا حج ادا نہیں ہوگا۔ اسی طرح وارث خود ہی اپنے مورث لہ (جس کا یہ وارث ہے) کی طرف سے حج کرے تو اس کی طرف سے حج نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا حکم دینا ضروری ہے۔

﴿۴﴾ نائب کے لئے ضروری ہے کہ جس کی طرف سے حج کر رہا ہے اسی کے حج کی نیت کرے اور اسی کی جانب سے احرام باندھے بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے "یقول بلسانه لبیک عن فلان" کہ زبان سے یہ کہے کہ اللہ میں تیرے دربار میں فلاں کی جانب سے حج کے لئے حاضر ہوں۔

﴿۵﴾ جس شخص کو حج کرنے کے لئے نائب بنایا گیا ہے وہ اسی کے مال سے حج کرے۔ اگر اپنے مال سے حج کرے گا تو اس کا حج نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ اس نے حکم دیا کہ تم میری طرف سے حج کرو، اس نے پہلے اپنا مال خرچ کر لیا پھر اس نے مال اسے دے دیا تو یہ حج اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔

اسی طرح اگر ایک شخص نے وصیت کی تھی کہ میرے مال سے میری طرف سے میرا فرض حج ادا کرا دینا، اگر اس کے مال سے حج کرا دیا گیا تو یہ حج بدل ہو گیا۔ اگر اس کا مال ورثاء نے تقسیم کر لیا، کسی ایک وارث نے خوشی سے اپنے مال سے حج کرا دیا تو یہ حج بدل نہیں ہوگا۔ البتہ حج کا ثواب اسے پہنچایا جا سکے گا۔

﴿۶﴾ نائب کے لئے اور شرط یہ ہے کہ جس نے حج کے لئے نائب بنایا ہے وہ سواری کا کرایہ اور باقی خرچ دے، پیدل حج بدل کرنے کی اس شخص پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

فائدہ: "**ثم الصحیح من المذهب فیمن حج عن غیره ان اصل الحج یقع عن المحجوج عنه ولهذا لایسقط به الفرض عن المامور وهو الحاج کذافی التبیین**"

پھر صحیح مذہب یہ ہے کہ حج اس شخص کا ہوگا جس نے خرچ دیا ہے، اور اپنا نائب بنایا ہے۔ حج کرنے

اگر کوئی شخص قید ہو تو وہ نائب کے ذریعے حج کرائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اگر اس قید کی حالت میں فوت ہو گیا تو حج اس کا ادا ہو گا، اگر قید سے آزاد ہو گیا تو اسے خود پھر حج کرنا پڑے گا۔

۳ اور شرط یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے حج ادا کیا جائے وہ حج کرنے کے متعلق اسے کہے۔ اگر اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے حج کرے تو اس کا حج ادا نہیں ہو گا۔ اسی طرح وارث خود ہی اپنے مورث لہ (جس کا یہ وارث ہے) کی طرف سے حج کرے تو اس کی طرف سے حج نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کا حکم دینا ضروری ہے۔

۴ نائب کے لئے ضروری ہے کہ جس کی طرف سے حج کر رہا ہے اسی کے حج کی نیت کرے اور اسی کی جانب سے احرام باندھے بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے "یقول بلسانه لبیک عن فلان" کہ زبان سے یہ کہے کہ اللہ میں تیرے دربار میں فلاں کی جانب سے حج کے لئے حاضر ہوں۔

۵ جس شخص کو حج کرنے کے لئے نائب بنایا گیا ہے وہ اسی کے مال سے حج کرے۔ اگر اپنے مال سے حج کرے گا تو اس کا حج نہیں ہو گا۔ ہاں البتہ اس نے حکم دیا کہ تم میری طرف سے حج کرو، اس نے پہلے اپنا مال خرچ کر لیا پھر اس نے مال اسے دے دیا تو یہ حج اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔

اسی طرح اگر ایک شخص نے وصیت کی تھی کہ میرے مال سے میری طرف سے میرا فرض حج ادا کرا دینا، اگر اس کے مال سے حج کرا دیا گیا تو یہ حج بدل ہو گیا۔ اگر اس کا مال ورثاء نے تقسیم کر لیا، کسی ایک وارث نے خوشی سے اپنے مال سے حج کرا دیا تو یہ حج بدل نہیں ہو گا۔ البتہ حج کا ثواب اسے پہنچایا جا سکے گا۔

۶ نائب کے لئے اور شرط یہ ہے کہ جس نے حج کے لئے نائب بنایا ہے وہ سواری کا کرایہ اور باقی خرچ دے، پیدل حج بدل کرنے کی اس شخص پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

فائدہ: " ثم الصحیح من المذهب فیمن حج عن غیره ان اصل الحج یقع عن المحجوج عنه ولهذا لا یسقط به الفرض عن المامور وهو الحاج کذافی التبیین"

پھر صحیح مذہب یہ ہے کہ حج اس شخص کا ہو گا جس نے خرچ دیا ہے، اور اپنا نائب بنایا ہے۔ حج کرنے

والے کا اپنا حج اس خرچ سے ادا نہیں ہوگا۔

" والافضل عن للانسان اذاارادان یحج رجلاعن نفسه ان یحج رجلاقدحج عن نفسه ومع هذالواحج رجلالم یحج عن نفسه حجةالاسلام یجوزعندناوسقط الحج عن الآمر کذافی المحیط"

افضل یہ ہے کہ جس شخص کو حج بدل کا نائب بنایا جائے اس نے اپنا فرض حج ادا کیا ہو، ہاں اگر ایسے شخص کو نائب بنایا جائے جس نے اپنا فرض حج ادا نہیں کیا ہوا تو پھر بھی حج پر بھیجنے والے کی طرف سے حج ادا ہو جائے گا۔ حج کرنے والے شخص کو اپنا حج پھر ادا کرنے پڑے گا۔

﴿۷﴾ حج بدل ادا کرنے والے کا عاقل اور بالغ ہونا ضروری ہے، بچے کو نائب بنانے سے اس کا حج ادا نہیں ہوگا۔

خیال رہے کہ نابالغ ہونے کی حالت میں جو حج ادا کیا جائے اس سے فرض ادا نہیں ہوتا۔

تنبیہ: حج بدل میں نائب بننے والے کے لئے بلکہ ہر شخص جو حج کرنے والا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حج کرنے کا طریقہ جانتا ہو، خصوصاً حج کے فرائض اور واجبات ہر شخص کو جاننے ضروری ہیں۔

﴿۸﴾ ایک شخص ایک وقت میں ایک شخص کا نائب بن کر ہی حج کر سکتا ہے۔ اگر دو آدمیوں نے ایک شخص کو اپنا نائب بنایا اس نے ایک سال ہی دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لیا تو یہ حج اسی شخص کا ہوگا جو حج کر رہا ہے، جنہوں نے اسے خرچ دے کر اپنا نائب بنایا تھا ان میں سے کسی ایک کا بھی حج ادا نہیں ہوا۔ حج کرنے والے پر لازم ہوگا کہ ان کا خرچ انہیں واپس کر دے۔

پہلے دونوں کا احرام باندھ لیا تھا حج کرنے کے بعد کسی ایک کے لئے حج معین کر دے تو پھر بھی اس کی طرف سے ادا نہیں ہوگا۔ ہاں اگر ماں باپ کی طرف سے حج کیا لیکن بعد میں دونوں میں سے ایک کے لئے خاص کر دے تو یہ جس کی طرف سے خاص کیا اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔

﴿۹﴾ ایک شخص کے لئے احرام معین کرنا ضروری ہے۔ اگر دو شخصوں نے ایک ہی آدمی کو حج کرنے کے لئے اپنا نائب بنا دیا اس نے ایک سال میں ایک کا ہی احرام باندھا ہے لیکن معین نہیں کیا بلکہ احرام باندھتے وقت یہ

کہا کہ یہ احرام دونوں میں سے ایک کا ہے اور اسی پر حج کر لیا تو حج اس کا اپنا ہوگا اور ان دونوں کو خرچ واپس کرنا ضروری ہوگا، ہاں اگر چہ احرام باندھتے وقت تو کسی ایک کو معین نہیں کیا تھا لیکن طواف قدوم سے پہلے پہلے دونوں میں سے ایک کو خاص کر لیا کہ اس مرتبہ یہ حج فلاں شخص کی طرف سے ہے تو جس کو معین کیا اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔

﴿۱۰﴾ نائب کے لئے ضروری ہے کہ خرچ دینے والے کے حکم کے مطابق عمل کرے۔ اگر ایک شخص نے دوسرے کو حج مفرد کرنے یا عمرہ کرنے کا حکم دیا اس نے قران کر لیا (حج اور عمرہ کو ایک احرام میں جمع کر لیا) تو اس نے حج کرانے والے کے حکم کے مخالف کام کیا اس کی طرف سے حج یا عمرہ ادا نہیں ہوگا اس پر لازم رہے گا کہ خرچ واپس لوٹائے۔

ہاں اس کی طرف سے صرف حج کیا یا عمرہ کیا لیکن احرام ایک ساتھ باندھ کر دوسرے کام کی نیت اپنے لئے کر لی یا کسی اور کے لئے کر لی تو اب بھی نائب بنانے والے کے حکم کی مخالفت ہے البتہ خرچ لوٹانے کا ضامن نہیں۔

تنبیہ: حج یا عمرہ جس کے لئے کسی کو نائب بنایا جائے اسے چاہئے کہ حج، عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد جلدی واپس لوٹ آئے، اگر واپس لوٹ سکتا تھا جان بوجھ کر دیر کرتا رہا تو جتنے دن زائد رہے گا اتنے دنوں کا خرچ اس کا اپنا ہوگا، نائب بنانے والے پر لازم نہیں کہ وہ زائد دنوں کا خرچ دے۔ (ماخوذ از عالمگیری)

آجکل حکومت حج کے لئے زیادہ پیسے جمع کرتی ہے، مناسب مقدار میں خرچ کیا جائے، عیاشی نہ کی جائے تو کچھ رقم بچ جاتی ہے، اس لئے حج بدل کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ بچی ہوئی رقم واپس لوٹا دے، ہاں البتہ وہ شخص کہے کہ جتنے پیسے حکومت نے جمع کر لئے ہیں وہ سب تمہارے ہی ہیں تو بچا کر رقم اپنے پاس رکھ لے تو جائز ہے۔

روح حج زیارۃ النبی ﷺ:

عشق ومحبت والوں کے لئے اس بحث کو ذکر کیا جا رہا ہے، کیونکہ اس وقت ان کا حج نامکمل ہی رہتا ہے، البتہ

ضعیف ایمان والے ان احادیث کوضعیف کہتے رہیں گے جن میں رسول اللہ ﷺ کے روضہ مطہرہ کی زیارت کا ذکر ہے۔

" قال مشائخنا رحمهم الله من افضل المندوبات وفی مناسک الفارسی و شرح المختار انها قريبة من الوجوب لمن له سعة"

ہمارے مشائخ رحمہم اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ تمام مستحبات میں سے افضل یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کی زیارت کرے، بلکہ مناسک فارسی اور شرح مختار میں ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے روضہ مطہرہ کی زیارت کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس پر حاضر ہونا واجب کے قریب ہے۔

" قال رسول الله ﷺ من زار قبرى وجبت له شفاعتى"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔ (دارقطنی ومسند بزار)

" قال رسول الله ﷺ من جاء نی زائرا لاتعمله حاجة الازيارتی كان حقاعلی ان اكون له شفيعا يوم القيامة"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو میری زیارت کے لئے آئے، اس کے آنے کی اور کوئی وجہ نہیں سوائے میری زیارت کے تو مجھ پر یہ حق لازم ہو جاتا ہے کہ میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں۔

(دارقطنی)

" قال رسول الله ﷺ من حج وزار قبری بعد موتی كان كمن زارنی فی حياتی"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے حج کیا اور میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو وہ شخص ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔ (فتح القدیر)

سوال: نبی کریم ﷺ کی ظاہری زندگی میں آپ کی حالت ایمان زیارت کرنے والا اور تا موت ایمان پر قائم رہنے والا تو صحابی بن جاتا تھا لیکن آپ کی قبر کی زیارت کرنے والا تو صحابی نہیں بنتا تو وجہ تشبیہ کیا ہے؟

جواب: تشبیہ میں مکمل طور پر ایک چیز کا دوسری چیز جیسا بننا لازم نہیں ہوتا۔ بعض وجوہ سے مشابہت کافی ہے۔

مطلب یہ کہ جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کی اس نے اگرچہ آپ کے ظاہری جلوے نہیں دیکھے اس لئے وہ تو صحابی نہیں بن سکتا لیکن نبی کریم ﷺ کی طرف سے اس پر بھی ایسے ہی رحمت ہے جیسے آپ کی رحمت آپ کے صحابہ کرام پر تھی۔ (راقم)

تنبیہ: جب فرض حج ادا کرے تو بہتر یہ ہے کہ پہلے حج کرے پھر نبی کریم ﷺ کے روضہ مطہرہ کی زیارت کرے اور اگر نفلی حج ہو تو اسے اختیار ہے چاہے تو پہلے حج کرے اور چاہے تو پہلے رسول اللہ ﷺ کے مزار پرانوار کی زیارت کرے۔

"فاذا نوی زیارة القبر فلینو معه زیارة المسجدای مسجدرسول الله ﷺ فانه احد المساجدالثلاثة التی تشدالیهاالرحال"

جب رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کی زیارت کی نیت کرے تو ساتھ ہی مسجد نبوی کی زیارت کی بھی نیت کر لے، کیونکہ یہ تین مساجد میں سے ہے جن کی طرف سفر کرنے کی اجازت ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کا مختار:

"والاولی فیمایقع عندالعبدالضعیف تجریدالنیة لزیارةقبرالنبی ﷺ ثم اذاحصل له اذا قدم زیارةالمسجد"

عبدضعیف (ابن ہمام) کے نزدیک زیادہ بہتر یہ ہے صرف نبی کریم ﷺ کے مزار پرانوار کی زیارت کی نیت کرے پھر جب وہاں پہنچے گا تو مسجد کی زیارت بھی حاصل ہو جائے گی۔ (فتح القدیر)

اعتراض: حدیث ابی ہریرہ سے تو منع نظر آتا ہے کہ قبروں کی زیارت کے لئے سفر منع ہے، کس طرح نبی کریم ﷺ کے مزار پرانوار کی زیارت سے مدینہ طیبہ میں جانا جائز ہے؟

"عن ابی هریرة عن رسول الله ﷺ قال لاتشدالرحال الاالی ثلاثة مساجد مسجد الحرام ومسجدی هذاومسجدالاقصی"

(نسائی جلداول، ص ۸۱ باب ماتشدالرحال الیه من المساجد)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سامان رخت نہ باندھا جائے (سفر نہ کیا جائے) سوائے تین مساجد کے، (وہ مساجد یہ ہیں) مسجد حرام، اور میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ۔

اس حدیث سے تو پتہ چلا کہ سوائے تین مساجد کے کہیں اور مزارات وغیرہ کی زیارت کی نیت سے جانا منع ہے۔

جواب: حدیث کا مطلب یہ نہیں جو معترضین نے سمجھا۔

" والمعنی لاینبغی شدالرحال والسفرمن بین المساجدالاالی ثلاثة مساجد"

بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ سوائے تین مساجد کے اور کسی مسجد میں زیادہ ثواب حاصل کرنے کی غرض سے سفر نہ کرے کیونکہ زیادہ ثواب صرف ان تین مساجد میں ہے۔

" واماالسفر للتعلم وزیارة العلماء والصلحاء وللتجارة ونحوذلک فغیر داخل فی حین المنع"

علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا، علماء اور صلحاء کی زیارت کے لئے سفر کرنا، تجارت کے لئے سفر کرنا اور ضروری کاموں کے لئے سفر کرنا اس ممانعت میں داخل نہیں، بلکہ یہ تمام سفر مستحب ہیں۔

" قال الحافظ ابن حجر فی فتح الباری ذھب البعض الی حرمة الشدالی غیر المساجدالثلاثة عملابظاھر الحدیث والصحیح عندامام الحرمین وغیرہ من الشافعیة لایحرم"

فتح الباری شرح بخاری میں علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ جن لوگوں نے حدیث پاک کے ظاہر الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ تین مساجد کے بغیر کہیں سفر کر کے جانا جائز نہیں یہ غلط ہے۔ صحیح مطلب وہ ہے جو امام الحرمین اور دوسرے اہل علم شوافع وغیرہ نے بیان فرمایا ہے کہ حدیث پاک سے کوئی حرمت ثابت نہیں۔

" ان المرادان الفضیلة الثابتة فی شدالرحال الی ھذہ المساجدبخلاف غیرھافانه جائز"

حدیث کا مطلب واضح ہے کہ تین مساجد کی طرف سفر کرنا تو باعث فضیلت، ان کے بغیر کہیں اور جانا جائز ہے۔

"او المراد انه لاتشدالرحال الی مسجدمن المساجدللصلوة فیه غیرھذا"

یا یہ مقصد ہے کہ تم سوائے تین مساجد کے کسی اور مسجد کی طرف اس غرض سے سفر نہ کرو کہ وہاں نماز ادا کرنے سے جو ثواب حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور مسجد میں نہیں حاصل ہوتا۔ یہ نظریہ صرف مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے متعلق ہی قائم کیا جاسکتا ہے۔

"واماقصدزیارة صالح ونحوھافلایدخل تحت النھی"

نیک آدمیوں کی زیارت کے لئے یا اور اس طرح نیکی وغیرہ کے کاموں کی طرف سفر کرنا جائز ہے اس میں کوئی ممانعت ثابت نہیں۔

مسند احمد میں حدیث ہی اس طرح واضح ہے کہ خود ہی مسئلہ حل ہوجاتا ہے کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔

"قال رسول اللہ ﷺ لاینبغی للمصلی ان یشدرحاله الی مسجدیبتغی فیه الصلوة غیر المسجدالحرام والمسجدالاقصی ومسحدی ھذا"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی نمازی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ سوائے مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ اور اس میری مسجد کے کسی اور مسجد کی طرف اس لئے سفر کرے کہ وہاں نماز ادا کرنا زیادہ ثواب ہے۔

فتح الباری کی طرح ہی عمدۃ القاری میں بھی یہی ثابت کیا گیا ہے۔ کہ نیک آدمیوں کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز ہے۔

"قال النووی قال ابومحمدالجوینی یحرم شدالرحال الی غیر ثلاثة وھوغلط"

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو محمد جوینی کا یہ کہنا غلط ہے کہ سوائے تین مساجد کہیں اور سفر کرنا جائز نہیں۔

"وفی الاحیاء ذھب البعض الی الاستدلال به علی المنع من الرحلة لزیارة المشاھد

وقبور العلماء والصالحين وماتبين لي ان الامر كذلك بل الزيارة مامور بها لخبر كنت نهيتكم عن زيارة القبور الافزوروها"

احیاء العلوم میں علامہ غزالی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ بعض لوگوں نے اس حدیث سے جو یہ دلیل حاصل کی کہ تین مساجد کے بغیر کہیں اور سفر کر کے جانا منع ہے نہ شہداء کے مزارات پر جائے اور نہ علماء وصلحاء کی قبور کی زیارت کے لئے جائے۔ مجھے نہیں سمجھ آسکا کہ انہوں نے یہ ناقص دلیل کیوں دی، اس لئے کہ قبور کی زیارت کا تو خود نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا، خبردار قبروں کی زیارت کرو۔

" والحديث انماورد نهيهاعن الشدلغير المساجدلتماثلهابل لابلدالا و فيها مسجد فلامعنى للرحلة الى مسجد آخر واماالمشاهدفلاتساوى بل بركة زيارتهاعلى قدر درجاتهم عندالله"

حدیث پاک سے صرف یہ ثابت ہورہا ہے کہ تمام مساجد میں عبادت کرنا ایک جیسا مرتبہ رکھتا ہے سوائے تین مساجد کے، کہ ان میں زیادہ ثواب ہے، مسجد حرام میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب ایک لاکھ نماز ادا کرنے کے برابر ہے اور مسجد نبوی میں پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے (پچاس ہزار نمازوں کے ثواب والی روایت ترمذی میں دیکھئے) اور بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں ایک نماز کا ثواب دس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔

ورنہ مطلقاً اگر یہ بھی کہا جائے کہ کسی اور مسجد کی طرف سفر کر کے نہ جاؤ تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ ہر شہر اور ہر بستی میں کوئی نہ کوئی مسجد ہے جس کی طرف چل کر جانا ہے اور نماز ادا کرنی ہے۔ پھر جمعہ ادا کرنے کے لئے ایک گاؤں سے شہر یا قصبہ میں جانا ہے وہ بھی سفر کر کے ادا کرنا ہے۔

ہاں البتہ قبور کی زیارت کرنا برابر نہیں بلکہ اصحاب قبور کے جس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات ہوں گے اسی طرح ان کے مزارات سے برکت حاصل ہوگی۔ (ماخوذ از حاشیہ نسائی)

زیارۃ النبی ﷺ پر راقم کی دلیل:

نورالایضاح میں باب زیارۃ النبی میں ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مزار پر انوار کی زیارت کرنا قریب الوجوب ہے، اس پر انہوں نے یہ دلیل قائم کی ہے۔

" فانہ ﷺ حرض علیھاوبالغ فی الندب الیھافقال من وجدسعۃ ولم یزرنی فقدجفانی"

بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنی زیارت پر برانگیختہ کیا ہے، اوراس کی فضلیت اورثواب میں مبالغہ فرمایا ہے۔آپ کاارشادگرامی ہے۔جس شخص نے طاقت پائی اورمیری زیارت نہ کی تواس نے مجھ پرظلم کیا۔

راقم نے نورالایضاح کے حاشیہ ذریعۃ النجاح میں اس عربی پرحاشیہ یوں تحریر کیا۔

(حرض علیھا)"ای حث علیھااعنی شوّق علیھابوعدالشفاعۃ وخوّف لتارکھابوعدالمحرومیۃ"

نبی کریم ﷺ نے اپنی زیارت پر برانگیختہ کیا یعنی اس کی شوق دلائی کہ جس نے زیارت کی وہ میری شفاعت کامستحق ہوگااورجس نے زیارت نہ کی اسے اپنی رحمت سے محرومیت کاخوف دلایا۔

(وبالغ فی الندب الیھا)" ای بالغ فی طلبھاوالمبالغۃ بذکرالوعدوالوعید"

آپ نے اپنی زیارت کی طلب میں مبالغہ فرمایا یعنی زیارت کرنے والے کے لئے وعدہ شفاعت اورنہ کرنے والے کے لئے وعیدمحرومیت بیان کرکے واضح کیا کہ آپ کی زیارت کرنامستحب بلکہ قریب الوجوب ہے۔

(فقال من وجدسعۃ) "بفتح السین وکسرھاوالمرادمن سعۃ قدرۃ علی الزاد لنفسہ وعیالہ الی وقت العودلان بغیرالاستطاعۃ تکلیف مالایطاق وھو غیر جائز لقولہ تعالی لایکلف اللہ نفساالاوسعھااذلایکلف اللہ بغیرالوسعۃ فرسولہ کیف یکلف

بغیر الوسعة لان الرسول لایخالفه علی حال کماقال اللہ تعالٰی ماینطق عن الھوی ان ھوالأوحی یوحی"

رسول اللہ ﷺ نے وسعت کا ذکر فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کے پاس آنے جانے کا خرچ ہواور واپس لوٹنے تک اہل وعیال کا خرچ بھی ہو، اس پر میری زیارت کرنا ضروری ہے اگر اس نے میری زیارت نہ کی تو مجھ پر اس نے جفا کی، اگر آپ یہ ذکر نہ فرماتے تو طاقت سے بڑھ کر تکلیف ہوتی۔ طاقت سے زائد تکلیف اللہ تعالٰی بھی نہیں دیتا اور اس کے رسول ﷺ بھی نہیں دیتے۔ کیونکہ اللہ کا رسول کسی حال میں بھی اللہ کی مخالفت نہیں کرتا۔ اور نہ اللہ تعالٰی کی وحی کے بغیر اپنی خواہشات سے کوئی کلام کرتے ہیں۔

آیئے اصل دلیل کی طرف توجہ فرمائیں، راقم نے نورالایضاح کے حاشیہ سے بطور نمونہ کچھ اقتباس پیش کر دیا۔

(فقدجفانی) "من کان له بصیرة فی العلم وھویعلم ان ھذاالحدیث اشد وعیدا لتارک الزیارة لان الجفاء ھوالایذاء وایذاء رسول اللہ ﷺ حرام بالنص القطعی ان الذین یؤذون اللہ ورسوله لعنھم اللہ فی الدنیاوالآخرة وھذہ الآیة تدل علی من اعرض بلاعذر قادرا فھولایعرف حق رسول اللہ ﷺ ویؤذیه ومن آذی رسول اللہ ﷺ فھوخسر الدنیا و الآخرة وورث یزیدواباجھل وماکان لمؤمن ان یرث یزیدواباجھل بایذائه بل لمؤمن ان یحب بتربة رسول اللہ ﷺ ویحصل قرة عینه منھا" (ذریعةالنجاح حاشیہ نورالایضاح)

جس شخص کو علم میں بصیرت حاصل ہے وہ جانتا ہے کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کو بغیر عذر کے چھوڑنے والے کے لئے وعید شدید فرمائی گئی۔ کیونکہ آپ نے جفاء کا ذکر فرمایا، نبی کریم ﷺ پر جفا کرنا آپ کو ایذاء پہنچانا ہے، اور آپ کو ایذاء پہنچانا حرام ہے جو نص قطعی سے ثابت ہے، کیونکہ رب تعالٰی نے فرمایا "بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہو دنیا اور آخرت میں"

گویا کہ اس آیۃ اور حدیث پاک کو ملا کر نتیجہ یہ نکلا کہ نبی کریم ﷺ کی زیارت پر قادر ہونے کے باوجود جو شخص آپ کی زیارت نہیں کرتا وہ آپ کو ایذاء پہنچا رہا ہے۔آپ کو ایذاء پہنچانے والا دنیا اور آخرت میں خسارے میں ہے اور یزید اور ابو جہل کا وارث ہے۔مومن کی شان کے یہ لائق نہیں کہ وہ یزید اور ابو جہل کا وارث بنے۔بلکہ مؤمن کو چاہئے کہ وہ رسول اللہ کے مزار اقدس کی خاک سے بھی محبت رکھے اور اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک سمجھے۔

مدینہ طیبہ میں حاضری کے آداب:

جب حاضری کے ارادہ سے چلے تو راستہ میں کثرت سے درود شریف پڑھے۔

☆ مدینہ طیبہ میں پہنچ کر نبی کریم ﷺ کے مزار پر انوار پر حاضری کے لئے غسل کرے یا وضو کرے، غسل کرنا افضل ہے۔

☆ صاف ستھرے کپڑے پہنے، نئے کپڑے پہننا زیادہ بہتر ہے۔

☆ مدینہ طیبہ کے قریب پہنچ کر سواریوں سے جو لوگ اتر جاتے ہیں اور پیدل چلتے ہیں ان کا یہ فعل مستحسن ہے۔

☆ ''وکل ماکان ادخل فی الادب والاجلال کان حسنا''

ہر وہ کام جو ادب اور بزرگی پر دلالت کرے وہ احسن ہوگا۔

☆ جب مدینہ طیبہ میں داخل ہو تو پڑھے۔

''باسم اللہ رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا''

☆ اور یہ دعاء کرے۔

''اللھم افتح لی ابواب رحمتک وارزقنی من زیارۃ رسولک ﷺ مارزقت اولیائک و اھل طاعتک واغفرلی وارحمنی یاخیر مسئول''

☆ نبی کریم ﷺ کے مزار پر انوار کی حرمت اور عزت کا لحاظ کرے، نہایت عجز وانکساری اور خشوع وخضوع سے حاضر ہو۔

☆ نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے میں کوئی کمی نہ چھوڑے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ مدینہ طیبہ میں سواری پر سوار نہیں ہوتے تھے، آپ یہ کہتے تھے۔

" استحی من اللہ تعالی ان اطأ تربة فیھا رسول اللہ ﷺ بحافر دابة"

مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں اس مٹی کو سواری کے پاؤں سے روندوں جس میں رسول اللہ ﷺ مدفون ہیں۔

راقم کے نزدیک حضرت امام مالک رحمہ اللہ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اگر سر کے بل آپ چل سکتے تو یقیناً اپنے پاؤں بھی مدینہ طیبہ کی گلیوں میں نہ لگاتے۔

☆ مسجد میں داخل ہو کر مسجد کے آداب کا لحاظ کرے، دایاں پاؤں پہلے مسجد میں رکھے اور دعاء پڑھے۔

"اللھم افتح لی ابواب رحمتک"

☆ نبی کریم ﷺ کے مزار پر انوار اور منبر تک مسجد کا حصہ جسے ریاض الجنۃ کہا جاتا ہے، اس میں تحیۃ المسجد ادا کرے۔ آجکل بہت ہجوم ہوتا ہے اس لئے ریاض الجنۃ میں جگہ نہ ملے تو تمام مسجد نبوی میں کہیں بھی جگہ ملے تو نوافل ادا کرے۔ مسجد نبوی میں جتنا بھی اضافہ ہوتا جائے گا وہ مسجد نبوی کے درجہ میں ہی ہوگا۔

☆ مدینہ طیبہ کی حاضری چونکہ عظیم نعمت ہے، اس لئے دو رکعت بطور شکر نفل ادا کرے۔

☆ نبی کریم ﷺ کی قبر شریف کے چھ سات فٹ کے فاصلہ پر قبلہ کی طرف چہرہ کرکے اور قبلہ شریف کی طرف پیٹھ کرکے کھڑا ہو۔ (از فتح القدیر)

مزار پر انوار پر ہدیہ درود و سلام پیش کرے:

مندرجہ ذیل الفاظ مبارکہ سے درود و سلام پڑھے۔

"الصلوۃ والسلام علیک یاسیدی یارسول اللہ　　الصلوۃ والسلام علیک یانبی اللہ

الصلوۃ والسلام علیک یاحبیب اللہ　　الصلوۃ والسلام علیک یانبی الرحمۃ

الصلوۃ والسلام علیک یاشفیع الامۃ　　الصلوۃ والسلام علیک یاسیدالمرسلین

الصلوۃ والسلام علیک یاخاتم النبیین　　الصلوۃ والسلام علیک یامزمل

الصلوۃ والسلام علیک یامدثر

الصلوۃ والسلام علیک وعلی اصولک الطیبین واھل بیتک الطاھرین

نبی کریم ﷺ سے شفاعت کی عرض کرے:

عاجزانہ انداز پر یوں عرض کرے۔

" انت الشافع المشفع الموعودبالشفاعۃ العظمی والمقام المحمودوالوسیلۃ "

آپ شفاعت کرنے والے ہیں۔آپ کی شفاعت کوقبول کرنے کا آپ سے رب تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔شفاعت عظمی کا منصب آپ کو حاصل ہوگا۔مقام محموداور مقام وسیلہ آپ کو ہی حاصل ہونا ہے۔

رب تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا۔

" ولوانھم اذظلموا انفسھم جاء وک فاستغفر اللہ واستغفرلھم الرسول لوجدوا اللہ توابارحیما "

اوراگر بیشک یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو آپ کے پاس آجائیں،تو اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں اوران کے لئے رسول بھی بخشش طلب کریں تو اللہ کوتوبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پائیں گے۔

ہم گناہوں کی وجہ سے اپنی جانوں پر ظلم کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکے ہیں،ہم خودتو بخشش طلب کر رہے ہیں،آپ بھی شفاعت فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہ معاف فرمادے۔اور ہماری موت آپ کی سنت پر قائم رہتے ہوئے آئے۔

" الشفاعۃ الشفاعۃ الشفاعۃ یارسول اللہ "

تین مرتبہ عرض کرے، یارسول اللہ! آپ شفاعت فرمائیں۔

پھر تمام مومنوں کے لئے یہ دعاء کرے۔

" ربنااغفرلناولاخوانناالذین سبقونابالایمان ولاتجعل فی قلوبناغلاللذین امنوا ربنا انک رؤف رحیم"

پھر جن لوگوں نے حضورﷺ کی خدمت میں سلام پیش کرنے کے متعلق کہا تھا ان کے نام لے کر آپ کی خدمت میں ان کے سلام پیش کرے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سلام عرض کرے۔

"السلام علیک یاخلیفة رسول اللہ

السلام علیک یاصاحب رسول اللہ جزاک اللہ عناافضل الجزاء"

پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تعریفی الفاظ ذکر کرے کہ آپ نبی کریم ﷺ کے غار کے ساتھی ہیں اور سفر وحضر کے ساتھی، آپ حضور کے رازوں کے امین ہیں۔ اس قسم کے آپ کو جو اوصاف بھی ذہن میں ہوں، وہ آپ کے حضور عرض کرے۔

پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سلام پیش کرے۔ یوں عرض کرے۔

" السلام علیک یاامیر المؤمنین

السلام علیک یامظہر الاسلام

السلام علیک یامکسر الاصنام جزاک اللہ عناافضل الجزاء "

پھر آپ کے حضور تعریفی کلمات پیش کرے اور یہ عرض کرے آپ نے مسلمانوں اور اسلام کی امداد فرمائی، اور آپ نے نبی کریم ﷺ کے بعد بہت سے علاقوں کو فتح فرمایا، یتیموں کی آپ نے کفالت کی۔ اس قسم کے جو الفاظ بھی ذہن میں آئیں جو آپ کی شان پر دلالت کریں وہی الفاظ آپ کے حضور پیش کرے۔

پھر دعاء کرے:

سلام پیش کرنے کے بعد اپنے لئے اور اپنے والدین کے لئے دعاء کرے۔اور جن لوگوں نے دعاء کے متعلق کہا تھا ان کے لئے دعاء کرے اور تمام مسلمانوں کے لئے دعاء کرے۔

متبرک مقامات سے حصول برکت:

اسطوانہ ابی لبابۃ کے پاس نوافل پڑھے اور دعاء کرے۔(حاجی حضرات ریاض الجنۃ میں ستونوں کو دیکھیں تو آج بھی ایک ستون پر "اسطوانہ ابی لبابۃ" لکھا ہوا نظر آئے گا) پھر نبی کریم ﷺ کے منبر کے پاس آئے اور اپنا ہاتھ رکھے اور برکت حاصل کرے۔

" ویجتهد فی احیاء اللیالی مدة اقامته واغتنام مشاهدة الحضرة النبویة وزیارته فی عموم الاوقات"

مدینہ طیبہ میں جتنے دن رہے نبی کریم ﷺ کے مزار پر انوار کی زیادہ سے زیادہ زیارت کرے وہاں کی حاضری کو غنیمت سمجھے۔جتنا ممکن ہو راتیں جاگ کر گذارے۔

" ویستحب ان یخرج الی البقیع فیأتی المشاهدوالمزارات خصوصاً قبر سید الشهداء حمزة رضی اللہ عنه ثم الی البقیع الآخر فیزور العباس والحسن بن علی بن علی وبقیة آل الرسول رضی اللہ عنهم ویزور امیر المؤمنین عثمان بن عفان وابراهیم بن النبی ﷺ وازواج النبی ﷺ وعمته صفیة والصحابة والتابعین رضی اللہ عنهم"

مستحب یہ ہے کہ مزارات پر حاضری دے،خصوصاً سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری دے،پھر بقیع میں حضرت عباس،حضرت امام حسن اور آل رسول کے دوسرے حضرات، اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ کے بیٹے حضرت ابراہیم اور نبی کریم ﷺ کی

ازواج مطہرات اورآپ کی پھوپھی حضرت صفیہ اورصحابہ اورتابعین رضی اللہ عنہم کے مزارات پر حاضری دے۔

" ویزورشهداء احدوان تیسریوم الخمیس فهواحسن ویقول سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الداریقرأآیةالکرسی والاخلاص احدی عشرة مرة وسورة یٰسٓ ان تیسرویهدی ثواب ذلک جمیع الشهداء ومن بجوارهم من المؤمنین"

شہداء احد کے مزارات پر حاضری دے، اگر جمعرات کو حاضر ہونے میں آسانی ہوتو بہتر یہی ہے کہ جمعرات کو حاضری دے۔ حاضری کے وقت ان کے حضور سلام پیش کرے اور کہے۔ "سلام علیکم بماصبرتم فنعم عقبی الدار"

اورآیۃ الکرسی اورسورۃ اخلاص گیارہ مرتبہ پڑھے اوراگر ہو سکے تو سورۃ یٰسٓ پڑھے، اس کا ثواب تمام شہداء اوران کے قریب تمام مومنوں کو پہنچائے۔

" ویستحب ان یاتی مسجدقباء یوم السبت اوغیره ویصلی فیه"

اورمستحب یہ ہے کہ مسجد قباء میں ہفتہ کے دن حاضر ہوکرنوافل پڑھے۔

مدینہ طیبہ میں جتنے دن رہنا نصیب ہوزیادہ سے زیادہ درودشریف پڑھتا رہے۔ زیادہ سے زیادہ عجز و انکساری سے کام لے۔ جتنازیادہ ادب واحترام کرے گا اتنازیادہ بلندمقام حاصل ہوگااورروح حج حاصل ہوگی۔

(ماخوذازفتح القدیرونورالایضاح)

☆☆☆☆☆

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ☆

(سورۃالبقرۃآیت،۱۹۷)

﴿۱﴾

حج کے کئی مہینے ہیں جانے ہوئے ،تو جوان میں حج کی نیت کرے تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو، نہ کوئی گناہ، نہ کسی سے جھگڑا حج کے وقت ،اور تم جو بھلائی کرو اللہ اسے جانتا ہے،اور توشہ ساتھ لو کہ سب سے بہتر توشہ پرہیزگاری ہے،اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو!

﴿۲﴾

حج کے مہینے معلوم ہیں ،تو جس شخص نے لازم کرلیا ان (مہینوں) میں حج تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو نہ کوئی گناہ نہ کسی سے جھگڑا حج کے دنوں میں، اور جو تم کرو بھلائی جانتا ہے اسے اللہ،اور توشہ ساتھ لو، بیشک بہتر توشہ پرہیزگاری ہے اور ڈرو مجھ سے اے عقل والو!

ماقبل سے تعلق:

پہلے ارشاد باری ذکر ہوا۔ ’’ یسئلونک عن الاهلة قل هی مواقیت للناس والحج‘‘ جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس سے اپنے افعال کے اوقات مقرر کرتے ہیں،اور یہ حج کے وقت کی علامتیں ہیں۔

اس سے یہ وہم ہوتا تھا کہ تمام مہینے حج کے لئے کس طرح علامات ہیں، تو اس کی وضاحت اس آیۃ کریمہ میں فرمائی۔ یعنی " ان الآیة الاولی مجملة وهذه الآیة مفسرة لها" پہلی آیت میں اجمال تھا، اس میں تفسیر ہے کہ حج کے مہینے معلوم ہیں۔ تمام سال کے تمام مہینے مراد نہیں۔ (از خازن)

پہلے حج اور عمرہ کا ذکر فرمایا۔ چونکہ عمرہ کا وقت مقرر نہیں لیکن حج کا وقت مقرر ہے، عمرہ سال میں کئی مرتبہ بھی ادا ہو سکتا ہے لیکن حج سال میں ایک مرتبہ ہی ادا ہوتا ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں یہی وضاحت کی گئی ہے کہ حج کے مہینے تو مشہور و معروف ہیں۔

" اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ" اس میں حذف مضاف ہے۔ اگر "اَشْهُرٌ" کا لفظ محذوف ہو تو عبارت معنوی طور پر اس طرح ہوگی "اَشْهُرُ الْحَجِّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ" حج کے مہینے معلوم مہینے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے اور راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔

اگر لفظ "وقت" محذوف ہو تو عبارت معنوی طور پر یہ ہوگی "وقت الحج اشهر معلومات" حج کا وقت معلوم مہینے ہیں۔

حج کے مہینے کون سے ہیں؟

وہ شوال اور ذیقعد اور ذی الحج کے دس دن ہیں۔

☆ "اخرج الطبرانی وابن مردویه عن ابی امامة قال قال رسول الله ﷺ فی قوله الحج اشهر معلومات شوال وذو القعدة وذو الحجة"

ابو امامہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے "الحج اشهر معلومات" کے متعلق فرمایا کہ اس سے مراد شوال اور ذیقعد اور ذی الحج ہے۔ (اس حدیث میں تین مہینوں کا ذکر ہے، یہ وضاحت نہیں کہ ذی الحج سے مراد کل مہینہ ہے یا بعض)

☆ "واخرج وکیع وسعید بن منصور وابن ابی شیبة وعبد بن حمید وابن جریر وابن

المنذر وابن ابی حاتم والبیهقی عن ابن مسعود الحج اشهر معلومات قال شوال وذوالقعدة وعشر لیال من ذی الحجة"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔"الحج اشهر معلومات" سے مراد شوال اور ذیقعد اور ذی الحج کی دس راتیں ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے یہ واضح ہوا ذی الحج کا مہینہ مکمل مراد نہیں بلکہ اس کی دس راتیں مراد ہیں۔

☆ "واخرج وکیع وسعید بن منصور وابن ابی شیبة وعبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر والحاکم وصححه والبیهقی فی سننه من طرق عن ابن عمر الحج اشهر معلومات قال شوال وذوالقعدة وعشر لیال من ذی الحجة"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا"الحج اشهر معلومات" سے مراد شوال اور ذیقعد اور ذی الحج کی دس راتیں ہیں۔

☆ "واخرج ابن المنذر والدارقطنی والطبرانی والبیهقی عن عبداللّٰہ بن الزبیر الحج اشهر معلومات قال شوال وذوالقعدة وعشر من ذی الحجة"

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔"الحج اشهر معلومات" سے مراد شوال، ذیقعد اور دس ذی الحج کے۔

☆ واخرج ابن ابی شیبة عن الحسن ومحمد وابراهیم مثله

ابن ابی شیبہ نے حسن اور محمد اور ابراہیم رضی اللہ عنہم سے روایات ذکر کی ہیں جن کا وہی مطلب ہے جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ہے۔

ان احادیث میں مطلق دس کا ذکر ہے۔دس دن یا دس راتوں کا ذکر نہیں۔لیکن بظاہر اس سے مراد دس دن ہی ہیں اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ (ماخوذ از در منثور)

☆ " قلت المراد شوال وذوالقعدة وتسع من ذی الحجة الی طلوع الفجر من یوم النحر"

ابوامامہ کی حدیث طبرانی سے جو ذکر کی ہے اس پر قاضی مظہری رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ ذی الحج سے مراد نو دن ذی الحج کے ہیں، یعنی دس ذی الحج کی صبح تک حج کا وقت ہے۔

تمام احادیث میں تطبیق:

اس مسئلہ میں کافی حد تک اتفاق ہے کہ ذی الحج کا مہینہ بعض مراد ہے کل نہیں۔

ذی الحج کے نو اور دس کے اقوال میں علامہ بغوی رحمہ اللہ نے تطبیق یوں دی۔

- "کل واحدمن اللفظین صحیح والمآل واحدغیر مختلف فیه فمن قال عشر عبرعن اللیالی ومن قال تسع عبرعن الایام"

دونوں لفظ "نو اور دس" صحیح ہیں، اور دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ جن حضرات نے ذی الحج کے نو کا ذکر فرمایا ان کی مراد ذی الحج کے نو دن ہیں، اور جن حضرات نے دس کا ذکر فرمایا ان کی مراد دس راتیں ہیں۔ (از مظہری)

راقم کے نزدیک چار اقوال میں تطبیق:

چونکہ حج میں وقوف عرفات فرض ہے، جو شخص مقام عرفات پر ذی الحج کی نو تاریخ دن کو یا آنے والی رات کو نہ جا سکے اس کا حج فوت ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے ذی الحج کے نو دن مراد ہیں، کیونکہ ذی الحج کی دس تاریخ پہنچ کر مقام عرفات پر ٹھہرنے کے باوجود حج نہیں ہوتا، لیکن یہ اس وقت ہے جب یہ لحاظ کیا جائے کہ ذی الحج کے دن کتنے مراد ہیں۔

اور اگر مطلقاً دن یا رات میں سے کوئی وقت بھی مراد ہو تو دس ذی الحج سے پہلی رات جو عام اوقات میں آنے والے دن کی ہی رات ہوتی ہے اس کا اعتبار کرتے ہوئے دس راتیں کہہ دیا کہ حج کے معلوم مہینوں میں سے ذی الحج کی دس راتیں مراد ہیں اور جب یہ لحاظ کیا جائے کہ اگرچہ وقوف عرفات کے پائے جانے پر حج فوت تو نہیں ہوتا لیکن حج کے فرائض کی تکمیل تو دس ذی الحج کو ہی ہو سکتی ہے، اس لئے کہ حلق یا قصر (سر منڈانے یا بال کٹانے) سے احرام کی باقی پابندیاں ختم ہوں گی لیکن ازواج سے جماع کرنے کی پابندی طواف زیارت کرنے سے ہی اٹھے گی، یہ طواف زیارت فرض ہے جو دس ذی الحج سے پہلے ادا نہیں ہوگا۔ اس لحاظ سے ذی الحج کے دن مراد ہیں۔

اور جب یہ لحاظ کیا جائے کہ کنکریاں مارنے کا عمل بارہ ذی الحج تک واجب ہے اور تیرہ ذی الحج کو کنکریاں مارنا مستحسن کام ہے، پھر طواف وداع کی تاریخ مقرر نہیں جس دن لوٹتا ہو اس دن کرے یا اس سے پہلے کرلے اس لحاظ پر ذی الحج کا مکمل مہینہ یا کم از کم ذی الحج کے بارہ دن مراد لینے پڑتے ہیں تو مطلقاً ذی الحج کا ذکر ہو گیا جس میں مکمل یا بعض کو ذکر نہیں کیا گیا۔

سب روایات میں مقصد بیان تو حج کے وقت کا بیان ہی ہے لیکن انداز بیان مختلف حالتوں کو دیکھنے سے متعلق ہے۔

اعتراض: جمع قلت کے کم از کم تین فرد ہوتے ہیں تو "اشھر" جب جمع ہے تو تیسرے مہینہ کے دس دن مراد لینا کیسے صحیح ہے؟

جواب: جمع قلت کا اطلاق کبھی مافوق الواحد پر بھی ہوتا ہے اور اسی طرح تیسرے فرد کا بعض ذکر ہو تو کل ذکر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ایام منی ثلاثة" منی کے دن تین ہیں۔ (یعنی دس ذی الحج اور گیارہ اور بارہ) لیکن حقیقت یہ ہے کہ بارہ ذی الحج کو سورج کے ڈھلنے کے ساتھ کنکریاں مار کر مکہ مکرمہ میں آ جانا درست ہے تو حدیث پاک میں بھی تیسرے فرد کے بعض حصہ کو کل سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

اور قرآن پاک میں ہے۔ "فقد صغت قلوبکما" یہاں ذکر قلوب ہے جو جمع ہے لیکن مراد تثنیہ ہے کیونکہ مراد دو ہیں۔

اعتراض: حج تو آٹھ ذی الحج سے شروع ہو کر بارہ ذی الحج کے سورج ڈھلنے پر کنکریاں مارنے سے ختم ہو جاتا ہے، دو مہینے دس دن حج کے وقت سے کیا مراد ہے۔

جواب: ایک وجہ تو تمتع کے بیان میں گذر چکی ہے کہ جس شخص نے شوال کی پہلی تاریخ یا اس کے بعد اپنی میقات سے عمرہ کا احرام باندھا، پھر عمرہ کر کے فارغ ہو گیا احرام کھول کر مکہ مکرمہ میں یا میقاتوں کے اندر اندر رہا پھر آٹھ ذی الحج کو حج کا احرام باندھ کر حج کیا وہ متمتع ہے۔

اگر شوال سے پہلے عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کر کے وہیں میقاتوں کے اندر اندر رہے، لوٹ کر نہ آئے تو پھر بھی حج کر لینے سے متمتع نہیں بنے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ حج کا احرام باندھنے کے لئے شوال سے وقت مستحب شروع ہوتا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ شوال سے پہلے حج کا احرام نہ باندھے۔ ہاں اگر شوال سے پہلے احرام باندھ لیا اسی احرام سے حج کر لیا تو مکروہ ہوگا، کیونکہ جتنا زیادہ وقت احرام کا ہوگا اسی قدر احرام کی پابندیوں پر عمل دشوار ہوگا۔

درحقیقت یہ وقت مقرر فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت کا اظہار فرمایا کہ اے میرے بندو بہت لمبے وقت کے لئے احرام باندھ کر اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالو۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب:

اس مسئلہ میں یہی ہے کہ شوال سے پہلے احرام باندھنا مکروہ ہے۔ پہلے احرام باندھ لیا تو حج ہو جائے گا۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر احرام پہلے باندھا تو حج ادا نہیں ہوگا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب احادیث کی روشنی میں دیکھئے۔

☆ " واخرج ابن ابی شیبة وابن خزیمة والحاکم وصححه والبیهقی عن ابن عباس قال لایحرم بالحج الافی اشهر الحج فان من سنةالحج ان یحرم بالحج فی اشهر الحج"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حج کے مہینوں کے سواء کسی اور مہینہ میں حج کا احرام نہ باندھے، کیونکہ حج میں سنت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں ہی حج کا احرام باندھے۔

حدیث پاک میں واضح طور پر سنت کے ذکر سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب روز روشن کی طرح واضح ہو رہا ہے کیونکہ ترک سنت سے کراہیت تو آئے گی لیکن فساد لازم نہیں آئے گا۔

☆ " واخرج الشافعی فی الامّ وابن ابی حاتم وابن ابی مردویه عن ابن عباس قال لاینبغی لاحدان یحرم بالحج الافی اشهر الحج"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کسی ایک کے لئے مناسب نہیں کہ حج کا احرام سوائے حج کے مہینوں کے باندھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی

پیش فرمائی لیکن لفظ "لا ینبغی" کی طرف کامل نظر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ہی رہی۔ کہ یہ مناسب نہیں۔ یہ نہیں فرمایا "لا یجوز" یہ جائز ہی نہیں۔ لہٰذا صرف یہی کہا جائے گا کہ حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھنا مکروہ ہے۔ حرام نہیں۔ حج ہو جائے گا، حج فاسد نہیں ہوگا۔ (در منثور)

اعتراض: " واخرج ابن ابی شیبة عن عطاء انه قال لرجل قداحرم بالحج فی غیر اشهر الحج اجعلها عمرة فانه لیس لک حج فان الله یقول الحج اشهر معلومات فمن فرض فیهن الحج"

عطا کہتے ہیں کہ ابن عباس نے ایک شخص کو کہا کہ تم نے حج کا احرام حج کے مہینوں کے علاوہ (وقت سے پہلے) باندھ لیا ہے اس احرام کو عمرہ کا احرام بنالو بیشک تمہارا حج نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "الحج اشهر معلومات فمن فرض فیهن الحج" آیۃ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ حج کے مہینے معلوم ہیں اور ان میں ہی احرام باندھا جائے۔

اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں میں باندھنا فرض ہے، اس سے پہلے اگر احرام باندھ لیا تو حج نہیں ہوگا، بلکہ حج کو چھوڑ کر اسی احرام سے عمرہ کر لے اور دم (جانور ذبح کر کے ہدی) ادا کر دے۔ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب کس طرح صحیح ہوگا؟

جواب: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا حج سنت کے مطابق نہیں۔ سنت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں احرام باندھا جائے، تم نے وقت سے پہلے احرام باندھ لیا ہے جو مناسب نہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ احرام عمرہ کا کرلو اور دم ادا کر دو، اور پھر وقت کے شروع ہونے پر احرام باندھنا تا کہ تمہارا احرام سنت کے مطابق ہو جائے "فانه لیس لک حج" کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمہارا حج کامل سنت کے مطابق نہیں۔

جواب کے الفاظ سے ذرا غور سے پڑھیں اور تینوں احادیث کو غور سے پڑھیں تو ان شاء اللہ ان میں شاندار تطبیق پائیں گے۔

"فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ"

جس شخص نے لازم کرلیا ان میں حج تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو نہ کوئی گناہ نہ کسی سے جھگڑا حج کے دنوں میں۔

(فمن فرض فیھن الحج) "ای الزمہ نفسہ بالشروع فیہ بالنیۃ قصدا باطنا و بالاحرام فعلاظاھر او بالتلبیۃ نطقامسموعا"

جس شخص نے اپنے آپ پر حج کو لازم کرلیا یعنی دل سے نیت کر کے اور ظاہری طور پر احرام باندھ کر اور بلند آواز سے زبان سے تلبیہ پڑھ کر حج کو شروع کر کے اپنے آپ پر لازم کرلیا۔ (قرطبی)

خیال رہے کہ راقم کا ترجمہ قرطبی رحمہ اللہ کی تفصیلی تفسیر کے مطابق ہے۔ اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مختصر لیکن جامع ہے۔

"فمن فرض فیھن الحج" جو ان میں حج کی نیت کرے۔

یہ ترجمہ بہت مختصر لیکن جامع کیسے؟ اس لئے کہ حج کی نیت کرنے سے حج لازم ہوتا ہے، اور حج کی نیت احرام باندھنے اور تلبیہ پڑھنے سے مکمل ہوتی ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"**(فمن فرض)** ای الزم نفسہ **(فیھن الحج)** بالاحرام ویصیر محرما بمجرد النیۃ عند الشافعی لکون الاحرام التزام الکف عن المحظورات فیصیر شارعافیہ بمجردھا کالصوم وعندنالا، بل لابدمن مقارنۃ التلبیۃ لانہ عقدعلی الاداء فلابدمن ذکر کمافی تحریمۃ الصلوۃ،،

(روح المعانی)

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک صرف احرام باندھنے سے ہی نیت کی تکمیل ہو جاتی ہے کیونکہ اس نے احرام باندھ کر اپنے آپ پر کئی چیزوں کو منع کرلیا تو اس کا حج شروع ہو گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک نیت کی تکمیل احرام اور تلبیہ سے ہوتی ہے کیونکہ احرام اداء پر عقد ہے اس کے ساتھ ذکر بھی ضروری ہے جس طرح نماز میں نیت کے ساتھ تکبیر تحریمہ بھی ضروری ہے۔

"فَلَارَفَثَ": تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو۔

یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ہے۔راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔اس ترجمہ کے کمال پر راقم کی کتاب تسکین الجنان سے ایک ورق دیکھئے۔

اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَائِکُمْ"

حلال کی گئی واسطے تمہارے رات روزے کی رغبت کرنا طرف بیبیوں اپنی کی۔(شاہ رفیع الدین صاحب)

تمہارے لئے روزوں میں راتوں کو اپنی بیبیوں کے پاس جانا حلال ہوا۔ (مودودی صاحب)

حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے۔ (محمود الحسن صاحب)

حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے۔ (شاہ عبد القادر صاحب)

روزوں کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا۔(فتح محمد صاحب)

روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے حلال ہوا۔(مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

"فَلَارَفَثَ"

تو بے حجاب ہونا جائز نہیں۔ (محمود الحسن صاحب)

کوئی شہواتی فعل سرزد نہ ہو۔ (مودودی صاحب)

تو بے پردہ ہونا عورت سے۔ (شاہ عبد القادر صاحب)

تو (حج کے دنوں میں) نہ عورتوں سے اختلاط کرے۔ (فتح محمد صاحب)

تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو۔ (مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

ان دونوں مقامات میں "رفث" کا معنی ایک ہی لیا گیا ہے، ایک جگہ مثبت اور ایک جگہ منفی۔

لیکن اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے مثبت مقام میں (یعنی پہلی آیت میں) جماع معنی لیا ہے

، کیونکہ عورتوں کے پاس جانا عام محاورہ میں جماع ہی ہے۔لیکن آپ نے دوسرے مقام میں ایسا ترجمہ نہیں کیا جس سے صرف جماع کی نفی ہوتی، بلکہ ایسا ترجمہ کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ صحبت کا تذکرہ بھی نہ ہو۔

وجہ فرق کیا ہے؟ پہلی آیت کی وجہ تو "بـاشـروهـن" کے ضمن میں گذر چکی ہے کہ رمضان شریف میں رات کی قیود کو (یعنی جماع نہ کرنے کے حکم کو) اٹھایا، اور جماع کو حلال کیا گیا۔

اب معنی بے حجاب ہونا یا بے پردہ ہونا، یا عورتوں کی طرف رغبت کرنا کرلیا جائے یا عورتوں کی پاس جانا کرلیا جائے ایک ہی صورت ہے۔

لیکن دوسرا مقام حج کے احکام میں ہے کہ حج میں ''رفث'' منع ہے، اب یہاں صرف جماع منع ہونا کافی نہیں، بلکہ عورتوں کے سامنے ذکرِ صحبت بھی منع ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے۔

(فلا رفث) هو الجماع او ذكره عند النساء"

رفث جماع ہے یا جماع کا عورتوں کے سامنے ذکر کرنا۔

ہدایہ میں بھی "رفث" کے معنی "ذكر الجماع بحضرة النساء" ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح درمختار میں ہے۔

"يتقى الرفث اى الجماع او ذكر بحضرة النساء"

یعنی رفث سے بچے رفث کا معنی جماع ہے۔اور اسی طرح عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے "بحضرة النساء" پر تحریر فرمایا "قول ابن عباس" یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہی ہے کہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا منع ہے۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر نظر کی جائے تو یقیناً سمجھ آئے گا کہ آپ نے اسی فقہی باریکی کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کیا جبکہ دوسرے مترجمین حضرات اسے نہ سمجھ سکے۔ (تسکین الجنان، ص ۶۲ تا ۶۴)

فائدہ: اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "فلا رفث" کا ترجمہ کیا ہے۔ تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو۔
اس سے ایک اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ عورت سامنے نہ ہو تو صحبت کا تذکرہ منع نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما احرام کی حالت میں اونٹ کو چلانے کے لئے حدی پڑھتے ہوئے اپنی لونڈی ہمیس کا تذکرہ ان الفاظ میں کر رہے تھے۔

وھن یمشین بناھمیسا ان یصدق الطیر ققک لمیسا

آپ کے اس شعر کو سن کر ابو العالیہ نے کہا۔ "اترفث وانت محرم" کیا تو رفث کر رہا ہے جبکہ تو محرم ہے۔ "فقال انما الرفث مایقال عندالنساء" تو آپ نے فرمایا "رفث" اس وقت ہوتا ہے جبکہ عورتوں کے پاس صحبت کا یا ان کو چھونے کا ذکر ہو، میرے پاس ہمیس موجود نہیں اس لئے یہ رفث نہیں۔ (از شیخ زادہ)

رفث کی تمام اقسام منع ہیں:

یعنی انسان جب احرام باندھ لے تو حالت احرام میں مطلقا رفث منع ہے، رفث کی چند قسمیں ہیں۔
"الرفث باللسان ذکر المجامعة ومایتعلق بها" زبان سے رفث بھی منع ہے۔ زبان سے رفث یہ ہے کہ عورتوں کے سامنے جماع یا جماع سے متعلق چھونے اور بوسہ لینے کا ذکر ہو۔
"والرفث بالید المس والغمز" احرام کی حالت میں ہاتھ سے رفث بھی منع ہے۔ ہاتھ سے رفث یہ ہے کہ ہاتھ سے چھونا اور انگلی وغیرہ کو محبت سے مروڑنا۔
"والرفث بالفرج الجماع" فرج (شرمگاہ) سے رفث بھی احرام کی حالت میں منع ہے۔ شرمگاہ سے رفث کا مطلب جماع کرنا ہے۔

"وَلَا فُسُوقَ" (اور نہ گناہ) یعنی حالت احرام میں کسی قسم کا معصیت والا کوئی کام نہ کرے۔
(ولا فسوق) "یعنی جمیع المعاصی کلها" یعنی رب تعالیٰ نے "ولا فسوق" ارشاد فرما کر تمام

معاصی سے منع فرمادیا۔ کہ حالت احرام میں ہر قسم کے گناہ کے کام سے اجتناب کرو۔

احرام کی حالت میں خشکی کا شکار کرنا۔ اور ناخن کاٹنا۔ بال کاٹنا اور سلے ہوئے کپڑے پہننا تمام کام غیر شرعی کام ہیں۔ لہٰذا یہ بھی فسق میں داخل ہیں۔ ان سے بھی اجتناب کرے۔

بتوں کے نام پر ذبح کرنا بھی فسق ہے اس سے بھی دور رہنا ضروری ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا۔ ''او فسقا اھل لغیر اللہ بہ''

کسی کو برے القاب سے پکارنا بھی فسق ہے۔ اس سے بچ کر رہنا بھی ضروری ہے۔

رب تعالیٰ نے اس کی مذمت میں فرمایا ''بئس الإسم الفسوق''

کسی کو گالی دینا بھی فسق ہے، لہٰذا احرام کی حالت میں کسی کو گالی نہ دے، گالی کی مذمت میں ارشاد نبوی ہے۔

'' قال ﷺ سباب المسلم فسوق وقتاله کفر''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا مسلمان کو گالیاں دینا فسق ہے اور قتل کرنا (جائز سمجھ کر) کفر ہے۔

مطلب واضح ہے کہ یہ تمام مثالیں ہیں۔ قانون اور ضابطہ وہی ہے جو پہلے ذکر کر دیا گیا کہ ہر قسم کے گناہ سے اجتناب کرے۔

☆ '' قال ﷺ من حج فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ امہ'' (خرجہ مسلم وغیرہ)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے حج کیا تو (حالت احرام میں) نہ رفث کیا اور نہ فسق کیا تو واپس لوٹے گا اس دن کی طرح جس میں اس کی ماں نے اسے جنا۔

یعنی جس طرح ولادت کے دن انسان گناہوں سے پاک وصاف ہوتا ہے اسی طرح اگر حج کرے جو رفث وفسق سے پاک ہو تو انسان گناہوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

☆ قال ﷺ والحج المبرور لیس لہ جزاء الا الجنۃ'' (خرجہ مسلم وغیرہ)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا حج مبرور کی جزا نہیں سوائے جنت کے۔

☆ قال ﷺ والذی نفسی بیدہ مابین السماء والارض من عمل افضل من الجھاد فی سبیل اللہ او حجۃ مبرورۃ لا رفث فیھا ولا فسوق ولا جدال''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے زمین وآسمان میں کوئی عمل اللہ کی راہ میں جہاد سے افضل نہیں اور حج مبرور سے (کوئی عمل افضل نہیں) جس میں رفث اور فسق اور جھگڑا نہ پایا جائے۔ (قرطبی)

فائدہ: اگرچہ حج مبرور کا ذکر پہلے گذر چکا ہے تاہم علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس مقام پر بھی ذکر کیا جس میں مختلف اقوال ذکر فرمائے ان تمام کے جمع کرنے سے عظیم فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

"قال الفقهاء الحج المبرور هو الذی لم یعص اللہ تعالی فی اثناء ادائه"

حج ادا کرنے کے دوران کسی قسم کی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرنا حج مبرور ہے۔

"وقال الفراء هو الذی لم یعص اللہ سبحانه بعدہ"

حج کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرنا حج مبرور ہے۔

یہ دونوں قول درحقیقت علامہ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کے ہیں۔ پہلا قول فقہاء کرام نے نقل کیا ہے اور دوسرا قول فراء نے نقل کیا ہے۔

"قلت الحج المبرور هو الذی لم یعص اللہ سبحانه فیه لابعدہ"

قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک دونوں قولوں کا مجموعہ معتبر ہے، یعنی حج مبرور یہ ہے کہ دوران حج بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے اور بعد میں بھی نافرمانی نہ کرے۔

"قال الحسن الحج المبرور هو ان یرجع صاحبه زاهدا فی الدنیا راغبا فی الآخرة"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حج مبرور یہ ہے کہ حج کرنے والا جب حج کر کے لوٹے تو دنیا میں زاہد ہو اور آخرت کی طرف رغبت کرنے والا ہو۔ (قرطبی)

مندرجہ بالا بحث سے ایک اور مسئلہ سمجھ آیا:

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ حج سے تمام صغائر اور کبائر گناہ معاف ہوجاتے ہیں یا کہ صرف صغائر معاف ہوتے ہیں اور کبائر توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حدیث شریف مطلقاً گناہوں کے معاف ہونے کا ذکر ہے تو صغائر سے مقید نہ کیا جائے۔

علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حج سے صرف صغائر گناہ معاف ہوتے ہیں کبائر صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی بحث سے راقم کو دونوں قولوں میں محاکمہ سمجھ آیا کہ حج مبرور سے تو تمام صغائر اور کبائر گناہ معاف ہوتے ہیں لیکن حج مبرور میں توبہ یقینی طور پر پائی گئی کہ دوران حج بھی معصیت سے باز رہا اور بعد میں بھی گناہ نہ کیا اسی کا نام توبہ ہے، توبہ کے بعد غلطی سے گناہ ہو جانے پر توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔

اگر دوران حج کوئی لغزش ہوگئی یا بعد میں کوئی لغزش ہوگئی تو اس حج سے صرف صغائر گناہ معاف ہوں گے، کبائر کے لئے توبہ کی ضرورت ہوگی۔

"وَلَا جِدَالَ" (اور نہ جھگڑا)، یعنی حالت احرام میں کسی سے کوئی جھگڑا نہ کرے۔

جدال کا لغوی معنی ہے بٹنا۔ "زمام مجدول و جدیل" بٹی ہوئی رسی کو کہا جاتا ہے۔ پھر جھگڑا کرنے کو بھی جدال کہا جاتا ہے کیونکہ دو جھگڑا کرنے والوں میں سے ہر ایک دوسرے کی رائے کو بٹنا چاہتا ہے کہ اس کی رائے پیچ دار ہو جائے اور میری رائے غالب ہو جائے۔ (از کبیر)

(ولا جدال) هو مقابلة الحجة بالحجة لنصرة الباطل و اما لنصرة الحق فلا بأس بذلک" (صاوی)

یہاں جس جدال سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد ایک دوسرے کے خلاف باطل طریقہ سے حجت بازی ہے، ورنہ دین کی خاطر ایک دوسرے سے بحث کرنا تا کہ حق راہ سمجھ آجائے اس میں کوئی حرج نہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، آپ فرماتے ہیں۔

"واماجمهور المتکلمین فانهم قالواالجدال فی الدین طاعة عظیمة"

دین میں ایک دوسرے کے خلاف حجت قائم کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔

اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

" ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن"

دعوت دیں اپنے رب کی راہ کی حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اچھے طریقہ سے مجادلہ کریں۔

اور نوح علیہ السلام کی قوم نے جو آپ کو کہارب تعالیٰ نے اسے بیان فرمایا۔

" یانوح قدجادلتنافاکثرت جدالنا"

اے نوح تم نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا پھر زیادہ ہی تم جھگڑا کر چکے ہو۔

" ومعلوم انه ماکان ذلک الجدال الالتقریراصول الدین"

اوران آیات سے یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ یہ جدال صرف اصول دین کو ثابت کرنے کے لئے تھا

جوجائز اور عبادت عظیمہ تھا۔

جب یہ ثابت ہوا کہ رب تعالیٰ نے جدال سے منع بھی فرمایا اور جدال کا حکم بھی فرمایا اور جدال کی تعریف بھی کی تو ان آیات میں وجہ تطبیق کیا ہے؟ ان میں وجہ تطبیق یہ ہے۔

" فنحمل الجدل المذموم علی الجدل فی تقریرالباطل وطلب المال والجاه و الجدل الممدوح علی الجدل فی تقریرالحق ودعوة الخلق الی سبیل اللّٰہ والذب عن دین اللّٰہ تعالی" (کبیر)

ہم کہتے ہیں کہ جدل کی دو قسمیں ہیں۔ایک مذموم اور دوسرا ممدوح۔جن آیات میں جدل سے منع کیا گیا ہے انکو ہم جدل مذموم (برے جھگڑے) پر محمول کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جھگڑا کر کے باطل راہ کو ثابت کیا جائے، باطل طریقہ سے کوئی جھگڑا بھی ہوگا برا ہوگا خواہ مال کی طلب کے لئے ہو یا مرتبہ کے حصول کے لئے۔

اور جن آیات میں جھگڑا کرنے کی تعریف بیان کی گئی ہے ان سے مراد، جدل ممدوح (قابل تعریف جھگڑا) ہے۔

حق بات کے لئے دلائل قائم کر کے مجادلہ کرنا قابل تعریف ہے خواہ اس کا تعلق مخلوق کو اللہ کی راہ کی طرف بلانے سے ہو یا دین حق پر اٹھنے والے اعتراضات سے اس مجادلہ کا تعلق ہو۔

مختصر الفاظ، کثیر مطالب:

"ولا جدال" کا مطلب واضح کر دیا گیا ہے البتہ مختلف قسم کے واقع ہونے والے جھگڑوں کا ذکر کئی حضرات نے کیا جس سے بظاہر سمجھ آتا ہے کہ شائد ان اقوال میں اختلاف پایا گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ کسی ایک واقعہ کا ذکر ایک صاحب نے کر دیا، دوسرے واقعہ کا ذکر دوسرے صاحب نے کر دیا۔

﴿۱﴾ جدال کی ایک وجہ کا ذکر حضرت بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔

" الجدال الذی یخاف منه الخروج الی السباب و التکذیب و التجهیل"

ایسا جھگڑا (بھی) منع ہے جس سے انسان گالیوں تک پہنچ جائے۔ اور دوسرے کو جھوٹا کہنے اور جاہل کہنے تک پہنچائے۔

﴿۲﴾ جدال کی دوسری وجہ محمد بن کعب قرظی نے بیان فرمائی ہے۔

" ان قریشا کانوا اذا اجتمعوا بمنی قال بعضهم حجنا اتم وقال آخرون بل حجنا اتم فنهاهم الله تعالی عن ذلک"

بیشک قریش جب منی میں جمع ہوتے تو بعض کہتے کہ ہمارا حج مکمل ہو گیا۔ دوسرے کہتے تھے کہ ہمارا حج مکمل ہو گیا۔ اللہ تعالی نے ان کو اس جھگڑے سے (بھی) منع فرمایا۔

﴿۳﴾ تیسری وجہ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں بیان فرمائی ہے۔

" الجدال فی الحج ان قریشا کانو یقفون عند المشعر الحرام فی المزدلفة بقزح و

کان غیرھم یقفون بعرفات، وکانوا یتجادلون یقولون ھؤلاء نحن اصوب ویقول ھؤلاء نحن اصوب"

حج میں قریش مزدلفہ میں مشعرحرام کے پاس مقام قزح میں وقوف کر کے واپس آ جاتے اور دوسرے لوگ مقام عرفات میں قیام کر کے آتے۔ پھر قریش کہتے ہمارا حج درست طور پر ادا ہوا۔ دوسرے حضرات کہتے ہمارا حج صحیح ادا ہوا۔ ایک دوسرے سے اس جھگڑے سے رب تعالیٰ نے ان کو منع کیا۔

بلکہ قریش کو مقام عرفات میں وقوف کر کے لوٹنے کا حکم دیا جس کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی آ جائے گا۔

﴿۴﴾ جدال کی چوتھی وجہ قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے بیان فرمائی۔

"الجدال فی الحج ان یقول بعضھم الحج الیوم وآخرون یقولون بل غدا"

کہ حج میں ان لوگوں کا جدال اس بات پر ہوتا کہ بعض لوگ ان میں سے یہ کہتے کہ حج آج ہے اور بعض لوگ کہتے حج کل ہے۔

ان کے اختلاف کی اصل وجہ یہ ہوتی کہ کچھ لوگ چاند دیکھ کر تاریخ کا تعین کرتے اور کچھ لوگ دنوں کی گنتی سے حساب لگاتے تھے، اسی وجہ سے ان کا عید میں بھی اختلاف ہوتا تھا کوئی کہتا آج عید ہے اور کوئی کہتا کل عید ہے، اس اختلاف سے اللہ تعالیٰ نے ان کو منع فرمایا۔ اور گویا رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ کہا گیا۔

" قدبینا لکم ان الاھلة مواقیت للناس والحج فاستقیموا علی ذلک ولاتجادلوا فیه من غیر ھذه الجھة"

کہ ہم نے جب تمہیں بتا دیا ہے کہ تم اپنے اوقات اور حج کا حساب چاند سے لگاؤ تو تم تمام کو اسی پر قائم ہونا چاہئے اور چاند کے دیکھنے کے بغیر کسی اور وجہ سے حساب لگا کر ایک دوسرے سے جھگڑا نہ کرو۔

﴿۵﴾ قفال رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جدال کی وجہ یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو عمرہ کر کے احرام کھولنے کا حکم دیا کہ حج کا احرام آٹھ ذی الحج کو باندھا جائے، صحابہ کرام نے بطور تعجب عرض کیا۔

" نروح الی منی ومذاکیرناتقطرمنیا"

یارسول اللہ اب ہم احرام کھول لیں اور اپنی ازواج سے جماع کرلیں، پھر ہم آٹھ ذی الحج کو احرام باندھ کر منیٰ میں پہنچ جائیں یہ تو عجیب حالت ہوگی کہ رات کو ہم نے جماع کیا ہوگا صبح ہم منیٰ میں جارہے ہوں گے۔

صحابہ کرام کے تعجب کی وجہ سے کلام کو رب تعالیٰ نے جدال سے تعبیر فرمادیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" لواستقبلت من امری مااستدبرت ماسقت الهدی ولجعلتهاعمرة "

میں جب کسی کام کی طرف آگے بڑھتا ہوں تو پیچھے نہیں ہٹتا، میں نے اگر ہدی اپنے ساتھ نہ چلائے ہوتی تو میں بھی عمرہ کر کے احرام کھول لیتا۔ اور حج کا احرام بعد میں باندھتا۔

صحابہ کرام کا تعجب جاتا رہا، انہوں نے پھر کوئی کلام نہ کیا۔

"وتر کوا الجدال حینئذ" گویا کہ انہوں نے اس وقت جھگڑا چھوڑ دیا۔

﴿۶﴾ عبدالرحمٰن نے ابن زید نے جدال کی وجہ یہ بیان کی۔

" جدالهم فی الحج بسبب اختلافهم فی ایهم المصیب فی الحج لوقت ابراهیم علیه السلام"

کہ ان لوگوں کا اختلاف اس میں ہوتا تھا کہ کوئی کہتا جس موسم میں ہم نے حج کیا ابراہیم علیہ السلام کا حج بھی اس وقت میں تھا، کوئی کہتے نہیں ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے حج کرنے کے وقت کو پایا تھا رب تعالیٰ نے ان کو اس جھگڑے سے منع فرمایا کہ حج کا تعلق تو چاند سے ہے گرمیوں سردیوں سے تو نہیں۔

﴿۷﴾ " انهم کانو مختلفین فی السننین فقیل لهم لاجدال فی الحج "

ان کا اختلاف سالوں میں ہوتا تھا، بلکہ وہ حج ہمیشہ موسم بہار میں کرتے تھے، زمانہ جاہلیت کی اس رسم کو مٹا دیا گیا کہ حج میں جھگڑا نہ کرو۔

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔

" الاان الزمان قداستدار کھیئة یوم خلق اللہ السماوات والارض"

خبردار! بیشک زمانہ اپنی پہلی ہیئت کی طرف لوٹ کر آ گیا جو ہیئت اسے زمین و آسمان کی تخلیق کے دن حاصل تھی۔ (اس جھگڑے سے بھی منع کیا گیا)۔ (از کبیر)

حاصل کلام:

" والمرادبالرفث الجماع ومقدماته وقول الفحش،وان یرادبالفسوق جمیع انواعه وبالجدال جمیع انواعه لان اللفظ مطلق ومتناول لکل هذه الاقسام"

آیۃ کریمہ میں تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔رفث، فسق اور جدال سے۔تینوں الفاظ اپنی اپنی تمام قسموں کو شامل ہیں کیونکہ ان کو مطلق ذکر کیا گیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ تمام اقسام کو شامل ہو۔

"رفث" جماع اور مقدمات جماع یعنی چھونے، بوسہ لینے،عورتوں کے سامنے صحبت کے ذکر اور فحش کلام کو شامل ہے۔"فلا رفث" کہہ کر ان تمام چیزوں سے دوران حج منع کر دیا گیا۔

"فسق" اپنی تمام قسموں کو شامل ہے۔"ولا فسوق" کہہ کر دوران حج تمام قسم کے گناہوں سے منع کر دیا گیا۔

"جدال" بھی اپنی تمام قسموں کو شامل ہے۔"ولا جدال" کہہ کر ہر قسم کے باطل جھگڑے سے منع کر دیا گیا ہے۔ (از کبیر)

سوال: فسق اور جھگڑا تو ہر حال میں منع ہے۔حج کے دوران ممانعت کا کیا مطلب ہے؟

جواب: "وهذه الاموروان کانت قبیحة واجبة الاجتناب فی کل حال الاانهافی حال الحج اقبح واشنع کلبس الحریرفی الصلوة والتطریب فی قرأة القرآن "

اگر چہ یہ کام ہر حال میں قبیح (برے) ہیں،ان سے اجتناب ضروری ہے،مگر حج میں زیادہ ہی برے

ہیں، جس طرح ریشم کا کپڑا پہننا مرد کے لئے ہر حال میں گناہ ہے لیکن نماز میں زیادہ ہی گناہ ہے۔اور اسی طرح قرآن کو عجیب سریلی آواز میں پڑھنا ہر حال میں قبیح ہے لیکن نماز میں اور ہی زیادہ قبیح ہے۔

" التطریب المنهی عنه مایفعله قراء زماننابین یدی الوعاظ فی المجالس من الالحان العجیبة"

عجیب وغریب طرز جو ہمارے زمانے میں واعظین کی مجالس میں لگائی جاتی ہے، وہ منع ہے، اس طرح پڑھنا قبیح ہے۔

" واماتحسین القرأة ومدهافهومندوب الیه قال ﷺ "حسنواالقرآن باصواتکم فان الصوت الحسن یزیدالقرآن حسنا"

ہاں البتہ قرآن پاک کو تجوید کے مطابق اچھی طرح پڑھنا، جہاں مد کی ضرورت ہو وہاں مد کرنا مستحب ہے، اسی کی طرف نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی راہنمائی کررہا ہے کہ'' قرآن پاک کو اچھی آوازوں سے پڑھو بیشک اچھی آواز قرآن پاک میں حسن پیدا کرتی ہے۔ (شیخ زادہ)

دینی طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

" فلارفث ولافسوق ولاجدال" تینوں مقامات میں لانفی جنس کا ہے اور یہ تینوں الفاظ مبنی برفتحہ ہیں۔ اور پہلے دونوں پر ایک قرأت میں رفع بھی پڑھا گیا ہے، تقدیر عبارت کی یہ ہے۔

"لایکن رفث ولافسوق"

" والافعال الثلاثة وان کانت خبراعلی صورةالنفی بمعنی ان شیأمنهالایقع فی خلال الحج الاانه المرادبهاالنهی لان ابقاء هاخبراعلی ظاهرهایستلزم الخلف فی خبر الله للعلم بان هذه الاشیاء کثیرماتقع فی خلال الحج"

جن تین کاموں سے منع کیا گیا ہے وہ اگرچہ خبر ہیں یعنی نفی ان میں پائی گئی ہے جن کا ظاہری معنی یہ ہے کہ حج میں کوئی رفث اور کوئی فسق اور کوئی جھگڑا نہیں پایا گیا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کا وقوع تو ہوتا رہتا ہے تو یہ معنی لینے سے اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب لازم آئے گا، اس لئے بظاہر ان میں نفی ہے لیکن مراد ان میں نہی ہے کہ یہ کام حج میں نہ کرو۔ البتہ حکم میں زور دینے کے لئے نفی کی صورت میں نہی کو ذکر کر دیا گیا۔ (از شیخ زادہ)

تین چیزوں سے ممانعت کی حکمت:

علوم عقلیہ میں یہ بات ثابت ہے کہ انسان میں چار قوتیں پائی جاتی ہیں۔

﴿۱﴾ قوة شهوانيه بهيمية (چوپایوں کی طرح شہوت والی قوت)

﴿۲﴾ قوة غضبيه سبعية (درندوں کی طرح غضب والی قوت)

﴿۳﴾ قوة وهمية شيطانية (شیطانوں کی طرح وہم والی قوت)

﴿۴﴾ قوة عقليه ملكية (فرشتوں کی طرح عقل والی قوت)

"والمقصود من جميع العبادات قهر القوى الثلاثة اعنى الشهوانية والغضبية والوهمية"

تمام عبادات کا مقصد تین قوتوں یعنی شہوانیہ، غضبیہ اور وہمیہ پر قہر کرنا ہے کہ یہ دب کر رہیں اور قوت ملکیہ ان پر غالب رہے۔

"فلا رفث" ارشاد فرما کر قوت شہوانیہ پر قہر کیا گیا کہ جماع یا جماع کے اسباب سے منع کر دیا گیا۔ غرضیکہ عورتوں کے سامنے صرف صحبت (جماع) کے ذکر کی بھی ممانعت کر دی گئی کیونکہ یہ بھی جماع تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

ہاں ایک بات یہ ذہن میں رہے کہ حج یا عمرہ کے احرام کے آگے پیچھے اپنی ازواج سے جماع یا جماع کے اسباب پر عمل کرنا جائز ہے صرف ناجائز طریقہ پر عمل کی ممانعت ہے۔ لیکن حج میں طواف زیارت سے فارغ ہونے تک اپنی ازواج سے بھی یہ منافع حاصل کرنے سے منع کر دیئے گئے تاکہ نفس کی قوت شہوانیہ کو مکمل طور پر دبایا جا سکے۔

"ولافسوق" کہہ کر انسان میں پائی جانے والی قوت غضبیہ پر قہر کیا گیا۔ کیونکہ درندے اپنے غیظ وغضب کی وجہ سے اور اپنی سرکشی کی وجہ سے دوسرے جانوروں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں، اسی قوت کی وجہ سے ہی انسان بھی سرکش ہو جاتا ہے، فرعونیت اس کے ذہن پر سوار ہو جاتی ہے۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ ہر قسم کے گناہوں سے باز رہنے کا حکم دے کر اور بالخصوص دوران حج برائیوں سے منع کر کے قوت غضبیہ کو دبایا گیا۔

"ولاجدال" کہہ کر قوت وہمیہ پر قہر کیا گیا، کیونکہ قوت وہمیہ کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں اور اس کے افعال واحکام میں، اور اس کے اسماء میں جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔

اور پھر یہی وہم اس کو انسانوں کے ساتھ جھگڑا کرنے پر ابھارتا ہے یہاں تک کہ وہ بات بات پر ہر کسی سے جھگڑا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ہر حال میں عمومی طور پر اور دوران حج خصوصی طور پر جھگڑا کرنے سے منع کر کے قوت وہمیہ کو دبایا گیا ہے۔

"فلما کان منشأ الشر محصورا فی ھذہ الامور الثلاثۃ لاجرم قال (فلا رفث ولافسوق ولاجدال فی الحج)"

جب تمام قسم کے شران تینوں چیزوں کی وجہ سے ہی پائے جاتے ہیں تو ان تینوں سے ہی دوران حج خصوصی طور پر اس آیۃ کریمہ میں منع کیا گیا ہے۔

مقصد عظیم:

"فمن قصد معرفۃ اللہ ومحبتہ والاطلاع علی نور جلالہ والانخراط فی سلک الخواص من عبادہ فلا یکون فیہ ھذہ الامور وھذہ اسرار نفیسۃ ھی المقصد الاقصی من ھذہ الآیات فلا ینبغی ان یکون العاقل غافلا عنھا ومن اللہ التوفیق فی کل الامور"

جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا چاہے، اور اس سے محبت کرنے کا ارادہ رکھے، اور اس کے نور جلال پر مطلع ہونا چاہے، اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی سلک (ڈوری) میں اپنے آپ کو پرونا چاہے تو اس میں یہ تینوں چیزیں جن سے منع کیا گیا ہے نہ پائی جائیں۔

ان آیات سے حاصل ہونے والے یہ نفیس قسم کے اسراراور مقاصد اعلیٰ ہیں، عقلمند انسان کو چاہئے کہ ان سے غافل نہ رہے، تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی توفیق حاصل کرنے کی دعاء کرتا رہے۔ (از کبیر)

اے میرے رب مولائے کائنات اپنے عاجز بندے کو اپنا قرب عطا فرمادے۔ تیری رحمت سے کچھ دور نہیں۔

(فی الحج) ''فی ایامه'' یعنی عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ اور فسق اور جھگڑا نہ ہو حج کے دنوں میں۔ یعنی ''فی الحج'' کا مطلب ہے ''فی ایام الحج'' (بیضاوی)

گذشتہ سے پیوستہ:

قرآن پاک میں فرض کا لفظ پانچ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

'' الاول فرض بمعنی اوجب'' پہلا فرض بمعنی واجب کرنے کے استعمال ہوا جیسا کہ اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں ہے۔

''فمن فرض فیهن الحج'' جس شخص نے اپنے آپ پر ان دنوں میں حج واجب کیا (لازم کیا)

اسی طرح ''فنصف مافرضتم'' میں بھی فرض بمعنی واجب کرنے کے استعمال ہوا ہے۔

''الثانی فرض بمعنی بین'' دوسرا معنی فرض کا بیان کرنا۔ واضح کرنا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

''قدفرض اللّٰہ لکم تحلة ایمانکم'' تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر واضح کر دیا ہے قسموں کا کھولنا۔

یعنی اگر معصیت کی قسم اٹھادی جائے تو اس قسم کو توڑ کر اس کا کفارہ دینے کا حکم واضح طور پر بیان کر دیا گیا۔

اسی طرح یہی معنی مراد ہے۔ ''سورۃ انزلناها و فرضناها'' سورت کو ہم نے نازل کیا اور اسے ہم نے بیان کیا۔

'' و الثالث فرض بمعنی احل'' تیسرا فرض کا معنی ہے حلال کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''ماکان علی النبی من حرج فیمافرض اللّٰہ له''

نبی پر کوئی حرج نہیں اس چیز میں جو اللہ نے اس کے لئے حلال کی۔

"والرابع فرض بمعنی انزل" فرض کا چوتھا معنی ہے نازل کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ان الذی فرض علیک القرآن" بیشک وہ ذات جس نے تم پر قرآن نازل کیا۔

"والخامس بمعنی الفریضۃ" پانچواں معنی فرض کا حصہ مقرر کرنا۔ جیسا کہ وراثت کے مسائل میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔ "فریضۃ من اللہ" اللہ تعالیٰ کی طرف سے (وراثت میں ہر وارث کا) حصہ مقرر ہے۔

"وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ"

اور جو تم کرو بھلائی جانتا ہے اسے اللہ۔

اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں سے منع فرمایا جو تمام شر امور کا سبب ہیں، اس کے بعد ان الفاظ مبارکہ کے ذریعے "رغب فی کل الطاعات فھو حث علی فعل الخیر"

ہر قسم کی نیکی کی طرف رغبت دلائی گئی اور نیکی کے کاموں پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔

"فیدخل فیه استعمال الکلام الحسن مکان القبیح والبر والتقوی مکان الفسوق والوفاق والاخلاق الجمیلة مکان الجدال"

ان الفاظ مبارکہ سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ قبیح کلام کو چھوڑ دو اس کی جگہ اچھا کلام لاؤ۔

اچھا کلام اپنے معنی میں وسعت رکھتا ہے۔ قرآن پاک پڑھنا، تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل، وعظ و نصیحت، نعت خوانی وغیرہ ہر قسم کا اچھا کلام ذکر کرنا اس میں آ گیا۔

اور یہ بتایا گیا کہ فسق کو چھوڑ کر نیکی اور تقویٰ کو اختیار کرو۔ یعنی ہر قسم کے گناہوں سے اجتناب کرو اور ہر قسم کے نیکی کے کام کرو۔

اور یہ فرمایا گیا کہ ہر قسم کے جھگڑے کو چھوڑ دو اور اخلاق جمیلہ سے کام لو اور ایک دوسرے سے محبت و اتفاق سے در پیش آؤ۔ (سبحان اللہ قرآن پاک کا یہی کمال ہے کہ مختصر الفاظ کتنے عظیم مطالب کو شامل ہوتے ہیں)۔ (از روح البیان)

ذکر خیر میں حکمت:

انسان خواہ عمل خیر کرے یا عمل شر، اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ لیکن رب تعالیٰ نے اچھے کام کے متعلق فرمایا کہ جو تم بھلائی کرو، اچھا کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ تم اچھا کام کرو یا برا کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔

اس میں عجیب حکمت یہ پائی گئی ہے۔

" اذاعلمت منک الخیر ذکرته وشهرته، واذاعلمت منک الشرسترته واخفیته لتعلم انه اذاکانت رحمتی بک فی الدنیاهکذافکیف فی العقبی"

کہ گویا اللہ تعالیٰ کے فرمان کا یہ مطلب ہے کہ جب میں تمہارے اچھے اعمال کو دیکھوں گا تو اس کا ذکر کروں گا اور اسے مشہور کروں گا، اور جب تمہارے برے اعمال کو دیکھوں گا تو ان کی پردہ پوشی کروں گا اور ان کو مخفی رکھوں گا۔ تا کہ تجھے معلوم ہو جائے جب میری رحمت تجھ پر دنیا میں یہ ہے تو آخرت میں میری رحمت کتنی عظیم ہوگی۔

اور حکمت یہ ہے کہ بادشاہ جب اپنے مطیع غلام کو یہ کہتا ہے کہ میری وجہ سے جو مشقت تم اٹھاتے ہو اور جو تم خدمت کرتے ہو میں اسے جانتا ہوں اور اس پر مطلع ہوں "کان هذاوعداله بالثواب العظیم" تو بادشاہ کی جانب سے یہ کہنا کہ میں جانتا ہوں یہ عظیم اجر کا وعدہ ہے۔

اور اگر سرکش غلام کو یہ کہا جائے کہ میں تمہارے اعمال کو جانتا ہوں تو "کان توعدابالعقاب الشدید" یہ شدید سزا کی دھمکی ہے۔

"ولماکان الحق سبحانه اکرم الاکرمین لاجرم ذکرمایدل علی الوعدبالثواب ولم یذکرمایدل علی الوعیدبالعقاب"

اللہ تعالیٰ جب کہ اکرم الاکرمین (سب سے زیادہ کرم کرنے والا) ہے تو اس نے اپنی شان کریمی کے مطابق بھلائی کے کاموں کے جاننے کا ذکر فرمایا جو باعث ثواب ہیں۔ برے کاموں کے جاننے

کا ذکر نہیں فرمایا جو باعث عذاب ہیں اور دھمکی پر دلالت کرنے والے الفاظ ذکر نہیں فرمائے۔

اور وجہ یہ ہے کہ جبرئیل نے جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا" ماالاحسان "احسان کیا ہے؟

تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

" الاحسان ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"

احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو بیشک وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

جب بندے پر واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے تو گویا کہ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ مالک الملک تمہارے اعمال پر مطلع ہے تو تمہیں اس کی فرمانبرداری میں کوشش کرنی چاہئے کیونکہ خادم کو جب معلوم ہو کہ میرے اعمال پر میرا مخدوم مطلع ہے تو وہ " کان احرص علی العمل و اکثر التذاذابہ" زیادہ کام کرنے پر حریص ہوتا ہے اور زیادہ لذت محسوس کرتا ہے، اسی طرح اے انسان تجھے بھی چاہئے کہ تو اپنے کریم مالک کی فرمانبرداری کر اور نافرمانی نہ کر کیونکہ وہ تیری بداعمالیوں کو ظاہر نہیں کرتا تیرے اچھے اعمال کا چرچا کرتا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

"وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى"

اور توشہ ساتھ لو، بیشک بہتر توشہ پرہیزگاری ہے۔

شان نزول:

ان الفاظ مبارکہ کے شان نزول کی ایک وجہ یہ ہے جو حضرت ابن عمر اور مجاہد اور قتادہ اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے بیان فرمائی ہے۔

" نزلت الآیۃ فی طائفۃ من العرب کانت تجی الی الحج بلازادویقول بعضھم کیف نحج بیت اللہ ولایطعمنافکانوایبقون عالۃ علی الناس فنھواعن ذلک و امروابالزاد"

کہ یہ آیۃ کریمہ عرب کے ایک گروہ کے متعلق نازل ہوئی جو حج کے لئے بغیر توشہ کے آجاتے، پھران میں سے کچھ کہتے ہم حج بیت اللہ کیسے کریں کہ ہمیں کوئی طعام کھلاتا ہی نہیں، اس طرح وہ لوگوں پر بوجھ بن جاتے۔ ان کو اس سے منع کیا گیا ہے اور زادراہ (راستے کا اور وہاں کا خرچ) ساتھ لینے کا حکم فرمایا۔ (قرطبی)

☆ عن ابن عباس قال کان اهل الیمن یحجون فلایتزودون ویقولون نحن متوکلون فاذا قدموا مکة سألوا الناس " (رواه البخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یمن کے کچھ لوگ حج کے لئے آتے تھے اور اپنا خرچ ساتھ نہیں رکھتے تھے، اور کہتے یہ تھے کہ ہم توکل کرنے والے ہیں، جب وہ مکہ میں آجاتے تو لوگوں سے مانگنا شروع کردیتے تھے۔

" وقال البغوی انمایفضی حالهم الی النهب والغصب فانزل اللّٰہ تعالی وتزودوا"

علامہ بغوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ کبھی تنگ حالی کی وجہ سے دوسرے کا مال چھین لیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں " وتزودوا " کے الفاظ مبارکہ کو نازل فرمایا کہ اپنا خرچ ساتھ رکھو۔ (مظهری، البحر المحیط)

☆ قال رجل لاحمدبن حنبل اریدان اخرج الی مکة علی التوکل بغیر زاد، فقال له احمد اخرج فی غیر القافلة فقال لا، الامعهم، قال فعلی جرب الناس توکلت (جرب جمع جراب ای وعاء)

ایک شخص نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو کہا کہ میں مکہ میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن بغیر خرچ ساتھ لے جانے کے توکل پر جانا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا بغیر کسی قافلہ کے ساتھ جانے کے اکیلے چلے جاؤ۔

اس نے کہا میں اکیلے تو نہیں جاسکتا قافلے کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ تو آپ نے فرمایا کیا تم لوگوں کے توشہ دانوں پر توکل کرنا چاہتے ہو۔ (قرطبی)

☆ ابوالفرج ابن جوزی کہتے ہیں۔

" وقد لبّس ابلیس علی قوم یدعون التوکل فخرجوا بلازاد وظنوا ان ھذا ھو التوکل و ھم علی غایۃ الخطاء"

بعض لوگوں کو ابلیس اس دھوکے میں مبتلاء کر دیتا ہے کہ وہ توکل کا دعویٰ کریں، بغیر خرچ کے گھر سے نکل جائیں لیکن ان کا اسے توکل سمجھنا غلطی ہے۔ (قرطبی)

ابن عربی کا شاندار موقف:

" قال ابن العربی امر اللہ بالتزود لمن کان لہ مال و من لم یکن لہ مال فان کان ذا حرفۃ تنفق فی الطریق او سائلا فلا خطاب علیہ "

ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زادِ راہ ساتھ لینے کا جو حکم فرمایا اس کا تعلق مالدار لوگوں کے لئے ہے جن کے پاس مال ہوتا تھا لیکن مال وہ اپنے گھر ہی چھوڑ کر چل پڑتے کہ ہم بغیر مال کے حج کرنے جارہے ہیں کہ ہم متوکل ہیں، لیکن اگر کوئی شخص کسی فن کو جانتا ہے اور وہ اپنا کاروبار راستے میں کرتا ہے اور اپنا خرچ اپنے کسب سے چلارہا ہے یا ایک انسان مالدار ہی نہیں وہ صرف سوال کے ذریعے ہی اپنا گذر اوقات چلارہا ہے، یعنی محنت و مزدوری کے قابل نہیں تو وہ اس حکم میں نہیں آتے، ان کا بغیر خرچ ساتھ لئے گھر سے نکلنا رب تعالیٰ کے حکم کی عدولی نہیں۔

(قرطبی و ابن عربی)

دینی طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

" تزودوا" باب تفعل ہے، زاد یزود، قال یقول کے وزن پر ہے جس طرح قال سے باب تفعل تقول ہے، اسی طرح زاد سے باب تفعل تزود ہے۔

بہتر زادراہ تقوی ہے:

" والتقوی فی عرف الشرع والقرآن عبارۃ عن فعل الواجبات وترک المحظورات"

قرآن پاک سے ثابت ہے کہ شریعت میں تقوی یہ ہے کہ واجب کاموں پر عمل کرے اور ممنوع کاموں کو چھوڑ دے۔

پہلے معصیت کے کاموں سے منع کیا، اب مکمل طور پر تقوی کرنے کا حکم دیا کہ ممنوعات سے رکنا بھی ضروری ہے اور واجبات پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

دوسفر اور دوزادراہ:

سفر کی دوقسمیں ہیں، ایک "سفرفی الدنیا" اور دوسرا "سفرمن الدنیا"

دنیا میں سفر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کھانے پینے کی اشیاء اپنے ساتھ رکھے اور سواری ہو سفر کے لئے اور اپنے ساتھ مال رکھے۔

اور دنیا سے سفر کے لئے بھی زادراہ ضروری ہے۔

" وھومعرفۃاللہ ومحبتہ والاعراض عماسواہ"

وہ زادراہ یہ ہے کہ اللہ تعالٰی کی معرفت حاصل ہو اور اس کی محبت حاصل ہو اور اس کے سواء اور چیزوں سے اعراض کرے۔

تقوی کی بہتری کی وجوہ:

جب یہ واضح ہوگیا کہ تقوی آخرت کا توشہ ہے اور ظاہری اسباب اور مال دنیا کا توشہ ہے تو بہت واضح ہے کہ آخرت کا توشہ دنیا کے توشہ سے اعلٰی ہے۔ تاہم اس کی چندوجوہ ذکر کی جارہی ہیں۔

" ان زادالدنیایخلصک من عذاب موھوم وزادالآخرۃ یخلصک من عذاب متیقن"

بیشک دنیا کا توشہ ان تکالیف سے بچاتا ہے جن کے متعلق صرف گمان ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اگر میں اپنے ساتھ خرچ نہ لے کر گیا تو مجھے تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑے، لیکن اخروی عذاب تو یقینی ہے فقط وہمی نہیں، لہٰذا اپنے ساتھ تقویٰ کو بطور زادراہ رکھے، کیونکہ یہ یقینی عذاب سے بچاتا ہے۔

﴿۲﴾ "ان زادالدنیایخلصک من عذاب منقطع وزادالآخرۃ یخلصک من عذاب دائم"

بیشک دنیا کا زادراہ تمہیں اس عذاب سے بچائے گا جس نے ختم ہوجانا ہے، کیونکہ جب دنیا نے ختم ہوجانا ہے بلکہ دنیا کے اختتام سے پہلے انسان نے خود فوت ہوجانا ہے تو دنیاوی تکالیف نے بھی ختم ہوجانا ہے۔

لیکن اخروی زادراہ نے اس عذاب سے بچانا ہے جو عذاب نہ ختم ہونے والا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے گا، تاہم مؤمنین کو ایمان کا توشہ ساتھ لے جانے کی وجہ سے آخر کار نجات حاصل ہونی ہے اور تقویٰ کا توشہ ساتھ لے جانے کی وجہ سے رب تعالیٰ کی رحمت سے عذاب نہ ہونے کی نعمت حاصل ہوگی۔"ان شاء اللہ"

﴿۳﴾ "ان زادالدنیایوصلک الی لذۃ ممزوجۃ بالآلام والاسقام والبلیات، وزادالآخرۃ یوصلک الی لذات باقیۃ خالصۃ عن شوائب المضرۃ آمنۃ من الانقطاع والزوال"

بیشک دنیا کے زادراہ میں جہاں لذات ہیں وہاں اس میں درد، بیماریاں اور مصیبتیں بھی ہیں، اور زاد آخرت سے وہ لذات حاصل ہوتی ہے جو باقی رہنے والی ہیں اور نقصان پہنچانے سے پاک وصاف ہوتی ہیں۔اور وہ نہ ختم ہونے والی ہیں۔

﴿۴﴾ "ان زادالدنیایوصلک الی الدنیاوھی کل ساعۃ فی الادبار والانقضاء وزادالآخرۃ یوصلک الی الآخرۃ وھی کل ساعۃ فی الاقبال والقرب والوصول"

بیشک دنیا کا توشہ دنیا تک پہنچاتا ہے، دنیا کی ہر گھڑی پیچھے کی طرف جارہی ہے اور دنیا کا ہر لمحہ اختتام کی طرف جارہا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ انسان اپنی عمر کے گھٹنے کو بڑا ہونا سمجھ رہا ہے اور پستی

کوترقی کا نام دے رہا ہےاورزوال کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ رہا ہے۔
لیکن آخرت کا توشہ آخرت کی طرف لے جانے والا ہے اس کی ہر گھڑی آگے کی طرف جائے گی۔اور انسان کو رب تعالی کا قرب حاصل ہوگا۔اور خوش قسمت لوگ واصل الی اللہ (رب کو پالینے کا درجہ حاصل کرنے والے) ہوں گے۔

۵۔ ان زادالدنیایوصلک الی منصة الشهوة والنفس وزادالآخرة یوصلک الی عتبة الجلال والقدس"
دنیا کا توشہ تجھے خواہشات نفسانیہ عطاء کرے گااور آخرت کا توشہ تمہیں مالک الملک کے دربار کی دہلیز تک پہنچائے گا۔

ان تمام وجوہ سے واضح ہوگیا کہ اگر چہ دنیا کا توشہ بھی ساتھ رکھنا ضروری ہے لیکن آخرت کا توشہ تقوی ہی بہتر ہےاور مقصود ہے۔

اعشی شاعر نے بہت ہی خوبصورت طریقہ سے اس مفہوم کو بیان کیا ہے۔

اذاانت لم ترحل بزادمن التقی ولاقیت بعدالموت من قدتزودا
ندمت علی ان لاتکون کمثله وانک لم ترصد کماکان ارصدا

جب تو دنیا سے تقوی کا توشہ ساتھ لے کر کوچ نہیں کرے گا۔
تو تیری ملاقات ایسے شخصوں سے ہوگی جن کے پاس تقوی کا توشہ ہوگا۔
تو نادم ہوگا کہ تو ان شخصوں کی طرح نہیں۔
اس لئے کہ تیرے پاس وہ رصد نہیں ہوگی جو ان کے پاس ہوگی۔ (ازکبیر)

"وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ" اور ڈرو مجھ سے اے عقل والو!

یعنی عقل کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ تعالی سے ڈرے اور تقوی اختیار کرے۔پہلے تقوی کا ذکر کر کے اس پر برانگیختہ کیا۔

" ثم امرهم بان یکون المقصود بهاهو اللّٰہ فیتبروا عن کل شیٔ سواہ وھو مقتضی العقل المعری عن شوائب الھوی"

پھران کو حکم دیا کہ اصل مقصد تمہارا اللہ تعالیٰ ہے۔اس لئے تم اللہ تعالیٰ کے بغیر تمام چیزوں سے اپنے آپ کو بیزار سمجھو۔

ہاں یہ منصب اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو خواہشات کے شائبہ سے اپنی عقل کو دور رکھے۔اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے عقل والوں کو خطاب کیا۔

" فانه من لم یتقه فکأنه لالب له"

جس شخص کو تقوی حاصل نہیں گویا کہ اسے عقل ہی حاصل نہیں۔

سبحان اللہ کامل عقل اولیاء کرام اور متقین حضرات کو ہی حاصل ہوتی ہے، ہمارے جیسے ہیچمدان صرف دعویدار ہی ہیں کہ ان کو عقل حاصل ہے۔

عقلمند شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنی عقل کو دنیاوی لغزشوں سے دور رکھے اور اپنے نفس کو مہذب کرے اور اپنے آپ کو اعلیٰ مراتب تک پہنچانے کی پوری پوری کوشش کرے۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

ولم ارفی عیوب الناس شیأ کنقص القادرین علی التمام

میں نے لوگوں میں اس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں دیکھا۔

کہ کمال حاصل کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود ناقص ہی رہیں۔

حج کی تکمیل:

تین چیزوں کا حاصل کرنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور حاجی کے لئے خاص کر کے اور ہی زیادہ ضروری ہے۔

﴿۱﴾ " الورع یحجزہ عن محارم اللّٰہ"

انسان کوورع (تقوی سے بلند پرہیز گاری) حاصل ہو جس کی وجہ سے انسان ان چیزوں سے اپنے آپ کو روک کرر کھے جن کو اللہ تعالی نے حرام کیا ہے۔ بلکہ جن میں ناجائز ہونے کا شبہ ہو ان سے بھی اجتناب کرے۔

﴿۲﴾ "وحلم یکف غضبه" اور بردباری رکھے جس کی وجہ سے اپنے غصہ کو روک کرر کھے۔

﴿۳﴾ "وحسن الصحابة لمن يصحبه من المسلمين" اپنے ساتھ مسلمان رفقاء سے اچھا سلوک رکھے۔

"فمن كملهافقد كمل حجه والافلا"

جس نے تینوں چیزوں کو کامل طور پر حاصل کرلیا اس کا حج مکمل ہو گیا، جو ان تین چیزوں کو مکمل نہ کر سکا اس کا حج بھی مکمل نہ ہوا۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا۔

ازمن بگوی حاجی مردم آزار را	کو پوستین خلق بآزار میدرد
حاجی تو نیستی شتر است از برای آنکه	بیچارہ خار میخوردو بار میبرد

لوگوں کو ستانے والے حاجی کو میری طرف سے کہہ دو۔ جو مخلوق کی ظلم سے چمڑی ادھیڑ رہا ہے۔

کہ تو حاجی نہیں اونٹ ہے۔ (بلکہ اس سے بھی گھٹیا ہے) اس لئے کہ وہ۔ بیچارہ کانٹے کھاتا ہے اور بوجھ اٹھاتا ہے۔

(ماخوذ از روح البیان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"اتقون" میں "اتقو" جمع مذکر مخاطب امر حاضر ہے، اصل میں "اوتقیوا" تھا، نون وقایہ ہے۔ اور یای متکلم ضمیر منصوب جو مفعول ہے محذوف ہے۔ اصل میں "اتقونی" ہے۔

☆☆☆☆☆

لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلاً مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ ۚ وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ ۚ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ (سورۃالبقرۃ آیت۱۹۸)

﴿۱﴾

تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو،تو جب عرفات سے پلٹوتو اللہ کی یادکرو مشعر حرام کے پاس اوراس کا ذکر کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت فرمائی ،اور بے شک اس سے پہلے تم بہکے ہوئے تھے۔

﴿۲﴾

نہیں ہے تم پر کچھ گناہ کہ تم طلب کروفضل اپنے رب کا،تو جب لوٹوتم عرفات سے تو ذکر کرواللہ کا مشعر حرام کے پاس اورذکر کرواس کا اس لئے کہ اس نے ہدایت دی تمہیں اور بیشک تم اس سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے۔

شان نزول:

چندواقعات کے درپیش آنے کے بعد آیۃ کریمہ کانزول ہوا۔جواحادیث میں مذکور ہیں۔

☆ ”عن ابن عباس قال كانت عكاظ ومجنة وذوالمجاز اسواقافي الجاهلية فلما كان الاسلام فكانهم تأثموا ان يتجروا في المواسم فنزلت“ (رواہ البخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عکاظ اور مجنہ اور ذوالمجاز بازار تھے زمانہ جاہلیت میں، جب اسلام آ گیاتو لوگوں نے حج کے دنوں میں تجارت کرنے کوگناہ سمجھاتو اس آیۃ کریمہ کانزول ہوا کہ تم پرکوئی گناہ نہیں کہ تم حج کے دنوں میں اپنے رب کافضل طلب کرو۔یعنی تجارت کے

ذریعے تم مال حاصل کرو تو یہ تمہارے لئے جائز ہے۔

خیال رہے کہ یہ تینوں بازار مکہ کے قریب حج کے دنوں میں لگائے جاتے تھے۔ ذیقعد کی پہلی تاریخ سے بیس تاریخ تک عکاظ بازار قائم ہوتا تھا۔ پھر ذیقعد کی اکیس تاریخ سے ذی الحج کی آٹھ تاریخ تک مجنہ (بفتح المیم و کسرھا) بازار قائم ہوتا تھا۔ پھر آٹھ ذی الحج کو ہی مقام عرفات کے قریب ذوالمجاز بازار قائم ہوتا تھا۔

عن ابی امامة التیمی قال کنت رجلا اکری فی هذا الوجه و کان الناس یقولون لی انه لیس لک حج فلقیت ابن عمر فقلت له یا اباعبدالرحمن انی رجل اکری فی هذا الوجه و ان اناسا یقولون انه لیس لک حج فقال ابن عمر الیس تحرم وتلبی وتطوف بالبیت وتفیض من عرفات وترمی الجمار فقلت بلی قال فان لک حجا، جاء رجل الی رسول الله ﷺ فسأله عن مثل ماسألتنی عنه فسکت رسول الله ﷺ فلم یجبه حتی نزلت هذه الآیة "لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم" فارسل الیه رسول الله ﷺ و قرأها علیه و قال لک حج" (اخرجه ابو داؤد و الترمذی)

حضرت ابوامامہ تیمی کہتے ہیں کہ میں حج کے دنوں میں اپنے اونٹ وغیرہ کو کرایہ پر دے دیتا تھا، لوگ مجھے کہتے کہ تمہارا حج نہیں، تو میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ملا تو میں نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن بیشک میں حج کے دنوں میں محنت و مزدوری کرتا ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا حج نہیں (کیا وہ صحیح کہتے ہیں) تو ابن عمر نے فرمایا کیا تم احرام نہیں باندھتے، کیا تم تلبیہ نہیں پڑھتے، کیا تم بیت اللہ شریف کا طواف نہیں کرتے، کیا تم مقام عرفات پر جا کر نہیں لوٹتے، کیا تم جمرات کو کنکریاں نہیں مارتے؟ تو میں نے کہا یہ سارے کام تو میں کرتا ہوں، آپ نے فرمایا بیشک تمہارا حج ہے، پھر انہوں نے بتایا کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے اسی طرح آپ سے سوال کیا جیسا کہ تم نے مجھ سے سوال کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ (وحی کی انتظار میں) خاموش رہے، آپ نے اسے کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف پیغام بھیجا اسے یہ آیۃ کریمہ پڑھ کر سنائی گئی اور اسے بتایا گیا کہ تمہارا حج ہے۔ (از خازن)

☆ "عن ابن عباس قال کانوا یتقون البیوع والتجارۃ فی الموسم والحج یقولون ایام ذکر فانزل اللہ تعالی لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم" (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ حج کے دنوں میں خرید وفروخت اور تجارت سے دور رہتے کہ یہ صرف ذکر کے دن ہیں تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ "نہیں تم پر کچھ گناہ کہ تم طلب کرو فضل اپنے رب سے"

☆ "وعن ابی صالح مولی عمر قال قلت یاامیر المؤمنین کنتم تتجرون فی الحج قال و هل کانت معایشهم الافی الحج"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام ابوصالح کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا اے امیر المؤمنین کیا تم حج کے دنوں میں تجارت کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا ہاں لوگوں کا ذریعہ معاش ہی حج کی تجارت پر موقوف تھا۔ (از صاوی)

حج کے دنوں میں تجارت نہ کرنا افضل ہے:

"والحق ان التجارۃ وان کانت مباحۃ فی الحج الاان الاولی ترکها"

حق یہ ہے کہ تجارت کرنا حج کے دنوں میں جائز تو ہے لیکن تجارت نہ کرنا بہتر ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالی نے فرمایا۔

"وما امروا الالیعبدوا اللہ مخلصین له الدین"

اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر یہ کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اسی کے لئے دین میں اخلاص پیدا کریں۔

"والاخلاص ان لایکون حامل علی الفعل سوی کونه طاعة وعبادة"

جو شخص طاعت اور عبادت کے بغیر اور کاموں میں مشغول رہے اس کی عبادت میں کامل اخلاص نہیں پایا جاتا۔ لہذا بہتر ہے کہ اگر کوئی شخص تجارت کرنے کے بغیر ہی حج کرے تو اس میں زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔

(روح البیان)

نزول آیۃ سے پہلے تجارت کے ناجائز ہونے کا گمان کیوں ہوا؟

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

﴿۱﴾ رب تعالیٰ نے جب جھگڑے سے منع فرمایا تو لوگوں نے اس سے یہ خیال کیا کہ تجارت میں بھی قیمت کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے جھگڑا ہوتا رہتا ہے" **فوجب ان تکون التجارة محرمة وقت الحج**" تو ضروری ہے کہ دوران حج تجارت حرام ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے تجارت کی اجازت دے کر ان کے اس وہم کو رد کر دیا۔

﴿۲﴾ زمانہ جاہلیت میں لوگ تجارت کو دین کے خلاف سمجھتے تھے اگرچہ تجارت کرتے بھی تھے۔ اسلام کے آنے کے بعد بھی ان لوگوں کے نظریات یہ رہے کہ دنیاوی طمع کی وجہ سے حج ضائع ہو جائے گا۔ ان کے اس باطل نظریہ کا رد کیا گیا کہ تجارت کرنے سے حج ضائع نہیں ہوتا، بلکہ تجارت کی تمہیں اجازت ہے۔

﴿۳﴾ حج میں کئی وہ کام ناجائز کر دیئے گئے جو حج کے آگے پیچھے جائز ہوتے ہیں جیسا کہ لباس پہننا، خوشبو لگانا اور شکار کرنا اور اپنی اہلیہ سے مباشرت کرنا، تو ان چیزوں سے لوگوں نے اندازہ لگایا کہ لباس پہننے کی ضرورت تو زیادہ ہوتی ہے، اور تجارت کی ضرورت کم ہوتی ہے، اس لئے تجارت ناجائز ہونی چاہئے۔ رب تعالیٰ نے حج کے دنوں میں تجارت کی اجازت دے کر واضح فرمایا کہ یہ جائز ہے۔

﴿۴﴾ نماز میں مشغول ہونے کی حالت میں کئی جائز کام حرام ہو جاتے ہیں، کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا وغیرہ تو لوگوں نے اسی سے یہ سمجھا کہ شاید حج کے دنوں میں تجارت بھی منع ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تجارت کے جواز کا حکم فرما کر اس وہم کا ازالہ کر دیا۔ (از کبیر)

حج میں اور کاموں کی آمیزش کو شدید جرم سمجھا گیا تھا۔

" واذا دخل العشر بالغوافی ترک البیع والشراء بالکلیة "

ذی الحج کی پہلی تاریخ سے دس تاریخ تک وہ مکمل طور پر خرید و فروخت چھوڑ دیتے تھے، بلکہ وہ حج

کے دنوں میں تجارت کرنے والے کے متعلق کہتے تھے۔

''هؤلاء الداج وليسوا بالحاج''

یہ ''الحاج'' نہیں بلکہ ''الداج'' ہے۔

''الداج'' کا معنی کسب کرنا اور چننا۔ اسی وجہ سے مرغی کو ''الدجاجة'' کہتے ہیں کہ وہ زمین سے دانے چنتی (اٹھاتی) ہے۔ وہ لوگ حج کے دنوں میں کسی مظلوم کی امداد، کسی ضعیف کی فریادرسی اور بھوکے کو طعام کھلانے کو بھی ناجائز سمجھتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے تجارت کی اجازت دے کر ان کے اس وہم کو زائل کر دیا۔

''لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ''

نہیں ہے تم پر کچھ گناہ کہ تم طلب کرو فضل اپنے رب کا۔

(ليس عليكم جناح) ''اى اثم من الجنوح وهو الميل عن القصد''

جناح کا معنی ''جنوح'' سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہوتا ہے میانہ روی سے عدول کر جانا۔ سیدھی راہ سے ہٹ جانا، گناہگار بھی اللہ تعالیٰ کے احکاموں پر عمل کرنے سے عدول کرتا ہے اس لئے گناہ کو ''جناح'' کہا گیا ہے۔ (از روح البیان)

''جناح'' نکرہ ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر تجارت میں اور کوئی ناجائز ہونے کی صورت نہ پائی گئی تو حج میں تجارت کا کچھ گناہ بھی نہیں ہوگا نہ صغیرہ اور نہ کبیرہ۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں ''کچھ'' کا لفظ اسی خوبی پر دلالت کر رہا ہے۔

اعتراض: آیہ کریمہ میں حج کا ذکر نہیں کیونکہ حکم مطلق ہے۔

''ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلا من ربكم''

اس میں صرف اتنا ہی ذکر ہے۔ ''تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم تلاش کرو اپنے رب کا فضل''

اس سے دوران حج تجارت کا جواز کیسے ثابت ہوا؟

جواب: " ماروی عطاء عن ابن مسعود وابن الزبیر انھماقرء ا"ان تبتغو افضلامن ربکم فی مو اسم الحج"

عطا کی روایت کے مطابق ابن مسعوداور ابن زبیر رضی اللہ عنہا کی قرأت میں "فی مواسم الحج" کے الفاظ موجود ہیں، جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو حج کے موسم میں یعنی حج کے دنوں میں۔

اور اصول فقہ میں یہ ضابطہ موجود ہے جو قرأتیں اخبار احاد سے ثابت ہیں وہ اگر چہ نماز میں تلاوت نہیں ہوں گی لیکن ان کا معنی اخبار مشہورہ کی تائید کرے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

(ان تبتغوا) "ای تطلبوا" (جلالین)

تم طلب کرو، تم تلاش کرو، تم حاصل کرو۔

(ان تبتغوا) "ای فی ان تقصدوا وتطلبوا" (روح البیان)

تم پر کوئی گناہ نہیں اللہ کے فضل کا ارادہ کرنے اور طلب کرنے میں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" ان تبتغوا " میں نون اعرابی ان ناصبہ کی وجہ سے حذف ہو گیا۔ یہ باب افتعال ہے، اصل اس کا مادہ "بغی" ہے۔ "البغی تجاوز الاقتصاد فیما یتحری "کسی کام میں اتنی کوشش کرنا کہ درمیانی راہ سے تجاوز کر جائے اسے "بغی" کہا جاتا ہے۔ پھر "بغی" کی دو قسمیں ہیں۔

" احدھما محمود وھو تجاوز العدل الی الاحسان والفرض الی التطوع "

" بغی "یعنی درمیانی راہ سے تجاوز کرنے کی ایک قسم اچھی ہے، قابل تعریف ہے، وہ عدل سے تجاوز کر کے احسان تک پہنچنا، اور فرض سے تجاوز کر کے نفل تک پہنچنا۔

کاش کہ یہ معنی لوگوں کو سمجھ آجائے تو سارے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں، جو آئے دن لوگوں کو مستحبات سے

اس لئے روکنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں کہ یہ کام نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا۔

" والثانی مذموم وهو تجاوز الحق الی الباطل اوتجاوزه الی الشبه کماقال علیه الصلوة والسلام الحق بین والباطل بین وبین ذلک امور مشتبهات ومن وقع حول الحمی اوشک ان یقع فیه"

اوردوسری قسم "بغی" تجاوز کی مذموم (بری) ہے۔ وہ یہ ہے کہ حق سے باطل کی طرف تجاوز کرنا یا شبہات کی طرف تجاوز کرنا جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا حق واضح ہے۔ اور باطل واضح ہے۔ اوران کے درمیان ایسے کام ہیں جن میں اشتباہ پایا جاتا ہے۔ جو شخص چراگاہ کے اردگرد (یعنی حدبندی کے ساتھ ساتھ) جانوروں کو چراتا ہے قریب ہے کہ وہ اس میں واقع ہو جائیں۔

(ازمفردات راغب)

"فضلامن ربکم" (اپنے رب کا فضل)

" عطاء وتفضلاوهو النفع والربح بالتجارة والکراء " (مدارک)

تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم طلب کرواپنے رب کی عطاءاوراس کے فضل کو۔ یعنی رب تعالیٰ سے منافع حاصل کرو، اورتجارت کر کے مالی نفع حاصل کرو، اورمحنت مزدوری کر کے اوراپنے اونٹ وغیرہ کرایہ پردے کر مالی نفع حاصل کرو۔

فائدہ: رزق حلال حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ انسان اپنے آپ کواوراپنے اہل وعیال کوحرام مال سے بچالیتا ہے۔

فضل کے معنی میں وسعت:

" ثم ان الفضل علی ثلاثة اقسام بالنسبة الی احوال العبدفان التنوع راجع الی تغییر احوال العبادلاالی تغییر صفة من صفات الحق تعالی"

فضل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ جب فضل کا تعلق بندوں سے ہوتا ہے تو اس تعلق کے لحاظ پر اللہ تعالیٰ کے فضل کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ " فالاول منھامایتعلق بالمعاش الانسانی من المال والجاہ"

ان میں سے پہلی قسم وہ ہے جس کا تعلق انسان کی معاش سے ہے خواہ وہ مال ہو یا مرتبہ۔

پھر مال کا تعلق یا غذا حاصل کرنے سے ہوگا یا لباس حاصل کرنے سے۔

اس فضل کی تفسیر رزق سے کی جاتی ہے۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"وابتغوا من فضل اللہ" اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ (سورۃ الجمعۃ آیت ۱۰)

یعنی رزق تلاش کرو۔

۲۔ والثانی منھامایتعلق بالمصالح الاخرویۃ للعبد"

دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ فضل کا تعلق بندے کی اخروی بہتریوں سے ہو۔

اس کی پھر دو قسمیں ہیں،ایک وہ ہے جس کا تعلق اعمال بدن سے ہو،یعنی شریعت کے مطابق کام ہوں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تابعداری کرے۔اور شیطانی راستہ سے بچ کر رہے۔

اس فضل کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا۔

" یبتغون فضلامن اللہ ورضوانا "اللہ کا فضل اور رضا چاہتے ہیں۔ (سورۃ الفتح آیت ۲۹)

یہاں فضل کا معنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری اور اس کی رضامندی کا حصول۔

اور دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق دل کے اعمال اور تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنے) سے ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

" ولولافضل اللہ علیکم ورحمتہ مازکی منکم من احدابداولکن اللہ یزکی من یشاء"

(سورۃ النور آیت ۲۱)

اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں کوئی پاکیزہ نہ ہوسکتا ہاں اللہ پاکیزہ کرتا ہے جسے چاہے۔

یہاں اللہ کے فضل سے مراد تزکیہ نفس ہے جس کا تعلق اعمالِ قلب سے ہے۔

۳۔ والقسم الثالث منھامایتعلق باللہ تعالیٰ"

فضل کی تیسری قسم وہ ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

اس کی پھر دو قسمیں ہیں، ایک وہ ہے جس کا تعلق "مواھب قربة" (رب تعالیٰ کی طرف سے قربت ملنا) سے ہے۔ اسی کو رب قدوس نے یوں بیان فرمایا۔

"وبشر المؤمنین بانّ لھم من اللہ فضلا کبیرا" (سورۃ الاحزاب آیت ۴۷)

اور بشارت دو مومنوں کو کہ ان کے لئے اللہ کا بڑا فضل ہے۔

"ای قربا کبیرا فانہ اکبر من الدنیا و الآخرۃ"

یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا قرب حاصل ہے جو دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔

اور اس کی دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق "مواھب وصلة" (اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصال) سے ہوتا ہے۔ یہ فضل باقی تمام قسموں سے اعلیٰ ہے، کیونکہ جب خدا مل گیا تو خود بخود خدائی مل گئی۔

تجھ سے تجھی کو مانگ کر مانگ لی کائنات

مجھ سا کوئی گدا نہیں، تجھ سا کوئی شاہ نہیں

اس آیۃ کریمہ میں تینوں قسم کے فضل حاصل کرنے کا حکم دیا گیا کہ حج میں بے خرچ ہو کر بھی نہ رہ جاؤ ضرورت پڑے تو رزق حلال حاصل کرو۔ اور حج میں تمام کام اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے مطابق ہوں اور مقصد اللہ تعالیٰ کو حاصل کرنا ہو۔

ہر حال میں انسان کو ان تمام قسم کے فضلوں کو تلاش کرے۔ خصوصاً حج میں زیادہ ہی اس کا لحاظ کرے۔

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں یعنی اہل سلوک کی ابتداء ترک دنیا سے ہوتی ہے کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں چلہ کشی کرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر کامل توکل کرتے ہیں، دنیاداروں سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو معرفت و توحید میں بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

اب اس اعلیٰ درجہ پر پہنچ کر ان کی یہی دعاء ہوتی ہے کہ اے اللہ ہمارے دلوں کو دنیا کی محبت سے پاکیزہ رکھ

اور ہمارے دلوں کو اپنی رحمت کے نور سے بھردے۔

" اللھم طھرقلوبنامن رجزحب الدنیاالدنیة و املاقلوبنانورابالطاف الخفیة"

ان لوگوں کو دنیا کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی بلکہ آخرت کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

" فلا یتصرفون فی شئ منھاوتصرفھم باللہ وفی اللہ وللہ"

ان کا دنیا میں کوئی تصرف نہیں ہوتا بلکہ ان کا تصرف اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے حصول کے لئے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے وصال کے حصول کے لئے ہوتا ہے۔

" لایتصرفون لحظوظ النفس بل لمصالح الدین واصابة الخیر الی الغیر وکذافی التاویلات النجمیة"

اللہ والے اپنی خواہشات کے مطابق کام نہیں کرتے بلکہ دین کی مصلحت کے لئے کام کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتے میں بھرپور کوشش کرتے ہیں، تاویلات نجمیہ میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔

مولانا روم مثنوی میں فرماتے ہیں۔

کار پاکاں راقیاس ازخودمگیر — گرچہ ماند درنوشتن شیر وشیر

شیر آں باشد کہ مردم رادرد — وشیر آں باشد کہ مردم اوراخورد

نیک لوگوں کے کام کو اپنے کام پر قیاس نہ کرو۔ — اگرچہ شیر اور شیر لکھنے میں ایک جیسے ہیں۔

شیر وہ ہے جو لوگوں کو پھاڑ دیتا ہے۔ — شیر (دودھ) وہ ہے جسے لوگ پیتے ہیں۔

(ماخوذازروح البیان)

فضل کے معنی میں مزید وسعت:

ابوجعفر محمد بن علی باقر رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایک اس کا یہ مطلب بھی ہے۔

" ھوان یبتغی الانسان حال کونہ حاجاعمالااخری تکون موجبة لاستحقاق فضل اللہ ورحمتہ مثل اعانة الضعیف و اغاثة الملھوف واطعام الجائع"

کہ انسان دوران حج اور بھی وہ کام کرے جو اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کا ذریعہ بنیں، یعنی ضعیف لوگوں کی امداد کرے اور مظلوموں کی فریاد رسی کرے اور بھوکوں کو کھانا کھلائے۔

تنبیہ: " اتفقوا علی ان التجارة اذا اوقعت نقصانافی الطاعة لم تکن مباحة اما ان لم توقع نقصانا البتة فیهافهی من المباحات التی اولی ترکها"

اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ اگر تجارت حج کے احکام بجالانے میں خلل پیدا کرے، یا تجارت میں جھوٹ وغیرہ کی آمیزش سے معصیت ہو تو تجارت کرنا جائز نہیں۔ اگر یہ نقصانات نہیں تو تجارت کرنا جائز ہے۔ البتہ تجارت نہ کرنا بہتر ہے۔

" والحاصل ان الاذن فی هذه التجارة جارمجری الرخص"

حاصل کلام یہ ہے کہ دوران حج تجارت کرنے کی اجازت دی گئی، تجارت کرنا لازم نہیں۔ اور نہ ہی تجارت کرنا افضل ہے۔ بلکہ تجارت نہ کرنا افضل ہے۔

" فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡکُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ "

توجب لوٹو تم عرفات سے تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام کے پاس۔

یعنی نو ذی الحج کو غروب آفتاب کے بعد عرفات سے لوٹ کر مزدلفہ میں آجاؤ، اگرچہ تمام مزدلفہ ہی ٹھہرنے کا مقام ہے لیکن مشعر حرام کے پاس ٹھہرنا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا زیادہ فضلیت رکھتا ہے۔ جس طرح مقام عرفات تمام ہی موقف (ٹھہرنے کا مقام) ہے لیکن جبل رحمت پر وقوف زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

مشعر حرام: ایک پہاڑ ہے جسے قزح کہا جاتا ہے جہاں امام کھڑا ہوتا ہے، اس کے اوپر "میقدة" ہے، جہاں آگ جلائی جاتی تھی، یہ مقام عرفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان ہے، وادیٔ محسر تک پھیلا ہوا ہے۔ البتہ یہ دونوں پہاڑ جو عرفہ میں ہیں اور وادیٔ محسر یہ مزدلفہ کا موقف نہیں۔

"مشعر" شعار سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی علامت ہے، اور حرام کا معنی روکنا، چونکہ وہ مقام حج کی علامت ہے اور حج کے منافی کاموں سے روکنے کا مقام ہے اس لئے اسے مشعر حرام کہا گیا ہے۔ (مدارک، خازن)

مقام عرفات سے غروب آفتاب کے بعد لوٹنا:

زمانہ جاہلیت میں غروف آفتاب سے پہلے لوگ لوٹ پڑتے تھے، لیکن نبی کریم ﷺ غروب آفتاب کے بعد لوٹے اور بعد میں لوٹنے کا آپ نے حکم دیا۔

☆ " عن اسامة بن زيدقال دفع رسول اللهﷺ من عرفة حتى اذاكان بالشعب نزل فبال ثم توضأولم يسبغ الوضوء فقلت الصلوة يارسول الله فقال الصلوة امامك فلماجاء المزدلفة نزل فتوضأفاسبغ الوضوء ثم اقيمت الصلوة فصلى المغرب ثم اناخ كل انسان بعيره فى منزله ثم اقيمت العشاء فصلى ولم يصل بينهماشيأ"

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ عرفات سے لوٹے جب آپ وادی میں پہنچے تو آپ سواری سے اترے، پیشاب فرمایا پھر وضوء فرمایا لیکن کامل وضوء نہ فرمایا (یعنی صرف ہاتھ وغیرہ دھونے پر اکتفاء کیا) میں نے کہا نماز (کا وقت ہو گیا) یارسول اللہ! آپ نے فرمایا نماز کا وقت آگے ہوگا، پھر آپ سوار ہوئے، جب مزدلفہ آ گیا تو آپ سواری سے اترے، وضوء فرمایا، کامل وضو فرمایا پھر نماز کے لئے اقامت کہی گئی مغرب کی نماز آپ نے ادا فرمائی، تمام لوگوں نے اپنی اپنی سواریوں کو بٹھایا، پھر عشاء کی اقامت کہی گئی، آپ نے عشاء کی نماز ادا فرمائی۔ ان کے درمیان کوئی اور نماز (یعنی نوافل وغیرہ) ادا نہیں کی۔ (بخاری ومسلم)(خازن)

☆ " واخرج الحاكم وابن مردويه والبيهقى فى سننه عن المسوربن مخرمة قال خطبنا رسول اللهﷺ بعرفة فحمدالله واثنى عليه ثم قال امابعدو كان اذاخطب قال امابعدفان هذااليوم الحج الاكبرالاوان اهل الشرك والاوثان كانوايدفعون من هھناقبل ان تغيب الشمس اذاكانت الشمس فى رؤس الجبال كانهاعمائم الرجال فى وجوهها واناندفع بعدان تغيب الشمس وكانوايدفعون من المشعرالحرام بعدان تطلع الشمس اذاكانت الشمس فى رؤس الجبال كانهاعمائم الرجال فى وجوهها وانا ندفع ان تطلع الشمس مخالفاهدينالهدى اهل الشرك"

مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے عرفات میں خطبہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی۔ پھر آپ نے کہا۔ ''امابعد'' آپ خطبہ میں (حمد وثناء کے بعد) ''امابعد'' کہتے تھے۔ آپ نے فرمایا آج کا دن حج اکبر کا دن ہے۔ خبردار بیشک اہل شرک اور بت پرست یہاں سے سورج کے غروب ہونے سے پہلے لوٹ جاتے تھے جبکہ سورج پہاڑوں کی چوٹیوں پر لوگوں کے سامنے پگڑیوں کی طرح نظر آتا تھا۔ لیکن ہم یہاں سے سورج کے غروب ہونے کے بعد لوٹیں گے۔ اور وہ لوگ مشعر حرام (مزدلفہ) سے اس وقت لوٹتے تھے جبکہ سورج طلوع ہو کر پہاڑ کی چوٹیوں پر لوگوں کے سامنے پگڑیوں کی طرح نظر آتا۔ لیکن ہم وہاں سے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے لوٹیں گے کیونکہ ہمیں رب تعالیٰ نے مشرکین کی راہ کے مخالف حق راہ کی ہدایت دی ہے۔ (درمنثور)

☆ '' واخرج ابوداؤد والترمذی واللفظ له وصححه وابن ماجه عن علی قال وقف رسول اللہ ﷺ بعرفة فقال هذه عرفة وهو الموقف وعرفة كلهاموقف ثم افاض حين غربت الشمس واردف اسامة بن زيدوجعل يشيربيده على هينته والناس يضربون يميناوشمالالايلتفت اليهم ويقول ياايهاالناس عليكم السكينة ثم اتى جمعافصلى بهم الصلوتين جميعافلمااصبح اتى قزح وقف عليه وقال هذاقزح وهو الموقف وجمع كلهاموقف ثم افاض حتى انتهى الى وادی محسرفقرع ناقته فخبب حتى جاوز الوادی فوقف واردف الفضل ثم اتى الجمرة فرماهاثم اتى المنحرفقال هذا المنحر ومنى كلهامنحر''

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ عرفات پر ٹھہرے تو آپ نے فرمایا یہ عرفات ہے، یہ ٹھہرنے کا مقام ہے، عرفات تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے، پھر سورج کے غروب ہونے پر آپ وہاں سے لوٹ پڑے اور اسامہ بن زید کو اپنے ساتھ اپنی سواریوں پر سوار کر لیا۔ آپ اپنے ہاتھ کے اشارہ سے لوگوں کو آہستہ آہستہ چلنے کے متعلق کہہ رہے تھے اور لوگ آپ کے دائیں

بائیں چل رہے تھے آپ ان کی طرف توجہ کرر ہے تھے اور فرمار ہے تھے اے لوگو آہستہ چلو، پھر آپ مزدلفہ میں آگئے وہاں آپ نے دونمازیں ایک وقت میں جمع کر کے پڑھائیں، جب صبح ہوئی تو آپ جبل قزح پر آئے اور وہاں نہ ٹھہرے۔ اور آپ نے فرمایا یہ قزح ہے یہ ٹھہرنے کا مقام ہے اور مزدلفہ تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے، پھر آپ لوٹے یہاں تک کہ وادئ محسر میں پہنچے تو وہاں سے جلدی جلدی آگے نکلنے کے لئے اپنی اونٹنی کو دوڑایا یہاں تک کہ وادی سے نکل گئے، پھر آپ نے اپنی سواری پر اپنے ساتھ فضل بن عباس کو سوار کیا اور (مقام منی میں) جمرات کے پاس آگئے ان کو کنکریاں ماریں، پھر آپ ذبح کرنے کے مقام میں آئے، اور فرمایا یہ ذبح کرنے کا مقام ہے۔ تمام منی ہی ذبح کا مقام ہے۔ (درمنثور)

☆ " واخرج البخاری ومسلم وابوداؤد والنسائی وابن ماجة عن اسامة بن زیدانه سئل کیف کان رسول اللهﷺ یسیر حین افاض من عرفة وکان رسول الله ﷺ اردفه من عرفات قال کان یسیر العنق فاذاو جدفجوة نص"

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ رسول اللہﷺ عرفہ سے لوٹتے ہوئے کس طرح چلتے تھے، تو انہوں نے بتایا کہ میں رسول اللہﷺ کے ساتھ سواری پر سوار تھا آپ آہستہ آہستہ سواری کو چلا رہے تھے۔ جب آپ کو جگہ کشادہ مل جاتی تو کچھ تیز چلتے۔ (درمنثور)

☆ " واخرج ابن خزیمة عن ابن عمران رسول الله ﷺ وقف حتی غربت الشمس فاقبل یکبر الله ویهلله ویعظمه ویمجده حتی انتهی الی المزدلفة"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہﷺ (عرفات پر) ٹھہرے یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا تو آپ متوجہ ہوئے (یعنی مزدلفہ کی طرف) "اللہ اکبر" اور "لا الہ الا اللہ" پڑھ رہے تھے۔ اور اللہ تعالی کی عظمت اور بزرگی بیان فرمار ہے تھے یہاں تک کہ آپ مزدلفہ میں پہنچ گئے۔

(درمنثور)

☆ "واخرج البخاری ومسلم والنسائی عن ابن عباس ان اسامة بن زید کان ردف رسول اللہ ﷺ من عرفة الی مزدلفة ثم اردف الفضل من المزدلفة الی منی فکلاھما قال لم یزل النبی ﷺ یلبی حتی رمی جمرة العقبة"

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں بیشک اسامہ بن زید رسول اللہ ﷺ کی سواری پر آپ کے ساتھ عرفہ سے مزدلفہ تک سوار رہے۔ پھر مزدلفہ سے منی تک فضل بن عباس آپ کے ساتھ سوار رہے۔ دونوں فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ منی میں جمرۂ عقبہ تک پہنچنے تک تلبیہ پڑھتے رہے۔

☆ واخرج سعیدبن منصوروابن جریروابن المنذروالبیھقی فی سننه عن ابن عمر فی قوله فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام قال ھو الجبل وماحوله"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے "فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام" کے متعلق فرمایا کہ مشعر حرام ایک پہاڑ (جبل قزح) اور اس کے اردگرد کا حصہ ہے۔ (در منثور)

☆ واخرج ابن ابی شیبة عن سعیدبن جبیر قال مابین جبلی مزدلفة فھو المشعر الحرام"

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مزدلفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان مشعر حرام ہے۔

(در منثور)

اعتراض: پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عرفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان مشعر حرام ہے۔ اس حدیث پاک میں مزدلفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان مشعر حرام کا ذکر ہے۔ ان میں تطبیق کیسے صحیح ہے؟

جواب: عرفہ کی آخری حد اور مزدلفہ کی ابتدائی حد پر یہ پہاڑ واقع ہیں، اس لئے عرفہ کے پہاڑ کہنا بھی صحیح ہے اور مزدلفہ کے پہاڑ کہنا بھی صحیح ہے۔

مشعر حرام پر ٹھہرنے کے لئے دھکے نہ دیئے جائیں:

"واخرج عبدالرزاق وعبدبن حمیدوابن جریر عن ابن عمر انه رأی الناس یزدحمون علی قزح فقال علام یزدحم ھؤلاء کل ماھھنا مشعر"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے لوگوں کو جبل قزح پر بھیڑ کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تو آپ نے فرمایا یہ ایک دوسرے کو کس لئے دھکے دے رہے ہیں تمام مقام ہی مشعر ہے۔ (درمنثور)

یعنی مزدلفہ تمام ہی ٹھہرنے کا مقام ہے بغیر دھکے دیئے اور کسی کو تکلیف پہنچانے کے بغیر مشعر حرام (جبل قزح) پر ٹھہرنے اور دعا کرنے کی جگہ مل جائے تو بہتر ورنہ مزدلفہ کے کسی مقام پر بھی ٹھہر جائیں۔

''وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدٰكُم'' اور ذکر کرو اس کا اس لئے کہ ہدایت دی اس نے تمہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے۔ ''اور اس کا ذکر کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت فرمائی''

یہ ترجمہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی اس تفسیر کے مطابق ہے۔

(واذكروه كماهداكم) ''ای کما علمکم المناسک والتشبیه لبیان الحال وافادة التقییداى اذکروه علی ذلک النحو ولاتعدلوا عنه''

اور اس کا ذکر کرو جس طرح اس نے ہدایت دی یعنی جس طرح اس نے تمہیں حج کے طریقہ سکھائے۔ یہاں تشبیہ بیان حال کے لئے ہے اور مقید کرنے کا فائدہ بتانے کے لئے ہے۔ یعنی رب تعالیٰ کو اسی طرح یاد کرو۔ اسی طرح اس کا ذکر کرو جیسا اس نے تمہیں بتایا ہے۔ اس سے اپنی مرضی کے مطابق عدول نہ کرو۔

'' ویحتمل ان یرادمطلق الهداية ومفادالتشبيه التسوية فی الحسن والکمال ای (اذکروه) ذکر احسنا کماهداکم هداية حسنة الى المناسک وغیرها''

اور ایک احتمال یہ ہے کہ مراد مطلق ہدایت ہو، تشبیہ کا تعلق حسن اور کمال سے ہو، مطلب یوں ہو، اس کا ذکر حسین وجمیل طریقہ سے کرو جیسا کہ اس نے حج کے طریقوں وغیرہ میں حسین وجمیل ہدایت دی۔ (روح المعانی)

لیکن راقم کا ترجمہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی اس تفسیر کے مطابق ہے۔

'' وذهب بعضهم الى ان الكاف للتعليل''

بعض حضرات نے کہا ہے کہ کاف تعلیل کے لئے ہے۔ (روح المعانی)

جلالین نے بھی یہی معنی بیان کیا ہے۔اور صاوی کی مزید وضاحت اس طرح ہے۔

(والکاف للتعلیل) "ای فالمعنی اذکروہ لاجل ھدایتہ ایاکم و لاجل انکم کنتم من قبل ذلک لمن الضالین"

کاف تعلیل کے لئے۔اس صورت میں معنی یہ ہے کہ اس کا ذکر کرو اس لئے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے اور اس لئے کہ اس کی ہدایت سے پہلے بیشک تم بھٹکے ہوئے تھے۔

(جلالین و صاوی)

راقم نے صاوی اور جلالین اور روح المعانی کی آیت تفسیر کے مطابق اس لئے ترجمہ کیا ہے تاکہ طلباء کرام کو یہ بحث بھی ذہن نشین ہو جائے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے بہت ہی زیادہ۔اور عاجزی اور خشوع سے ذکر کرے۔اور ذکر کرے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف توجہ کرے اور اس کا خوف دل میں رکھے،اور اس کا ذکر کرتے ہوئے یوں سمجھو کہ تم اس کے جلال و جمال کا مشاہدہ کر رہے ہو،نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے یہ واضح ہو رہا ہے۔

" الاحسان ان تعبداللہ کأنک تراہ"

احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔

سب سے پہلے "ذکر باللسان" (زبان سے ذکر) کا درجہ ہے۔پھر اس کی دو قسمیں ہیں۔جہری ذکر اور سری ذکر (یعنی بلند آواز سے اور آہستہ)۔جب مقصد یہ ہو کہ بلند آواز سے ذکر کرنے سے دوسرے غافل لوگ بھی ذکر کریں گے تو بلند آواز سے ذکر کرنا بہتر ہوگا جہاں تک آواز جائے گی وہاں تک شجر و حجر گواہی دیں گے۔اور اگر یہ مقصد ہو کہ آہستہ ذکر کیا جائے تاکہ اس میں ریاءکاری کا کوئی شائبہ بھی نہ پایا جائے تو یہ بھی کمال ہے۔

پہلی قسم کا نام ہے "ذکر اللسان فی مقام اللسان" اور دوسری قسم کا نام ہے "ذکر اللسان فی مقام النفس"

اس کے بعد درجہ ہے "ذکر بالقلب فی مقام الافعال" کا، یعنی دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا کہ اس کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا اور اس کے اوامر ونواہی کے مطابق عمل کرنا۔

اس کے بعد سری ذکر (مخفی ذکر) کا وہ درجہ ہے جس میں رب تعالیٰ کے افعال کا معاینہ پایا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کی صفات کی تجلیات کا علم مکاشفہ پایا جاتا ہے۔ پھر درجہ ہے ذکر روح کا، وہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی صفات کی تجلیات کے انوار کے مشاہدہ کے ساتھ نور ذات کا ملاحظہ بھی ہو۔ خیال رہے کہ ملاحظہ کا اصل مطلب آنکھ کے ایک کنارے سے دیکھنا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے "کچھ توجہ کرنا"

اس کے بعد درجہ ہے ذکر خفی کے اس مقام کا جس سے رب تعالیٰ کی ذات کے جمال کا (بلا کیف) مشاہدہ پایا جائے لیکن دوئی باقی رہے، کہ بندہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے وجود کا عکس نہ تصور کرے۔

اس کے بعد درجہ ہے ذکر ذات کا جس سے شہود ذاتی حاصل ہوتا ہے۔ دوئی کی دوری ختم ہو جاتی ہے۔ بندہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرا وجود اور کائنات کا وجود رب تعالیٰ کے وجود کا عکس ہے۔ اسی کے وجود کے قیام سے کائنات موجود، اس کے وجود میں عدم نہیں۔ اگر وہ معدوم ہوتا تو کائنات بھی معدوم ہو جاتی۔ ہاں وہ جب چاہے خود موجود ہوتے ہوئے کسی کو معدوم کر دے یہ اس کی شان قدرت ہے۔ (روح البیان بتصرف)

سوال: جب پہلے متصل ہی "فاذکروا اللہ" (اللہ کا ذکر کرو) آچکا ہے تو دوبارہ "واذکروہ" (اور اسے یاد کرو) کو کیوں ذکر کیا گیا ہے۔

جواب: یہاں ذکر میں تکرار نہیں۔ بلکہ چند وجوہ سے فرق ہے۔ پہلے ذکر سے مراد اور ہے، دوسرے سے مراد اور ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفیہ ہیں قیاسیہ نہیں۔ (یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جو نام ذکر فرمائے ہیں وہ توقیفیہ کہلاتے ہیں، اپنی عقل سے بیان کرنا قیاسیہ کہلاتے ہیں)

پہلے حکم فرمایا "اذکروا اللہ" اللہ کا ذکر فرمایا، پھر اس کی وضاحت "واذکروہ کما ھداکم" سے کی۔ کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ان اسماء وصفات سے کرو جن کی ہدایت رب تعالیٰ نے تمہیں دی۔

"لابالاسماء التی نذکرھابحسب الرای والقیاس"

انسان یہ یادرکھے کہ ایسے اسماء سے ہم نے رب تعالیٰ کو یادنہیں کرناجن میں صرف رائے اورقیاس کا دخل ہو۔ رب تعالیٰ کے اسماء کی تفصیلی بحث نجوم الفرقان جلداول سورہ فاتحہ میں دیکھیں۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکرکرنے کاحکم دیا۔ پھرفرمایا"واذکروہ کماھداکم" جس کامطلب یہ ہے۔

"وافعلوامـاامرناکم به من الذکر کماھداکم اللہ لدین الاسلام فکأنه تعالی قال انما امرتکم بهذاالذکرلتکونواشاکرین لتلک النعمة"

ہم نے جوتمہیں اللہ کے ذکرکاحکم دیاہے وہ ذکرکروجس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں دین اسلام کی ہدایت دی ہے۔گویاکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایاکہ میراذکرکرکے میری نعمتوں کاشکراداکرو۔

﴿۳﴾ "فاذکرو االلہ عندالمشعرالحرام" میں زبان کے ذکرکوبیان فرمایا،اور"اذکروہ کماھداکم" میں دل سے ذکرکرنے کاحکم دیا۔کیونکہ ذکرکبھی نسیان کے مقابل استعمال ہوتاہے اورکبھی قول کے مقابل استعمال ہوتاہے۔یعنی مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے حکم دیاہے اس کاذکرزبان سے بھی کرواوردل سے بھی کرو۔

﴿۴﴾ پہلے"اذکرو االلہ" میں مطلق ذکرکاحکم دیا،پھر"واذکروہ کماھداکم" میں یہ بتایا"اذکروہ بتوحیدہ کماذکرکم بهدایته" کہ تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کاذکرکروکیونکہ اس نے تمہیں اپنی وحدانیت پرایمان لانے کی ہدایت بھی دی ہے۔

﴿۵﴾ ایک احتمال یہ ہے کہ مراد یہ ہوکہ ذکرکے ساتھ ذکرملاتے چلو،گویاکہ یہ کہاگیاہے۔

"اذکروہ ذکرابعدذکر کماھداکم هداية بعدهداية"

اللہ کاذکرکرو،پھراللہ کاذکرکروجس طرح اس نے تمہیں ہدایت ایمان دی پھرہدایت اعمال صالحہ دی،پھرہدایت ذکروغیرہ دی۔

اللہ تعالیٰ کایہ ارشادگرامی" یاایهاالذین امنوااذکرو االلہ ذکرا کثیرا" (اے ایمان والواللہ تعالیٰ کاذکرکثیرکرو)اسی مفہوم کوواضح کررہاہے۔

۶۔ رب تعالیٰ نے پہلے مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے کا حکم دے کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ احکام شریعہ کو بجالایا جائے پھر "واذکروہ کماھداکم" کہہ کر یہ ثابت کیا گیا کہ مشعر حرام کے پاس ذکر کا حکم دینے کا مطلب صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانے ہے۔ مشعر حرام مقصود نہیں۔

" فاذاعرفت ھذاقربت الی مراتب الحقیقة وھو ان ینقطع قلبک عن المشعرالحرام بل عمن سواہ فیصیر مستغرقافی نور جلالہ وصمدیتہ ویذکرہ لانہ ھوالذی یستحق لھذاالذکر"

اے انسان جب تجھے یہ معلوم ہوجائے گا تو تو مراتب حقیقت کے قریب ہوجائے گا۔ وہ یہ کہ تمہارا دل مشعر حرام سے اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے منقطع ہوجائے گا صرف اللہ تعالیٰ جو ذات صمد ہے اس کی صفت صمدیہ اور اس کے نور جلال میں تمہارا دل مستغرق ہوجائے گا اور تم جب اللہ تعالیٰ کا ذکر اس شان سے کروگے تو تمہیں مقام عروج حاصل ہوجائے گا جس کے بیان سے زبان قاصر ہے اور خیال وگمان اس کے ادراک سے قاصر ہیں۔

۷۔ پہلے جو ذکر کا حکم دیا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفات حسنیٰ ہیں، اور دوسری مرتبہ جو ذکر کا حکم دیا اس سے مراد اس کا شکر ادا کرنا ہے۔ کیونکہ اس کو ہدایت کے ساتھ معلق کیا ہے اور ہدایت اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ ہے۔ "والذکر المرتب علی النعمة لیس الاالشکر" نعمت پر مرتب ہونے والا ذکر شکر ہی ہے۔

۸۔ پہلے جب رب تعالیٰ نے مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے کا حکم دیا تو اس سے یہ گمان ہورہا تھا کہ دوران حج اور اس خاص مقام پر ہی شاید اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا حکم ہے۔ دوبارہ ذکر کا حکم دے کر اس وہم کا ازالہ کیا گیا۔

" یعنی اذکروہ علی کل حال وفی کل مکان لان ھذاالذکر انماوجب شکراعلی ھدایتہ فلماکانت نعمة الھدایة متواصلة غیرمنقطعة فکذلک الشکریجب ان یکون مستمراغیرمنقطع"

یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہر حال میں کرو۔ اور ہر جگہ کرو کیونکہ یہ ذکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہدایت کا شکر ادا کرنے کے لئے ہے جب ہدایت کی نعمت لگاتار حاصل ہونے والی ہے۔ منقطع نہیں ہونے والی، اسی طرح شکر بھی ہمیشہ کے لئے جاری ہے منقطع نہ ہونے والا ہے۔

﴿۹﴾ یہ بھی ممکن ہے کہ "فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام" سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کرنا ہو، اور "واذکروہ کما ھداکم" سے مراد تسبیح و تہلیل ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

ان بیان کردہ وجوہ سے واضح ہو گیا کہ دو مرتبہ ذکر کا حکم دینا علیحدہ علیحدہ مطالب پر مبنی ہے۔

"وَاِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ" اور بیشک تم اس سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے۔

"من قبلہ" میں ضمیر مجرور کا مرجع یا ہدایت ہے، تقدیر عبارت کی یہ ہوگی۔

"وان کنتم من قبل ان ھداکم من الضالین"

بیشک تم اللہ کی ہدایت سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر قرآن پاک کی طرف لوٹ رہی ہے جو التزاما "ھداکم" سے سمجھ آ رہا ہے۔ تقدیر عبارت کی یہ ہے۔

" واذکروہ کما ھداکم بکتابہ الذی بین لکم معالم دینہ ،وان کنتم من قبل انزالہ ذلک علیکم من الضالین "

اور ذکر کرو اس کا کہ اس نے تمہیں اپنی کتاب یعنی قرآن پاک کے ذریعے ہدایت دی اور تمہارے لئے اس میں دین کی معلومات اور علامات کا ذکر فرمایا، اور بیشک تم قرآن پاک کے نازل ہونے سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے۔ (کبیر)

ضالین کے معنی میں ہدایت کے معنی کی طرح وسعت ہے:

یعنی ہدایت کے معنی میں جس طرح وسعت ہے اس کے مقابل ہی یہاں ضالین کا استعمال ہوگا تم ایمان

سے جاہل اور بھٹکے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔تم اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری سے دور تھے یعنی بھٹکے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اطاعت کی ہدایت دی۔ (بیضاوی)

اسی طرح وسیع مفہوم میں ہے کہ تم حج کا طریقہ نہیں جانتے تھے،نماز کا طریقہ نہیں جانتے تھے،غرضیکہ تمہیں اوامر ونواہی کا کچھ پتہ نہ تھا اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک اوراپنے رسول ﷺ کے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔

دینی طلباءکرام خصوصی توجہ فرمائیں:

"واذکروہ کماھداکم" میں "ما" کے لفظ میں دواحتمال ہیں کہ ما مصدریہ ہو۔یا۔ما کافہ ہو۔

دونوں معنوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں مراد مطلق دلالت ہے۔اور کیفیت ذکر کی تعلیم ہے۔اس صورت میں کاف سے مراد تشبیہ نہیں بلکہ فقط تقیید مراد ہے۔معنی یہ ہوگا۔

"اذکروہ علی الوجہ الذی ھداکم الیہ لاتعدلو عماھدیتم الیہ"

اس کا ذکر کرواس وجہ پر جواس نے تمہیں ہدایت دی۔جس راہ کی تمہیں ہدایت دی گئی اس سے عدول نہ کرو۔

یہ معنی ایسے ہے جیسے عرب حضرات کہتے۔"افعل کماعلمتک" میں نے تمہیں جوتعلیم دی اس کے مطابق کام کرو۔

دوسری صورت میں ہدایت کا معنی ہوگا۔"دلالۃ موصلۃ" مقصد تک پہنچانے والی راہنمائی۔یعنی بندے کو دنیااور آخرت کی ہرطرح کی بھلائی کی راہ دکھانا۔اس صورت میں کاف تشبیہ کے لئے ہوگا۔معنی یہ ہے۔"یاد کرو اس کو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی"۔

یہ معنی عرب حضرات کے اس قول کے مطابق ہے۔"اخدمہ کمااکرمک"تواس کی خدمت کر جیسے اس نے تیری عزت کی،یعنی اس کی خدمت کرنے میں کوتاہی نہ کر۔

ایک اور توجہ: " وان کنتم من قبله لمن الضالین " میں لفظ "ان" میں دو احتمال ہیں۔

﴿۱﴾ وان هی المخففة من الثقیلة و اللام هی الفارقة "

"ان" اصل میں ثقیلہ تھا پھر اسے مخفف کر دیا گیا، اور اس کی خبر پر "لام" اسی لئے لگایا گیا تا کہ "ان" مخففه من الثقیلة ، اور "ان" نافیہ میں فرق ہو سکے۔ اگر چہ مخفف ہونے کی صورت میں لفظی عمل اس کا باقی نہیں رہتا لیکن معنی وہی تاکید والا رہتا ہے۔ اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے اور راقم نے بھی وہی ترجمہ نقل کیا ہے کہ زیادہ معتبر بھی وہی ہے۔

﴿۲﴾ " وقیل ان نافیة و اللام بمعنی الا" فراء نے یہ کہا ہے کہ "ان" نافیہ ہے، اور لام بمعنی "الا" ہے۔ جیسا کہ "وان نظنک لمن الکاذبین" میں ہے۔

اس صورت میں معنی ہوگا "وما کنتم من قبله الا من الضالین" اور نہیں تھے تم اس سے پہلے مگر بھٹکے ہوئے۔ کسائی رحمہ اللہ کا موقف اس مسئلہ میں راقم کو مستحسن نظر آتا ہے، آپ فرماتے ہیں اگر "ان" جملہ فعلیہ پر داخل ہو تو بمعنی "قد" آتا ہے، اور اگر جملہ اسمیہ پر داخل ہو تو نافیہ ہوتا ہے، جیسا کہ " وان کل لما علیها حافظ" میں "ان" نافیہ ہے اور "لما" بمعنی "الا" ہے۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)

ایک اور توجہ: (فاذا افضتم) "الافاضة الاندفاع فی السیر بکثرة" سیر میں کثرت سے لوٹنا "افاضة" ہے۔

"افاض البعیر" اونٹ کا جگالی کرنا یعنی چارہ پہلے پیٹ میں جمع کر لینا پھر نکال نکال کر چبانا۔

"افاض الاقداح فی المسیر" جوأ کے تیر جمع کرنا پھر پھیلانا۔

"افاضة الماء" پانی انڈیلنا یعنی پانی جمع کر کے متفرق کرنا۔ (انڈیلنا)

"فاذا افضتم" کا ترجمہ اگر چہ مختصر "جب تم لوٹو" کر دیا گیا ہے۔ لیکن تفصیلی طور پر مطلب یہ ہوگا "جب تم عرفات پر جمع ہو کر لوٹو"۔ (از کبیر)

ایک اور توجیہ:

عرفات جمع ہے عرفۃ کی، ایک جگہ کا نام عرفات (جمع) اسی طرح رکھا گیا جیسا کہ "ثوب اخلاق" میں مختلف جگہ سے کپڑے کے پھٹے ہونے کی وجہ سے ایک کپڑے پر "اخلاق" جمع کا اطلاق ہے۔

گویا کہ ہر ٹکڑا عرفۃ ہے۔ مجموعہ کا نام عرفات رکھ دیا گیا ہے۔ بظاہر اس میں تعریف اور تانیث دو سبب منع صرف کے نظر آتے ہیں لیکن غیر منصرف نہ بنانے کی وجہ یہ ہے زمین کے ایک حصہ پر علیحدہ علیحدہ ٹکڑا کو جب عرفہ کہا گیا "وعلی هذا التقدیر لم یکن علما" تو اس تقدیر پر علم نہ ہوا۔ پھر جمع کی صورت میں بظاہر علمیت کے پائے جانے کے اصل کا اعتبار کر کے غیر منصرف نہیں بنایا گیا۔ (کبیر)

تفسیر کبیر سے مزید اقتباسات:

ذی الحج کی آٹھ تاریخ کا نام ہے "یوم الترویہ" اور نو تاریخ کا نام ہے "یوم عرفه" اور ایک خاص جگہ کا نام ہے "عرفات" ان مقامات کے یہ نام کیوں رکھے گئے۔ ان کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں جن کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

یوم الترویہ کی وجہ تسمیہ:

اس میں دو قول ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ماخوذ ہے۔ "روی یروی ترویة" سے۔ جس کا معنی ہے "فکر کرنا اور فکر کا عمل کرنا" کہا جاتا ہے "روّیتهٗ" میں نے اس کا فکر کیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی ماخوذ ہے۔ "رواہ من الماء یرویه" سے۔ جس کا معنی ہے "پیاسے کو پانی پلانا"

پہلے قول میں پھر تین وجوہ ہیں۔

ایک وجہ یہ کہ آدم علیہ السلام کو جب بیت اللہ شریف بنانے کا حکم دیا گیا تو آپ نے جب فرشتوں کے ساتھ مل

کر کعبہ شریف کی بنیادوں کو مکمل کر لیا جس پر بیت المعمور کو رکھ دیا گیا۔ "فلما بناہ تفکر" تو آپ نے کعبہ شریف کو بنانے کے بعد فکر کیا اور رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے میرے رب ہر عمل کرنے والے کو اجر ملتا ہے اس عمل پر میرا کیا اجر ہے؟ رب تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا۔

"اذا طفت به غفرت لک ذنوبک باول شوط من طوافک"

جب تم طواف کرو گے تو طواف کے پہلے چکر سے تمہاری مغفرت کر دوں گا۔

(مغفرت کا مطلب پہلے پارہ میں عصمت انبیاء کی بحث میں دیکھو)

"قال یارب زدنی" آپ نے عرض کیا اے میرے رب مجھے اور زیادہ اجر عطاء فرما۔

"قال اغفر لاولادک اذا طافوا به"

رب تعالیٰ نے فرمایا تمہاری اولاد میں سے بھی جو طوافِ کعبہ کریں گے ان کی مغفرت کر دوں گا۔

"قال زدنی" پھر عرض کیا، اے اللہ اور زیادہ اجر عطا فرما۔

"قال اغفر لکل من استغفر له الطائفون من موحدی اولادک"

تو رب تعالیٰ نے فرمایا تمہاری اولاد میں سے جو کعبہ کا طواف کر کے دوسرے مومن بھائیوں کے لئے استغفار کریں گے ان کی بھی مغفرت کر دوں گا۔

"قال حسبی یارب حسبی" آپ نے عرض کیا مجھے کافی ہے۔ اے میرے رب مجھے کافی ہے۔
گذشتہ اوراق میں حج مبرور کی بحث دیکھیں تو ان شاء اللہ آپ کو یہ بحث بھی سمجھ آ جائے گی۔

دوسری وجہ تفکر کی یہ ہے۔ کہ ذی الحج کی آٹھویں رات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا گویا کہ میں بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔

"فاصبح مفکرا اھل ھذا من اللہ تعالی او من الشیطان"

صبح آپ نے تفکر کیا، کیا یہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطان نے وسوسہ ڈالنے کی کوئی کوشش تو نہیں کی۔

" فلمارأه لیلة عرفة یؤمر به اصبح فقال عرفت یارب انه من عندک"

جب آپ ذی الحج کی نویں تاریخ کو پھر دیکھا کہ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ بیٹے کو ذبح کرو تو آپ نے عرض کیا اے میرے رب میں نے پہچان لیا ہے کہ یہ حکم تیری طرف سے ہے۔

تیسری وجہ تفکر کی یہ ہے۔

" ان اهل مکة یخرجون یوم الترویة الی منی فیروون فی الادعیة التی یریدون ان یذکرها فی غدهم بعرفات"

کہ اہل مکہ آٹھ ذی الحج کو منی میں یہ تفکر کرتے تھے کہ کل عرفات پر جانا ہے وہاں کون کون سی دعائیں کرنی ہیں۔

دوسرے قول میں بھی تین وجوہ ہیں۔ یعنی جب "ترویة الماء" سے "یوم الترویة" ماخوذ ہو تو معنی یہ ہوگا پیاسے کو پانی پلانے کا دن، اس معنی کے لحاظ پر تین وجوہ ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ اہل مکہ دور سے آنے والے (آفاقی) حاجیوں کے لئے پانی جمع کر کے مخفی رکھتے تھے۔ وہ حاجی حضرات اس دن میں سفر کی مشقت سے راحت پکڑتے تھے۔

" ویتسعون فی الماء ویروون بهائمهم بعدمقاستهم قلة الماء فی طریقهم"

اور اہل مکہ کے جمع کئے ہوئے پانی سے وسعت حاصل کرتے اور اپنے چوپاؤں کو پانی پلاتے اسی طرح وہ راستے میں پانی کی قلت سے حاصل ہونے والی تکلیف اور مشقت سے راحت حاصل کرتے تھے۔

دوسری وجہ پانی سے سیراب ہونے کی یہ ہے کہ آٹھ ذی الحج کو وہ عرفہ میں پانی کو جمع کرتے تھے، تو پانی کا توشہ جمع کرنے کی وجہ سے نام یوم الترویہ رکھ لیا گیا۔

تیسری وجہ یہ ہے۔

" ان المذنبین کالعطاش الذین وردوا بحار رحمة اللہ فشربوا منھا حتی رووا"

کہ گناہگار لوگ پیاسوں کی طرح حج کا آغاز آٹھ ذی الحج سے کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سمندر میں وارد ہو جاتے ہیں اور گویا کہ وہ رحمت کا پانی پی کر اس دن سیراب ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کا نام یوم الترویۃ ہے۔

اس دن کی فضلیت پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "والشفع والوتر" (قسم ہے شفع اور وتر کی) دلالت کر رہا ہے۔ ان الفاظ گرامی کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ تاہم ایک قول یہ ہے۔

" عن ابن عباس بأن الشفع التروية وعرفة والوتر يوم النحر "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں شفع سے مراد یوم الترویۃ اور عرفہ ہے۔ اور وتر سے مراد یوم النحر ہے۔

☆ عن عبادة انه عليه الصلوة والسلام قال صيام عشر الاضحى كل يوم منها كالشهر و لمن يصوم يوم التروية سنة ولمن يصوم يوم عرفة سنتان"

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اضحیٰ کے دس دنوں میں روزہ رکھنا ایسے ہے جیسے ایک مہینہ روزے رکھنے ہیں۔ اور یوم الترویۃ کا روزہ رکھنا ایک سال کے روزوں کی طرح ہے۔ اور یوم عرفہ کا روزہ رکھنا دو سال کے روزوں کی طرح ہیں۔

☆ وروى انس انه عليه الصلوة والسلام قال من صام يوم التروية اعطاه الله مثل ثواب ايوب على بلائه ومن صام يوم عرفة اعطاه الله تعالى مثل ثواب عيسى بن مريم عليه السلام"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے یوم الترویۃ (آٹھ ذی الحج) کو روزہ رکھا تو اس کو اللہ تعالیٰ ایسا ثواب عطاء فرمائے گا جیسا کہ ایوب علیہ السلام کو آزمائش

پر صبر کرنے سے دیا گیا۔اور جس شخص نے یوم عرفہ (نو ذی الحج) کو روزہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ ایسا ثواب عطاء فرمائے گا جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو (یہود کے مظالم پر صبر سے) عطا فرمایا۔ (از کبیر)

یوم عرفہ کو روزے رکھنے کے متعلق "کتب علیکم الصیام" کی بحث میں دیکھئے۔

یوم عرفہ کی وجہ تسمیہ:

نو ذی الحج کے دن کے دس نام ہیں، پانچ وہ ہیں جو اس کے ساتھ خاص ہیں، اور پانچ وہ ہیں جو اس کے نام بھی ہیں اور اس کے غیر کے بھی نام ہیں۔

وہ پانچ نام جو اس کے ساتھ خاص ہیں ان میں سے ایک نام "**عرفہ**" ہے۔

یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہے؟ اس میں تین قول ہیں، ایک یہ کہ مشتق ہے معرفۃ سے (پہچاننا معنی ہے) دوسرا یہ کہ مشتق ہے عرفۃ سے بمعنی اعتراف، اور تیسرا یہ کہ مشتق ہے عرف سے بمعنی اچھی خوشبو۔

عرفہ بمعنی معرفت میں آٹھ وجوہ ہیں۔ان میں سے **پہلی وجہ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

"ان آدم وحواء التقیا بعرفة فعرف احدهما صاحبه فسمی الیوم عرفة والموضع عرفات"

بیشک آدم علیہ السلام اور حضرت حواء کی ملاقات نو ذی الحج کو ہوئی۔انہوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اس لئے اس کا نام یوم عرفہ (پہچاننے کا دن) اور اس جگہ کا نام عرفات رکھ دیا گیا۔

اصل وجہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو جنت سے اتار کر سراندیپ (ہندوستان) میں بھیج دیا گیا اور حضرت حواء کو جدہ میں۔حضرت آدم علیہ السلام کو جب حج کا حکم دیا گیا تو آپ کی ملاقات حضرت حواء سے مقام عرفات میں نو ذی الحج کو ہوئی۔

دوسری وجہ: حضرت آدم علیہ السلام کو جبریل امین نے رب تعالیٰ کے حکم سے مناسک حج سکھائے۔پھر مقام

عرفات پرنوذی الحج کو پوچھا"اعرفت قال نعم" کیاتم نے پہچان لیا؟ آپ نے فرمایاہاں۔تو اس دن سے اس جگہ کا نام عرفات اورنو ذی الحج کا یوم عرفہ رکھ دیا گیا۔

تیسری وجہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ایک جگہ کے متعلق بتایا گیا کہ فلاں جگہ حج میں ٹھہرنا فرض ہوگا، آپ جب وہاں پہنچے۔

"عرفهاحين رآهابماتقدم من النعت والصفة"

تو آپ نے اس مقام کو بتائی ہوئی صفات کے مطابق ہی پہچان لیا،اسی وجہ سے اس مقام کا نام عرفات اوردن کا نام یوم عرفہ رکھ لیا گیا۔

چوتھی وجہ: حضرت جبریل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کورب تعالیٰ کے حکم سے مناسک حج سکھائے پھر آپ کونوذی الحج کومقام عرفات پر پہنچا کرسوال کیا۔

"اعرفت كيف تطوف وفي اى موضع تقف؟قال نعم"

کیاتم نے پہچان لیا کہ طواف کیسے کرناہےاورکس جگہ میں ٹھہرنا ہے؟ آپ نے فرمایاہاں۔

پانچویں وجہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ اوراپنے بیٹے کوکعبہ شریف کے پاس رب تعالیٰ کے حکم سے چھوڑکرخودشام کےعلاقہ فلسطین میں چلے گئے۔پھرکئی سال کے بعدلوٹے تو"التقيايوم عرفة بعرفات" آپ کی ملاقات ان دونوں (زوجہ اور بیٹے) سےنو ذی الحج مقام عرفات پر ہوئی۔

خیال رہے کہ یہ وجہ اگرچہ بعض کے نزدیک صحیح ہے۔لیکن تحقیق یہی ہے کہ حضرت ہاجرہ سے آپ کی پھر ملاقات ہی نہ ہوسکی۔اورحضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے کعبہ شریف کے قریب ملاقات ہوئی۔"واللہ اعلم بالصواب"

چھٹی وجہ: "ماذكرناه من امرمنام ابراهيم عليه السلام" پہلے ذکرکیاجاچکا ہے کہ آٹھویں رات کو بیٹے کوذبح کرنے کےخواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کوتردد ہوااورذی الحج کی نویں رات کوخواب دیکھنے پر پہچان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہے۔

ساتویں وجہ: " ان الحاج یتعارفون فیه بعرفات اذاوقفوا" حاجی حضرات جب اس میدان میں کھڑے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں، یہی وجہ ہے مقام عرفات اور یوم عرفہ کے ناموں کی۔

آٹھویں وجہ: " انه تعالى يتعرف فيه الى الحاج بالمغفرة و الرحمة" جب حاجی حضرات اس مقام میں نو ذی الحج کو جمع ہوتے ہیں تو رب تعالیٰ کی طرف سے رحمت و مغفرت کا اعلان ہوتا ہے تو حاجی حضرات اس دن اس جگہ میں رب تعالیٰ کو اسی کی خصوصی صفات غفور اور رحیم سے پہچانتے ہیں۔

عرفہ بمعنی اعتراف: یوم عرفہ کا نام رکھنے میں دوسرا قول یہ ہے کہ عرفہ اعتراف کے معنی میں استعمال ہے۔

" لان الحاج اذاوقفوافی عرفة اعترفواللحق بالربوبية و الجلال و الصمدية و الاستغناء و لانفسهم بالفقرو الذلة و المسكنة و الحاجة"

اس لئے کہ حاجی حضرات اس مقام میں جب نو ذی الحج کو وقوف کرتے ہیں تو یہ پہچان لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفت ربوبیت (رب ہونے کی صفت) حاصل ہے، اور وہ صاحب جلال ہے، وہ بے نیاز اور مستغنی ہے۔

اور وہ یہ بھی پہچان لیتے ہیں کہ ہم فقیر ہیں۔ ہم مقام ذلت و مسکنت میں ہیں اور ہم محتاج ہیں۔ درحقیقت اپنے آپ کو ذلت و مسکنت کی حالت میں پہچاننا کامل عجز ہے۔

اس میں دوسری وجہ یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔
" ربناظلمنا انفسنا" تو رب تعالیٰ نے یوں فرمایا "الآن عرفتماانفسكما" اب تم نے اپنے نفسوں کی جانب سے بھول اور بے توجہی سے پھسلنے کا اعتراف کرلیا ہے۔

عرفہ بمعنی خوشبو: یوم عرفہ کا نام عرفہ رکھنے میں تیسرا قول یہ ہے۔"انه من العرف وهو الرائحة الطيبة" کہ یہ ماخوذ ہے 'عرف" سے جس کا معنی ہے اچھی خوشبو۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

"یدخلهم الجنة عرفهالهم" ای طیبهالهم.

اللہ تعالیٰ ان کو پاکیزہ اور خوشبو والی جنت میں داخل فرمائے گا۔ ("عرفها" کا یہ ایک معنی ہے)

اور معنی یہ ہے کہ گناہگار لوگ جب مقام عرفات میں رب تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، تو بہ کرتے ہیں اور گناہوں کی نجاست سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں۔ "ویکتسبون به عندالله تعالی رائحة طيبة" وہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھی خوشبو حاصل کریں گے۔ یعنی جنت کی پاکیزہ اور اچھی خوشبو حاصل کریں گے۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" خلوف فم الصائم عندالله اطيب من ريح المسک"

روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری سے زیادہ خوشبودار ہے۔

اس کا معنی تو مشہور و معروف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کی بو کستوری کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں روزہ دار کے منہ کی بو کا بدلہ جنت میں کستوری سے زیادہ خوشبو والی ہوا ہے۔

دوسرا نام: نو ذی الحج کا دوسرا نام "یوم ایاس الکفار" کافروں کی ناامیدی کا دن۔

" فامامعنى اياس المشركين فهوانهم ينسوامن قوم محمدعليه الصلوة والسلام ان يرتدواراجعين الى دينهم"

اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار و مشرکین اس دن نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ کی رضاء کے لئے مقام عرفات میں جمع ہونے کو دیکھ کر ناامید ہو جاتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے دین سے پھر کر ہمارے دین کی طرف آنے والے نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ " اليوم يئس الذين كفروامن دينكم"

آج کے دن کفار ناامید ہو گئے تمہارے دین (سے پھر جانے سے)

اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں ایک قول حضرت عمر اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) کا ہے۔

" ان هـذه الآیة نـزلـت عشیة عرفة وکان یوم الجمعة والنبی ﷺ واقف بـعرفة فی موقف ابراهیم علیه السلام وذلک فی حجة الوداع وقداضمحل الکفروهدم بنیان الجاهلیة"

کہ یہ آیۃ کریمہ جمعہ کونو ذی الحج کی پچھلی پہر کے وقت نازل ہوئی جبکہ نبی کریم ﷺ مقام عرفات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے موقف (ٹھہرنے کی جگہ) میں وقوف فرمار ہے تھے۔ یہ حجۃ الوداع تھا۔ تحقیق کفر پر لرزہ طاری ہوگیا۔ جاہلیت کی بنیادیں منہدم ہوگئیں۔

" فقال علیه الصلوة والسلام لویعلم الناس مالهم فی هذه الآیة لقرت اعینهم"

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں اگرلوگوں کومعلوم ہوجائے کہ ان کے لئے اس آیۃ کریمہ میں کیا (رب تعالیٰ کافضل وکرم مذکور) ہےتو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں۔

" فـقـال الیهـودی لـعـمـرلـوان هـذه الآیة نزلت علینالاتخذناذلک الیوم عیدافقال عمر امانحن فجعلناه عیدین کان یوم عرفة ویوم الجمعة"

چونکہ اسی آیۃ کریمہ میں" الیـوم اکـمـلـت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی " کےالفاظ مبارکہ بھی ہیں۔ان الفاظ مبارکہ کودیکھ کرایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوکہا اگر یہ آیۃ ہم پر نازل ہوتی تو ہم نزول کے دن کوعید کا دن بنالیتے۔تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم نے اس کے نزول کے دن میں دوعیدیں بنائی ہیں کیونکہ وہ نوذی الحج کا دن تھااور جمعہ کا دن تھا، یہ دونوں ہمارے لئے عید کے دن ہیں۔

تیسرانام: ذی الحج کی نوتاریخ کا"یوم اکمال الدین" دین کے مکمل کرنے کا دن۔

چوتھانام: ذی الحج کی نوتاریخ کا"یوم اتمام النعمة" نعمت کے مکمل کرنے کا دن۔

پانچواں نام: ذی الحج کی نوتاریخ کا"یوم الرضوان" اللہ تعالیٰ کی رضاء کا دن۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس دن آیۃ کریمہ "الیـوم یـئس الذین کفروا" مکمل نازل ہوئی۔اس سے یہ واضح ہوا کہ اس دن دین کے احکام مکمل کردیئے گئے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد کسی شرعی حکم کونافذ نہیں فرمایا۔ لہٰذا یہ دین کو مکمل کرنے کا دن ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے عظیم نعمت دین ہے۔

" لأن بهايستحق الفوز بالجنة و الخلاص من النار"

اس وجہ سے کہ اس نعمت عظمیٰ پر عمل کر کے ہی انسان جہنم کی آگ سے چھٹکارا حاصل کرسکتا ہے اور جنت کے مستحق ہونے کی کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

اس عظیم نعمت کا ذکر وضوء کے فرائض بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا۔ "وليتم نعمته عليكم لعلكم تشكرون" تا کہ وہ اپنی نعمت کو مکمل کرے کہ تم شکر گذار بن سکو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب حضرت یوسف علیہ السلام کی بشارت دینے والا شخص آیا تو آپ نے اس سے سوال کیا "على اىّ دين تركت يوسف" تم جب وہاں سے چلے تھے تو یوسف کس دین پر قائم تھا؟ اس نے کہا۔ "على دين الاسلام" وہ دین اسلام پر قائم تھے۔ تو آپ نے فرمایا۔ "الآن تمت النعمة" اب نعمت مکمل حاصل ہوگئی۔

اس بحث سے واضح ہوگیا کہ دین پر قائم رہنے کی توفیق حاصل ہو تو نعمتِ عظمی حاصل ہوتی ہے۔

اس دن کو "يوم الرضوان" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر راضی ہوتا ہے جو دین اسلام کے مطابق عمل کریں اور اپنی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق گذاریں۔

اللہ تعالیٰ نے نو ذی الحج کو اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا جس میں "اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي" کے الفاظ مبارکہ بھی ہیں تو یہ تینوں نام پتہ چل گئے کہ اس دن دین کو مکمل فرمایا۔ اور اپنی عظیم نعمت یعنی تکمیل دین سے تکمیل نعمت فرمائی اور دین اسلام پر چلنے والوں کے لئے اپنی رضاء کا ذکر فرمایا، اور "ورضوان من الله اكبر" (اللہ کی رضاء بڑی چیز ہے) سے سمجھ آیا کہ جب دین اسلام پر عمل کرنے سے اللہ کی رضاء حاصل ہوتی ہے۔ اور اللہ کی رضاء عظیم چیز ہے تو واضح ہوا کہ دین اسلام پر عمل کرنا ہی نعمت عظمیٰ ہے۔

فائدہ: بعض حضرات نے کہا یہ دن "يوم صلة الواصلين" اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا دن ہے۔

یہ نام "اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي" (آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت کو مکمل فرمایا) سے سمجھ آیا۔

اور یہ دن ''یوم قطیعة القاطعین'' رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے انقطاع کرنے والوں سے بیزاری کا دن ہے۔

یہ نام اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ''ان اللہ بریء من المشرکین و رسوله'' (بیشک اللہ اور اس کا رسول بیزار ہیں مشرکوں سے) سے سمجھ آیا۔

مقام افسوس ہے کہ بعض حاجی حضرات حج کرنے کے باوجود کفار اور یہود و نصاریٰ سے روابط قائم رکھتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں، اپنے اپنے اسلامی ممالک کو ان کے اشاروں سے تباہ و برباد کرتے ہیں۔

اور یہ دن ''یوم اقالة عثر النادمین و قبول توبة التائبین'' (ندامت والوں کی لغزش کے ختم ہونے اور توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے کا دن ہے)۔

یہ نام ''ربنا ظلمنا الخ'' سے سمجھ آیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس دعاء سے (اور نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے)

''تاب برحمته علی آدم فکذلک یتوب علی اولاده''

...... آدم علیہ السلام کی طرف نظر رحمت سے رجوع فرمایا تو اسی طرح یہ دعاء کرنے سے ان کی اولاد کی اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں سے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔ ''وھو الذی یقبل التوبة عن عباده'' وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

اور یہ دن ''یوم وفد الوافدین'' رب کے حضور حاضر ہونے والوں کا دن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''واذن فی الناس بالحج'' اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔

اور حدیث پاک میں ہے۔ ''الحاج وفد اللہ'' حاجی اللہ کا وفد ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے والے ہیں۔

''والحاج زوار اللہ'' اور حاجی اللہ کی زیارت کرنے والے ہیں۔

''وحق علی المزور الکریم ان یکرم زائره''

جب کریم شخص کی زیارت کی جائے تو وہ اپنے زیارت کرنے والے کی عزت کرتا ہے اس پر اپنا کرم کرتا ہے۔

پانچ اورنام: نوذی الحج کے پانچ اورنام بھی ہیں، لیکن ان میں اور بھی اقوال ہیں کہ نو ذی الحج کے بغیر بھی ان کے مطالب ہیں۔

وہ یہ ہیں۔"یوم الحج الاکبر۔ الشفع۔ الوتر۔ الشاھد۔ المشھود"

مزدلفہ کی وجہ تسمیہ:

مزدلفہ کومزدلفہ کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کی چند وجوہ ہیں۔

﴿۱﴾ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ "ازدلاف" کا معنی ہے "قریب ہونا" لوگ چونکہ عرفات سے لوٹ کر مزدلفہ میں جب آتے ہیں تو منی کے قریب ہو جاتے ہیں، اس لئے اس مقام کا نام مزدلفہ رکھ لیا گیا۔

﴿۲﴾ دوسری وجہ یہ کہ ازدلاف کا معنی ہے اجتماع۔ لوگ چونکہ اس جگہ پر جمع ہوتے ہیں تو اجتماع کی وجہ سے اس جگہ کا نام مزدلفہ رکھ لیا گیا۔

﴿۳﴾ " انهم یزدلفون الی اللہ تعالٰی ای یتقربون بالوقوف"

تیسری وجہ یہ ہے کہ لوگ اس مقام میں آکر دعا کرتے ہیں اور تسبیح وتہلیل کی وجہ سے اللہ تعالٰی کا تقرب حاصل کرتے ہیں، تو بوجہ معنیٔ قربت کے نام مزدلفہ رکھا گیا۔

﴿۴﴾ اور اس میں چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس مقام میں مغرب اور عشاء کی نماز کو جمع کیا جاتا ہے تو اس طرح دو نمازوں کے اجتماع کی وجہ سے اس کا نام مزدلفہ رکھ لیا گیا۔

﴿۵﴾ "وقیل ان آدم علیه السلام اجتمع فیھامع حواء، وازدلف الیھا ای دنا منھا"

اور وجہ یہ ہے کہ جنت سے اترنے کے بعد اس مقام میں حضرت آدم علیہ السلام کا حضرت حواء سے اجتماع ہوا۔ یعنی زوجہ کے قریب ہوئے اور وصل حاصل ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۹)

﴿۱﴾

پھر بات یہ ہے اے قریشیو تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں اور اللہ سے معافی مانگو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿۲﴾

پھر لوٹو (اے قریش) جہاں سے لوٹتے ہیں لوگ، اور مغفرت طلب کرو اللہ سے، بیشک اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

راقم کی تسکین الجنان سے ایک ورق دیکھئے۔

"ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ"

پھر طواف کے لئے پھرو جہاں سے سب لوگ پھریں۔ (محمود الحسن صاحب)

پھر طواف کو چلو جہاں سے سب لوگ چلیں۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

پھر بات یہ ہے کہ اے قریشیو تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ (مولانا احمد رضا خان بریلوی)

زمانہ جاہلیت میں قریش کا دستور تھا کہ حج میں یہ عام لوگوں کے ساتھ مقام عرفات پر کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ تکبر کی وجہ سے یہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔

رب قدوس نے ان کو اس طریقہ سے روکا کہ تم بھی لوگوں کے ساتھ ہی ٹھہرو اور وہاں سے ہی لوٹو جہاں سے اور لوگ لوٹتے ہیں۔ تم مزدلفہ سے ہی پلٹ کر نہ آجاؤ۔

یہ مفہوم اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ کے ترجمہ سے بہت واضح ہے جبکہ دوسرے تراجم میں اس طرح نہیں۔ کیونکہ دوسرے تراجم سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ یہ حکم قریش کو ہے یا اور لوگوں کو۔

جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو۔

" (ثم افیضوا) یاقریش (من حیث افاض الناس) ای من عرفة بان تقفوا بهاای بعرفة معهم ای مع سائر الناس و کانوا الایقفون بعرفات و کانوا یقفون بالمزدلفة ترفعا عن الوقوف"

اے قریشیو تم بھی وہیں سے (عرفات) سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ یعنی تم بھی لوگوں کے ساتھ مقام عرفات پر ٹھہرو۔ کیونکہ قریش مقام عرفات پر نہیں ٹھہرتے تھے بلکہ تکبر کے طور پر مقام مزدلفہ سے ہی لوٹ آتے تھے۔

مدارک میں بھی ایسے ہی ہے۔

"هذا امر قریش بالافاضة من عرفات الی جمع و کانوا یقفون بجمع و سائر الناس بعرفات ویقولون نحن قطان(سکان) حرمه فلانخرج منه"

یہ قریش کو حکم ہے کہ تم بھی عرفات سے پلٹ کر مزدلفہ میں آؤ۔ کیونکہ وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور دوسرے لوگ عرفات میں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم چونکہ حرم کے رہنے والے ہیں، لہٰذا حرم سے نہیں نکل سکتے۔ (تسکین الجنان ص ۶۴، ۶۵)

☆ "عن عائشة قالت کان قریش ومن دان دینهایقفون بالمزدلفة و کانوا یسمون الحمس فکان سائر العرب یقفون بعرفة فلماجاء الاسلام امر الله تعالی بنبیه ان یأتی عرفات فیقف بهاثم یفیض منهافلذلک قوله عزوجل ثم افیضوامن حیث افاض الناس"

(بخاری و مسلم، مشکوۃ باب الوقوف بعرفة)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں قریش اور ان کے دین کی تابعداری کرنے والے لوگ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور اپنے آپ کو شجاع کہتے تھے۔ باقی تمام عرب مقام عرفات پر ٹھہرتے تھے۔ جب اسلام آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ مقام عرفات پر آئیں اور وہاں وقوف کریں پھر لوٹیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ثم افیضوامن حیث افاض الناس"

وضاحت حدیث:

"ومن دان دینھم" جن لوگوں نے ان کی تابعداری کی اوران کے دین کواختیار کیا،یعنی قریش اور بنی کنانہ اور بنوخزاعہ اور کچھ قبائل جوقریش کے دین کو پسند کر تے تھے،وہ تمام مزدلفہ میں ٹھہر کر واپس منی میں آ جاتے تھے۔

"وکانوایسمون الحمس" حمس جمع ہے احمس کی،حماسہ کا معنی ہے شجاعت۔وہ اپنے آپ کو بہادر کہتے تھے،وہ اپنی شجاعت و بہادری کی وجہ سے فخر کر تے تھے۔اپنی شان دوسرے لوگوں سے امتیازی سمجھتے تھے۔ اسی لئے جہاں دوسرے لوگ وقوف کر تے تھے یہ وہاں نہیں جاتے تھے اوران کا دعویٰ یہ تھا۔

"انااھل الحرم المحترم کالحمام فلانخرج منه للوقوف کالعوام"

کہ ہم حرم کے باشندے ہیں اس لئے محترم لوگ ہیں اور جس طرح حرم کے کبوتر حرم میں ہی رہتے ہیں باہر نہیں جاتے ہم بھی حرم سے باہر نکل کر وہاں جاکر (عرفات میں) وقوف نہیں کر سکتے جہاں عوام جاکر وقوف کر تے (ٹھہر تے) ہیں۔

"فکان سائر العرب یقفون بعرفة.علی العادة القدیمة و الطریقةالمستقیمة"

باقی تمام عرب عرفات میں ٹھہر تے تھے کیونکہ پہلا طریقہ اور سیدھا راستہ ہی یہی ہے۔

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے بعد آنے والے تمام انبیاء کرام مقام عرفات پر وقوف کر کے مزدلفہ کی طرف لوٹتے اور مزدلفہ سے منی کی طرف لوٹتے تھے۔پھر جب اسلام آ گیا تو نبی کریم ﷺ کو مقام عرفات پر آنے کا حکم دیا۔کیونکہ وہی طریقہ تمام انبیاء کرام کا تھا،اسے ہی جاری رکھنے کا حکم دیا گیا کہ مقام عرفات پر وقوف کر کے لوٹو۔

باقی لوگ تو پہلے سے ہی مقام عرفات پر آ رہے تھے۔صرف قریش یا ان کے متبعین عرفات پر نہیں آتے تھے، ان کو بھی حکم دے دیا گیا"ثم افیضوا من حیث افاض الناس"پھر(اے قریش)تم لوٹو جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں۔

دینی طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

"ثم" تراخی کے لئے آتا ہے۔ یہاں تراخی کا معنی کیسے پایا گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ "ثم" اس مقام میں اپنے حقیقی معنی پر رکھنا بھی درست ہے، کیونکہ منی سے عرفات تک کافی فاصلہ ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوا کہ تم اے قریش مزدلفہ سے آگے کا فاصلہ بھی طے کرو اور مقام عرفات تک جا کر بُعد مکانی طے کر کے واپس لوٹو۔ (روح المعانی)

"ثم للتفاوت مابین الافاضتین کمافی قولک احسن الی الناس ثم لاتحسن الی غیر کریم"

قریش چونکہ مزدلفہ سے ہی لوٹ آتے تھے ان کا یہ طریقہ دین ابراہیمی کے خلاف تھا، جو نیا طریقہ دین کے خلاف ہو خصوصاً جس سے فرض کی بھی ترک لازم آ رہی ہو وہ بدعۃ ضلالۃ ہے۔

"ولاشک ان الضلالۃ متراخیۃ عن الھدی بحسب الرتبۃ"

اور یہ بات شک سے دور ہے کہ ضلالت رتبہ کے لحاظ پر ہدایت سے متراخی ہے۔

یعنی اس مقام میں "ثم" تراخی رتبی کے لئے ہے، بُعد مکانی کے لئے نہیں۔ (ازبیضاوی وشیخ زادہ)

یوم عرفہ اور وقوف عرفات کی فضیلت:

☆ "عن عائشۃ قالت ان رسول اللہ ﷺ قال مامن یوم اکثرمن ان یعتق اللہ فیہ عبدامن النارمن یوم عرفۃ وانہ لیدنوثم یباھی بھم الملائکۃ فیقول ماارادھؤلاء"

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب وقوف العرفۃ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوم عرفہ سے بڑھ کر اور کوئی دن ایسا نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ زیادہ تعداد میں بندوں کو آگ سے آزاد کرتا ہو۔ بیشک اس دن اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل قریب ہوتے ہیں۔ پھر وہ فرشتوں پر ان کا مرتبہ ظاہر فرماتا ہے۔ پھر کہتا ہے یہ بندے کیا ارادہ رکھتے ہیں (کیا چاہتے ہیں)۔

وضاحت حدیث:

''مباهاة'' کا معنی ہے ''فخر کرنا''۔

''ثم یباهی بهم الملائکة،قال بعضهم ای یظهر علی الملائکة فضل الحجاج وشرفهم''

ایک معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں پر مقام عرفات میں کھڑے ہونے والے حاجیوں کا مرتبہ اوران کی شرافت کوفرشتوں پر ظاہر کرتا ہے۔

گویا کہ فرشتوں کو یاددلائی جاتی ہے کہ تم تخلیق آدم پر میرے مشورہ کا جواب یہ دے رہے تھے۔

''اتجعل فیهامن یفسدفیهاویسفک الدماء''

کیاتو بنائے گا اس میں جوفساد پھیلائیں گے اس میں اورخونریزیاں کریں گے۔اور میں نے کہاتھا

''انی اعلم مالاتعلمون'' بیشک میں جانتاہوں جوتم نہیں جانتے۔

آج اولاد آدم کو دیکھو،میرے علم کی جلوہ گری دیکھو،یہ لوگ کس طرح اپنی ہستی کومٹا کر(بال بڑھے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے،صرف دوچادروں میں ملبوس)میری رضا کے لئے مقام عرفات میں جمع ہیں۔

''اویحلهم من قربه و کرامته محل الشیٔ المباهی به''

یااس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یوم عرفہ کومقام عرفات پرٹھہرنے والے حاجیوں کواپنا قرب عطافرماتا ہے۔ اوران کووہ مقام کرامت عطافرماتا ہےجوان کے لئے مقام فخر ہے۔

''فیقول ماارادهؤلاء'' رب تعالیٰ فرماتا ہے یہ کیا چاہتے ہیں؟

یہ جملہ بڑامختصرلیکن عظیم مطالب پرمشتمل ہے۔معنی یہ ہوا۔

''ای شیٔ ارادهؤلاء حیث ترکوااهلهم واوطانهم وصرفواامو الهم واتعبواابدانهم''

کہ یہ لوگ کس چیز کاارادہ رکھتے ہیں،کیسے ہیں یہ لوگ جواپنے اہل وعیال کوچھوڑ کر یہاں جمع ہیں۔اپنے وطنوں کوچھوڑ کر یہاں آئے ہوئے ہیں۔اپنے مال خرچ کر کے یہاں پہنچے ہیں۔اور

اپنے جسموں کو مشقت میں ڈالے ہوئے ہیں۔

"ای ماارادوا الاالمغفرة والرضاوالقرب واللقاء ومن جاء هذاالباب لایخشی الرد"

یعنی انہوں نے یہاں آکر سوائے مغفرت اور رب تعالیٰ کی رضاء اوراس کے قرب اوراس کی ملاقات کے کوئی ارادہ نہیں فرمایا۔ جو شخص اس دروازہ پر آئے اسے یہ ڈر نہیں ہوتا کہ اس کی درخواست کو رد کردیا جائے گا۔

ابھی تک جو بیان کیا ہے وہ استفہام انکاری اور ما نافیہ کے مطابق کلام ہے۔

اور اگر ما موصولہ بنایا جائے تو.....

"اوالتقدیر ماارادهؤلاء فهو حاصل لهم ودرجاتهم علی قدر مراداتهم ونیاتهم"

مطلب یہ ہوگا کہ جو انہوں نے ارادہ کیا ہے وہ انہیں حاصل ہے اوران کے درجات ان کی مراد اور نیت کے مطابق ہوں گے۔

"اوای شئ ارادهؤلاء ای شیأسهلایسیراعندنااذالمغفرة کف من التراب لایتعاظم عندرب الارباب"

یا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کس چیز کا ارادہ کررہے ہیں، وہ چیز عطا کرنا ہمارے لئے آسان ہے۔ رب تعالیٰ کے نزدیک مغفرت فرمانا (یااور بڑی سے بڑی نعمت عطاء کرنااس کی قدرت میں) ایسے ہی ہے جس طرح لوگوں کو مہربانی کرنے والے بڑے لوگوں کے سامنے ایک مٹھی مٹی کی حیثیت ہے۔

(مرقاة، ج۵،ص ۳۲۹، ۳۳۰)

☆ "عن عمروبن شعیب عن ابیه عن جده ان النبی ﷺ قال خیر الدعاء دعاء یوم عرفة و خیرماقلت اناوالنبیون من قبلی لااله الااللّٰہ وحده لاشریک له الملک وله الحمد و هوعلی کل شئ قدیر" (رواه الترمذی،مشکوة باب الوقوف علی العرفة)

عمروبن شعیب اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا بہتر دعاء

عرفہ کے دن کی دعاء ہے اور بہتر ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام نے کہا ہے (وہ یہ ہے) لاالہ الااللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمدوھو علی کل شیٔ قدیر

وضاحت حدیث:

"دعاء یوم عرفة" کی اضافت میں دو احتمال ہیں۔

ایک یہ ہے کہ اضافت بمعنی لام کے ہو۔ اور لام اختصاص کے لئے ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ بہتر دعاء وہ ہے جو عرفہ کے دن کے ساتھ خاص ہے۔ اور وہ بہتر دعاء یہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام نے کی ہے۔ وہ دعاء یہ ہے۔

"لاالہ الااللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمدوھو علی کل شیٔ قدیر"

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اضافت بمعنی "فی" کے ہو کہ یوم عرفہ میں دعاء کرنا بہتر دعاء اس معنی کے لحاظ پر دعاء میں عمومی معنی ہوگا۔ یعنی یوم عرفہ کو ہر قسم کی دعاء کرنا بہتر ہے۔ یہ معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔

اعتراض: "فان قلت ھو ثناء" پہلے احتمال میں جو بیان کیا گیا ہے کہ "لاالہ الااللہ الخ" دعاء ہے حالانکہ یہ ثناء ہے، ثناء کو دعا کیسے کہا گیا ہے۔

جواب: "قلت فی الثناء تعریض بالطلب" اللہ تعالیٰ کی تعریف جب بندہ کرتا ہے تو اشارۃً اس میں طلب خود ہی پائی جاتی ہے۔ گویا یوں کہا جائے "ذکر خدا مستلزم دعا" ہے۔

" لما شارک الذکر الدعاء فی انه جالب للمثوبات ووصلة الی حصول المطلوبات ساغ عده من جملة الدعوات فیکون من قبیل الکنایات التی ھی ابلغ فی قضاء الحاجات فان التلویح اولی من التصریح"

جب ذکر کے ساتھ دعاء کو شریک کیا جائے تو اس میں ہر قسم کا ثواب حاصل ہوگا اور مطلوب چیزوں کے حصول تک پہنچنا ہوتا ہے اس لئے اسے دعا میں شمار کرنا جائز ہے۔ لہٰذا یہ کنایۃً (اشارۃً) دعاء

ہے۔اپنی حاجات کواشارہ سے پیش کرنا زیادہ بہتر ہے بنسبت ظاہر کرنے کے۔یہی مشہور ہے کہ ''تلویح (کنایہ) تصریح سے بہتر ہے''۔

امیہ بن صلت نے ابن جدعان کو کہا۔

أ أذکر حاجتی ام قد کفانی — حیاؤک ان شیمتک الحیاء

اذا اثنی علیک المرء یوما — کفاہ من تعرضہ الثناء

کیامیں اپنی حاجت کوذکرکروں یامجھے کافی ہے۔ تمہاری حیاء بیشک تمہاری عادت ہی حیاء ہے۔

جب تم پرکوئی انسان کسی دن تعریف کرے۔ اس کاتعریف کرنے کے درپے ہوناہی اسے کافی ہے۔

ذکرکودعاء سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ پایا گیا ہے۔

"انہ ینبغی للعبدان یشتغل بذکرالمولی ویعرض عن المطالبۃ فی الدنیاوالاخری اعتمادا علی کرمہ واحسانہ وانعامہ وامتنانہ فقدوردمن شغلہ ذکری عن مسألتی اعطیتہ افضل مااعطی السائلین"

کہ بیشک بندہ جب مولیٰ کے ذکر میں مشغول ہوتو وہ دنیااورآخرت میں اپنے مطالبات پیش نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کے کرم اوراحسان اورانعام اوراس کی مہربانی پراعتماد کرے،اسی لئے گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا گیا ہے۔جومیرے ذکر میں مشغول ہونے کی وجہ سے مجھ سے سوال نہیں کرتا میں اسے سوال کرنے والوں سے زیادہ عطاء کرتا ہوں۔

یعنی اس صورت حال میں انسان اپنے آپ کوکامل طورپراللہ تعالیٰ کے سپرد کردیتا ہے کہ اے مولیٰ میں تیری تقدیر پرراضی ہوں۔کیاخوب کسی نے کہا۔

وکلت الی المحبوب امری کلہ — فان شاء احیانی وان شاء اتلفا

میں نے اپنے تمام معاملات اپنے محبوب کے سپرد کردیئے ہیں۔اگرچاہے تومجھے زندہ رکھے اور اگرچاہے توہلاک کردے۔

یعنی انسان کو اختیار دیا گیا کہ چاہے تو دعاء کر کے رب تعالیٰ کا قرب حاصل کر لے، دعاء کر کے مدارج کی بلندی اور ثواب حاصل کرے، دعاء کر کے گناہوں سے اور عذاب سے نجات حاصل کرے۔ اور چاہے تو رب تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو کر، توکل کر کے اپنے معاملات اس پر چھوڑ دے، ہر راہ خوب سے خوب تر ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ ''عن جابر قال قال رسول اللہ ﷺ اذا کان یوم عرفۃ ان اللہ ینزل الی السماء الدنیا فیباھی بھم الملائکۃ فیقول انظروا الی عبادی اتونی شعثا غبرا ضاجین من کل فج عمیق اشھدکم انی قد غفرت لھم فیقول الملائکۃ یا رب فلان کان یرھق وفلان و فلانۃ قال یقول اللہ عزوجل قد غفرت لھم قال رسول اللہ ﷺ فما من یوم اکثر عتیقا من النار من یوم عرفۃ'' (رواہ فی شرح السنۃ، مشکوۃ باب الوقوف علی العرفۃ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب عرفہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا نزول آسمان دنیا پر فرماتا ہے، اپنے بندوں سے فرشتوں پر فخر کرتا ہے، تو کہتا ہے میرے بندوں کو دیکھو وہ میرے پاس آئے ہوئے ہیں، ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں، غبار آلود ہیں، جو اپنی آواز بلند کر رہے ہیں، وہ بڑے دور دراز سے آئے ہیں، میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی، فرشتے کہتے ہیں اے ہمارے رب فلاں شخص تو بہت بڑے گناہوں کی طرف منسوب ہے، اور فلاں شخص، اور فلاں عورت (اس طرح وہ کئی مردوں اور عورتوں کا ذکر کرتے ہیں) راوی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تحقیق میں نے ان کی مغفرت کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوم عرفہ سے بڑھ کر کوئی اور دن ایسا نہیں جس میں آگ سے زیادہ لوگوں کو آزاد کیا جاتا ہو۔

مشکل الفاظ کے معانی:

''شعثا'' جمع ہے اشعث کی۔ وہ شخص جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں۔

''غبرا'' جمع ہے اغبر کی۔ وہ شخص جس کے اعضاء غبار آلود ہوں۔

"ضــاجيــن" جیم مشدد ہے۔آواز کو بلند کرنے والے یعنی بلند آواز سے تلبیہ پڑھنے والے، اور اس کا معنی گرمی میں وقوف کرنے والے۔

☆ "عـن طـلـحة بن عبيدالله بن كريزان رسول الله ﷺ قـال مـارؤى الشيـطان يو ماهو فيه اصـغـر و لاادحـر و لااحـقـر و لااغيـظ مـنـه في يوم عرفة و ماذاک الالمايرى من تنزل الـرحـمة وتـجـاوز الله عـن الـذنوب العظام الامارؤى يوم بدر فانه قدرأى جبريل يزع الملائكة" (رواه مالک وفي شرح السنة بلفظ المصابيح ،مشكوة باب وقوف العرفة)

طلحہ بن عبید اللہ بن کریز فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوم عرفہ کی بنسبت کسی اور دن میں شیطان کو زیادہ ذلیل ہوتے ہوئے اور زیادہ دور کیے جانے اور زیادہ حقیر ہوتے ہوئے اور زیادہ غصہ میں نہیں دیکھا گیا۔اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا (بندوں پر) نزول دیکھتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کا بڑے بڑے گناہوں کو معاف کرنا دیکھتا ہے (تو غصہ میں جل جاتا ہے) ہاں سوائے بدر کے دن کے (یعنی بدر میں بھی اس کی یہی حالت تھی) کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ جبریل فرشتوں کی صفوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔

یعنی یوم عرفہ کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت نازل فرماتا ہے اور بندوں کے بڑے بڑے گناہ معاف کرتا ہے۔ شیطان اسے دیکھ کر غصہ میں ہوتا ہے۔ یہ اس کے لئے ذلت وحقارت اور دور دھکیلے جانے کی وجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تو کبھی نہیں چاہتا کہ بندوں کی اس طرح مغفرت کر دی جائے۔

جنگ بدر میں بھی شیطان کے ارادوں پر پانی پھر گیا وہ تو چاہتا تھا کہ مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں، لیکن جب اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کی امداد کے لئے تو جبریل فرشتوں کو لے کر آ گئے ہیں اور ان کی صف بندی کر رہے ہیں تو وہ مایوس ہو کر غصہ میں جلنے لگا۔مسلمانوں کو کامیابی سے ہمکنار کر کے شیطان کو ذلیل کر دیا گیا۔

☆ "وعن عباس بن مرداس ان رسول الله ﷺ دعـا لامته عشية عرفة بالمغفرة فأجيبَ انى قـدغـفـرت لهـم ماخلاالمظالم فاني آخذللمظلوم منه قال اى رب ان شئت اعطيت

المظلوم من الجنة وغفرت للظالم فلم یجب عشیة فلما اصبح بالمزدلفة اعادالدعاء فاجیب الی ماسأل قال فضحک رسول اللہ ﷺ او قال تبسم فقال له ابوبکر وعمر بابی انت وامی ان هذه لساعة ماکنت تضحک فیها فما الذی اضحکک اضحک اللہ سنک قال ان عدو اللہ ابلیس لما علم ان اللہ عزوجل قداستجاب دعائی وغفر لامتی اخذالتراب فجعل یحثوه علی رأسه ویدعوبالویل والثبور فاضحکنی مارأیت من جزعه" (رواه ابن ماجه وروی البیهقی فی کتاب البعث والنشورنحوه)

حضرت عباس بن مرداس کہتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے عرفہ کے پچھلے پہر اپنی امت کے لئے مغفرت کی دعاء فرمائی۔ آپ کو جواب دیا گیا کہ بیشک میں نے ان کی مغفرت کردی ہے سوائے مظالم کے۔ کیونکہ میں مظلوم کی وجہ سے ظالم کی گرفت کروں گا۔ نبی کریم ﷺ نے عرض کی۔ اے میرے رب اگر تو چاہے تو مظلوم کو جنت عطاء کردے اور ظالم کی مغفرت فرمادے، عرفہ کی شام کو تو اس دعاء کی قبولیت کا آپ سے کوئی وعدہ نہ کیا گیا۔ مزدلفہ میں جب صبح ہوئی تو آپ نے اپنی دعاء کو لوٹایا۔ آپ نے دعاء میں جو سوال کیا تھا اسے قبول کرلیا گیا۔ راوی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ ہنسے یا مسکرائے (راوی کو شک ہے) حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یارسول اللہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، اس وقت میں آپ کے ہنسنے کی وجہ کیا ہے، کس چیز نے آپ کو ہنسایا، اللہ تعالیٰ آپ کو ہنساتا رہے۔ آپ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کے دشمن ابلیس کو جب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعاء کو قبول فرمالیا اور میری امت کی مغفرت کردی ہے تو وہ مٹی لے کر اپنے سر پر ڈالنے لگا وہ ہلاکت اور بربادی کو پکارنے لگا۔ (میری ہلاکت، میری بربادی، امت مصطفیٰ تو بخشی گئی) اس کی جزع کو دیکھ کر مجھے ہنسی آئی۔

فائدہ: نبی کریم ﷺ نے اکثر اوقات تبسم فرمایا۔ بہت کم شاذ و نادر آپ سے ضحک بھی ثابت ہے۔ اکثر احادیث میں ضحک بمعنی تبسم کے استعمال ہے۔ آپ قہقہہ سے کامل طور پر اجتناب فرماتے تھے۔ تبسم کا معنی مسکراہٹ ہے جس میں

آواز نہیں ہوتی صرف ہونٹ کھلتے ہیں۔ تبسم سے نماز نہیں ٹوٹتی اور وضو بھی نہیں ٹوٹتا۔

ضحک اس ہنسی کو کہتے ہیں جس میں ہلکی آواز ہوتی ہے جو انسان خود ہی سنتا ہے ساتھ والا شخص اس کی ہنسی کی آواز نہیں سنتا۔ ضحک سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، البتہ وضو نہیں ٹوٹتا۔

قہقہہ۔ ٹاہ ٹاہ کر ہنسنے کو کہتے ہیں، یعنی اتنی آواز سے ہنسنا جو آواز قریب والا شخص سن لے۔ اگر کوئی شخص رکوع و سجود والی نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے اور نماز بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ (یہ حکم نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت یا خارجِ نماز کا نہیں)

زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے:

"عن ابی هريرة قال قال رسول اللهﷺ من ياخذعنى هؤلاء الكلمات فيعمل بهن او يعلم من يعمل بهن قلت انايارسول الله فاخذبيدى فعدخمسافقال اتق المحارم تكن اعبدالناس، وارض بماقسم الله لك تكن اغنى الناس، واحسن الى جارك تكن مؤمنا، واحب للناس ماتحب لنفسك تكن مسلما، ولاتكثرالضحك فان كثرة الضحك تميت القلب". (رواه احمدوالترمذى وقال هذاحديث غريب، مشكوة كتاب الرقاق)

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہﷺ نے فرمایا کون ہے جو مجھ سے یہ کلمات حاصل کرے پھر ان کے مطابق عمل کرے، اور سکھائے ان لوگوں کو جو اس کے مطابق عمل کریں۔ میں نے کہا میں یارسول اللہ (آپ سے یہ کلمات سیکھوں گا) آپ نے میرے ہاتھ کو پکڑا تو پانچ چیزوں کو شمار فرمایا۔ آپ نے فرمایا حرام کاموں سے بچ کر رہو، یعنی تمام لوگوں سے زیادہ عبادت گذار بن کر رہو۔ اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہو، یعنی لوگوں سے زیادہ مستغنی ہو کر رہو۔ اپنے پڑوسی سے اچھا سلوک کرو، یعنی کامل مؤمن (امن دینے والا) بن کر رہو۔ اور لوگوں کے لئے وہ چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، یعنی کامل مسلمان بن کر رہو۔ اور زیادہ ہنسو نہیں، بیشک زیادہ ہنسنا دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔

وضاحت: حرام کاموں سے بچ کر رہو، یعنی لوگوں سے زیادہ عبادت گذار بن کر رہو، اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کا اہتمام گناہوں کے اجتناب سے مشروط کیا گیا ہے۔

"یعنی ان العبادة الامتثالیة انمایتم ویکمل بالاجتناب عن المحارم"

یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کر کے عبادت میں مشغول ہونے کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ حرام کاموں سے اجتناب کرے گا۔

"فمن لم یستقص فی الامتثالیات النوافل المندوبات ولکن یتق المحارم ویجتنب عنها ویبالغ فی ذلک فهو اعبدمن الذی یستقصی فی الامتثال ویقصر فی الاجتناب" (لمعات)

جو شخص زیادہ نوافل تو نہیں پڑھتا، لیکن حرام کاموں سے بچتا ہے اور ان سے اجتناب کرتا ہے، اور حرام کاموں سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے، وہ بنسبت اس شخص کے زیادہ عبادت گذار ہوتا ہے جو نوافل تو زیادہ پڑھتا ہے لیکن حرام کاموں سے اجتناب نہیں کرتا۔

مقام افسوس: آجکل سڑک پر چلتے ہوئے نوجوانوں کے بیہودہ قہقہے سن کر، اور بسوں میں سفر کرتے ہوئے اور بس سٹاپ پر کھڑے نوجوانوں کے بیہودہ قہقہے سن کر، اور شادیوں کی محافل میں افیسران کو قہقہے لگاتے دیکھ کر یہی سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی دھجیاں بکھیرنے والے واقعی مردہ دل ہیں۔ بیہودہ قہقہوں سے درسگاہیں بھی خالی نہیں۔ دنیاوی درسگاہ ہو یا دینی ان میں بیہودہ قہقہے لگانا یقیناً بیہودہ طریقہ ہے۔

"وَاسْتَغْفِرُوااللّٰه": اور بخشش طلب کرو اللہ سے۔

"فالمرادمنه الاستغفار باللسان مع التوبة بالقلب"

مراد اس سے یہ ہے کہ زبان سے بھی استغفار کرو اور دل سے بھی توبہ کرو۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت میں جو تقصیر ہوئی ہو اس پر نادم ہو جائے، اور عزم کرے کہ اس کے بعد کوئی کوتاہی نہیں کرے گا، اور غرض اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء ہو اور جلدی حاصل ہونے والے (دنیاوی) منافع مقصود نہ ہوں۔

استغفار کا حکم بھی ایسے ہی ہے جس طرح شہادتین کا حکم ہے، جب تک حضور قلب سے شادتین کا ذکر نہیں کرے گا اس وقت تک حقیقی ایمان حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ منافقین بھی زبان سے شہادتین پڑھتے تھے۔

"واما الاستغفار باللسان من غير حصول التوبة بالقلب فهو الى الضرر اقرب"

صرف زبان سے استغفار کرنا دل سے توبہ نہ کرنا نقصان دہ تو ہو سکتا ہے لیکن نفع مند نہیں۔ نفع مند اسی وقت ہوگا جب حال قال (دلی کیفیت زبان کے) مطابق ہو۔

سوال: یہاں استغفار کا حکم مطلق ہے، یعنی سب لوگوں کو حکم ہے، حالانکہ کئی لوگ گنہگار نہیں ہوتے، ان کو استغفار کا حکم دینے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اگر کوئی شخص گنہگار ہوا تو استغفار کرنا اس پر واجب ہے۔ اگر گنہگار نہ ہوا تو پھر بھی ممکن ہے کہ واجبات کے ادا کرنے میں یا گناہوں سے اجتناب کرنے میں اس سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہو۔

"وجب عليه الاستغفار ايضا تداركا لذلك الخلل المجوز"

تو اسی لئے اس شخص پر بھی استغفار واجب ہوگی تاکہ جن کوتاہیوں کا احتمال پایا گیا ہے ان کا ازالہ ہو سکے۔

اور یہ کہنا کہ کسی شخص سے گناہ صادر ہی نہیں ہوا یقینا (یہ انبیائے کرام کے بغیر عام) بشر کے لئے تو ممکن ہی نہیں۔ کسی ایک عمل کے متعلق بھی یہ کہنا ممکن نہیں، ساری عمر کے اعمال کے لئے کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے ساری عمر میں کوئی غلطی نہیں کی۔

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ کسی نے ساری عمر کوئی گناہ نہیں کیا "فالاستغفار ايضا واجب" استغفار پھر بھی واجب ہے۔

"وذلک لان طاعة المخلوق لاتليق بحضرة الخالق"

اس لئے کہ مخلوق کو یہ طاقت ہی حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق اس کی عبادت کر سکے۔

"ولهذا قالت الملائكة سبحانک ماعبدناک حق عبادتک"

اسی وجہ سے ملائکہ نے کہا اے اللہ تیری ذات پاک ہے ہم نے تیری عبادت نہیں کی جیسا کہ تیری عبادت کرنے کا حق تھا۔

" فکان الاستغفار لازمامن هذہ الجھة"

اس لئے بھی استغفار لازم ہے کہ انسان اگر گنہگار نہ بھی ہو تو اپنی عبادات کو کم سمجھ کر رب تعالیٰ سے استغفار کرتا ہے جو بلندیٔ مراتب کا ذریعہ ہے۔

" ولھذاقال ﷺ انه لیغان قلبی و انی لاستغفر اللّٰہ فی الیوم واللیلة سبعین مرة"

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک میرے دل پر جب پردہ چھا جاتا ہے تو میں دن رات میں ستر مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ تبلیغ دین کے لئے بندوں سے بھی تعلق رکھتے اور دنیاوی مشاغل بھی در پیش آتے ، اس لئے ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ میں آپ کمی سمجھتے ، جسے آپ نے پردہ سے تعبیر فرمایا کہ دنیاوی مشاغل کی وجہ سے جب رب تعالیٰ کی طرف توجہ میں کمی محسوس کرتا ہوں تو استغفار کرتا ہوں۔

"اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ" بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔

غفور اور رحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ یعنی غفور کا معنی بہت زیادہ بخشش کرنے والا۔ اور رحیم کا معنی بہت زیادہ رحم کرنے والا۔

یہ آیۃ دلالت کرتی ہے اس پر کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گنہگاروں کو مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا۔ پھر اپنی شان بیان فرمائی کہ میں بہت زیادہ بخشنے والا اور بہت زیادہ رحم کرنے والا ہوں۔

" فھذایدل قطعاعلی انه تعالی یغفر لذلک المستغفر ویرحم ذلک الذی تمسک بجبل رحمته و کرمه"

اسی سے یقینی طور پر سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ مغفرت طلب کرنے والے کی مغفرت فرماتا ہے اور اس شخص پر رحم فرماتا ہے جو اس کے جبل رحمت اور جبل کرم کا سہارا لیتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

فَاِذَا قَضَیۡتُمۡ مَّنَاسِکَکُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَذِکۡرِکُمۡ اٰبَآءَکُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِکۡرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا وَ مَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ ☆ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ☆ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ نَصِیۡبٌ مِّمَّا کَسَبُوۡا ؕ وَ اللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ☆

(سورۃ البقرۃ آیات ۲۰۰ ۲۰۲)

﴿۱﴾

پھر جب اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو جیسے اپنے دادا کا ذکر کرتے تھے، بلکہ اس سے زیادہ اور کوئی آدمی یوں کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔ اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچا۔ ایسوں کو ان کی کمائی سے بھاگ ہے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

﴿۲﴾

پھر جب ادا کر لو اپنے احکام حج تو ذکر کرو اللہ کا جیسے ذکر کرتے تھے تم اپنے باپ دادا کا بلکہ اس سے زیادہ ذکر کرو۔ تو کوئی آدمی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے عطاء کر ہمیں دنیا میں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔ اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں عطاء کر دنیا میں بھلائی اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے، ان لوگوں کا حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کسب کیا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے حج کے احکام تفصیل سے بیان فرمائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد "فاذاافضتم من عرفات فاذکروا اللہ" فرما کر ذکر کرنے کا حکم دیا، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہی اقتصار کرو، پھر اس کے بعد کیفیت دعا کا ذکر فرمایا۔

کتنی ہی حسین ہے یہ ترتیب:

" فانه لابدمن تقديم العبادة لكسر النفس و ازالة ظلماتها"

عبادت کا سب سے پہلے پایا جانا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے نفس میں عجز پایا جاتا ہے، نفس کا تکبر ٹوٹ جاتا ہے اور اسے گناہوں کی تاریکیوں کا ازالہ پایا جاتا ہے۔

" ثم بعد العبادة لابدمن الاشتغال بذكر الله تعالیٰ لتنوير القلب وتجلي نور جلاله"

پھر عبادت کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونا ضروری ہے تاکہ ذکر سے دل منور ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی نورانی تجلیات کا ظہور ہو۔

" ثم بعدذلك الذكر يشتغل الرجل بالدعاء فان الدعاء انمايكمل اذا كان مسبوقا بالذكر"

پھر ذکر کے بعد انسان دعاء میں مشغول ہو، بیشک دعاء کی تکمیل ہی اس وقت ہوتی ہے جو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر پایا جائے۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا، یعنی کہا۔

" الذی خلقنی فهو يهدين" جس نے مجھے پیدا کیا وہی مجھے ہدایت دینے والا ہے۔ پھر عرض کیا۔

" رب هب لی حكما والحقنی بالصالحين "

اے میرے رب مجھے حکم عطاء فرما اور مجھے اپنے قرب کے لائق لوگوں سے ملا۔ (تفسیر کبیر)

شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک عرب کے لوگ جب حج سے فارغ ہوتے تھے تو ایام تشریق کے بعد منی میں مسجد اور پہاڑ کے درمیان ٹھہر جاتے، پھر ہر ایک اپنے آباء واجداد کی سخاوت اور شجاعت اور صلہ رحمی کا ذکر کرتا، اپنے آباء کی تعریف میں اشعار پڑھتے اور نثر میں تقریریں کرتے، اس طرح وہ اپنی شہرت حاصل کرتے اور اپنے اسلاف کے قصیدے پڑھ کر فخر کرتے۔

" فلماانعم اللہ علیھم بالاسلام امرھم ان یکون ذکرھم لربھم کذکرھم لآبائھم "

جب اللہ تعالیٰ نے ان کو نعمت اسلام عطاء کی تو ان کو حکم فرمایا کہ حج ادا کرنے کے بعد تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جیسا کہ تم اپنے آباء واجداد کا ذکر کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کرو۔

یعنی اب تم اپنے آباء واجداد کے ذکر کو چھوڑ دو صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ ذکر کرو۔

(تفسیر کبیر)

" فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ " جب تم ادا کر لو احکام حج۔

" ای فرغتم من ارکان الحج ومناسکھا وذلک یوم النحر بعد رمی جمرۃ العقبۃ و الذبح والحلق والطواف والسعی"

یعنی جب تم حج کے ارکان اور دوسرے احکام واجبات وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ یعنی جمرات کو کنکریاں مارنے اور ذبح کرنے اور سر منڈانے اور طواف کرنے اور سعی کرنے سے دس ذی الحج کو تم فارغ ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔

(مظہری)

"قضاء" کے مختلف مطالب ہیں۔ اصل میں اس کا معنی "فیصلہ کرنا" ہے، پھر اس کا تعلق یا قول سے ہوتا ہے یا فعل سے، پھر ہر ایک کا تعلق یا اللہ تعالیٰ سے ہوگا یا انسانوں سے۔

اللہ تعالیٰ کے قول سے تعلق ہو، جیسا رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"(وقضی ربک ان لاتعبدو االاایاہ)ای امر بذلک"

اور آپ کے رب نے یہ فیصلہ فرمایا کہ تم اس کے بغیر کسی اور کی عبادت نہ کرو (یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے)۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"(وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب)فھذا قضاء بالاعلام والفصل فی الحکم"

اور ہم نے بنی اسرائیل کی طرف فیصلہ فرمایا کتاب میں (یعنی ان کو بتایا اور حکم دیا)۔

قضاء کا تعلق اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"واللہ یقضی بالحق" اللہ تعالیٰ حق کا فیصلہ فرماتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا فعل حق پر مبنی ہوتا ہے۔

قضاء کا تعلق بندوں کے قول سے ہو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

"قضی الحاکم بکذا" حاکم نے اس طرح فیصلہ کیا ہے۔ یعنی حاکم نے اس طرح کہا ہے۔

قضاء کا تعلق بندوں کے فعل سے ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"فاذا قضیتم مناسککم" جب تم حج کے افعال سے فارغ ہو جاؤ۔

قضاء بمعنی موت اور قتل کے بھی استعمال ہے۔ (مفردات راغب)

ذکر کردہ معنی حدیث پاک سے:

" اخرج ابن ابی حاتم عن عطاء فاذا قضیتم مناسککم قال حجکم" (درمنثور)

حضرت عطاء کہتے ہیں، رب تعالیٰ کے ارشاد "فاذا قضیتم مناسککم" کا مطلب یہ ہے کہ جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ۔

"فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ"

تو ذکر کرو اللہ کا جیسا تم ذکر کرتے تھے اپنے آباء و اجداد کا۔

شانِ نزول سے مطلب واضح ہو چکا ہے، تاہم اس تشبیہ سے کئی وجوہ سمجھ آ رہی ہیں۔

﴿۱﴾ "توفروا علی ذکر اللہ کما کنتم تتوفرون علی ذکر الآباء وابذلوا جھدکم فی الثناء علی اللہ وشرح آلائہ ونعمائہ کما بذلتم جھدکم فی الثناء علی آبائکم"

اللہ تعالیٰ کا ذکر وافر مقدار میں (زیادہ سے زیادہ) کرو، جیسا تم اپنے آباء واجداد کا ذکر وافر مقدار میں کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی نعمتوں کی وضاحت کرنے میں پوری پوری کوشش صرف کرو، جیسا کہ تم اپنے آباء واجداد کی تعریف کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کرتے تھے۔

انسان اگر غور کرے تو انسان کی عقل بھی یہ تسلیم کرے گی کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے میں کمال ہے اور اپنے آباء واجداد کی تعریف کرنے میں نقصان ہے۔ اس لئے کہ اگر اپنے آباء واجداد کی تعریف میں جھوٹ بولتا ہے، مبالغہ کرتا ہے تو دنیا میں لوگوں کے سامنے وہ شخص گھٹیا ہو جاتا ہے اور آخرت میں سزا کا مستحق ہوگا۔ اور اگر اپنے آباء واجداد کی سچی تعریف کرتا ہے تو اس سے انسان کو تکبر وغرور حاصل ہوتا ہے۔

"وکل ذلک من امھات المھلکات"

اپنے آباء واجداد کی جس طرح بھی تعریف کرے وہ نقصان کا سبب ہے اور گویا کہ انسان کو برباد کرنے کی جڑ ہے۔

"فثبت ان اشتغالکم بذکر اللہ اولی من اشتغالکم بمفاخرۃ آباء کم"

تو ثابت ہوا بیشک تمہارا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونا بہتر ہے بنسبت اپنے آباء واجداد کے ذکر کے۔

﴿۲﴾ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں زیادہ طور پر مذکر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں لیکن وہ مؤنث کو بھی شامل ہیں۔ اور کبھی دو متقابل چیزوں میں سے ایک کا ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"سرابیل تقیکم الحر" (اور بنایا تمہارے لئے) لباس جو تمہیں گرمی (اور سردی) سے بچائے۔

یہاں گرمی کا ذکر ہے، سردی کا نہیں اگرچہ مراد گرمی اور سردی دونوں ہی ہیں۔

اس تمہید کے بعد مقصد بیان یہ ہے کہ "کذکرکم آباء کم" سے مراد یہ ہے کہ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) جیسا کہ تم اپنے ماں، باپ کا ذکر کرتے تھے۔ چونکہ بچہ جب سب سے پہلے بولنا شروع کرتا ہے تو ابا، ابا۔ امی، امی کہتا ہے۔ وہ ہر وقت یہ لفظ بولتا رہتا ہے، تو گویا کہ یہ مطلب بھی سمجھ آیا۔

"کونوا مواظبین علی ذکر اللہ کمایکون الصبی فی صغرہ مواظبا علی ذکر ابیہ وامہ"

کہ تم اللہ تعالیٰ کا ذکر ہمیشہ کرو، اللہ اللہ کرتے ہی رہو جیسا کہ تم بچپن میں ابا، ابا۔ امی، امی کرتے رہے۔

﴿۳﴾ تیسری وجہ یہ ہے۔

"ان الرجل کمالاینسی ذکر ابیہ فکذالک یجب ان لایغفل عن ذکر اللہ"

کہ انسان جس طرح اپنے باپ کے ذکر اور اس کی یاد کو نہیں بھولتا اسی طرح اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ رہے۔

﴿۴﴾ چوتھی وجہ یہ ہے۔" عظموا اللہ کتعظیم آباء کم "

کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو، اس کی تعظیم بجالاؤ جس طرح تم اپنے آباء واجداد کی تعظیم کرتے ہو۔

﴿۵﴾ "اذکروا اللہ بالوحدانیۃ کذکرکم آباء کم بالوحدانیۃ"

تم اللہ تعالیٰ کو وحدانیت سے یاد کرو جس طرح تم اپنے والدین کو ایک سمجھتے ہو۔

اگر کوئی شخص کسی کو کہے تمہارے دو باپ ہیں اور تمہاری دو مائیں ہیں تو وہ ماننے کے لئے تیار نہیں بلکہ اسے اس قول سے تکلیف ہوتی ہے اور شرم محسوس ہوتی ہے، تو پھر وہ انسان سمجھ سے کتنا ہی دور ہے جو "کان یثبت لنفسہ آلھۃ" اپنے نفس کے لئے کئی خدا مانتا ہے۔

﴿۶﴾ چھٹی وجہ یہ ہے۔

"ان الطفل کمایرجع الی ابیہ فی طلب جمیع المھمات ویکون ذکرالہ بالتعظیم فکونوا انتم فی ذکر اللہ کذلک"

بچہ جس طرح ہر مشکل میں اپنے آباء کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اپنے والدین کا ذکر تعظیم سے

کرتا ہے تو اسی طرح اسے چاہئے کہ ہر مصیبت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، اور نہایت تعظیم سے اور ادب واحترام سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔

﴿۷﴾ اور ساتویں وجہ اس میں یہ ہے کہ یہ احتمال پایا گیا ہے کہ وہ اپنے آباء واجداد کے اعمال کو دعاء کی قبولیت کا وسیلہ بناتے ہوں۔

"فعرفهم الله تعالى ان آباء هم ليسوا في هذه الدرجة اذافعالهم الحسنة صارت غير معتبرة بسبب شركهم"

تو رب تعالیٰ نے ان کو یہ پہچان کرائی کہ بیشک ان کے آباء واجداد اس درجہ کے نہیں تھے کہ ان کے اچھے اعمال کو تم دعاء کی قبولیت کا وسیلہ بناؤ، کیونکہ وہ تو مشرک تھے، ان کے شرک کی وجہ سے ان کے اچھے اعمال غیر معتبر تھے۔

"وامروا ان يجعلوا بدل ذلك تعديد آلاء الله ونعمائه وتكثير الثناء عليه ليكون ذلك وسيلة الى تواتر النعم فى الزمان المستقبل"

ان کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے آباء واجداد کے اعمال کا وسیلہ پیش کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی نعمتوں اور اس کی ثناء میں کثرت کو پیش کریں جن کے وسیلہ سے زمانہ مستقبل میں تمہیں اور نعمتیں عطاء ہوں۔

زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء واجداد کے ناموں کی قسمیں اٹھائی جاتی تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا، یوں ارشاد فرمایا۔

" من كان حالفا فليحلف بالله او ليصمت"

جو شخص قسم اٹھائے وہ اللہ تعالیٰ (کے نام) کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے۔

فائدہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا کہ ان لوگوں کے آباء واجداد کے اعمال شرک کی وجہ سے غیر معتبر تھے، اسی سے سمجھ آیا کہ اگر ان کے آباء واجداد مشرک نہ ہوتے تو ان کے نیک اعمال کا وسیلہ یقیناً معتبر ہوتا۔ علامہ

رازی کے ان الفاظ کو غور سے پڑھو تو یہ مسئلہ آپ کو سمجھ آ جائے، آپ فرماتے ہیں۔

"اذا کان ماسوی اللہ فانما ھو للہ و باللہ"

جب اللہ تعالیٰ کے ماسواء کا وسیلہ ہو تو وہ اللہ کی رضاء کے لئے ہو کہ یہ شخص اللہ کا نیک بندہ ہے، اس کے نیک اعمال ہیں، وہ وسیلہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کا ہی ہوگا، کیونکہ اس کی نیک مخلوق کا وسیلہ اس کے قرب کا ذریعہ ہے۔

ہاں البتہ تعظیم کامل اور عبادت صرف رب تعالیٰ کی ہے۔

"فالأولی ان تعظیم اللہ تعالی و لا الہ غیرہ"

زیادہ بہتر یہی ہے کہ تعظیم کامل صرف اللہ تعالیٰ کی پائی جائے کیونکہ اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔

﴿۸﴾ آٹھویں وجہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیۃ کریمۃ کی تفسیر میں بیان کی وہ یہ ہے۔

"ھو ان تغضب للہ اذا عصی اشد من غضبک لو الدک اذا ذکر بسوء"

کہ جس طرح تمہارے سامنے تمہارے باپ کی کوئی شخص برائی بیان کرے تو تمہیں اس پر غصہ آتا ہے اس طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے نافرمان پر غصہ آنا چاہئے۔

تنبیہ: یہ وجوہ جو بیان کی گئی ہیں ان میں سے پہلی وجہ تو شان نزول کے لحاظ پر بہت واضح اور متعین ہے، لیکن باقی تمام وجوہ بھی پائی گئی ہیں۔

"انہ یجب علی العبدان یکون دائم الذکر لربہ دائم التعظیم لہ دائم الرجوع الیہ فی طلب مھماتہ دائم الانقطاع عمن سواہ"

کہ بندے کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے، ہمیشہ اس کی تعظیم کرتا رہے، تمام مصائب و آلام میں اور تمام اہم کاموں میں اس کی طرف رجوع کرے، اور اس کے ماسواء اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرائے بلکہ اس کے شرکاء سے انقطاع کرے، البتہ اس کے مقبولوں کی طرف اسی کی رضاء کے لئے رجوع کرے۔

" اللهم اجعلنابهذه الصفة یااکرم الاکرمین"

اے اکرم الاکرمین! ہمیں بھی اس صفت سے نواز۔ (ماخوذ از کبیر)

"اَوْاَشَدَّ ذِكْرًا" معناه بل اشدذکرا۔

اس کا معنی یہ ہے کہ بلکہ اس کا ذکر آباء کے ذکر سے بھی زیادہ کرو۔

یہ بات واضح ہے کہ انسان کے آباء واجداد کے کمالات قلیل (تھوڑے) ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی صفات کمالیہ غیر متناہی (بے حد) ہیں۔

" فیجب ان یکون اشتغالھم بذکر صفات الکمال فی حق اللہ تعالی اشدمن اشتغالھم بذکرمفاخر آبائھم"

اس لئے واجب ہے کہ اللہ کی صفات کاملہ کے ذکر میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہو، بنسبت اپنے اپنے آباء واجداد کے ذکر میں مشغول رہنے سے۔ (ماخوذ از کبیر)

مقام توجہ: اس سے پہلے جن آٹھ وجوہ کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام سے "او اشد ذکرا" کا تعلق ہے۔ یعنی اپنے آباء واجداد کے ذکر سے بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ کرو، اپنے آباء واجداد کی تعظیم سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم زیادہ کرو، اپنے اہم کاموں میں اور مصائب وآلام میں اپنے آباء واجداد کی طرف رجوع کرنے سے زیادہ رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف کرو، تمام وجوہ کو اسی کے مطابق طلبائے کرام خود سمجھنے کی کوشش کریں۔ (راقم)

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ☆ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ☆

تو کوئی آدمی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے عطاء کر ہمیں دنیا میں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔ اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں عطاء کر دنیا میں بھلائی اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے۔

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے دعاء کرنے والوں کے دو گروہوں کا ذکر کیا، ایک گروہ وہ ہے۔

" احدهما ان یکون دعاؤهم مقصورا علی طلب الدنیا" جو صرف دنیا کی طلب کی دعاء کرتا ہے۔

اس کے متعلق فرمایا۔" وماله فی الآخرة من خلاق" اور نہیں ہے اس کا آخرت میں کچھ حصہ۔

پہلا احتمال: اس گروہ سے مراد اگر کفار ہوں جیسا کہ بعض حضرات کا قول ہے تو " وماله فی الآخرة من خلاق" کا مطلب ہوگا۔" لانصیب له فیهامن کرامة ونعیم وثواب"

کہ ان کو آخرت میں کوئی عزت حاصل نہیں ہوگی اور نہ ہی نعمتیں حاصل ہوں گی اور نہ ہی ان کو ثواب حاصل ہوگا۔

کفار صرف دنیا کے حصول کی دعاء کرتے تھے۔

" روی عن ابن عباس ان المشرکین کانویقولون اذاوقفوااللهم ارزقنا ابلا و بقرا و غنما وعبیداواماء (وماکانویطلبون التوبة والمغفرة وذلک لانهم کانوامنکرین للبعث والمعاذ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مشرک لوگ عرفات اور مزدلفہ کے وقوف (ٹھہرنے) میں یہ دعاء کرتے تھے۔اے اللہ! ہمیں اونٹ عطاء فرما اور ہمیں گائے اور بھیڑ، بکریاں اور غلام اور لونڈیاں عطا فرما۔(وہ توبہ نہیں کرتے تھے اور مغفرت طلب نہیں کرتے تھے اس لئے کہ وہ قیامت کے منکر تھے)۔

" وعن انس کانوایقولون اسقناالمطرواعطناعلی عدوناالظفر"

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کفار ومشرکین کہتے تھے ہمیں بارش عطاء کر اور ہمیں دشمن پر کامیابی عطاء فرما۔

تو اس فریق یعنی کفار کی خبر دیتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا۔" وماله فی الآخرة من خلاق" اور نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ۔

دوسرا احتمال: اس فریق سے مراد مؤمنین بھی ہوسکتے ہیں، کیونکہ کئی مومن بھی "یسألون اللہ لدنیاھم لا لأخراھم" اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا کا سوال کرتے تھے آخرت کی طلب نہیں کرتے تھے۔

اس عظیم مقام میں صرف فانی دنیا کے متعلق سوال کرنا اور آخرت کی دائمی نعمتوں سے اعراض کرنا ان کے لئے آخرت کے حصہ سے محرومیت کا سبب ہے۔ اس صورت میں "وماله فی الآخرة من خلاق" کا معنی یہ ہوگا۔

" لاخلاق له فی الآخرة کخلاق من سأل اللہ لآخرته"

کہ اس کو آخرت میں وہ حصہ نہیں حاصل ہوگا جو آخرت کی طلب کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ وہ مومن ہونے کے لحاظ پر آخرت کے حصہ سے محروم تو نہیں ہوگا لیکن اس ثواب میں وہ کمال حاصل نہیں ہوگا جو آخرت کی طلب والے کو حاصل ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے واضح ہو رہا ہے، آپ فرماتے ہیں۔

" ان اللہ یؤید ھذا الدین باقوام لاخلاق لھم "

بیشک اللہ تعالیٰ دین کو ایسی قوموں کے ذریعے تائید دے گا جن کا کوئی حصہ نہیں۔

یعنی ان کا کام خلوص پر مبنی نہیں ہوگا، دین کا کام وہ آخرت کے لئے نہیں کریں گے بلکہ دنیا کے لئے کریں گے، خواہ دنیا کا مال حاصل کرنے کے لئے یا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے، یا ان کا کام ریاء کاری کے لئے ہوگا تو ان کو اگرچہ اس کا ثواب حاصل نہیں ہوگا لیکن دین کو ان سے تائید حاصل ہوگی۔

اسی طرح دنیا کی دعاء کرنے والا جب مسلمان ہو تو وہ اپنی دعاء میں یہ کہہ رہا ہوگا کہ اے اللہ! دنیا عطاء کر اور عمل سے جھوٹی قسمیں اٹھا کر دنیا کا مال جمع کر رہا ہوگا، اسے آخرت میں کوئی حصہ (یعنی اجر و ثواب) حاصل نہیں ہوگا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

" ان الذین یشترون بعھد اللہ و ایمانھم ثمنا قلیلا اولئک لاخلاق لھم فی الآخرة"

بیشک وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور قسموں کے ذریعے تھوڑی قیمت (دنیا کا حقیر مال) حاصل کرتے

ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔"**انہ لاخلاق لہ فی الآخرۃ الاان یتوب**"

بیشک اس فریق کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہاں مگر یہ کہ توبہ کرلے۔

یا مطلب یہ ہوگا۔"**انہ لاخلاق لہ فی الآخرۃ الاان یعفو اللہ عنہ**"

بیشک اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادے۔

یا مطلب یہ ہوگا۔"**انہ لاخلاق لمن اخذ مالا بیمین فاجرۃ کخلاق من تورع ذلک**"
جس شخص نے جھوٹی قسموں کے ذریعے مال حاصل کرلیا اس کا ایسا حصہ نہیں ہوگا جیسا کہ اس سے بچ کر تقوی حاصل کرنے والے کو حصہ حاصل ہوگا۔

مقصد واضح ہوا کہ کافر مکمل طور پر اخروی حصہ سے محروم ہوگا لیکن مومن خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہوا پھر اس نے صرف دنیا کو حاصل کرنے کی تمنا کی ہو تو پھر بھی دولت ایمان کا نفع تو اسے آخرت میں حاصل ہونا ہے۔البتہ خصوصی اجر وثواب سے بغیر توبہ کے یا بغیر اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے کے محرومیت حاصل ہوگی۔ (از کبیر بتصرف)

دنیاوی مشکلات سے بچنے کی بھی دعاء کرتا رہے:

یعنی اپنی دعاء کو صرف آخرت کی بھلائی تک محدود نہ کرے بلکہ دنیا کی بھلائی بھی طلب کرے تاکہ وہ دنیاوی مشکلات سے بچ جائے۔

☆ **واخرج ابن ابی شیبۃ واحمد بن حمید والبخاری ومسلم والترمذی وابویعلی وابن حبان وابن ابی حاتم والبیہقی فی الشعب عن انس ان رسول اللہ ﷺ عاد رجلا من المسلمین قد صار مثل الفرخ المنتوف فقال لہ رسول اللہ ﷺ ہل کنت تدعو اللہ بشئ قال نعم کنت اقول اللہم ماکنت معاقبی فی الآخرۃ فعجلہ لہ فی الدنیا فقال رسول اللہ ﷺ سبحان اللہ اذن لاتطیق ذلک ولاتستطیعہ فہلا قلت "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار"** (درمنثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں میں سے ایک شخص کی عیادت کی جو پرندے کے چھوٹے بچے کی طرح ہو چکا تھا (یعنی اس چوزے کی طرح جس کے جسم پر بال نہیں ہوتے) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ سے کوئی دعاء بھی کرتے رہے، تو اس شخص نے عرض کیا ہاں میں یہ عرض کرتا رہا ''اے اللہ! جو تو نے مجھے آخرت میں سزا دینی ہے وہ جلدی دنیا میں ہی دے دے'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''سبحان اللہ'' تمہیں اس کی طاقت حاصل نہیں (کہ دنیا میں سزا کو برداشت کرلو) تم نے یہ دعاء کیوں نہیں کی۔

''ربنااٰتنافی الدنیاحسنة وفی الآخرة حسنة وقناعذاب النار''

اے ہمارے رب عطاء کر ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی دے اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے۔

دنیاوی مراتب: ''واعلم ان مراتب السعادات ثلاث روحانية وبدنية وخارجية

سعادت حاصل کرنے کے مراتب تین ہیں۔ (۱) روحانیہ (۲) بدنیہ (۳) خارجیہ

روحانیہ کی پھر دو قسمیں ہیں، ایک قوت نظریہ کی تکمیل علم سے حاصل کرنا، اور دوسری قسم قوت عملیہ کی تکمیل اچھے اخلاق سے حاصل کرنا۔

سعادت بدنیہ کی دو قسمیں ہیں۔ صحت حاصل ہونا اور جمال حاصل ہونا۔

سعادت خارجیہ کی بھی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک مال کا حاصل ہونا اور دوسری مرتبہ کا حاصل ہونا۔

یہ تمام قسمیں دنیاوی مراتب میں آجاتی ہیں، جب ان میں خلوص اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کی طلب نہ پائی جائے۔

'' فان العلم اذاكان يرادللتزيين به فى الدنياوالترفع به على الاقران كان من الدنيا''

بیشک علم جب اس لئے حاصل کیا جائے کہ یہ میرے لئے دنیا میں زینت کا ذریعہ بنے گا اور مجھے میرے ساتھیوں سے بلند مرتبہ عطاء کردے گا تو یہ علم دنیا سے متعلق ہوگا اگرچہ بظاہر دینی علم ہوگا۔

" والاخلاق الفاضلة اذا کانت ترادللریاسة فی الدنیا وضبط مصالحها کانت من الدنیا"

اچھے اخلاق اس لئے انسان حاصل کرے کہ اس کے ذریعے مجھے دنیا میں ریاست اور برتری حاصل ہوگی، اور اچھے اخلاق کے ذریعے میرے دنیاوی کام اچھی طرح ہو جائیں گے، تو یہ بھی دنیاوی مرتبہ ہی حاصل ہوا۔

" وکل من لایؤمن بالبعث والمعادفانه لایطلب فضیلة لاروحانیة ولاجسمانیة الا لاجل الدنیا"

ہر وہ شخص جس کا قیامت پر ایمان نہیں وہ جسمانی فضیلت حاصل کرے یا روحانی وہ دنیا کے لئے ہی حاصل کر رہا ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

ایسے لوگوں کے متعلق ہی رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"ومالہ فی الآخرة من خلاق" ای لیس له نصیب فی نعیم الآخرة".

کہ اس قسم کے لوگوں کو آخرت کی نعمتوں سے کوئی حصہ حاصل نہیں ہوگا۔

اس کے مطابق رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے۔

" من کان یرید حرث الآخرة نزد له فی حرثه ومن کان یرید حرث الدنیانؤته منها ومالہ فی الآخرة من نصیب" (سورہ شوری آیت، ۲۰)

جو آخرت کی کھیتی چاہے ہم اس کے لئے اس کی کھیتی زیادہ کر دیتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہے ہم اسے اس میں سے کچھ دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

طالب دنیا کی دعاء قبول ہوتی ہے یا نہیں:

جو شخص آخرت کی بھلائی نہ طلب کرے بلکہ صرف دنیا کو طلب کرے اس کی دعاء اس درجہ کی قبول نہیں ہوتی جس کی تعریف کی جائے۔

" لان کون الانسان مجاب الدعوة صفة مدح فلا تثبت الالمن کان ولیاللہ تعالی مستحقا للکرامة"

کیونکہ کسی شخص کا مستجاب الدعوات ہونا کہ اس کی تعریف کی جائے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ولی کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے عزت افزائی کا مستحق ہوتا ہے۔

ہاں البتہ کبھی کبھی ایسے لوگوں کی دعاء کو بھی قبول کرلیا جاتا ہے۔

"لکن تلک الاجابة قدتکون مکرا و استدراجا"

لیکن ان کی دعاء میں قبولیت مکر اور استدراج کے لئے ہوتی ہے۔

کسی غیر مسلم یا آخرت سے دور صرف دنیا کے طالب کو عادت کے خلاف کام کرنے یا اس کی دعاء کو قبولیت عطاء کرنے کو استدراجی قوت کہا جاتا ہے۔

یعنی اس کی دعاء کو کبھی کبھی قبول کر کے اسے آخرت سے اور دور کر دیا جاتا ہے کہ وہ یہ کہتا رہے کہ ہم بھی مسلمان ہیں، ہم بھی دین کو سمجھتے ہیں، ہماری دعاء بھی رب قبول کرتا ہے، صرف صوفی یا مولوی ہی دین کو نہیں سمجھتے۔

دنیا اور آخرت کی بھلائی سے کیا مراد ہے؟

دنیا کی بھلائی صحت، امن، کفایت، نیک اولاد، نیک زوجہ، دشمن پر امداد، رزق میں خوشحالی اور وسعت اور جنگ میں کامیابی، اور جنگ میں شہادت کا حاصل ہونا، اور آخرت کی بھلائی یہ ہے کہ ثواب حاصل ہو، جس کی وجہ سے بہت بڑی کامیابی حاصل ہو، اور عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو۔

" وبالجملة فقوله تعالی (ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة) کلمة جامعة لجمیع مطالب الدنیا و الآخرة"

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة" ایسا جامع ارشاد ہے جو دنیا اور آخرت کے تمام اچھے مطالب کو شامل ہے۔

☆ روی حمادبن سلمة عن ثابت انهم قالو الانس ادع لنا،فقال "اللهم اتنافی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقناعذاب النار "قالواز دنافاعادها،قالواز دنا،قال ما تریدون؟ قدسألت لکم خیرالدنیاوالآخرة"

حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ کچھ حضرات نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کوکہاتم ہمارے لئے دعاءکرو،تو آپ نے دعاءکی''اے اللہ! عطاءکرہمیں دنیامیں بھلائی اورآخرت میں بھلائی اوربچا ہمیں آگ کے عذاب سے''توانہوں نے کہاکہ کچھ اورزیادہ دعاءکرو،آپ نے پھرپہلے والے کلمات لوٹادیئے،انہوں نے پھرکہا کچھ اورزیادہ دعاءکیجئے،آپ نے فرمایاتم کیاچاہتے ہو،میں نےتمہارے لئے دنیا کی بھلائی اورآخرت کی بھلائی طلب کرلی۔

یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کیاخوب بیان فرمایاکہ بندے کے لئے جب دنیااورآخرت کےمقامات کے بغیرکوئی اورمقام نہیں توجب دنیااورآخرت کی بھلائی طلب کرلی"لم یبق شئ سواہ" تواس کےسوا کچھ باقی نہ رہا۔

"وثانیهماان المرادبالحسنة فی الدنیاالعمل النافع وهوالایمان والطاعة والحسنة فی الآخرة اللذة الدائمة والتعظیم والتنعم بذکرالله وبالانس به وبمحبته وبرؤیته"

اوراحتمال یہ ہے کہ دنیامیں بھلائی سے مرادنفع دینے والاعمل ہو،وہ ایمان اورطاعت ہے،اور آخرت کی بھلائی سے مراددائمی لذت اورتعظیم اوراللہ تعالیٰ کے ذکرکی نعمت کاحصول اوراس سے اُنس حاصل کرنااوراس سے محبت کرنااوراس کے دیدار سےمشرف ہونا۔

☆ "روی الضحاک عن ابن عباس ان رجلادعاربه فقال فی دعائه "ربنااتنافی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقناعذاب النار "فقال النبی ﷺ ماعلم ان هذاالرجل سأل الله شیأ من امرالدنیا،فقال بعض الصحابة بلی یارسول الله انه قال "ربنااتنافی الدنیا حسنة"فقال رسول اللهﷺ انه یقول "آتنافی الدنیاعملاصالحا"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے رب تعالیٰ سےدعاءکی تواپنی دعاءمیں یہ کہا "ربنااتنافی الدنیاحسنة وفی الآخرة حسنة وقناعذاب النار" تونبی کریمﷺ نے

فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ اس شخص نے دنیا کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا، کسی صحابی نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ، اس نے تو کہا ہے ''اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر'' (تو یہ دنیا کی طلب کی ہی دعاء ہے) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''بیشک وہ کہہ رہا تھا اے ہمارے رب ہمیں عطاء کر دنیا میں نیک عمل۔

سبحان اللہ کیا ہی علم ہے میرے پیارے نبی کریم ﷺ کا کہ وہ شخص زبان سے کہہ رہا ہے ''ربنا آتنافی الدنیا حسنة'' لیکن آپ اس کے دل پر مطلع ہیں، فرمارہے ہیں کہ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ ''ربنا آتنافی الدنیاعملاصالحا'' کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں نیک عمل عطاء فرما۔

اسی سے اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ جب دنیا کی چیز کو دین کے لئے طلب کیا جائے تو وہ دین کا ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے نیک لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ان کی اس دعاء کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

'' والذین یقولون ربناھب لنامن ازواجناوذریاتناقرة اعین واجعلنالِلمتقین اماما''

(سورۃ الفرقان آیت ۷۴)

اور وہ جو عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دے ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

'' وتلک القرة ھی ان یشاھدوا اولادھم وازواجھم مطیعین مؤمنین مواظبین علی العبودیة ''

آنکھوں کی ٹھنڈک کی جس کی وہ دعا کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں وہ بیبیاں عطاء فرما اور وہ اولاد عطاء فرما جو مومن ہوں اور تیری طاعت کرنے والے ہوں اور ہمیشہ عبودیت پر قائم رہیں تا کہ ان کو دیکھ کر ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو۔

'' وثالثھاقال قتادة الحسنة فی الدنیاوفی الآخرة طلب العافیة فی الدارین''

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ دنیا اور آخرت میں بھلائی کی طلب کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دونوں جہانوں میں عافیت عطاء فرما۔

"وعن الحسن الحسنة فی الدنیافهم کتاب اللّٰہتعالی وفی الآخرۃ الجنۃ "

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، دنیا میں بھلائی سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتاب کو سمجھنا ہے اور آخرت میں بھلائی کے حاصل کرنے سے مراد طلب جنت ہے۔ (از کبیر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد:

" قول علی رضی اللہ عنہ الحسنة فی الدنیا المراۃ الصالحۃ وفی لآخرۃالحوراء و عذاب النار امراۃ السوء " (بیضاوی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں دنیا میں بھلائی سے مراد نیک عورت ہے اور آخرت میں بھلائی سے مراد جنتی حور ہے اور آگ کے عذاب سے مراد بری عورت ہے۔

☆ "عن عبداللہ بن عمر بن العاص عن النبی ﷺ قال الدنیا متاع وخیرمتاعھاالمراۃ الصالحۃ وقیل الحنسنة فی الدنیا العلم والعبادۃ وفی الآخرۃ الجنۃ وقیل الحسنة فی الدنیا الرزق الحلال والعمل الصالح وفی الآخرۃ المغفرۃ والثواب وقیل من آتاہ اللہ الاسلام والقرآن واھلا وما لا فقد اوتی الدنیا حسنة وفی الآخرۃ حسنة یعنی فی الدنیا عافیة وفی الآخرۃ عافیة " (خازن)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا دنیا سامان (نفع مند چیز) ہے، دنیا میں سب سے بہتر نفع مند چیز نیک زوجہ ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا دنیا کی بہتر چیز علم اور عبادت ہے۔ اور آخرت کی بہتر چیز جنت ہے اور بعض حضرات نے کہا کہ دنیا کی بہترین چیز رزق حلال اور نیک عمل ہے۔ اور آخرت میں بہتر چیز مغفرت اور ثواب ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلام اور قرآن اور اہل وعیال اور مال عطاء کر دیا، اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی عطاء کر دی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا میں عافیت کا حاصل ہونا دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت میں عافیت حاصل ہونا آخرت کی بھلائی ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

عقل کا تقاضا یہ ہے کہ " الحسنة "معرفہ ذکر ہوتا اور الف لام استغراقی ہوتا تو ہر قسم کی بھلائی کو شامل ہوتا، یعنی یوں کہا جاتا" آتنا الحسنة فی الدنیا و الحسنة فی الآخرة " (ہمیں عطاء کر دنیا میں ہر قسم کی بھلائی اور آخرت میں ہر قسم کی بھلائی دے) لیکن "حسنة" کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے ؟

تو اس کا جواب یہ ہے۔

" لیس الداعی ان یقول اللھم اعطنی کذا و کذا بل یحب ان یقول اللھم ان کان کذا و کذا مصلحة لی و مو افقا لقضائک و قدرک فاعطنی ذلک"

دعا کرنے والے کو چاہئے کہ وہ یہ دعا نہ کرے کہ اے اللہ مجھے یہ چیز عطاء کر اور یہ چیز عطاء کر اور اس طرح عطاء کر۔ بلکہ ضروری ہے کہ یہ کہے، اے اللہ اگر اس کام میں میری مصلحت ہے اور یہ تیری تقدیر کے موافق ہے تو مجھے یہ عطاء کر دے۔

اگر دعاء یہ کرے "اللھم اعطنی الحسنة فی الدنیا و الآخرة" اے اللہ مجھے ہر قسم کی بھلائی دنیا اور آخرت میں عطاء کر۔ تو یہ ادب کے خلاف تھا، کیونکہ انسان معین کر کے چیزیں مانگ رہا ہے۔

لیکن جب" حسنة" نکرہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ تو دنیا اور آخرت میں وہ بھلائی عطاء کر جو تیری تقدیر اور تیری رضاء اور تیرے حکم اور تیری حکمت کے مطابق ہو۔

" فکان ذلک اقرب الی رعایة الادب و المحافظة علی اصول الیقین"

یہ دعاء ادب کے بہت قریب ہے اور اس کی محافظت اور اس کی رعایت کرنا اصول یقین کے موافق ہے۔

"وقنا عذاب النار": اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے۔

عذاب نار سے مراد جہنم کا عذاب ہے۔ یا اس سے مراد بری عورت ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا جا چکا ہے۔

(از مدارک)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وقنا" میں "و" عاطفہ ہے جس کا معنی ہے "اور" اور "ق" امر حاضر کا صیغہ ہے جو "تقی" سے بنا ہے، اور تقی اصل میں "تـو قـی" ہے۔ صرفی قوانین کی طرف خود توجہ فرمائیں۔ "ق" کا معنی ہے "بچا" "نـا" ضمیر ہے منصوب متصل کی جس کا معنی ہے "ہمیں"۔

"عن انس بن مالک قال کان اکثر دعاء النبی ﷺ اللهم آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار "

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات یہ دعاء فرماتے تھے " اللهم آتنا فی الدنیاحسنةوفی الآخرةحسنة وقناعذاب النار "

"عن عبدالله بن السائب قال سمعت رسول الله ﷺ یقول بین الرکنین ربنا آتنا فی الدنیاحسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار" (اخرجہ ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن السائب کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دو رکنوں (حجر اسود اور رکن یمانی) کے درمیان یہ دعاء کرتے ہوئے سنا " ربنا آتنا فی الدنیاحسنة وفی الآخرة حسنة وقناعذاب النار"۔

طلباء کرام خصوصی طور پر یاد رکھیں کہ رکن اسود اور رکن یمانی میں رکن کا معنی کونہ ہے۔ یعنی دیواروں کا وہ کونہ جس میں حجر اسود ہے، اسے رکن اسود کہا جاتا ہے اور اسی دیوار کے جنوبی کونہ کو رکن یمانی کہا جاتا ہے۔ (خازن)

"واخرج ابن ابی شیبة والبیهقی فی الشعب عن ابن عباس ان ملکا موکلا بالرکن الیمانی منذ خلق الله السماوات والارض یقول آمین آمین فقولوا ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار " (درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک فرشتہ کو رکن یمانی پر اس وقت سے مقرر کر دیا گیا ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا ہے، وہ آمین آمین کہتا رہتا ہے، اس

لئے تم رکن یمانی کے پاس یہ دعاء کیا کرو " ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار"

☆ " واخرج احمد والترمذی وحسنه عن انس قال جاء رجل الی رسول الله ﷺ فقال یارسول الله ایّ الدعاء افضل قال تسأل ربک العفو والعافیة فی الدنیا والآخرة ثم اتاه من الغد فقال یا رسول الله ای الدعاء افضل قال تسأل ربک العفو والعافیة فی الدین والدنیا والآخرة ثم اتاه من الغد فقال یارسول الله ای الدعاء افضل قال تسأل ربک العفو والعافیة ثم اتاه من الیوم الرابع فقال یارسول الله ای الدعاء افضل قال تسأل ربک العفو والعافیة فی الدنیا والآخرة فانک اذا اعطیتهما فی الدنیا ثم اعطیتهما فی الآخرة فقد افلحت " (درمنثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو کہا یا رسول اللہ کون سی دعاء افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے رب سے دنیا اور آخرت میں عفو وعافیت کا سوال کرو، وہ شخص دوسرے دن پھر آیا تو اس نے کہا یا رسول اللہ کون سی دعاء افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا تم اپنے رب سے دین دنیا اور آخرت میں عفو اور عافیت طلب کرو، تیسرے دن وہ شخص پھر آیا اس نے کہا یا رسول اللہ کون سی دعاء افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے رب تعالیٰ سے عفو وعافیت طلب کرو، چوتھے دن وہ شخص پھر آیا اس نے کہا یا رسول اللہ کون سی دعاء افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے رب سے دنیا اور آخرت میں عفو وعافیت کا سوال کرو، بیشک جب تمہیں دنیا میں عفو وعافیت عطاء کردی گئیں، پھر تمہیں آخرت میں عفو عافیت عطاء کردی گئی تو تم کامیاب ہو گئے۔

"اولئک لهم نصیب مما کسبوا والله سریع الحساب":

ان لوگوں کا حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کسب کیا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

"اولـــئک" کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا اشارہ دوسرے فریق کی

طرف ہے یعنی ان کی طرف جولوگ دنیا اور آخرت کی بھلائی طلب کرتے ہیں۔ کیونکہ پہلے کا حکم " وما لہ فی الآخرۃ من خلاق " (اور نہیں ہے اس کا آخرت میں کچھ حصہ) میں آچکا ہے۔ اور یہ حکم دوسرے فریق کا ہے کہ "ان لوگوں کا حصہ ہے جوانہوں نے کسب کیا"۔

لیکن دوسرا قول یہ ہے" انہ راجع الی الفریقین "کہ اس کا اشارہ دونوں فریقوں کی طرف ہے۔ یعنی ہر فریق نے جو عمل کیا اور جس عمل کی نیت کی اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

اگر قیامت کا انکار کیا اور کسی قسم کا کفر وشرک کیا" واللہ مجازیہ" تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

اور اگر کوئی عمل صرف دنیا کی غرض سے کیا " اعطی نصیب مثلہ فی الدنیا" تو اسے اس کے عمل کے مطابق دنیا میں ہی بدلہ دے دیا جائے گا۔

اور جس شخص نے دنیا کی بھلائی طلب کی اور آخرت کی بھلائی بھی طلب کی، اسے اس کے مطابق ثواب عطاء کیا جائے گا، تو اس تفصیل کے بعد واضح ہو گیا کہ دونوں فریقوں کی طرف اشارہ کرنا زیادہ واضح ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"لھم نصیب مما کسبوا" پر بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ نصیب نکرہ ہے اور تنوین حقارت پر دلالت کر رہی ہے، کیونکہ " مما" جو اصل میں " من ما" ہے، اس میں " من" تبعیض کے لئے ہے، اس سے بھی حقارت سمجھ آ رہی ہے۔ اصل کے مطابق معنی یہ ہوگا "انہوں نے جو کسب کیا اس میں سے کچھ کا انہیں کچھ حصہ دیا جائے گا" حالانکہ اللہ تعالیٰ نیکیوں کی جزاء میں کوئی کمی نہیں فرمائے گا، بلکہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا زائد سے لیکر سات سو گناہ زائد، بلکہ اس سے بھی زائد عطاء فرمائے گا۔ تو " من" تبعیضیہ بنانا کیسے درست ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ " من" ابتداء غایت کے لئے ہے، تبعیضیہ نہیں۔ اب معنی یہ ہوگا "انہوں نے جو کسب کیا اس کا ان کے لئے حصہ ہے"۔

یعنی ہر کسب کا ان کو بدلہ دیا جائے گا، ایسا نہیں ہوگا کہ کسی کسب کا بدلہ دیا جائے اور کسی کا بدلہ نہ دیا جائے، جب کسب صرف دنیا کے لئے ہوا تو اس کا بدلہ بھی عمل کے مطابق ہوگا، اب " نصیب" میں تنوین تقلیل یا تحقیر کے لئے بنانا صحیح ہوگا۔

اور جب ان کا کسب دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی حاصل کرنے کے لئے ہوگا، تو ان کو جزاء بھی اس کے مطابق دی جائے گی، اب " نصیب" میں تنوین تعظیم اور تکثیر کے لئے ہوگی، یعنی ان کے کسب کا بہت زیادہ اور عظیم مرتبہ والا حصہ دیا جائے گا۔ (از کبیر بزیادة)

کسب کیا ہے؟

"ماینالہ المرء بعملہ" انسان اپنے عمل سے جو حاصل کرے اسے " کسب " کہا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس سے نفع حاصل ہو، یا اس سے ضرر (نقصان دہ، باعث تکلیف) کو دور کیا جائے۔

اور اگر عمل ایسا ہو جو باعثِ ضرر ہو، اسے کسب نہیں کہا جاتا، بلکہ اکتساب کہہ لیا جاتا ہے۔ البتہ یہ خیال کیا جائے کہ کسب کبھی اکتساب کے معنی میں اور اکتساب کبھی کسب کے معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

سوال: "هل تدل هذه الآية على ان الجزاء على العمل"

کیا یہ آیت کریمہ اس پر دلالت کرتی کہ بندہ کو اپنے عمل کی جزاء دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے؟

جواب: "نعم ولكن بحسب الوعد لا بحسب الاستحقاق الذاتي"

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بندہ اپنے عمل کی جزاء کا ضروری طور پر مستحق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ جزاء عطاء کرے لیکن یہ وجوب رب تعالیٰ نے وعدہ فرما کر اپنے کرم کے ذریعے اپنے ذمہ لے لیا ہے، ورنہ اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ اور بندہ بھی ذاتی طور پر اپنے عمل کی جزاء کا مستحق نہیں، کیونکہ اسے تو پہلے ہی اتنے انعام عطاء کر دیئے گئے ہیں کہ وہ ان کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ اور استحقاق کا دعوی کرے، البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور وعدہ سے بندہ کو اس کے اعمال کی جزاء کا مستحق ٹھہرادیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

''واللہ سریع الحساب'': اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

'' سریع '' ماخوذ ہے '' سرع یسرع سرعا سرعة'' سے، جس کا معنی ہے جلدی کرنا۔

'' حساب '' مصدر ہے، جس طرح محاسبۃ مصدر ہے، اس کا لغوی معنی ہے ''شمار کرنا'' چونکہ حساب کرنے یعنی کسی چیز کو شمار کرنے میں کمی و بیشی نہیں کی جاتی، بلکہ اس میں وہ علم حاصل ہوتا ہے جو کافی ہوتا ہے، اس لئے ''حسبک کذا'' کفاک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ چیز اس طرح تمہیں کافی ہے۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

''حسب یحسب حسابا محاسبة'' (حساب کرنا، شمار کرنا) اس صورت میں ماضی اور مضارع دونوں ہی مکسور العین استعمال ہوتے ہیں۔

اور ''حسب یحسب حسبانا'' (گمان کرنا) اس صورت میں ماضی مکسور العین ہوگی اور مضارع مفتوح العین''

حساب لینے کا کیا مطلب:

اس میں اگرچہ چند اقوال ہیں، لیکن وہ تمام ہی مجموعی طور پر معتبر ہیں۔

﴿۱﴾ اس میں ایک قول یہ ہے۔ '' **انه تعالٰی یعلمهم ما لهم و علیهم**'' کہ بیشک اللہ تعالٰی بندوں کو ان کے ثواب یا عذاب کا علم عطاء کردے گا۔ یعنی اللہ تعالٰی ان کے دلوں میں ان کے اعمال کی مقدار اور تعداد اور کیفیات کا علم پیدا کردے گا، جس کی وجہ سے انہیں اپنے اعمال کے ثواب و عذاب کی مقدار کا پتہ چل جائے گا۔

''**عن ابن عباس انه قال انی لاحساب علی الخلق بل یقفون بین یدی الله ویعطون کتبهم بایما نهم فیها سیأتهم فیقال لهم هذه سیأ تکم قدتجاوزت عنها ثم یعطون حسنا تهم ویقال هذه حسنا تکم قدضعفتها لکم**''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک مخلوق پر حساب کا یہ مطلب ہے کہ ان کو اللہ کے

حضور کھڑا کیا جائے گا، مومنین کو نامہء اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا، جس میں ان کے گناہ بھی درج ہوں گے، ان کو رب تعالیٰ بتائے گا یہ تمہارے گناہ تھے جن کو میں نے معاف کر دیا ہے، پھر ان کی نیکیوں کو سامنے لایا جائے گا اور ان کو بتایا جائے گا کہ تمہاری نیکیاں تو یہی تھی البتہ میں نے اپنے فضل و کرم سے ان کو کئی گناہ زیادہ کر دیا، جس کی وجہ سے تمہیں جنت میں اعلیٰ مقام دیا جا رہا ہے۔

﴿۲﴾ دوسرا قول یہ ہے کہ حساب کا مطلب ہے جزاء دینا۔ اصل میں حساب سبب ہے لینے اور دینے کا، سبب کا اطلاق مسبب پر جائز ہے۔ "فحسن اطلاق لفظ الحساب عن المجازاۃ" اس لئے ذکر حساب کا اور مراد جزاء لینا مستحسن ہے۔

﴿۳﴾ تیسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ان کے اعمال کے احوال اور ان اعمال کے مطابق ثواب و عذاب کی کیفیت کے متعلق کلام فرمائے گا " ان کلامہٗ لیس بحرف و لا صوت " البتہ رب تعالیٰ کے کلام کی کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اس کے کلام میں حروف اور آواز نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ مکلف کے کانوں میں سماعت پیدا کر دے گا، جس کی وجہ سے وہ کلام قدیم کو سن لے گا، جیسا کہ انسان کی آنکھ میں قوت بصارت پیدا کر دے گا، جس کی وجہ سے ذاتِ قدیم کو دیکھ سکے گا۔

البتہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں آواز ہوگی، البتہ اس کی کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ وہ آواز مکلّف سن لے گا، اسی کلام کے ذریعے اس کے اعمال کے ثواب و عذاب کو بیان کر دیا جائے گا۔ یہی بندوں کا عذاب ہوگا، غور کرنے سے خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تینوں صورتیں حاصل ہوتی ہیں۔

جلدی حساب لینے کا کیا مطلب ہے؟

اس میں بھی چند وجوہ ہیں، جو تمام ہی معتبر ہیں۔

﴿۱﴾ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مکلف کے دل میں اس کے اعمال کی مقدار اور اس کے ثواب اور

عذاب کی مقدار پیدا فرمادے گا۔ یا ہر مکلّف کو اس کے ثواب کے حق تک پہنچا دے گا۔ یا ہر مکلف کے کانوں میں قوت سماعت پیدا کردے گا، جس کی وجہ سے وہ کلام قدیم کو سن لے گا، یا ہر مکلف کے کانوں میں ایک آواز پیدا کردے گا، جو اس کے ثواب وعذاب کی مقدار پر دلالت کرے گی۔ ان تمام وجوہ کی دارومدار ایک ہی چیز پر ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز کو پیدا کرے گا، یہی اس کا حساب ہوگا، اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام ممکنات سے متعلق ہوگی۔ اس کی تخلیق کسی مادہ یا مدت یا آلہ کی محتاج نہیں۔

" و لا یشغله شان عن شان" اسے کوئی حال دوسرے حال سے پھیر نہیں سکتا۔

" لا جرم کان قادرا علی ان یخلق جمیع الخلق فی اقل من لمحة البصر ، وھذا کلام ظاھر "

یقیناً اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو آنکھ جھپکنے سے بھی کم وقت میں پیدا کرنے پر قادر ہے۔ جلدی حساب لینے کا یہ مطلب بہت واضح ہے۔

" ولذلک وردفی الخبر ان اللہ تعالیٰ یحاسب الخلق فی قدر حلب ناقة"

اسی وجہ سے حدیث شریف میں مذکور ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب اونٹنی کا دودھ دوہنے کی مقدار میں لے لے گا۔

یعنی بہت قلیل مدت میں تمام مخلوق کے دلوں میں ان کے اعمال کے ثواب وعذاب کی مقدار وکیفیت کو پیدا کردے گا، قلیل مدت بھی صرف لوگوں کو سمجھانے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی، ورنہ وہاں تو" کن فیکون" کی بات ہے۔

﴿۲﴾ " وثانیھاان معنی کو نه تعالیٰ "سریع الحساب" انه سریع القبول لدعاء عباده والاجابة لھم"

دوسری وجہ جلدی حساب لینے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعاء کو جلدی قبول فرماتا ہے۔ ایک وقت میں کتنے سوال کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہر ایک مختلف چیز طلب کرنے والا ہوتا ہے، جن کا تعلق امور دنیا سے بھی ہے اور امور آخرت سے بھی، ہر ایک کو اس کا مطلوب عطاء کرتا ہے اور اس پر کوئی چیز مشتبہ

نہیں ہوتی، اگر دنیا والوں سے اتنے لوگ اتنی چیزوں کا سوال کرتے تو ان کو لمبا حساب کرنا پڑتا، بلکہ حساب سے عاجز آجاتے، لیکن اللہ تعالیٰ کسی فکر اور کسی چیز کو شمار میں لانے اور حساب رکھنے کا محتاج نہیں۔

﴿۳﴾ " وثا لثها ان محاسبة الله سريعة بمعنى آتية لا محالة"

جلدی حساب لینے کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ کہنا ''اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے'' اس کا مقصد یہ کہ اس نے یقیناً حساب لینا ہے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "ان ما توعدون لصادق وان الدين لواقع" (والداريات، ٥، ٦)

بیشک جس بات کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ ضرور سچ ہے، اور بیشک انصاف ضرور ہونا ہے۔

"كل ماهو آت فكأنه قيل ان الساعة التي فيها الجزاء والحساب قريبة"

یعنی ہر وہ چیز جس نے آنا ہے اس نے آنا ہی ہے، گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ گھڑی جس میں حساب ہونا ہے اور جزاء دی جانی ہے وہ قریب ہے۔

فائدہ: "الحساب" سے یہ بھی سمجھ آیا "الحسب ماعدمن مفاخر المرء ويقال حسبه دينه ويقال ماله" انسان جن چیزوں کی وجہ سے فخر کر سکے، وہ اس کا حسب ہیں، اسی وجہ سے انسان کے دین کو حسب کہا جاتا ہے، اور اسی طرح اس کے مال کو بھی اس کا حسب کہا گیا ہے۔

سمرۃ بن جندب کی روایت میں ہے "الحسب المال والكرم التقوى" (رواه ابن ماجه)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حسب مال ہے اور کرم تقویٰ ہے۔

☆ وقيل لعلى بن ابى طالب رضى الله عنه كيف يحاسب الله العباد في يوم، قال كما يرزقهم في يوم"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب ایک دن میں کیسے لے لے گا؟ آپ نے فرمایا جس طرح تمام مخلوق کو ہر دن رزق عطاء فرماتا ہے۔ (از قرطبی)

تنبیہ: " اولئک لهم نصيب مما كسبوا" سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ صرف اپنے اعمال کا ہی ثواب ملتا ہے اور کسی دوسرے کے عمل کا ثواب نہیں ملتا، یہ سوچ غلط ہے۔

"قال ابن عباس فی قوله تعالٰی "اولئک لھم نصیب مما کسبوا" ھو الرجل یأخذ مالا یحج به عن غیرہ فیکون له ثواب "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں ذکر فرمایا کہ جو شخص کسی سے مال لے کر اس کی جانب سے حج کر لے تو پیسے دینے والے کو حج کرانے والے کو ثواب حاصل ہوتا ہے اور حج بھی اسی کا ہوگا، حج کرنے والے کو مقامات مقدسہ کی زیارت اور نیک اعمال کا ثواب حاصل ہوگا، تاہم اس کا فرض حج ادا نہیں ہوگا۔

بلکہ یہ بھی خیال رہے کہ خود اپنے خرچ پر حج کر کے کسی کو ثواب پہنچایا جا سکتا ہے، جیسا کہ اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

" ان رجلا قال یارسول اللہ مات ابی ولم یحج ، افأحج عنه فقال النبی ﷺ لو کان علی ابیک دین فقضیته اما کان ذلک یجزی ؟ قال نعم،قال فدین اللہ احق ان یقضی، قال فھل لی من اجر؟ فانزل اللہ تعالٰی (اولئک لھم نصیب مما کسبوا) یعنی من حج عن میت کان الا جر بینه وبین المیت "

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے کہا یا رسول اللہ میرے باپ فوت ہو گئے ہیں لیکن وہ حج نہیں کر سکے، کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اگر تمہارے باپ پر قرض ہوتا تو تم ادا کر دیتے تو کیا اس کو کافی ہو جاتا؟ اس شخص نے عرض کیا ہاں (کافی ہو جاتا) یا رسول اللہ۔

آپ نے فرمایا اللہ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔ اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا مجھے بھی اس حج کا اجر حاصل ہوگا؟ تو اس وقت "اولئک لھم نصیب مما کسبوا" الفاظ مبارکہ نازل ہوئے۔ یعنی حج کرنے والے کو بھی اجر حاصل ہوگا اور جس کی جانب سے حج کیا گیا اسے بھی اجر حاصل ہوگا۔ (از قرطبی)

☆☆☆☆☆

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت، ۲۰۳)

﴿۱﴾

اور اللہ کی یاد کرو گنے ہوئے دنوں میں، تو جو جلدی کرے دو دن میں چلا جائے تو اس پر گناہ نہیں، اور جو رہ جائے تو اس پر گناہ نہیں پرہیز گار کے لئے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ تمہیں اس کی طرف اٹھنا ہے۔

﴿۲﴾

اور یاد کرو اللہ کو چند گنتی کے دنوں میں تو جس شخص نے جلدی کر لیا دو دنوں میں تو نہیں گناہ اس پر اور جو دیر کرے تو نہیں ہے گناہ اس پر (یہ اس کے لئے ہے) جس نے تقویٰ اختیار کیا اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو بیشک تم کو اس کی طرف جمع کیا جانا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

حج کے احکام میں سے ابھی تک رمی (کنکریاں مارنے) کا ذکر نہیں کیا تھا، اس آیۃ کریمہ میں اس کا ذکر کیا جا رہا ہے، البتہ رمی کا پہلے نہ ذکر کرنا اس وجہ سے تھا کہ کنکریاں مارنے کا عمل ان کے نزدیک مشہور تھا اور اس میں انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی تھی، لیکن مشعر حرام کے پاس ذکر کرنا یا عرفات پر جانا بعض لوگوں نے چھوڑ دیا تھا اس لئے ان کا ذکر پہلے کر دیا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کنکریاں مارنے کا ذکر پہلے اجمالی طور پر کر دیا گیا، اب تفصیلی طور پر ذکر کیا جا رہا ہے، کیونکہ ہر کنکری کے ساتھ ''اللہ اکبر'' پڑھنا ہے۔ جو اللہ کا ذکر ہے، پہلے اللہ کے ذکر کرنے کا جب حکم دے دیا گیا تو اجمالی طور پر اس میں کنکریاں مارنے کا حکم دے دیا گیا۔ (از کبیر)

مختصر مطلب:

دس ذی الحج کو " یوم النحر " کہا گیا اور گیارہ، بارہ، اور تیرہ، ذی الحج کو " ایام تشریق " کہا گیا ہے۔
اس آیہ کریمہ میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ دس ذی الحج کے بعد ایام تشریق کے دو دنوں میں یعنی گیارہ اور بارہ ذی الحج کو کنکریاں مار کر اور تکبیریں پڑھ کر اگر کوئی شخص لوٹ آئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تیسرے دن یعنی تیرہ ذی الحج کو بھی کنکریاں مار کر لوٹے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اگرچہ گناہ نہ ہونے میں تو دونوں برابر ہیں، لیکن زیادہ ثواب اور تقوی اسے ہی حاصل ہوگا جو تیسرے دن یعنی تیرہ ذی الحج کو بھی کنکریاں مار کر اور تکبیریں پڑھ کر لوٹے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ اللہ سے ڈرو، اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف تمہیں اٹھایا جانا ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی:

مختصر مطلب کو سمجھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ذرا پھر سے دیکھیں۔ مقصد کو سمجھانے کے لئے کیا خوب ترجمہ ہے۔

" فمن تعجل فی یو مین فلا اثم علیه " "تو جلدی کر کے دو دن میں چلا جائے اس پر کچھ گناہ نہیں"

یعنی گیارہ اور بارہ ذی الحج کو کنکریاں مار کر اور تکبیریں پڑھ کر مکہ میں چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

"ومن تا خر فلا اثم علیه " "اور جو رہ جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں"

یعنی جو ایک دن کے لئے مزید منیٰ میں رہ جائے اور تیرھویں تاریخ کو بھی کنکریاں مار کر مکہ میں جائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔

اسی طرح اعلیٰ حضرت نے " واعلموا " کا ترجمہ کیا ہے "اور جان رکھو" یعنی جانتے پہلے بھی ہو لیکن اس علم اور یقین پر قائم رہو۔

اور اعلیٰ حضرت نے " انکم الیه تحشرون " کا ترجمہ کیا ہے "تمہیں اس کی طرف اٹھنا ہے"

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے روح المعانی میں بیان کیا ہے کہ اگر چہ حقیقی اور لغوی معنی " حشــر " کا جمع کرنا ہے۔ لیکن یہاں مجازی معنی حساب اور جزاء کے لیے اٹھایا جانا ہے۔

راقم کا ترجمہ اگر چہ اس کمال اور چاشنی سے خالی ہے جو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں ہے، تاہم طلباء کو لغوی معنی پر مطلع کرنے کے لیے فقط لغوی معنی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

"واذکر واالله فی ایام معدودات": اور یاد کرو اللہ کو چند گنتی کے دنوں میں۔

اس مقام پر " ایام معدودات " کہا گیا، اور سورۃ الحج میں فرمایا۔

" لیشھدوا منافع لھم ویذکروا اسم الله فی ایام معلومات "

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ذی الحج کے پہلے دس دن" ایام معلومات" (چند معلوم دن) ہیں اور " ایام معدودات " سے مراد ایام تشریق (گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحج) ہیں۔

" ایــام مــعـدودات " میں تقریباً اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد ایام تشریق ہی ہیں، کیونکہ یہاں کنکریاں مارنے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر پڑھنے کا ذکر ہے۔

البتہ " ایام معلو مات " میں ایک قول وہی ہے جو ذکر کیا جا چکا ہے، تاہم ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد آٹھ، نو، اور دس ذی الحج (تین دن) ہیں۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آٹھ ذی الحج سے تیرہ ذی الحج تک دن مراد ہیں۔ تاہم راقم کے نزدیک ان میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ ذکر سے مراد اگر تلبیہ ہو اور ذکر کرنے والے سے مراد قران کرنے والا ہو تو وہ اپنے احرام سے لے کر دس ذی الحج تک کنکریاں مارنے تک تلبیہ پڑھے گا۔ اس کے ذکر کے" ایام معلو مات " دس دن یا زیادہ ہوں گے۔

اور اگر تمتع کرنے والا ہے یا حج مفرد کرنے والا تو وہ آٹھ ذی الحج کو احرام باندھے گا اور تلبیہ پڑھے گا، اور دس ذی الحج کو کنکریاں مارنے سے تلبیہ چھوڑ دے گا، اس کے لئے" ایــام معلو مات " تین دن یعنی آٹھ، نو، اور دس ذی الحج ہوئے۔

اور اگر ذکر سے مراد عام ہو یعنی تلبیہ اور تکبیر اور تسبیح وغیرہ سب کو شامل ہو تو احرام سے لے کر آخر ایام تشریق تک وہ اللہ کا ذکر کرے گا، اس طرح دن کچھ زیادہ ہوں گے۔

☆ "واخرج الفریابی وابن ابی الدنیا وابن المنذر عن ابن عمر فی واذکروا اللہ فی ایام معدودات قال ثلاثۃ ایام ایام التشریق وفی لفظ ھی الثلاثۃ الایام بعد یوم النحر" (درمنثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے "واذکروا اللہ فی ایام معدودات" کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ "ایام معدودات" تین دن ہیں، یعنی ایام تشریق، تین دنوں کی وضاحت "بعد یوم النحر" سے بھی کی گئی ہے کہ دس ذی الحج کے بعد تین مراد ہیں۔

☆ "واخرج الطبرانی عن عبداللہ بن الزبیر واذکروا اللہ فی ایام معدودات قال ھن ایام التشریق یذکر اللہ فیھن تسبیح و تھلیل و تکبیر و تحمید" (درمنثور)

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے "واذکروا اللہ فی ایام معدودات" کی وضاحت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "ایام معدودات" سے مراد ایام تشریق ہیں، ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر (کثرت سے) کیا جاتا ہے، یعنی ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھے، اور لا الہ الا اللہ پڑھے اور اللہ اکبر پڑھے اور الحمد للہ پڑھے۔

☆ "واخرج المروزی عن یحیی بن کثیر فی قولہ واذکروا اللہ فی ایام معدودات قال ھو التکبیر فی ایام التشریق دبر الصلوۃ" (درمنثور)

یحیٰ بن کثیر نے "واذکروا اللہ الخ" میں ذکر کیا ہے کہ ذکر سے مراد تکبیر ہے، یعنی ایام تشریق میں نمازوں کے بعد "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کا ورد کرے۔

☆ "واخرج ابن المنذر عن ابن عمر انہ کان یکبر ثلاثا ثلاثا وراء الصلوۃ بمنی لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیٔ قدیر" (درمنثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما منیٰ میں تمام نمازوں کے بعد تین تین مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھتے۔ پھر "لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الملک ولہ الحمد و ھو علی کل شیٔ قدیر"

☆ "اخرج البیھقی فی سننه عن سالم بن عبدالله بن عمر انه رمی الجمرة بسبع حصیات یکبر مع کل حصاة الله اکبر الله اکبر اللھم اجعله حجا مبرورا و ذنبا مغفورا و عملا مشکورا وقال حد ثنی ابی ان النبی ﷺ کا ن کلما رمی بحصاة یقول مثل ما قلت" (درمنثور)

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہم) نے جمرہ کو منی میں سات کنکریاں ماریں، اور ہر کنکری کے ساتھ آپ "الله اکبر، الله اکبر" پڑھ رہے تھے، اس کے بعد یہ دعا کر رہے تھے "اللھم اجعله حجا مبرورا و ذنبا مغفورا و عمله مشکورا" اور آپ نے فرمایا میرے باپ (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) نے مجھے حدیث بیان کی کہ بے شک نبی کریم ﷺ نے کنکریاں پھینکتے ہوئے وہی کچھ کہا جو میں نے کہا۔

"ومن تعجلَ في یو مین فلااثم علیه ومن تا خر فلاا ثم علیه":

تو جو شخص جلدی کر کے دو دن میں چلا جائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔ اور جو رہ جائے تو اس پر گناہ نہیں۔

☆ "واخرج ابن جریر عن علی فی قوله فمن تعجل فی یو مین فلا اثم علیه قال غفر له و من تأ خر فلا اثم علیه قال غفر له"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "فمن تعجل فی یو مین فلااثم علیه" کی تفسیر میں بیان کیا کہ جو شخص دس ذی الحج کے بعد دو دن کنکریاں مار کر جلدی سے مکہ میں چلا جائے اس پر کوئی گناہ نہیں یعنی اس کی رب تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کر دی جاتی ہے۔ اور آپ نے "و من تأخر فلا اثم علیه" کی تفسیر میں بھی یہی بیان کیا جو تیسرے دن بھی کنکریاں مار کر جاتا ہے اس پر کوئی گناہ نہیں کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

☆ "واخرج وکیع والفریابی وابن ابی شیبة وعبدبن حمیدوابن جریروابن المنذروابن ابی حاتم والطبرانی عن ابن مسعودفمن تعجل فی یومین فلااثم علیه قال مغفور له ومن تأخرفلااثم علیه قال مغفور له" (درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے بھی وہی تفسیر بیان کی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی۔

''واخرج البیھقی فی سننه عن ابن عباس فی الآیة قال من تعجل فی یو مین غفر له ومن تأ خر الی ثلا ثه ایام غفر له''

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اسی آیۃ کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ جو شخص جلدی کر کے دو دنوں میں چلا گیا اس کی مغفرت ہوگئی اور جو دیر سے گیا یعنی تین دن مکمل کر کے گیا اس کی مغفرت کر دی گئی۔

''لمن اتقٰی'' : جس نے تقوی اختیار کیا (جو شخص بچا)۔اس میں کئی احتمال ہیں۔

(۱) ''خبر لمحذوف ای ذلک التخییر المذکور''

ان وجوہ میں سے ایک یہ وجہ بھی ہے کہ '' لمن اتقی '' خبر ہے متبداء (ذلک) محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اختیار دیا گیا ہے کہ جو دو دنوں میں کنکریاں مار کر چلا جائے یا تیسرے دن بھی مار کر چلا جائے یہ حکم اس لئے کہ وہ شخص متقی ہے۔یعنی حج کرنے والا تقوی سے کام لیتا ہے۔ (روح المعانی)

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ دو دنوں میں کنکریاں مار کر جانے والا اگر چہ گنہگار نہیں اور مغفور (بخشا ہوا) ہے اور تین دن کنکریاں مار کر جانے والا بھی گنہگار نہیں اور مغفور ہے لیکن تیسرے دن کنکریاں مارنا تقوٰی کا کام ہے۔

'' اوھو مخیر فی التعجیل و التأخر و ان کان التأخر افضل فقد یقع التخییر بین الفاضل والا فضل کما خیر المسا فر بین الصوم و الافطار و ان کان الصوم افضل'' (مدارک)

اگر چہ یعنی جلدی کرنے میں اور تاخیر میں اختیار دیا گیا ہے لیکن تاخیر افضل ہے،یعنی اس مقام میں فاضل اور افضل میں اختیار دیا گیا ہے،جس طرح مسافر کو روزہ رکھنے اور افطار کرنے میں اختیار دیا گیا ہے،اگر چہ روزہ رکھنا اس کے لئے افضل ہے۔

(۳) حج کرنے والا شخص مغفور (بخشا ہوا) ہوگا،لیکن شرط یہ ہے کہ باقی عمر گناہوں سے بچ کر رہے،یعنی جو کام باعث عذاب ہیں ان سے اجتناب کرتا رہے،صرف حج کے اعمال پر ہی بھروسہ نہ کرتا رہے،گویا کہ......

"فبین تعالی ان علیهم مع ذلک ملازمة التقوی و مجانبة الاغترار بالحج السابق"

رب تعالیٰ نے بیان فرمادیا ہے کہ حج کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے متقی بن کر رہیں، صرف اپنے حج پر اپنی مغفرت کی دارو مدار قائم کر کے دھوکے میں نہ رہیں۔

(۴) "ان هذه المغفرة انما تحصل لمن کان متقیا قبل حجه"

اور وجہ اس میں یہ پائی گی ہے کہ مغفرت ان کو حاصل ہوگی جو حج سے پہلے بھی متقی تھے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "انما یتقبل الله من المتقین" بیشک اللہ تعالیٰ متقین سے ہی قبول کرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حج کرنے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتا ہو، گناہوں پر نادم ہوتا ہو۔

"وحقیقته ان المصر علی الذنب لا ینفعه حجه وان کان قد ادی الفرض علی الظاهر"

اس لئے کہ گناہوں پر اصرار کرنے والا حج کرے، حج کرتے ہوئے بھی خیال یہ ہی رہے کہ میرا فلاں کام چھوٹ رہا، کب گھر پہنچوں اور وہ گناہوں والے کام کروں، تو اس صورت میں اس شخص کو حج کامل طور پر نفع نہیں دے گا۔ اگر چہ ظاہری طور پر اس کا فرض ادا ہو گیا۔

(۵) "ان هـذه الـمغفرة انما تحصل لمن کان متقیا عن جمیع المحظورات حال اشتغاله بالحج"

اور وجہ اس میں یہ ہے کہ حج سے مغفرت ان کو حاصل ہوتی ہے جو حج میں تمام ممنوع چیزوں سے اجتناب کرتے رہیں۔

☆ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ پیش فرماتے ہیں۔

"من حج لله ولم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدته امه" (بخاری و مسلم)

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے حج کیا اور عورتوں سے صحبت کی باتیں نہ کیں اور گناہ نہ کئے تو وہ (حج سے) لوٹ کر ایسے آئے گا (گناہوں سے پاک وصاف ہو کر) جیسا کہ وہ آیا جس دن اس کی ماں نے اسے جنا۔

☆ "وعن ابی هریرة مرفوعا" الحج المبرور لیس له جزاءﷺالا الجنة " (بخاری مسلم)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج مبرور کی جزا نہیں ہے سوائے جنت کے۔

☆ "وعن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ الحج والعمرة ینفیان الفقروالذنوب کما ینفی الکیر خبث الحدید" (رواه الشافعی والترمذی وعن عمر و نحو رواه احمد)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج اور عمرہ فقر اور گناہوں کو ایسے مٹاتے ہیں جس طرح آگ کی بھٹی لوہے کے زنگ کو مٹاتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر و مظهری وبغوی)

"واتقوا الله": اور اللہ سے ڈرو۔

تقوی کا جو یہ حکم دیا گیا ہے اس میں تکرار نہیں، کیونکہ یہ امر ہے، اس کا تعلق مستقبل زمانہ سے ہے، اور "لمن اتقی" میں ماضی کا زمانہ ہے۔

"وان التقوی عبارة عن فعل الواجبات وترک المحرمات"

بیشک تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ واجب کام کرنا اور حرام کاموں کو چھوڑنا۔

"واتقوا الله" میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالی سے ہمیشہ ڈرتے رہو یعنی واجبات کو ادا کرتے رہو اور حرام کاموں سے اجتناب کرتے رہو۔

"واعلموا انکم الیه تحشرون": اور جان لو بیشک تمہیں اسی کی طرف جمع کیا جانا ہے۔

تقوی کے حکم کے بعد یہ حکم تاکید کے لئے لایا گیا ہے، اور تقوی پر شدت سے قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہے،

"لان من تصور انه لابد من حشرومحاسبة ومسألة وان بعد الموت لا دارالاالجنة اوالنار صار ذلک من اقوی الدواعی له الی التقوی"

اس لئے کہ جس شخص کو یہ تصور حاصل ہو جائے کہ ہمیں رب کے حضور پیش کیا جانا ہے، ہمارا

حساب ہونا ہے اور ہمارے اعمال کے مطابق ہم سے سوال کیا جانا ہے، اور موت کے بعد جنت یا جہنم کے بغیر اور کوئی مقام نہیں ہوگا تو یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کا زیادہ خوف رکھے گا جس کی وجہ سے اسے تقوی حاصل ہوگا۔ (از کبیر)

حشر کا مطلب یہ ہے کہ ان کو قبروں سے نکال کر ایک میدان میں جمع کر دیا جائے گا، البتہ حشر کی تکمیل حساب وکتاب اور جزاء سے ہوگی۔ یعنی تمہیں رب تعالیٰ کی طرف اٹھایا جائے گا تا کہ وہ تمہارے اعمال کی تمہیں جزاء دے۔

(از کبیر وروح المعانی)

فائدہ: رب تعالیٰ نے فرمایا" واعلموا انکم الیہ تحشرون "اور جان لو بیشک تمہیں اس کی طرف جمع کیا جائے گا۔

" والمراد بقوله(الیه) انه حیث لامالک سواه، ولاملجأ الاایاه ولایستطیع احد دفعاعن نفسه، کما قال تعالیٰ (یوم لاتملک نفس لنفس شیأ والأمر یومئذلله)"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "الیه" سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ کے بغیر اور کوئی مالک نہیں رب تعالیٰ کے بغیر اور کوئی جائے پناہ نہیں اور کوئی شخص اپنے آپ سے عذاب کو مندفع نہیں کر سکے گا۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔"یوم لا تملک نفس لنفس شیأ والأمر یومئذلله"

(الانفطار ۱۹)

جس دن کوئی جان کسی جان کا کچھ اختیار نہ رکھے گی اور سارا حکم اس دن اللہ کا ہے۔ (از کبیر)

احادیث مبارکہ:

اگر چہ طریقہ حج کے آخر میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کی بحث کو ذکر کیا جا چکا ہے، لیکن اس آیۃ کی تفسیر کے آخر میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے چند احادیث درمنثور میں ذکر فرمائی ہیں، جو نبی کریم ﷺ کی زیارت سے متعلق ہیں۔

محبت مصطفیٰ ﷺ کی وجہ سے ہی علامہ سیوطی رحمہ اللہ غیر مقلدین اور ان کے حاشیہ برداروں (چمچوں) کو پسند نہیں آتے۔

پہلی بحث اوراس بحث میں بعض احادیث کے تکرار کو باعث برکت سمجھا جائے، تکرار کو بے فائدہ قرار نہ دیا جائے۔

☆ "اخرج ابن حبان فی الضعفاء وابن عدي فی الکامل والدارقطنی فی العلل عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال من حج ولم یزرنی فقد جفانی" (در منثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تحقیق اس نے مجھ پر جفاء کی۔ (یعنی ظلم کیا)

☆ "واخرج سعید بن منصور وابو یعلی والطبرانی وابن عدی والدار قطنی والبیهقی فی الشعب وابن عساکر عن ابن عمر قال قال رسول ﷺ من حج فزار قبری بعد وفاتی کان کمن زارنی فی حیاتی" (در منثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے حج کیا، پھر میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی، گویا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

یعنی میری طرف سے اس پر نظر رحمت میں کوئی فرق نہیں آئے گا' اگر چہ اسے مقامِ صحابیت حاصل نہیں ہوگا' کیونکہ صحابیت کا تعلق آپ کی ظاہری حیات سے ہے۔

☆ "واخرج الحکیم الترمذی والبزار وابن خزیمة وابن عدی والدار قطنی والبیهقی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ من زار قبری وجبت له شفاعتی" (درمنثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت لازم ہوگئی۔

☆ "واخرج الطبرانی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ من جاء نی زائرالم تنزعه حاجة الازیارتی کان حقا علی ان اکون له شفیعا یوم القیمة" (در منثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص میری زیارت کے لئے آیا' اور وہ اپنے ذاتی کسی کام سے نہیں آیا بلکہ صرف میری زیارت کے لئے آیا تو مجھ پر لازم ہو جاتا

ہے کہ میں قیامت کے دن اس کی (خصوصی) شفاعت کروں۔

☆ "واخرج الطیالسی والبیهقی فی الشعب عن عمر سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من زار قبری کنت له شفیعا او شهیدا ومن مات فی احد الحرمین بعثه الله فی الآمنین یوم القیمة"

(درمنثور)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا' جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میں اس کا شفیع (شفاعت کرنے والا) ہوں گا' اور اس کا گواہ ہوں گا' اور جو شخص حرمین (حرم مکہ اور حرم مدینہ) میں سے کسی ایک حرم میں فوت ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن امن میں رہنے والوں میں اٹھائے گا۔ (یعنی اسے اللہ تعالیٰ کا خاص قرب حاصل ہوگا)

☆ "واخرج البیهقی عن حاطب قال قال رسول اللہ ﷺ من زارنی بعد موتی فکأ نما زارنی فی حیاتی ومن مات باحد الحرمین بعث من الآمنین یوم القیامة" (درمنثور)

حاطب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی گویا کہ اس نے میری حیات میں میری زیارت کی اور جو شخص حرمین میں سے ایک میں فوت ہوگیا اسے قیامت کے دن امن میں رہنے والوں میں اٹھایا جائے گا۔

☆ "واخرج العقیلی فی الضعفاء والبیهقی فی الشعب عن رجل من آل الخطاب عن النبی ﷺ قال من زارنی متعمدا کان فی جواری یوم القیامة ومن سکن المدینة وصبر علی بلا ئها کنت له شهیدا وشفیعا یوم القیامة ومن مات فی احدالحرمین بعثه الله من الآمنین یوم القیامة"

(درمنثور)

آل خطاب میں سے ایک شخص نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے صرف میری زیارت کے ارادہ سے میری زیارت کی وہ قیامت کے دن میرے قریب ہوگا' اور جو شخص مدینہ طیبہ میں رہا اور وہاں کی مصیبتوں کو برداشت کیا تو میں قیامت کے دن اس کا گواہ اور شفیع ہوں گا'

اور جو شخص حرمین میں سے کسی ایک مقام پر فوت ہوا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن امن میں رہنے والے لوگوں میں اٹھائے گا۔

☆ "واخرج ابن ابی الدنیا والبیھقی عن انس بن مالک ان رسول اللہ ﷺ قال من زارنی بالمدینۃ محتسبا کنت لہ شھیدا وشفیعا یوم القیامۃ" (درمنثور)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مدینہ میں میری زیارت کی، صرف نیکی کی غرض سے، قیامت کے دن میں اس کا گواہ اور شفیع ہوں گا۔

☆ "واخرج البیھقی عن ابن عمر انہ کان یاتی القبر فیسلم علی رسول اللہ ﷺ ولا یمس القبر ثم یسلم علی ابی بکر ثم علی عمر" (درمنثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے مزار پر حاضر ہوتے تھے تو قبر کو مس نہیں کرتے تھے پھر ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو سلام پیش کرتے تھے۔

☆ "واخرج البیھقی عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ مامن عبد یسلم علی عند قبری الاوکل اللہ بھا ملکا یبلغنی وکفی امر آخرتہ ودنیاہ وکنت لہ شھیدا وشفیعا یوم القیامۃ" (درمنثور)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں جو میری قبر کے پاس آکر مجھ پر سلام پڑھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے جو میرے پاس وہ سلام پہنچاتا ہے، اس شخص کو دنیا اور آخرت کے معاملات کے لئے کافی ہوتا ہے اور قیامت کے دن میں اس کا شفیع اور گواہ ہوں گا۔

☆ "واخرج البیھقی عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال مامن مسلم یسلم علی الا رداللہ علی روحی حتی ارد علیہ السلام" (درمنثور)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان ایسا نہیں جو

مجھ پر سلام بھیجے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری توجہ اس کی طرف کر دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

☆ "واخرج البیھقی عن محمد بن المنکدر قال رایت جابرا وھو یبکی عند قبر رسول اللہ ﷺ وھو یقول ھنا نسکب العبرات سمعت رسول اللہ ﷺ یقول مابین قبری و منبری روضة من ریاض الجنة" (در منثور)

محمد بن المنکدر فرماتے ہیں میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے مزار کے پاس روتے ہوئے دیکھا اور آپ کہہ رہے تھے کہ ہم یہاں آنسو بہاتے ہیں کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ آپ فرمارہے تھے کہ میری قبر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔

☆ "واخرج ابن ابی الدنیا والبیھقی عن منیب بن عبداللہ بن ابی امامة قال رایت انس بن مالک اتی قبر النبی ﷺ فوقف فرفع یدیه حتی ظننت انه افتتح الصلوة فسلم علی النبی ﷺ ثم انصرف" (در منثور)

منیب بن عبداللہ ابی امامہ فرماتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کی قبر شریف پر آتے ہوئے دیکھا، آپ آئے، وہاں ٹھہرے تو آپ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ آپ نماز شروع فرمارہے ہیں، تو آپ نے نبی کریم ﷺ پر سلام پڑھا، پھر واپس چلے گئے۔

☆☆☆☆☆

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۰۴)

﴿۱﴾

اور بعض آدمی وہ کہ دنیا کی زندگی میں اس کی بات تجھے بھلی لگے اور اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ لائے اور وہ سب سے بڑا جھگڑالو ہے۔

﴿۲﴾

اور لوگوں میں سے کوئی وہ شخص ہے جو تعجب میں ڈالتا ہے آپ کو اپنی بات سے دنیا کی زندگی میں، اور گواہ لاتا ہے اللہ کو اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ بہت زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

" فقد قسم الله الناس على اربعة اقسام الاول من يطلب الدنيا لا غير، ومنهم من يطلب الدنيا والآخرة، ومنهم من يظهر انه من اهل الآخرة مع انه فى الواقع من اهل النار ومنهم من هو مو من ظاهرا وباطنا وذكر هم على هذا الترتيب " (صاوی)

تحقیق اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔

پہلی قسم کے وہ لوگ ہیں جو صرف دنیا کو طلب کرتے ہیں آخرت کی کچھ طلب نہیں کرتے، ان کو آخرت میں کوئی ثواب حاصل نہیں ہوگا ان کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں فرمایا " فمنهم من يقول ربنا آتنا فى الدنيا وماله فى الآخرة من خلاق "

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں بھلائی طلب کرتے ہیں اور آخرت میں بھلائی طلب کرتے ہیں، اور آگ کے عذاب کی پناہ چاہتے ہیں، ان کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا " ومنهم من

یقول ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقناعذاب النار "

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ہم آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں حالانکہ ان کا آخرت پر کوئی ایمان نہیں وہ جہنم میں جائیں گے، ان کا ذکر اس آیت میں کیا " ومن الناس من یعجبک " الخ

اور چوتھی قسم کے وہ لوگ ہیں جو ظاہراً اور باطناً مومن ہیں۔ ان کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے مطابق ہوتا ہے۔ ان کا ذکر آنے والی آیت مبارکہ میں کیا " ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات الله " الخ

شانِ نزول:

اس کے شانِ نزول میں چند وجہ ہیں۔

(۱) ایک وجہ ان میں سے یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی ہے اخنس بن شریق ثقفی کے متعلق۔ جس کا نام ابی بن شریق تھا۔ یہ بنی زہرہ کا حلیف تھا۔ نبی کریم ﷺ کے پاس آکر اسلام کو ظاہر کیا، اور اس پر قسم اٹھا کر کہتا کہ میں مخلص مومن ہوں، نبی کریم ﷺ نے بھی شرعی قانون کا پاس کرتے ہوئے اس کے ظاہر قول کا اعتبار کیا۔

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی " یعجبک قوله فی الحیوة الدنیا ویشهد الله علی ما فی قلبه " کا یہی مطلب ہے۔" غیز انه کا ن منا فقاحسن العلا نیة خبیث الباطن "

لیکن حقیقت میں وہ منافق تھا، ظاہری طور پر بڑے خلوص کا اظہار کرتا تھا لیکن باطنی طور پر نفس میں خباثت رکھتا تھا۔

پھر وہ نبی کریم ﷺ کے دربار سے نکل کر مسلمانوں کی کھیتی سے گذرا تو کھیتی کو آگ لگا دی، اور گدھوں کو مار ڈالا، اس کے اس عمل کا تذکرہ آنے والی آیۃ کریمہ میں آرہا ہے۔

تنبیه : بعض حضرات نے " یعجبک قوله " کی وجہ یہ بیان کی کہ اخنس نے بنی زہرہ کو بدر کے دن پیچھے ہٹ

جانے کا مشورہ دیا اور ان کو یہ کہا۔

"ان محمد ابن اختکم فان یک کاذبا کفا کموہ سائر الناس و ان یک صادقا کنتم اسعد الناس بہ"

کہ بے شک محمد تمہاری بہن کا بیٹا ہے (وہ قبیلہ نبی کریم ﷺ کا ننہال تھا) اگر جھوٹا ہے تو تمہاری جانب سے اور لوگ اسے کافی ہو جائیں گے اور اگر سچا ہے تو تم اس کے نزدیک نیک بخت ہو جاؤ گے۔

سب نے اس کی رائے کو پسند کیا کہ تم ٹھیک کہتے ہو، اس نے اپنے پیروکار تین سو آدمیوں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دے دیا، اسی وجہ سے اسے اخنس کہا گیا ہے۔ کیونکہ "خنس" کا معنی ہے پیچھے ہٹ جانا، اس کی اس بات کو نبی کریم ﷺ نے بہت عجیب سمجھا۔ لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس وجہ کو رد کیا' آپ فرماتے ہیں۔

"وعندی ان ھذا القول ضعیف و ذلک لأنہ بھذا الفعل لا یستوجب الذم"

میرے نزدیک یہ قول ضعیف ہے کیونکہ یہ باعث مذمت نہیں' حالانکہ ان آیات میں اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

(۲) اس آیۃ کریمہ کے شانِ نزول کی اور وجہ یہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ضحاک نے بیان فرمائی ہے کہ کفار قریش نے نبی کریم ﷺ کی طرف پیغام بھیجا کہ بیشک ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے' آپ ہماری راہنمائی کے لئے اپنے اصحاب میں سے کچھ علماء کو بھیجیں، نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف ایک جماعت کو بھیجا، وہ جب بطن رجیع میں پہنچے تو کفار کو خبر ملی، ستر سواروں نے ان کا احاطہ کر لیا اور ان کو شہید کر کے سولی پر چڑھا دیا۔

"ففیھم نزلت ھذہ الآیۃ و لذلک عقبہ من بعد بذکر (من یشری نفسہ ابتغاء مرضاۃ اللہ) منبھا بذلک علی ھؤلاء الشھداء"

ان لوگوں کی مذمت میں اس آیت کریمہ کو نازل کیا اور آنے والی آیۃ کریمہ میں شہید ہونے والوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔ (از کبیر)

بطن رجیع کے مقام میں شہید ہونے والوں میں حضرت عاصم بن ثابت اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہما بھی تھے،

منافقین نے شہید ہونے والے حضرات کے متعلق کہا۔

" ویح ھؤلاء القوم لا ھم قعدوا فی بیو تھم و لا ھم ادوا رسالة صاحبھم "

یہ لوگ ہلاک ہو گئے نہ گھروں میں بیٹھے اور نہ ہی اپنے صاحب (نبی کریم ﷺ) کا پیغام لوگوں تک پہنچا سکے۔تو اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی مذمت میں اس آیۃ کریمہ کو اور شہداء کی شان میں آنے والی آیۃ کو نازل فرمایا۔ (قرطبی)

(۳) حضرت قتادہ اور مجاہد اور دوسرے اہل علم کی ایک جماعت کا قول یہ ہے۔

"نزلت فی کل مبطن کفرا او نفاقا او کذ با او اضرارا و ھو یظھر بلسانه خلاف ذلک فھی عامة " (قرطبی)

کہ یہ آیۃ کریمہ ہر اس شخص کی مذمت میں نازل ہوئی ہے جو باطنی طور پر کافر ہو، یعنی اوپر سے مسلمان اور اندر سے کافر ہو یا منافق ہو یا جھوٹا ہو، یعنی دعویٰ اسلام میں جھوٹا ہو، یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والا ہو، یعنی زبان سے جس چیز کو ظاہر کرنے والا ہے وہ اس کے دل میں نہیں پائی گئی۔

شان نزول میں یہ قول ترمذی کی اس روایت کے مطابق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب میں ہے۔

" ان من عباداللہ قو ما السنتھم احلی من العسل و قلو بھم امر من الصبر یلبسون للناس جلو دا لضأ ن من اللین یشترون الدنیا با لدین یقول اللہ تعالیٰ أبی یغترون و علی یجترؤن فبی حلفت لأ تیحن لھم فتنة تد ع الحلیم منھم حیران " (قرطبی)

کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے بندوں میں کچھ ایسی قومیں ہوں گی جن کی زبانیں شہد سے میٹھی ہوں گی، اور ان کے دل مصبر (ایلوا) سے زیادہ کڑوے ہوں گے، وہ لوگوں کے لئے بھیڑ کے چمڑوں سے بھی نرم لباس پہنے ہوں گے، دنیا کو دین کے بدلے حاصل کریں گے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میری وجہ سے دھوکا میں مبتلا ہوں گے اور مجھ پر وہ جرأت کریں گے، مجھے اپنی ذات کی قسم میں ان پر ایسا فتنہ مسلط کروں گا جو بڑے بڑے صابروں کو حیران کر دے گا۔

تمام اقوال میں محاکمہ:

اگر چہ آخری وجہ شان نزول کی ابن کثیر کے نزدیک بھی معتبر ہے اور کبیر میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

'' وھو اختیار اکثر المحققین من المفسرین '' یہی قول اکثر محققین مفسرین کرام کا ہے۔

تاہم اس میں بہتر محاکمہ یہ پایا گیا ہے جو محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا ہے۔

'' فلایمتنع ان تنزل الآیة فی الرجل ثم تکون عامة فی کل من کان موصوفا بتلک الصفات '' (کبیر)

کہ ہوسکتا ہے آیہ کریمہ نازل تو خاص اخنس بن شریق کی مذمت میں ہوئی ہو لیکن بعد میں الفاظ کی عمومیت کے پیش نظر ہر منافق کو شامل ہو۔

عموم پر دلالت کی وجوہ:

یعنی آیہ کریمہ کا شان نزول اگر چہ خاص بھی مان لیا جائے تو الفاظ کے عموم کے لحاظ پر عام رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

(۱) حکم کسی مناسب وصف پر مرتب ہوتا ہے، جس میں علت بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، جب اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مذمت بیان کی ہے اور ان کی وہ صفات بیان کی ہیں جو باعثِ مذمت ہیں، تو ہمیں واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ ان لوگوں کی مذمت کی وجہ ان کی بری صفات ہیں۔

''فیلزم ان کل من کان موصوفا بتلک الصفات ان یکون مستوجبا للذم ''

تو ضروری ہے کہ بے شک ہر وہ جو ان صفات سے متصف ہوگا (یعنی جس شخص میں بھی یہ صفات پائی جائیں گی) وہ مذمت کا مستحق ہے۔

(۲) '' ان الحمل علی العموم اکثر فائدة'' عمومی معنی لینے میں فائدہ زیادہ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عاقل و بالغ شخص کو برے طریقے سے روکنا لازم آئے گا۔

(۳) اگر آیۃ کریمہ کو عام معنی پر محمول کریں تو اس میں زیادہ احتیاط ہے، اس لئے کہ جب حکم تمام منافقوں کے متعلق ہوگا تو ان میں وہ خاص شخص یعنی اخنس بن شریق بھی آجائے گا۔ جب حکم اس کے لئے خاص ہوگا تو عام لوگوں کو شامل نہیں ہوگا۔

" فثبت بما ذکر نا ان حمل الآیۃ علی العموم اولی "

جو ہم نے ذکر کیا ہے اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ آیۃ کریمہ کو عموم پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔

اس سے بھی زیادہ عموم بہتر ہے:

اس آیۃ کریمہ اور آنے والی دو آیتوں میں مجموعی طور پر پانچ بری صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ صفات خواہ منافقوں میں پائی جائیں یا ریاکاری کرنے والے مسلمانوں میں پائی جائیں، سب ہی مذمت کے مستحق ہوں گے اور سب کو ان سے باز رہنا ضروری ہے۔

ان صفات مذمومہ میں سے ایک صفت یہ ذکر فرمائی گئی۔

" یعجبک قو لہ فی الحیو ۃ الدنیا " تعجب میں ڈالتی ہے تمہیں اس کی بات دنیا کی زندگی میں۔

یعنی دنیا میں وہ بظاہر میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے جو جھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ صفت منافق میں پائی جائے یا مسلمان میں، باعثِ مذمت ہے۔ اس وصف والے شخص کو اس بری صفت سے باز رہنا ضروری ہے۔

اور بری صفت یہ بیان کی گئی ہے۔

" ویشھد اللہ علی مافی قلبہ" اور گواہ بناتا ہے اللہ کو اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے۔

اس صفت کو صفتِ مذمومہ (بری) اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ظاہر طور پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر یعنی قسم اٹھا کر اپنے دل کے خلوص اور اپنی سچائی کو پیش کرتا ہے۔ " مع ان قلبہ بخلا ف ذلک " باوجود اس کے کہ وہ سچا نہیں، اس کے دل میں اس کے خلاف ہوتا ہے۔

یہ بری صفت (یعنی جھوٹی قسمیں اٹھا کر دل کے خلوص کو پیش کرنا اور حقیقت میں اس کے خلاف ہونا) خواہ منافق میں پائی جائے یا مسلمان میں وہ قابلِ مذمت ہے، انسان کو اس بری صفت سے باز آنا ضروری ہے۔

اور تیسری بری صفت رب تعالٰی نے بیان فرمائی۔

" وهو الدالخصام " وہ سخت جھگڑالو ہے۔

لہٰذا شرعی جواز کے بغیر کسی سے جھگڑا کرنا بری صفت ہے اور خصوصاً اس بری صفت میں اور ہی زیادہ مبتلا ہونا زیادہ ہی باعثِ مذمت ہوگا، لہٰذا یہ صفتِ مذمومہ خواہ منافق میں پائی جائے یا مسلمان میں وہ مذمت کا مستحق ہوتا ہے، لہٰذا اس صفت والے شخص کو چاہئے کو وہ اس سے باز آجائے۔

اور چوتھی بری صفت یہ بیان کی گی ہے۔

" واذ اتو لی سعی فی الارض لیفسد "اور جب پیٹھ پھیرے تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے۔

لہٰذا سامنے میٹھی میٹھی باتیں کرنا اور بڑے خلوص کا اظہار کرنا اور پیچھے فساد پھیلانا بہت بری صفت ہے، یہ بری صفت خواہ منافق میں پائی جائے یا مومن میں وہ مذمت کے قابل ہے، ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اس بری صفت سے دور رہے۔

اور پانچویں بری صفت کا رب تعالٰی نے ذکر فرمایا۔

" واذاقیل له اتق الله اخذته العزة بالاثم "

اور جب اسے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو اسے اور ضد چڑھے گناہ کی۔

یعنی جب اسے گناہ سے روکا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو وہ اپنی دنیاوی عزت کی وجہ سے اور ہی زیادہ ضد میں آجاتا ہے اور ضد کی وجہ سے اور ہی زیادہ گناہ شروع کر دیتا ہے۔

لہٰذا یہ صفت مذمومہ خواہ منافق میں پائی جائے یا مسلمان میں وہ مستحق مذمت ہے، ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اس بری صفت سے باز آجائے۔

اس مندرجہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ یہ پانچ بری صفات منافق میں ضرور پائی جاتی ہیں، لیکن کبھی یہ صفات بعض مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

" فثبت انا متی حملنا الآیة علی الموصوف بهذه الصفات الخمسة دخل فیها المنافق و المرائی "

تو واضح ہوا کہ آیۃ کریمہ کا جب ہم مطلب یہ لیں گے کہ جو شخص بھی ان بری صفات والا ہوگا وہ مستحقِ مذمت ہے تو اس میں منافق اور ریاء کار مسلمان دونوں ہی شامل ہوں گے۔ (از بیہ بتصرف)

نتیجہ واضح ہوا کہ آیۃ کریمہ نازل تو ایک منافق کی مذمت میں ہوئی، لیکن الفاظ کی عمومیت کی وجہ سے ہر منافق کو شامل ہے، بلکہ ریاء کار مسلمان بھی ضمناً اس میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں ان صفات مذمومہ سے محفوظ رکھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

" ومن الناس من یعجبک قوله فی الحیوة الدنیا" میں" فی الحیوة الدنیا "جار مجرور ہیں۔ اس ظرف کا تعلق " یعجب " سے ہے۔ یا" قوله " سے ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔

"(فی الحیوة الدنیا) متعلق بالقول ای ما یقوله فی امور الدنیا و اسباب المعاش او فی معنی الدنیا فانها مراده من ادعاء المحبة و اظهار الایمان "

جب اس ظرف کا تعلق قول سے ہو تو دو معنی ہوں گے، ایک ان میں یہ ہے کہ لوگوں میں کوئی وہ شخص ہے جس کی دنیا کے معاملات کے متعلق اور اسباب معیشت (دنیا کے گذران کے اسباب) کے متعلق باتیں آپ کو تعجب میں ڈالتی ہیں۔ اور ان معانی میں سے دوسرا معنی یہ ہے کہ اس شخص کی باتیں دنیا کو حاصل کرنے کے متعلق آپ کو تعجب میں ڈالتی ہیں۔ کیونکہ اس کا دعویٰ محبت اور اظہار ایمان دنیاوی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ہے۔

خیال رہے تعجب کا معنی کسی چیز کو عمدہ سمجھنا۔ اور اپنے نفس میں کسی چیز کو عظیم سمجھنا' اور جس چیز سے تعجب آرہا ہو اس کی وجہ سے حیران ہونا۔

اگر ظرف کا تعلق " یعجب " سے ہو تو معنی یہ ہے، اس شخص کی باتیں دنیا میں آپ کو تعجب میں ڈالتی ہیں، کیونکہ ان میں چاشنی یعنی مٹھاس پائی جاتی ہے اور ان میں فصاحت پائی جاتی ہے۔ لیکن آخرت میں ان کی باتیں آپ کو تعجب میں نہیں ڈال سکیں گی۔ کیونکہ اس پر دہشت طاری ہوگی اور اس کی زبان میں لکنت ہوگی، وہ باتیں رک رک کرے گا، جن میں تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

یا دوسرا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اس کو رب تعالیٰ کی طرف سے کلام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، اور طلباء کرام یہ بھی خیال کریں کے " قول "بمعنی " مقول " کے ہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

" **ویشهدالله علی ما فی قلبه** " اور گواہ بناتا ہے اللہ کو اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے۔

" فالمعنی انه یقرر صدقه فی کلامه و دعواه بالاستشهاد بالله "

معنی یہ ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے کہ میں اپنے کلام میں سچا ہوں۔

اس میں پھر دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہو، ساتھ ساتھ قسمیں بھی اٹھاتا ہو کہ میں اپنے دعوی میں سچا ہوں۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ قسمیں تو نہ اٹھاتا ہو لیکن وہ دعویٰ کی سچائی پر فقط اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہو۔

تنبیہ : عام قراء نے " یشهد " کو یاء کے ضمہ (پیش) سے پڑھا ہے اور ضمیر قائل کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ شخص اللہ کو گواہ بناتا ہے اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے۔

لیکن ابن محیصن کی قرأت میں " یشهد " یاء کے فتحہ (زبر) سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا۔

" ان الله یعلم من قلبه خلاف ما اظهره "

بیشک اللہ گواہ ہے' یعنی اللہ جانتا ہے کہ اس کے دل میں اور ہے اور ظاہر اور کر رہا ہے۔

یعنی اس کے دل میں وہ چیز نہیں جو زبان سے ظاہر کر رہا ہے۔

"وهو الد الخصام": وہ بہت سخت جھگڑالو ہے۔

" الد ' الشديد الخصومة " سخت جھگڑا کرنا۔" الخصام جمع خصم "خصام خصم کی جمع ہے جس کا معنی جھگڑا کرنا۔" الدالخصام اى اشد الخصوم خصومة " یعنی " الدالخصام " کا معنی یہ ہے کہ بہت زیادہ جھگڑا کرنا۔ مطلب تو یہی ہے، البتہ مفسرین کرام نے اس کی تفسیر میں مختلف الفاظ ذکر فرمائے ہیں۔

" الدالخصام معناه طالب لايستقيم "

حضرت مجاہد نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے ایسی راہ کو طلب کرنے والا، جو سیدھی نہ ہو۔

" وقال السدى اعوج الخصام " سدی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا" ٹیڑھی راہ پر چلنے والا"

"وقال قتادة الدالخصام معناه انه جدل بالباطل شديد القسوة فى معصية الله عالم اللسان جاهل العمل "

حضرت قتادہ نے " الدالخصام " کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے والا، اللہ تعالیٰ کی معصیت میں سختی سے قائم رہنے والا، زبان سے علم رکھنے والا، عمل سے جاہل۔

مطلب سب معانی کا ایک ہی ہے" بہت زیادہ جھگڑا کرنے والا" (از کبیر)

☆ "وقداخرج البخارى ومسلم عن عائشة رضى الله عنهاعن النبى ﷺ ابغض الرجال الى الله تعالى الألدالخصم "

بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو لوگوں میں زیادہ ناپسند وہ شخص ہے جو زیادہ جھگڑالو ہے۔ (روح المعانی)

☆ "واخرج احمد عن ابى الدرداء كفى لك اثماان لاتزال مما رياو كفى بك ظالما ان لاتزال مخاصماو كفى بك كا ذبا ان لا تزال محدثا الاحديث فى ذات الله "

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تیرے گنہگار ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ تو ریا کاری

سے باز نہ آئے، اور تیرے ظالم ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ جھگڑے سے باز نہ آئے اور تیرے جھوٹے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ تو زیادہ باتیں کرنے سے باز نہ آئے، سوائے اس کلام کے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق ہو۔

یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعریف میں جو کلام کرے گا، یا شریعت کے متعلق جو کلام کرے گا اس کا ثواب حاصل ہوگا، لیکن دنیاوی بے فائدہ باتیں اکثر طور پر جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں۔

" وشدة الخصومة من صفات المنافقين لا نهم يحبون الدنيافيكثرون الخصام عليها "

اور زیادہ جھگڑا کرنا منافقین کی صفت ہے کیونکہ وہ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور دنیا کی وجہ سے زیادہ جھگڑا کرتے ہیں۔ (روح المعانی)

"واخرج الطستی عن ابن عباس ان نافع بن الازرق سأله عن قوله وهو الدالخصام قال الجدل المخاصم فی الباطل قال وهل تعرف العرب ذلک قال نعم اماسمعت قول مهللهل "

ان تحت الاحجار حزماوجورا وخصيماالدذامغلاق

نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ " الدالخصام " کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا باطل میں جھگڑا کرنا، نافع نے پوچھا کیا اہل عرب نے یہ معنی لیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، کیا تم نے مہلہل کا شعر نہیں دیکھا، اس نے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

بے شک پتھروں کے نیچے سختی اور ظلم پایا گیا ہے۔ اور باطل راہ پر چلنے والے پر حق کے دروازے بند ہیں۔ (درمنثور)

"واخرج البخاری ومسلم وابو داؤد والترمذی والنسائی عن عبدالله بن عمروان النبی ﷺ قال اربع من کن فيه کان منافقاخالصا ومن کانت فيه خصلة منهن کانت فيه خصلة من النفاق حتی يدعها اذا ائتمن خان واذاحدث کذب واذاعاهد غدر واذا خاصم فجر"

عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص میں چار چیزیں پائی جائیں وہ خالص منافق کے قریب ہے اور جس میں ان چار سے ایک پائی جائے اس میں منافقت کی علامت پائی گئی، یہاں تک کہ وہ ان کو چھوڑ دے (وہ چار چیزیں یہ ہیں) اس کے پاس جب امانت رکھی جائے وہ خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب معاہدہ کرے تو دھوکا کرے، اور جب جھگڑا کرے تو فجور کرے۔ (گالی گلوچ اور بیہودگی سے کام لے) (در منثور)

☆ " واخرج الترمذی والبیهقی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ كفى بك اثما ان لا تزال مخاصما" (درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا گنہگار ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ تم جھگڑا کرنے سے باز نہ آو۔ (ترمذی، بیہقی)

☆ "واخرج احمد عن ابی الدرداء قال من كثر كلامه كثر كذبه ومن كثر حلفه كثر اثمه ومن كثرت خصومته لم يسلم دينه "

حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں جو شخص زیادہ باتیں کرتا ہے وہ زیادہ جھوٹا ہوتا ہے۔ اور جو شخص زیادہ قسمیں اٹھائے وہ زیادہ گنہگار ہوتا ہے اور جو شخص زیادہ جھگڑا کرے اس کا دین سلامتی میں نہیں رہتا۔ (درمنثور)

تنبیه : "وفی هذه الآية دليل وتنبيه على الاحتياط فيمايتعلق بامور الدين والدنيا "

اس آیۃ کریمہ میں اس پر دلیل ہے اور اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ دین اور دنیا کے معاملات میں احتیاط سے کام لیا جائے۔

گواہوں کے احوال کو دیکھا جائے کہ یہ سچے ہیں یا جھوٹے، خفیہ طور پر گواہوں کے محلہ میں آدمی بھیج کر ان کے متعلق پتہ چلائے کہ وہ کیسے ہیں، ان کے سامنے علانیہ طور پر ان کے متعلق پتہ چلائے۔ بغیر چھانٹ بینٹ کے صرف ان کے ظاہری احوال کو دیکھ کر کوئی فیصلہ نہ کرے۔

ابتداء اسلام میں تو صرف کسی کا کلمہ طیبہ پڑھ لینا اس کے مؤمن ہونے کے لئے کافی تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ " امرت ان اقاتل حتی یقولو الا اله الاالله "

مجھے حکم دیا گیا کہ میں کفار سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ کہیں "لا اله الاالله "

لیکن بعد میں جب فساد عام ہو گیا، مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے کفار نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا، اور بظاہر مسلمانوں سے محبت کرتے لیکن حقیقت میں وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے ۔ ان حالات میں ابن عربی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے۔ " قلت والصحیح ان الظاهر یعمل علیه حتی یتبین خلافه "

کہ صحیح یہ ہے کہ ظاہر پر عمل کیا جائے لیکن اگر اس کے خلاف ظاہر ہو تو ضرور تحقیق کرے صرف ظاہر پر عمل نہ کرے۔

☆ اسی کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بخاری شریف میں مذکور ہے۔

" ایها الناس ان الوحی قد انقطع وانما نأخذكم الآن بما ظهر لنا من اعمالكم، فمن اظهر لنا خیرا امناه وقربناه، ولیس لنا من سریرته شیٔ الله یحاسبه فی سریرته ومن اظهر لنا سوا لم نؤمنه ولم نصدقه وان قال ان سریرته حسنة "

آپ نے فرمایا، اے لوگو! بیشک وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، اب ہم تمہارے ظاہری اعمال کو دیکھیں گے، جس شخص نے ظاہری طور پر بہتر عمل کئے، ہم اسے امن دیں گے اور ہم اسے اپنے قریب کریں گے، ہمیں کسی کے باطن کے متعلق کچھ علم نہیں، اس کے باطنی عقائد واعمال کا حساب رب تعالیٰ کے ہاں ہوگا، ہاں اگر ہمیں کسی شخص کی برائیوں کے متعلق پتہ چل گیا تو ہم اسے امن نہیں دیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے، یہاں تک کے آپ نے فرمایا کہ اگر چہ کسی شخص کا باطن نیک ہو لیکن ظاہر اس کے خلاف ہو تو وہ شخص امن کا مستحق نہیں ہوگا۔ (از قرطبی)

نتیجہ:

"دعوی المحبة والخلوص بدون المواطأة من فعل الملاحدة والزنادقة والمحب لا یفعل الاما یحب محبوبه"

محبت وخلوص کا صرف زبانی دعویٰ پایا جائے اور دل میں محبت اور خلوص نہ پائے جائیں تو یہ فعل ملحد اور زندیق (بے دین) لوگوں کا کام ہے۔ محب صرف وہی کام کرتا ہے جو اس کے محبوب کو پسند ہو۔

کسی شاعر نے کہا ہے۔

تعصی الاله وانت تظهر حبه هذا لعمری فی الفعال بدیع

تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ مجھے میری عمر کی قسم یہ تو عجیب کام ہے (یعنی یہ تو بہت غلط کام ہے)۔

لو کان حبک صادقا لأطعته ان المحب لمن احب مطیع

اگر تیری محبت سچی ہوتی تو میں اس کی اطاعت کرتا۔ بیشک محب اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔

حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

بصدق کوش کہ خورشید زاید از نفست
کہ از دروغ سیاہ روے گشت صبح نخست

سچائی میں کوشش کر کہ سچائی کی وجہ سے تیرے نفس کا سورج روشن ہوگا۔ کہ جھوٹ سے تیری صبح صادق بھی سیاہ ہو جائے گی۔ (روح البیان)

☆☆☆☆☆

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۰۵)

۱

اور جب پیٹھ پھیرے تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے اور کھیتی اور جانیں تباہ کرے اور اللہ فساد سے راضی نہیں۔

۲

اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو چلتا ہے زمین میں تاکہ فساد پھیلائے اس میں اور تباہ کرے کھیتی اور جانوں کو اور اللہ نہیں پسند فرماتا فساد کو۔

شانِ نزول:

(۱) یہ آیۃ کریمہ بھی اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی، کیونکہ اس کے اور بنی ثقیف کے درمیان جھگڑا تھا، اس نے ایک رات ان کی کھیتی کو آگ لگادی اور ان کے مویشیوں کو ہلاک کردیا۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اخنس بن شریق نے طائف کے ایک شخص سے قرض لینا تھا، جب اس کے پاس قرض لینے کے لئے گیا تو اس کی کاٹی ہوئی کھیتی کے ڈھیر کو آگ لگادی اور اس کے گدھوں کی کونچیں کاٹ دیں۔ (خازن)

"واذا تولی": "ای ادبر واعرض عنک بعد الانۃ القول وحلاوۃ المنطق"
جب وہ آپ سے پیٹھ پھیرتا ہے، یعنی آپ سے نرم گفتگو کرنے کے بعد اور میٹھی باتیں کرنے کے بعد جب وہ اعراض کرتا ہے۔ (خازن)

"سعی فی الارض": ای سار و مشی فی الارض، تو زمین میں چلتا ہے۔ (خازن)

"والسعی ھنا بمعنی القصد" یہاں سعی کا معنی ہے ارادہ کرنا۔ (صاوی)

یعنی جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو فساد پھیلانے کا ارادہ کرتا ہے۔

"(سعی) ای اسرع فی المشی اوعمل" یعنی سعی کا معنی ہے چلنے میں جلدی کرنا، یا عمل میں جلدی کرنا۔

یعنی جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو جلدی جلدی چلتا ہے اور مکمل کوشش کرتا ہے زمین میں فساد پھیلانے کی۔

(روح المعانی)

"لیفسدفیھا" : تاکہ اس میں فساد پھیلائے۔

"فساد" مختلف معانی میں استعمال ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کر کے ان کو اسلام سے دور کرنا۔

اور فساد کا معنی یہ بھی ہے کہ لوگوں کے درمیان اپنے کلام سے اختلاف پیدا کرنا، یعنی ادھر اور ادھر کی باتیں کر کے لوگوں کو لڑانا۔

اور فساد کا معنی قطع رحمی، اور فساد کا معنی خون بہانا۔ اس آیہ کریمہ میں یہی معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے تاکہ آنے والے الفاظ مبارکہ " ویھلک الحرث والنسل " اس کا بیان بن سکیں۔ (ماخوذ از کبیر)

ایک اور تفسیر:

"وقیل معناہ (واذاتولی) ای صار والیا وملک الأمر سعی فی الارض لیفسد فیھا یعنی با لظلم والعدوان کما یفعلہ ولاۃ السوء والظلمۃ" (خازن)

اور تفسیر یہ بیان کی گئی ہے کہ (واذاتولی) کا معنی ہے جب وہ والی (حاکم) بن جاتا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ اپنے امور کا والی بن جاتا ہے اور خود مختار ہوتا ہے تو زمین میں ظلم وستم اور لوگوں پر زیادتی کرنے سے فساد پھلاتا ہے، جیسے برے اور ظالم حکام زمین میں فساد برپا کر کے تباہی اور بربادی پھیلا دیتے ہیں۔

تیسری تفسیر:

" وقیل یظھر ظلمه حتی یمنع الله بشؤم ظلمة القطر (ای المطر) فیھلک الحرث والنسل" (خازن)

جب وہ والی بن جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلاتا ہے تو اس کے ظلم کی نحوست کی وجہ سے بارشیں نہیں ہوتیں، جس کی وجہ سے کھیتیاں اور جانیں برباد ہو جاتی ہیں۔

"والله لا یحب الفساد": اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔

" ای لا یر تضیه فاحذروا غضبه علیه "

اللہ تعالیٰ فساد پر راضی نہیں بلکہ وہ فساد پر غضب فرماتا ہے، اس لئے فساد نہ پھیلا کر اس کے غضب سے بچ کر رہو۔

اعتراض:

یہ کس طرح کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ خود چیزوں کو تباہ و برباد کرتا ہے، کھیتوں کو وہ تباہ کرتا ہے، جانوں کو وہ ہلاک کرتا ہے۔

جواب:

" ان الافساد فی الحقیقة اخراج الشئ عن حالة محمودة لالغرض صحیح وذلک غیر موجود فی فعل الله تعالیٰ ولاھو آمر به ولا محب له وما نراه من فعله ونظنه بظاھره فسادافھو بالاضافة الینا واعتبار ناله کذلک واما بالنظر الالھی فکله صلاح وحکمة ولھذا قال بعض الحکماء یامن افساده اصلاح یعنی ان ما نظنه افسادا فانما ھو لقصور نظرنا ومعرفتنا وھو فی الحقیقة اصلاح محض "

فساد پھیلانے کا حقیقی معنی یہ ہے کہ ایک چیز کو اچھی حالت (قابل تعریف حالت) سے نکال دینا جبکہ اس میں کوئی صحیح غرض نہ پائی جائے' ایسا فساد پھیلانا اللہ تعالی کے افعال میں نہیں' اور نہ ہی وہ اس کا حکم دیتا ہے' اور نہ ہی وہ اسے پسند کرتا ہے' ہم جو اللہ تعالی کے افعال میں لوگوں اور جانوروں اور دوسری اشیاء کی ہلاکت دیکھتے ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ فساد ہے وہ درحقیقت ہماری وجہ سے بربادی آتی ہے' اس کا حقیقت میں سبب ہم ہوتے ہیں' (جس کو اللہ تعالی نے خود ہی بیان فرمادیا)

ظھر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون (سورۃ الروم آیت، ۴۱)

ظاہر ہوا فساد خشکی اور تری میں بوجہ اس کے جو کسب کیا لوگوں کے ہاتھوں نے (یعنی لوگوں کے عمل کی وجہ سے) تاکہ چکھائے مزہ ان کو ان کے بعض کرتوتوں کا' تاکہ وہ باز آجائیں۔

وہی کام جب اللہ تعالی کی طرف منسوب ہوتا ہے تو تمام کا تمام کام ہی اصلاح پر مبنی ہوتا ہے اور اس میں حکمت پائی جاتی ہے اسی وجہ سے کسی حکیم (صاحب علم دانا) نے کہا اے اللہ! تو وہ ذات ہے کہ تیرا فساد پھیلانا بھی اصلاح ہے۔ اگر غور فکر کیا جائے تو بات واضح طور پر یہ علم حاصل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالی کے ہر کام میں اصلاح ہی اصلاح ہے' صرف ہم اپنے علم کی کمی کی وجہ سے اور کوتاہ نظر کی وجہ سے رب تعالی کے افعال کو فساد سمجھتے ہیں۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

☆ "واخرج ابن جریر و ابن ابی حاتم عن مجاھد انه سئل عن قوله (و اذ تولی سعی فی الارض) قال یلی فی الارض فیعمل فیھا بالعدوان و الظلم فیحبس الله بذلک القطر من السماء فھلک بحبس القطر الحرث و النسل' (و الله لا یحب الفساد) ثم قرأ مجاھد ظھر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس الخ (درمنثور)

مجاھد رحمہ اللہ سے " واذتولی سعی فی الارض " آیۃ کریمہ کے متعلق سوال کیا گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ شخص والی (حاکم) بن جاتا

ہے تو وہ لوگوں پر ظلم ستم شروع کر دیتا ہے' جس کی وجہ سے اللہ تعالی بارشوں کو روک دیتا ہے' آسمانوں سے کوئی قطرہ بارش کا نہیں آتا' بارشوں کے رک جانے کی وجہ سے کھیتیاں اور نسلیں برباد ہو جاتی ہیں۔ پھر مجاہد رحمہ اللہ نے " واللہ لا یحب الفساد " کا مطلب بیان کرتے ہوئے بطور دلیل سورۃ الروم کی وہ آیۃ پڑھی جس کا ذکر قریب ہی ہو چکا ہے۔

" ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس "

ظاہر ہوا فساد خشکی اور تری میں بوجہ لوگوں کے اعمال کے۔

معتزلہ کی غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

"واللہ لایحب الفساد" سے معتزلہ نے یہ سمجھا کہ محبت اور ارادہ ایک چیز ہے' اس لئے انہوں نے کہا کہ جب یہ کہا جائے کہ" اللہ پسند نہیں کرتا فساد کو' تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی فساد کا ارادہ نہیں کرتا۔

لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ یہ ہے۔

" ان الارادة غیر المحبة فان الانسان قد یرید شیأ و لا یحبه وذلک لانه قدیتنا ول الدواء المرو لایحبه"

کہ بیشک ارادہ اور چیز ہے اور محبت اور چیز ہے، ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، کیونکہ انسان کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس سے محبت نہیں کرتا، جیسا کہ کڑوی دواء انسان اپنے ارادہ سے پی لیتا ہے، لیکن اس کے پینے میں اسے محبت نہیں ہوتی۔

" وقیل ان المحبة مدح الشی وتعظیمه والارادةبخلاف ذلک "

محبت اور ارادہ میں ایک اور فرق یہ بیان کیا گیا ہے کہ محبت میں ایک چیز کی تعریف کی جاتی ہے اور اس کی تعظیم کی جاتی ہے لیکن ارادہ میں کسی چیز کی مدح اور تعظیم کا پایا جانا ضروری نہیں۔ (خازن)

تنبیہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "النسل" کا معنی "جانیں" کیا ہے اور راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے، کیونکہ ہر ذی روح چیز کو "النسل" کہا گیا ہے۔

"والنسل ماخرج من کل انثی من ولد"

کسی مونث سے جو بچہ پیدا ہو، خواہ وہ بچہ مذکر ہو یا مونث اسے نسل کہا جاتا ہے۔

اصل معنی اس کا نکلنا اور گرنا ہے کہا جاتا ہے "نسل الشعر" بال گر گئے" نسل ریش الطائر" پرندے کے پر گر گئے، اسی طرح بال نکل آئے، اور پر نکل آئے، بھی ان الفاظ کا معنی ہے۔

فائدہ:

اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ زمین کاشت کرنا، کھیتی باڑی کرنا اور درخت لگانا اور حیوانوں کی پرورش کرنا جن سے نسل کی افزائش (نسل بڑھے) ہو افضل ہے۔

"وبذلک یتم قوام الانسان وھو یرد علی من ترک الاسباب"

اسی سے انسان کے قوام (مادہ اور جسم) کی تکمیل ہوتی ہے۔ لہٰذا ان حضرات کا اس آیۃ کریمہ میں رد موجود ہے جو یہ کہتے ہیں کہ صرف توکل سے کام لیا جائے، اسباب کی طرف نہ دیکھا جائے، ان کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ اسباب کا ذکر خود رب تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ (قرطبی)

☆ "عن جابر ان النبی ﷺ دخل علی ام مبشر الانصاریة فی نخل لها فقال لها رسول الله ﷺ من غرس هذا النخل مسلم ام کافر فقالت بل مسلم فقال لا یغرس مسلم غرسا ولا یزرع زرعا فیاکل منه انسان ولا دابة ولا شیء الا کانت له صدقة"

(مسلم ج ۲ باب فضل الغرس والزرع)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بے شک نبی کریم ﷺ ام مبشر انصاریہ کے باغ میں داخل ہوئے تو ان سے

پوچھا یہ کھجور کے درخت کس نے لگائے ہیں مسلمان نے یا کافر نے؟ انہوں نے یہ عرض کیا یہ مسلمان نے لگائے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ کوئی مسلمان درخت نہیں لگاتا اور نہ ہی کھیتی باڑی کرتا ہے کہ اس سے انسان کھائیں اور جانور کھائیں اور کوئی چیز بھی (پرندے درندے وغیرہ) کھائے مگر یہ کہ اسے صدقہ کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اس حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کھیتی باڑی کرنا اور درخت لگانا افضل ہے، جو دانے یا پھل انسان کھائیں گے یا جانور کھائیں گے یا پرندے اور درندے کھائیں گے، تو اس شخص کو صدقہ کا ثواب ملے گا، جس نے فصل کاشت کیا یا درخت لگائے۔

گذشتہ سے پیوستہ:

فساد کا معنی خراب کرنا بھی آتا ہے۔ سعید بن میتب فرماتے ہیں۔

"قطع الدراهم من الفساد فی الارض" درہم کو توڑنا (یعنی خراب کرنا) بھی زمین میں فساد پھیلانا ہے۔

عطاء بن منبہ نے احرام کی حالت میں جبہ پہنا ہوا تھا تو نبی کریم ﷺ نے ان کو جبہ اتارنے کا حکم دیا، تو انہوں نے جبہ اتار دیا۔

"قال قتادة قلت لعطاء انا كنا نسمع ان يشقها فقال عطاء ان الله لا يحب الفساد"

قتادہ کہتے ہیں میں نے عطاء کو کہا ہم تو سنتے تھے کہ جبہ کو پھاڑ کر جسم سے ہٹا دیا جائے، تو عطاء نے کہا بیشک اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی جبہ کو پھاڑنا جبہ کو خراب کرنا ہے اور کسی چیز کو خراب کرنا فساد ہے، جسے رب تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ (قرطبی)

☆☆☆☆

وَاِذَاقِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ☆

(سورۃالبقرۃ آیت،۲۰۶)

☆۱☆

اور جب اِس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو اسے اور ضد چڑھے گناہ کی ایسے کو دوزخ کافی ہے اور وہ ضرور بہت برا بچھونا ہے۔

☆۲☆

اور جب کہا جاتا ہے اسے ڈر اللہ سے، پکڑ لیتی ہے اسے عزت بسبب گناہ کے، تو کافی ہے اسے جہنم اور البتہ وہ برا ٹھکانا ہے۔

مختصر مطلب:

یہ اسی شخص کی ایک اور بری صفت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ جب اسے کہا جاتا ہے تو اللہ سے ڈر، اپنے قول و فعل کو رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق رکھ، تو وہ اپنے باطل گمان کے مطابق اور اپنے گناہوں کی وجہ سے اپنی توہین سمجھتا ہے، اور ضد میں آ کر اور ہی گناہ کرتا ہے کہ میں بڑا عزت والا شخص تھا تو یہ مجھے فسادی کہہ رہے ہیں۔

رب تعالیٰ نے اس شخص کی سزا کا حکم ذکر فرمایا کہ اسے جہنم کافی ہے، اور جہنم اس کا برا بچھونا اور برا ٹھکانا ہے۔

"واذقیل لہ اتق اللّٰہ": اور جب کہا جاتا اسے ڈر اللہ سے۔

ماقبل سے تعلق:

ھوا عوج المقال سیٔ الفعال فبین قولہ وفعلہ، کلامہ کذب واعتقادہ فاسد وافعالہ قبیحۃ، فاذاوعظ ھذاالفاجر فی مقالہ وفعالہ وقیل لہ اتق اللہ وانزع عن قولک وفعلک وارجع الی الحق امتنع وابی"

یعنی وہ شخص اخنس بن شریق ٹیڑھی باتیں کرنے والا تھا یعنی بظاہر میٹھی باتیں کرتا تھا لیکن حقیقت میں وہ جھوٹا تھا، اور اس کے افعال (کام) برے تھے، کیونکہ وہ لوگوں کی کھیتیوں کو برباد کرتا تھا اور انسانوں اور مویشیوں کو ہلاک کرتا تھا، تو رب تعالیٰ نے پہلے اس کے جھوٹے کلام کا ذکر فرمایا، پھر اس کے برے افعال کا ذکر فرمایا کہ اس کا کلام جھوٹا ہے اور اس کا اعتقاد فاسد ہے کہ وہ بظاہر اللہ کو گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ حقیقت میں ایمان دار ہی نہیں بلکہ کافر و منافق ہے اور اس کے افعال بھی برے ہیں۔ اس آیۃ کریمہ میں اس فاسق و فاجر (منافق) کو نصیحت کی گئی کہ تو اپنے اقوال اور افعال کو درست کر اور حق کی طرف آ، یعنی حق راہ پر چل، تو اس نے انکار کر دیا، اپنے اقوال و افعال کو اس نے درست نہ کیا۔ (از صابونی)

''اخذته العزة با لأثم'' : پکڑ لیا اس کو عزت نے بوجہ گناہ کے۔

عظمتِ قرآن پر قربان:

بظاہر یہ مختصر جملہ ہے، یعنی تھوڑے الفاظ ہیں لیکن اس کے بہت بڑے مطالب ہیں۔

'' العزة ، القوة و الغلبة '' عزت کا معنی قوت اور غلبہ ہے۔ '' عزه يعزه '' لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے وہ شخص اس پر غالب آ گیا۔

'' وقيل العزة هنا الحمية'' اور بیان کیا گیا ہے کہ عزت کا معنی یہاں حمیت ہے۔

عزتِ نفس کی وجہ سے، اور خاندان کی عزت کی وجہ سے جوش میں آنا حمیت کہلاتا ہے۔

'' وقيل العزة هنا المنعة وشدة النفس ''

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں عزت کا معنی منع کرنا، طاقت رکھنا اور نفس میں شدت کا آنا۔

(۱) اس جملہ کے مختلف معانی میں سے ایک معنی یہ ہے۔

" اعتزفی نفسه و انتحی فاوقعته تلک العزة فی الاثم حین اخذ ته و الزمته ایا ہ "

اپنے آپ کو وہ عزت والا سمجھتا ہے اور ارادہ رکھتا ہے کہ میں عزت والا رہوں تو اس کا عزت والا ہونے کا باطل گمان اسے گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے، کیونکہ اس کا عزت کو لازم پکڑ نا ہی تکبر ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

(۲) ان معانی میں دوسرا معنی جو حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے۔

" اذاقیل له مهلا ازداد اقداما علی المعصیة "

کہ جب اسے کہا جاتا ہے رک جا، یعنی اللہ سے ڈر، گناہوں سے باز آجا، تو وہ اور ہی زیادہ گناہ کرتا ہے۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ''اور جب اس سے کہا جائے اللہ سے ڈرو تو اسے اور ضد چڑھے گناہ کی''

(۳) ان معانی میں تیسرا معنی یہ ہے۔

" اخذ ته العزة بما یؤثمه ای ارتکب الکفر للعزة وحمیة الجاهلیة "

اسے عزت پکڑتی ہے بوجہ اس چیز کے جو اسے گناہ میں ڈالتی ہے، یعنی وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے بوجہ اپنی عزت کے اور جاہلانہ حمیت کے۔

(۴) ان معانی میں سے چوتھا معنی یہ ہے۔

"الباء فی "بالاثم" بمعنی اللام ای اخذته العزة والحمیة عن قبول الوعظ للاثم الذی فی قلبه وهو النفاق"

" بالاثم " میں با بمعنی لام کے استعمال ہے، یعنی اس کو عزت اور حمیت نے پکڑا ہے بوجہ اس گناہ کے جو اس کے دل میں واقع ہے، یعنی نفاق جو اس کے دل میں واقع ہے، اسی وجہ سے وہ نصیحت قبول نہیں کرتا۔

راقم کے ترجمہ پہ ذرا پھر سے نظر کریں تو بفضلہ تعالیٰ یہی ترجمہ آپ کو نظر آئے گا۔

(۵) ان معانی میں سے پانچواں معنی یہ ہے۔

" الباء بمعنی مع ای اخذته العزة مع الاثم "

یعنی "بالاثم" میں باء بمعنی "مع" کے ہے، اب معنی یہ ہوگا اس کو عزت نے پکڑا ہے بمع گناہ کے۔

(قرطبی)

"فحسبه جهنم": تو کافی ہے اس کو جہنم۔

" حسبه ای کافیه معاقبة وجزاء "یعنی اس کی جزاء اور عذاب کے لئے جہنم اس کے لئے کافی ہے۔

عرب حضرات اسی کے مطابق یہ جملہ استعمال کرتے ہیں۔

"کفاک ماحل بک وانت تستعظم وتعظم علیه ماحل "

جو ذلت تجھے حاصل ہوئی تیرے لئے یہی کافی ہے، تو بڑا بنتا تھا یہ ذلت ہی تیری بڑائی ہے۔ (قرطبی)

"ولبئس المهاد": اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

دینی طلباء توجہ فرمائیں:

" لبئس " میں لام موطء للقسم ہے، جواب قسم مقدر ہے اور مخصوص بالذم بھی محذوف ہے۔ (روح المعانی)

اب معنوی طور پہ عبارت یہ بن گئی۔

" واللہ لبئس الفراش جهنم " قسم ہے اللہ تعالیٰ کی برا ہے بچھونا جہنم۔ (روح البیان)

"مهاد " کا معنی فرش بچھانا، اور جائے قرار یعنی ٹھکانا، اور سونے کے لئے بچھونا۔

راقم نے طلباء کو دوسرا معنی ذہن نشین کرانے کے لئے ترجمہ کیا ہے "ٹھکانا"

اور اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے "بچھونا"

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس عبارت کے مطابق ہے۔

" وقال بعض العلماء المهاد الفراش للنوم فلما کان المعذب فی النار یلقی علی نار جهنم جعل ذلک مهاداله وفراشا"

بعض علماء نے کہا ہے کہ " مھاد " کا معنی سونے کا بچھونا ہے اس لئے کہ جب آگ کا عذاب دیا جائے گا تو اسے جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا جو اس کے لئے بچھونا ہوگا، جو برا بچھونا ہوگا۔

(از کبیر)

" جھنم " کے متعلق بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ لفظ عجمی ہے جو بعد میں عربی میں بھی استعمال ہونے لگا، یہ نام ہے اس آگ کا جس سے آخرت میں عذاب دیا جائے گا۔

کچھ اور حضرات نے کہا ہے کہ یہ لفظ شروع سے ہی عربی ہے، آخرت میں عذاب دینے والی آگ کا یہ نام اس لئے رکھ لیا گیا ہے کہ اس آگ کو بہت گہرائی میں رکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے عرب حضرات گہرے کنویں کو " رکیة جھنام " کہتے ہیں۔ (از کبیر)

☆ " قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ من اکبر الذنب عنداللہ ان یقال للعبد اتق اللہ فیقول علیک نفسک "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بہت بڑا گناہ ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں جب کسی بندے کو کہا جائے " اتق اللہ " (تو اللہ سے ڈر) تو وہ کہے تو اپنے نفس کو لازم پکڑ (تو اپنا خیال کر مجھے چھوڑ)

(روح البیان)

☆ "وقیل لعمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اتق اللہ فوضع خدہ علی الارض تواضعاللہ تعالی"

ایک دن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کسی نے کہا " اتق اللہ " (اللہ سے ڈر) تو آپ نے یہ الفاظ مبارکہ سنتے ہی اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی سے اپنے رخسار زمین پر رکھ دیئے۔ (روح البیان)

ہارون الرشید کا خوف خدا:

ایک یہودی کو ہارون الرشید سے کوئی کام تھا، اس کا کوئی مطالبہ تھا، لیکن ایک سال میں اس نے کئی چکر لگا دیئے، ہارون الرشید تک اس کی پہنچ نہ ہوسکی اور نہ ہی اس کی حاجت کو پورا کیا گیا، ایک دن وہ یہودی ہارون الرشید کے دروازہ پر کھڑا ہوگیا، جو وہ دروازے سے باہر نکلا تو یہ دوڑ کر آگے آ گیا اور کہنے لگا۔

" اتق الله يا امير المو منين "

اے امیر المومنین اللہ سے ڈرو۔

ہارون اپنی سواری سے اترا اور سجدہ میں گر گیا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو اس کی حاجت کو پورا کرنے کا حکم دیا، تو کچھ درباریوں نے کہا، اے امیر المومنین! ایک یہودی کی بات پر تم سواری سے اتر آئے؟ اس نے کہا اصل وجہ یہ نہیں، چونکہ اس نے جب مجھے کہا "اتق الله " تو مجھے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یاد آ گیا" **و اذا قيل له اتق الله**" الخ (قرطبی)

☆☆☆☆☆

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ☆

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۰۷)

﴿۱﴾

اور کوئی آدمی اپنی جان بیچتا ہے اللہ کی مرضی چاہنے میں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

﴿۲﴾

اور جو شخص سودا کرتا ہے اپنی جان کا طلب کرتے ہوئے رضاء اللہ کی، اور اللہ مہربان ہے بندوں پر۔

شانِ نزول میں چند وجوہ:

شانِ نزول میں اگر چہ مفسرین کرام نے چند وجوہ بیان کی ہیں، تاہم راقم کے نزدیک وہ تمام وجوہ پہلے درپیش آئیں اور آیہ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا، جو سب کو شامل ہے۔

(۱) حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے جب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف نبی کریم ﷺ کی ملاقات کی غرض سے ہجرت کی، تو قریش نے ان کا پیچھا کیا، اسی طرح عمار بن یاسر اور ان کی والدہ سمیہ اور ان کے باپ یاسر اور حضرت بلال اور خباب بن ارت اور حضرت ابوذر اور عابس رضی اللہ عنہم کو کفار نے اپنے گھیرے میں لے لیا اور ان کو عذاب دیا، حضرت ابوذر اور خباب بن ارت تو بھاگ کر نکل گئے اور مدینہ طیبہ میں پہنچ گئے، اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو مشرکین نے دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر اونٹوں کو ہانک دیا، اس طرح وہ شہید ہو گئیں اور حضرت یاسر کو بھی شہید کر دیا اور دوسرے حضرات نے مشرکین کے مطالبہ پر کچھ مال دے کر اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اور حضرت صہیب رومی......

فنزل عن راحلته ونثر ما فی کنانته واخذ قوسه ثم قال یامعشر قریش، لقد علمتم انی من ارماکم رجلا وایم الله لا تصلون الی حتی ارمی بما فی کنانتی ثم اضرب بسیفی مابقی فی یدی منه شئ ثم افعلوا ما شئتم"

اپنی سواری سے اتر آئے اور اپنے ترکش سے تیر پھیلا دئے اور کمان کو ہاتھ میں پکڑا، پھر قریش کو کہا تمہیں معلوم ہے کہ میں تم تمام سے زیادہ تیر اندازی میں ماہر ہوں۔ قسم ہے اللہ تعالی کی تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے جب تک میرے ترکش میں تیر ہیں، اس وقت تک تو میں تیر پھینکوں گا، پھر تلوار ہاتھ میں لوں گا، جب تک میرے ہاتھ میں تلوار ہوگی، اس وقت تک تلوار سے خوب قتال کروں گا۔ پھر تم جو چاہو کر لینا۔

پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں ایک بوڑھا شخص ہوں، میں تم میں رہوں یا تمہارے دشمن کے پاس رہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

" فقالوا دلناعلی بیتک ومالک بمکة ونخلی عنک "

تو انہوں نے کہا تم ہمیں مکہ میں اپنے گھر اور مال کی راہنمائی کردو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔

آپ نے کہا ٹھیک ہے تم میرے ساتھ معاہدہ کرو کہ تم مجھے نبی کریم ﷺ کے پاس جانے دو گے، رکاوٹ نہیں بنو گے، تو میں اپنے مال پر تمہیں مطلع کر دیتا ہوں، تم میرا مال لے لو، انہوں نے آپ سے معاہدہ کرلیا، آپ نے ان کو مال کا پتہ بتا دیا۔

اس طرح یہ بھی جان خلاصی کرا کے مدینہ طیبہ پہنچ گئے، جب آپ مدینہ طیبہ پہنچے تو سب سے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے ان کو سودے کی مبارک دی، انہوں نے پوچھا تمہیں کیسے علم حاصل ہوا؟ تو انہوں نے بتایا کہ قرآن پاک کی آیۃ نازل ہو چکی ہے (وہ یہی آیت تھی) پھر ان کی ملاقات نبی کریم ﷺ سے ہوئی تو آپ نے فرمایا" ایا یحیی ربح البیع ربح البیع " اے ابو یحییٰ (یہ صہیب کی کنیت ہے) بڑا نفع مند سودا ہوا، بڑا نفع مند سودا ہوا۔ (از کبیر و روح المعانی)

(۲) شان نزول کی اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ آیۃ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی کہ ہجرت کی رات اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر آپ نبی کریم ﷺ کی چارپائی اور بستر پر سو گئے تا کہ لوگوں کی امانتیں واپس کر کے آپ میں آ جائیں، جب آپ نبی کریم ﷺ کی چارپائی اور بستر پر سوئے ہوئے تھے۔

" قام جبرئيل عليه السلام عند رأسه و ميكائيل عندر جليه و جبريل ينا دى بخ بخ من مثلک يا ابن ابی طالب يبا هی الله بک الملا ئکة و نزلت الآية "

توجبریل آپ کے سر کے پاس کھڑے ہو گئے اور میکائیل پاؤں کے پاس کھڑے ہو گئے، جبریل آپ کو پکار کر کہہ رہے تھے، اے ابن ابی طالب! تمہارے لئے خوشی کا مقام ہے' اللہ تعالیٰ تمہاری وجہ سے فرشتوں پر فخر کر رہا ہے۔ تو اس واقعہ کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ (رازکبیر)

(۳) اس آیۃ کریمہ کی وجہ حضرت عمر' حضرت علی' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے یہ بیان فرمائی کہ یہ آیت ہر اس شخص کے متعلق نازل ہوئی جس کو " امر بالمعروف و نهی عن المنکر " (اچھے کام کا حکم دینا اور برے کام سے روکنے) کی وجہ سے تکالیف دی گئیں۔ (قرطبی)

(۴) تفسیر کواشی میں ہے کہ یہ آیۃ حضرت زبیر بن عوام اور آپ کے دوست مقداد بن اسود کے متعلق نازل ہوئی، اس لئے کہ جب حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو اہلِ مکہ نے سولی پر چڑھا دیا تو حضور ﷺ نے فرمایا۔

" من ينزل خبيبا عن خشبة فله الجنة " جو شخص خبیب کو سولی سے اتارے گا اس کے لئے جنت ہے۔

تو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ میں اور میرے دوست مقداد ان کو اتاریں گے، انہوں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ان کو سولی سے اتارا تو ان کے حق میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(روح المعانی)

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ:

"عن ابی هريرة قال بعث النبی ﷺ سرية عينا و أمّر عليهم عاصم بن ثابت و هو جد عاصم بن عمر الخطاب فانطلقوا حتی اذا كانوا بين عسفان ومكة ذكروا الحی من هذيل يقال لهم بنو لحيا ن فتبعوهم بقريب من ما ئة رام فاقتفوا آثارهم حتی اتوا منزلا نزلو ه فوجدوا فيه لجز االی فد فدو جاء القو م فا حاطوا بهم فقا لوا لكم العهد و الميثاق ان نزلتم الينا ان لا نقتل منكم رجلا فقال عاصم اماأنا فلا انزل فی ذمة كافر اللهم اخبر عنارسولک فقاتلو هم

فرموهم حتی قتلوا عاصما فی سبعة نفر بالنبل وبقی خبیب وزید ورجل آخر فاعطوهم العهد و المیثاق فلمانزلوا الیهم فلما استمکنوا منهم حلوا اوتار قسیهم فربطوهم بها فقال الرجل الثالث الذی معهم هذا أول الغدر فابی ان یصحبهم فجروه وعالجوه علی ان یصحبهم فلم یفعل فقتلوه وانطلقوا بخبیب وزید حتی باعوهما بمکة فاشتری خبیبا بنو الحارث بن عامر بن نوفل وکان خبیب هو الذی قتل الحارث یوم بدر فمکث عندهم اسیرا حتی اذا اجتمعوا علی قتله استعار موسی من بعض بنات الحارث یستحد بها فاعارته قالت فغفلت عن صبی لی فدرج الیه حتی اتاه فوضعه علی فخذه فلما رأیته فزعت فزعة عرف ذلک منی وفی یده الموسی فقال اتخشین منی ان اقتله ما کنت لأفعل ذلک ان شاء اللہ تعالی وکانت تقول ما رأیت اسیرا قط خیرا من خبیب لقد رأیته یأکل من قطف عنب وما بمکة یومئذ ثمرة وانه لموثق فی الحدید وما کان رزقا الا رزقه اللہ خبیبا فلما خرجوا به من الحرم لیقتلوه قال دعونی اصلی رکعتین فصلی رکعتین ثم انصرف فقال لو لا ترون ان ما بی جزع من الموت لزدت فکان اول من سن رکعتین عند القتل وقال اللهم احصهم عددا، وقال

فلست ابالی حین اقتل مسلما ۔۔۔ علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی

وذلک فی ذات الاله وان یشأ ۔۔۔ یبارک علی اوصال شلو ممزع

ثم قام الیه عقبة بن الحارث فقتله وبعث قریش الی عاصم لیؤتوا بشیئ من جسده بعد موته وکان قتل عظیما من عظمائهم یوم بدر فبعث اللہ علیه مثل الظلة من الدبر فحمته من رسلهم فلم یقدروا منه علی شیئ" (بخاری)

زاد فی روایة واخبر یعنی النبی ﷺ اصحابه یوم اصیبوا خبرهم"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے سریہ (رجیع) کے موقع پر (کفار کے مطالبہ پر کہ ہم نے اسلام قبول کرلیا ہے ہماری رہنمائی کے لئے کچھ اصحاب کو بھیجیں) دس صحابہ کرام کو بھیجا، جن پر

امیر عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، یہ عاصم بن ثابت عاصم بن عمر بن خطاب کے نانا تھے۔
یہ حضرات چلے جب عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو بنی ہذیل کو ان کے متعلق پتہ چلا، بنو ہذیل کو بنی لحیان بھی کہا جاتا ہے اس قبیلہ کے ایک سو تیر انداز (اور ایک سو غیر مسلح) لوگوں نے ان کا پیچھا کیا، ان کے اور ان کی سواریوں کے قدموں کے نشانات کو دیکھتے ہوئے وہ لوگ وہاں پہنچ گئے جہاں یہ ٹھہرے ہوئے تھے، ان لوگوں نے کھجور کی ایک گٹھلی کو اٹھایا تو کہنے لگے کہ یہ گٹھلی تو یثرب (مدینہ طیبہ) کی کھجور کی ہے، یہ مدینہ سے ہی آئے ہیں، آخر کار وہ ان کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔
جب عاصم اور ان کے ساتھیوں نے ان کفار کو دیکھا تو ایک ٹیلے کی پناہ لی (تو ایک ٹیلے پر چڑھ گئے) کفار نے ان کا احاطہ کرلیا، اور کہا کہ ہم تمہارے ساتھ پختہ عہد کرتے ہیں کہ اگر تم ہماری طرف اتر کر آجاؤ تو ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے، حضرت عاصم نے کہا میں تو کسی کافر کا ذمی بن کر (کافر کی پناہ میں آکر) نہیں اترتا، (رب تعالی کے حضور دعاء کی) اے اللہ ہماری طرف سے اپنے رسول کو خبر پہنچادے۔
انہوں نے کفار سے لڑائی کی، تیر مارے یہاں تک کہ حضرت عاصم اور ان دوسرے چھ ساتھی یعنی کل سات کی تعداد میں صحابہ کرام شہید ہو گئے۔ اور حضرت خبیب اور زید اور ایک صحابی باقی رہ گئے۔ ان سے کفار نے پھر وعدہ کی پیش کش کی کہ تم اتر آؤ، ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے، انہوں نے ان کے وعدہ کا اعتبار کرلیا، یہاں تک کہ ٹیلے سے اتر آئے، کفار جب ان کو پکڑنے پر قادر ہو گئے تو انہوں نے اپنی کمانوں کے چمڑے کے دھاگے کھول کر ان کو باندھ لیا۔ تیسرے صحابی کہنے لگے یہ ان کا پہلا غدر (دھوکہ) ہے، میں تو ان کے ساتھ نہیں جاؤں گا، انہوں نے گھسیٹا، اور پھر دھوکہ دے کر اپنے ساتھ چلانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا، کفار نے ان کو بھی شہید کر دیا۔
خبیب اور زید رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر چلے اور ان کو مکہ میں جا کر بیچ دیا، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن نوفل کے بیٹوں نے خرید لیا، کیونکہ خبیب نے حارث کو بدر میں قتل کر دیا تھا۔ ان کا

خبیب کو قتل کرنے پر اتفاق ہو گیا۔ تو خبیب نے حارث کی ایک بیٹی سے استرہ عاریۃ طلب کیا تا کہ آپ زیر ناف بال صاف کر لیں۔ تو اس نے ان کو استرہ عاریۃ دے دیا۔

وہ حارث کی بیٹی کہتی ہے اس دوران میری غفلت سے میرا چھوٹا بچہ خبیب کے پاس چلا گیا' خبیب نے اسے اپنی ران پر بٹھالیا' میں خبیب کے ہاتھ میں استرہ دیکھ کر بہت زیادہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئی۔ خبیب نے میری پریشانی کو دیکھ کر کہا، کیا تم ڈر رہی ہو کے میں بچے کو قتل کر دوں گا' میں انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں کروں گا' حارث کی بیٹی کہتی تھی میں نے خبیب جیسا بہتر کوئی نہیں دیکھا (سبحان اللہ کیا شان ہے صحابہ کرام کی، کہ وہ قتل کرنے کی تیاری کر رہے ہیں لیکن خبیب کہتے ہیں میرے نبی کریم ﷺ نے میدان جنگ میں بھی بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے تو میں کیوں قتل کروں)

حارث کی بیٹی کہتی ہے کے میں نے خبیب کو انگور کا خوشہ کھاتے ہوئے دیکھا، حالانکہ اس وقت مکہ میں انگور کا پھل موجود نہیں تھا' خبیب کو لوہے کی بیڑیاں لگی ہوئی تھی' کھانے پینے کی کوئی چیز ان کو نہیں دی جارہی تھی لیکن اللہ تعالی ان کو رزق عطاء کر رہا تھا۔

جب حارث کے بیٹے آپ کو شہید کرنے کی غرض سے حرم سے باہر لے جا رہے تھے تو آپ نے کہا مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے کی اجازت دو انہوں نے اجازت دی، تو آپ نے دو رکعت مختصر طور پر ادا کیں' اور ساتھ یہ کہا کہ اگر مجھے یہ خیال نہ آتا کہ تم کہو گے میں موت سے گھبرا رہا ہوں تو میں نماز کو لمبا کرتا۔

شہادت کے وقت دو رکعت نماز ادا کرنے کو سب سے پہلے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے ہی رواج دیا۔

پھر آپ نے کہا اے اللہ! ان سب کو شمار کر لے (یعنی ان کو تباہ برباد کر دے' آپ کی دعا کا ہی اثر تھا کہ حارث کے تمام بیٹے جو آپ کو شہید کرنے میں شریک تھے تھوڑے ہی عرصہ میں ذلت کی موت مرے)

پھر آپ نے یہ شعر پڑھے۔

'' ترجمہ'' مجھے کوئی پرواہ نہیں میں حالت اسلام میں شہید ہو رہا ہوں۔ جس جانب بھی میں گر اوہ

اللہ کی رضا کے لئے ہوگا۔ جب میری شہادت اللہ کی رضاء کے لئے ہے تو ان شاء اللہ وہ میرے جسم کے ٹکڑوں اور جوڑوں پر برکت نازل فرمائے گا۔

پھر عقبہ بن حارث نے آپ کو شہید کر دیا۔

قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کے وہ عاصم کے جسم کا ٹکڑا کاٹ کر لائیں (تاکہ وہ ان کا کر دل کی پیاس بجھائیں) کیونکہ عاصم نے بھی ان کے ایک بڑے سر کردہ شخص کو بدر میں قتل کیا تھا۔ لیکن جب وہ لوگ حضرت عاصم کی لاش کے پاس آئے تو اللہ تعالی نے شہد کی مکھیوں اور بھڑ کو ان کی لاش کی حفاظت کے لئے بھیج دیا' جنہوں نے ان کے جسم پر سایہ کر دیا، کفار ان کے جسم کا حصہ کاٹنے میں ناکام رہے۔

ایک اور روایت میں ہے کے نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں ان صحابہ کرام سے در پیش آنے والے واقعہ کی خبر دے رہے تھے کہ اب فلاں کو شہید کیا جا رہا ہے اب فلاں کو۔

تنبیہ : بخاری شریف کی اس روایت کے بغیر اور روایات میں واقعہ کی تفصیل کچھ مزید بھی ہے۔

بنو حارث جب حضرت خبیب رضی اللہ تعالی عنہ کو حرم سے باہر تنعیم میں لے گئے تو انہوں نے کہا کہ خبیب کو زندہ ہی سولی پر لٹکا دیا جائے تو جب آپ کو سولی پر لٹکا دیا گیا' تو آپ نے رب تعالی کے حضور عرض کیا۔

" اللهم انک تعلم انه ليس لی احد حولی يبلغ سلامی رسولک فابلغه سلامی "

اے اللہ تو جانتا ہے کہ بیشک کوئی شخص میرے ارد گرد ایسا نہیں جو میرا اسلام تیرے رسول ﷺ کو پہنچائے اس لئے تو ہی میرا اسلام پہنچا دے۔

تو ابو میسرہ سلامان نے آپ کے سینہ پر نیزہ رکھا تو آپ نے فرمایا "اتق الله" اللہ سے ڈر۔
لیکن اس نے کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ کے سینہ میں نیزہ گاڑ دیا۔ ادھر عقبہ بن حارث نے شہید کر دیا۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو حضرت خبیب کی شہادت اور سولی پر چڑھائے جانے کی خبر دی، اور یہ فرمایا کہ جو شخص خبیب کو سولی سے اتارے گا، اس کے لئے جنت ہے۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ (نبی کریم ﷺ کی پھوپھی کے بیٹے) نے عرض کیا میں اور میرے دوست مقداد بن اسود اتاریں گے۔ یہ چلے گئے، رات کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے، ایک رات مکہ مکرمہ کے مقام تنعیم میں پہنچ گئے، سولی کے اردگرد چالیس مشرکین پہریدار موجود تھے، لیکن وہ سب سوئے ہوئے تھے، حضرت زبیر نے خبیب کو سولی سے اتارلیا۔

" فاذاھو رطب ینثنی ولم یتغیر منه شئی بعد اربعین یوما ویده علی جراحته وھی تبض دما اللون لو ن الدم والریح ریح المسک "

چالیس دن گزر چکے تھے، لیکن حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا جسم تروتازہ تھا، خون رس رہا تھا، حضرت زبیر کا ہاتھ آپ کے زخم پر پڑا تو آپ کا ہاتھ خون آلود ہوگیا۔ اور آپ کے جسم سے کستوری کی خوشبو آرہی تھی۔

حضرت زبیر نے اپنے ساتھ گھوڑے پر حضرت خبیب کے جسم کو سوار کرلیا، ادھر کفار جاگے تو خبیب کو نہ پایا، قریش کو مطلع کیا تو ستر شخص اپنے گھوڑوں پر سوار ہوکر چلے یہاں تک کہ حضرت زبیر کے قریب پہنچ گئے۔

تو حضرت زبیر نے گھوڑے سے اتار کر حضرت خبیب کے جسم کو زمین پر رکھ دیا۔

" فابتلعه الارض فسمی بلیع الارض "

تو آپ کو زمین نے نگل لیا، اسی وجہ سے آپ کو " بلیع الارض " کہا جاتا ہے۔

پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے قریش کو کہا اے قریش کی جماعت! تمہیں ہم پر کیسے جرأت حاصل ہوئی، پھر آپ نے اپنے سر سے پگڑی کو اتارا کہ یہ لوگ مجھے دیکھ لیں، آپ نے فرمایا میں زبیر بن عوام ہوں اور میری ماں صفیہ بنت عبدالمطلب ہیں، اور میرے یہ دوست میرے ساتھ مقداد بن اسود ہیں۔

"(هما)اسدان ضاريان يد فعان عن اشبا لهما فان شئتم نا ضلتكم و ان شئتم نا زلتكم
و ان شئتم انصر فتم فانصرفوا الی مکۃ"

پھر آپ نے انہیں کہا زبیر اور مقداد دونوں ہی حملہ آور شکار کرنے والے شیر ہیں، وہ اپنے مقابل بچوں کو بھگا دیتے ہیں، اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہیں تیروں سے چھلنی کر دیتا ہوں اور اگر تم چاہتے ہو تو میں مقابلہ کے لئے سواری سے نیچے اتر آتا ہوں تا کہ دو دو ہاتھ کر لئے جائیں۔ اگر اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ، وہ واپس مکہ چلے گئے۔

جب حضرت زبیر اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو جبرئیل آئے اور کہنے لگے

"یا محمد ان الملا ئکۃ لتباھی بھذین من اصحابک "

یارسول اللہ بے شک فرشتے آپ کے ان دونوں صحابیوں کی بہادری اور جرأت پر تعجب کر رہے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد یہ آیۃ نازل ہوئی۔ (از خازن)

حضرت زید رضی اللہ عنہ کی شہادت:

حضرت زید بن دشنہ رضی اللہ عنہ کو صفوان بن امیہ نے خرید لیا تا کہ آپ کو اپنے باپ کے بدلے میں شہید کر سکے، کیونکہ اس کا باپ امیہ بن خلف بھی قتل کر دیا گیا تھا۔

صفوان نے اپنے غلام نسطاس کے ساتھ زید بن دشنہ کو تنعیم کی طرف بھیجا تا کہ انہیں شہید کر دیا جائے۔ جب آپ کو تنعیم میں لیا جایا گیا وہاں قریش کے کچھ لوگ جمع ہو گئے، جن میں ابوسفیان بن حرب بھی تھا۔ جب زید کو قتل کی جگہ کھڑا کر دیا گیا، تو ابوسفیان نے کہا، اے زید! میں تم سے اللہ کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں۔

" اتحب محمداعندنا الآن مکانک یضرب عنقه و انک فی اھلک"

کیا تم اس وقت میں یہ پسند کرتے ہو کہ تمہاری جگہ ہمارے پاس محمد ہوتے ان کی گردن اڑا دی جاتی اور تم اپنے اہل وعیال میں ہوتے۔

"فقال زید واللہ ماا حب ان محمد الآن فی مکا نہ الذی ھو فیہ تصیبہ شوکۃ تؤذیہ وانا جالس فی اھلی"

حضرت زید بن دثنہ نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مجھے تو اتنا بھی پسند نہیں کہ میری جگہ محمد ہوتے اور ان کو کوئی کانٹا چبھ جاتا اور ان کو تکلیف دیتا اور میں اپنے اہل وعیال میں بیٹھ کر بچ جاتا۔

"فقال ابو سفیان مارأیت احد ایحب احد کحب اصحاب محمد محمدا"

ابوسفیان نے کہا میں نے کسی ایک کو کسی سے ایسی محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جیسی محبت محمد کے اصحاب محمد سے کرتے ہیں۔

اس مکالمہ کے بعد حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو نسطاس نے شہید کر دیا۔

" ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ "

اور جو شخص سودا کرتا ہے اپنی جان کا طلب کرتے ہوئے رضاء اللہ کی۔

شراء کا معنی بیچنا بھی ہے اور خریدنا بھی۔ عام مفسرین کرام اور مترجمین نے "بیچنا" ہی مراد لیا ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد گرامی ہے "وشروہ بثمن بخس "اور انہوں نے بیچا کھوٹے سکوں سے۔

اس مقام میں بھی " شروہ " بیچنے کے معنی میں استعمال ہے۔

"وتحقیقہ ان المکلف باع نفسہ بثواب الآخرۃ وھذا البیع ھوانہ بذلھا فی طاعۃ اللہ من الصلوۃ والصیام والحج والجھاد ثم توصل بذلک الی وجد ان ثواب اللہ، کان مایبذلہ من نفسہ کالسلعۃ وصار الباذل کالبائع واللہ کالمشتری"

تحقیق یہ ہے کہ مکلف اپنے نفس کو آخرت کے ثواب کے بدلے بیچتا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے نماز ادا کرنے میں اور روزہ رکھنے میں اور حج ادا کرنے میں اور جہاد کرنے میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے اور اس کے بدلے ثواب حاصل کرتا ہے جس طرح بیچنے والا اپنا سامان دیتا ہے اسی طرح یہ اپنی جان خرچ کر رہا ہے یہ شخص بیچنے والا ہوا اور اللہ تعالیٰ

اسے ثواب عطا کر کے اس کی جان کو خرید نے والا ہوا۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

" ان اللہ اشتری من المو منین انفسھم و امو الھم بان لھم الجنۃ " (التوبۃ، ۱۱۱)

بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لئے ہیں اس بدلے پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔ یعنی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو مشتری کہا ہے اور مومنین کو بائع۔

شراء کا معنیٰ خریدنا:

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔" وعندی انہ یمکن اجراء لفظۃ الشراء علی ظاھرھا "

میرے نزدیک " ومن الناس من یشری "میں شراء کا ظاہری معنیٰ (خریدنا) لینا بھی ممکن ہے۔

کیونکہ انسان جب کفر اختیار کرتا ہے اور فسق میں اور دنیاوی مشاغل اور منافع میں زندگی گزارتا ہے اور آخرت سے اعراض کرتا ہے تو دائمی عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

اور کفر سے باز رہ کر اور نیکیوں میں مشغول ہو کر اور آخرت کے لئے کام کر کے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچالیتا ہے۔" وصار کانہ اشتری نفسہ من العذاب و النار "

تو گویا کہ یہ شخص عذاب اور آگ کے بدلے اپنے نفس کو خریدنے والا ہو گیا۔ (رازی کبیر)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے جمہور مفسرین کرام کی تحقیق کے مطابق "یشری" کا معنیٰ "بیچنا" کیا ہے۔

لیکن راقم نے علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کو دیکھ کر طلباء کے فائدے کے لئے ترجمہ کیا ہے، ,,جو شخص سودا کرتا ہے" تاکہ یہ دونوں معنیٰ کو شامل ہو جائے، کیونکہ جو شخص بیچتا ہے وہ بھی سودا کرتا ہے اور جو شخص خریدتا ہے وہ بھی سودا کرتا ہے۔

"ابتغاء مرضات اللہ،ای طلبالرضاہ"اللہ تعالیٰ کی رضامندی طلب کرتے ہوئے۔(روح المعانی)

"واللہ روف بالعباد" اور اللہ مہربان ہے بندوں پر۔

"ای المؤمنین حیث ارشدهم لما فیه رضاه"

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے، اس کی مہربانی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو وہ راہ دکھاتا ہے جس راہ پر چلنے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی پائی جاتی ہے۔

"وجعل النعیم الدائم جزاء العمل المنقطع"

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ وہ ختم ہو جانے والے اعمال کی جزاء دائمی نعمتیں عطاء کرتا ہے۔

"واثاب علی شراء ملکه بملکه"

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کے وہ بندوں کی جان خریدتا ہے اور جنت عطاء کرتا ہے جبکہ بندوں کی جان بھی اس کی ملکیت میں ہے اور جنت کا بھی وہی مالک ہے۔ (روح المعانی)

سبحان اللہ! رب تعالیٰ اپنے بندوں پر کتنا مہربان ہے کہ اپنی ملکیت چیز خرید کر اس کے بدلے میں بہت بڑا ثمن عطا کر رہا ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی خریدار نہیں کہ اپنی چیز لے کر بدلے میں بھاری رقم ادا کرے۔

"ومن رأفته جوزلهم کلمة الکفر ابقاء علی النفس"

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کے کفار سے کفریہ کلمات سن کر بھی ان کو زندہ رکھتا ہے۔

"ومن رأفته انه لا یکلف نفسا الا وسعها"

یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کے وہ کسی نفس کو طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

"ومن رأفته ورحمته ان المصر علی الکفر مائة سنة اذا تاب ولو فی لحظة اسقط کل ذلک العقاب واعطاه الثواب الدائم"

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور رحمت ہے کہ سو سال تک بھی کفر پر قائم رہنے والے اور کفر پر اصرار کرنے کے باوجود اگر وہ شخص سچے دل سے توبہ کرے اور ایک لحظہ (آنکھ جھپکنے کی مقدار) میں اس کا عذاب ختم کر دے اور اسے دائمی ثواب عطا کر دے۔ (کبیر)

آیۃ کریمہ میں عموم:

اگر چہ شانِ نزول کے لئے تو چند واقعات خاص ہیں، لیکن آیۃ کریمہ اپنے الفاظ کی عمومیت کی وجہ سے حکم عام ہی رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" اذا عرفت هذا فنقول يد خل تحت هذ ا كل مشقة يتحملها الانسان فی طلب الدين فيد خل فيه المجاهد ، ويد خل فيه البا ذل مهجته الصابر علی القتل كما فعله ابو عمار وامه ويد خل فيه الآبق من الكفار الی المسلمين ويد خل فيه المشتری نفسه من االكفار بماله كما فعل صهيب ويد خل فيه من يظهر الدين و الحق عند السلطان الجابر"
(كبير)

جب تمہیں آیۃ کریمہ کی تفسیر کا پتہ چل گیا تو ہم کہتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ میں ہر وہ شخص داخل ہے جو دین کی طلب میں کسی قسم کی مشقت اٹھائے، اس لئے جہاد کرنے والے مومنین بھی اس آیۃ میں داخل ہیں، کفار کے ظلم وستم کو برداشت کرتے ہوئے صبر اور خوشی سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے والے بھی اس آیۃ میں داخل ہیں۔ جیسا کہ ابوعمار اوران کی والدہ نے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضامندی کے لئے جان دے دی۔

اور کفار سے بھاگ کر مسلمانوں کی طرف آنے والے یعنی اللہ کی رضا کی خاطر ہجرت کرنے والے بھی اس آیۃ میں داخل ہیں اور اپنا مال دے کر اپنی جان کو بچا کر مسلمانوں سے جا کر مل جانے والے بھی اس آیۃ کریمہ میں داخل ہیں۔ جیسا کہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے اپنا مال کفار کے حوالے کر کے اپنی جان بچا کر نبی کریم ﷺ سے مل گئے۔ اور ظالم بادشاہ کے سامنے دین کی بات کرنے والے اور کلمہ حق کہنے والے بھی اس آیت میں داخل ہیں۔

☆ **"عن ابی سعيد قال قال رسول الله ﷺ من اعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر اخرجه الترمذی وقال حديث حسن غريب ،،**

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔ (خازن)

" وروی ان عمر رضی اللہ عنہ بعث جیشافحاصروا قصرا فتقدم منهم واحد فقاتل حتی قتل فقال بعض القوم القی بیده الی التهلکه فقال عمر کذبتم رحم اللہ ابا فلان وقرأ "ومن الناس من یشری نفسه ابتعاء مرضات اللہ "

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر بھیجا لشکر نے کفار کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا لشکر میں سے ایک شخص آگے بڑھا، کفار پر حملہ کر دیا، ان سے لڑائی کرتے ہوئے شہید ہو گیا، تو کچھ حضرات کہنے لگے اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے، یعنی اکیلا حملہ کرنے میں مقتول ہو جانا واضح تھا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم جھوٹ کہہ رہے ہو اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے، اس نے تو اپنی جان کا سودا رب تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے رب سے کیا ہے، پھر آپ نے بطور دلیل اسی آیت کریمہ کو پیش کیا۔

"ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات اللہ " (کبیر)

فائدہ جلیلہ:

"واعلم ان المومنین باعوا باختیارهم انفسهم فکان ثمن نفس المومنین الجنة اما الاولیاء فانهم باعوا باختیار هم انفسهم فکان ثمن الاولیاء مرضاة اللہ تعالی، وبینهما فروق کثیرة"

بیشک مومنین جب اپنے اختیار سے اپنی جان کا سودا کرتے ہیں تو اس کی قیمت انہیں جنت حاصل ہوتی ہے اور اولیاء کرام جب اپنی جان کا سودا کرتے ہیں تو ان کو اس کی قیمت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

راہ سلوک کی منازل طے کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اپنے بشری وطن سے نکل جائے اور اپنے ساتھیوں کے

شہروں سے نکل کر مسافر ہو جائے۔

"حتی یکون مجاهدا حقیقیا و شهیدا معنویا"

تا کہ حقیقی مجاہد بن جائے اور شہادت معنوی حاصل ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا "طوبی للغرباء" مسافرین کے لئے کامیابی اور جنت ہے۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا " من مات غریبا فقد مات شهیدا " جو مسافری کی حالت میں فوت ہو جائے وہ شہید ہے۔

اس مسافری سے کیا مراد ہے؟" الانقطاع من الخلق الی الخالق " اس سے مراد یہ ہے کہ مخلوق سے توجہ ہٹا کر خالص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے۔ یہ مقام اسی وقت حاصل ہو گا جب عام لوگوں کی عادات کو چھوڑ دے اور عام لوگوں کی طرح اس میں خواہشات نہ پائی جائیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" یا انس ان استطعت ان تکون ابدا علی وضوء فافعل فان ملک الموت اذا قبض روح العبد وهو علی وضوء کتب له شهادة "

اے انس! اگر تم طاقت رکھو، ہمیشہ وضوء پر رہنے کی تو وضوء پر رہو، کیونکہ ملک الموت (موت کا فرشتہ) جب بندے کی روح قبض کرتا ہے، اس وقت اگر بندہ وضو میں ہو تو اس کے لئے شہادت کا مرتبہ لکھ دیا جاتا ہے۔

اس حدیث میں بھی نبی کریم ﷺ کا اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے انفصال ہو، اور رب تعالیٰ سے اتصال ہو۔

"کما ان الصلوة اشارة الی الاتصال بالله تعالی"

جس طرح نماز میں انسان باقی تمام چیزوں سے توجہ ہٹا کر اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کئے ہوتا ہے۔

اور ارشاد مصطفوی ہے۔" دم علی الطهارة یوسع علیک الرزق"

تم ہمیشہ طہارت پر رہو تمہارے رزق میں وسعت پائی جائے گی۔

ظاہری طہارت ظاہری رزق کی وسعت کا سبب ہے اور باطنی طہارت باطنی رزق کی وسعت کا سبب ہے۔

باطنی طہارت یہی ہے کہ دل اور اشیاء (چیزوں) سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف لگا دے، اور معنوی رزق یہ ہے کہ معرفت حاصل ہو، الہام ہو جائے، خواب میں بشارت حاصل ہو جائے، کشف حاصل ہو، وغیرہا۔

" وعند ذلک یحی القلب بالحیوۃ الطیبۃ وتموت النفس عن صفاتھا ولیس ذلک الا اثر الجھاد الحقیقی فمن تخلص من قید النفس ومات بالاختیار فھو حی ابدا"

جس شخص کو یہ مقام حاصل ہو گیا، یعنی اسے معنوی طہارت حاصل ہو گئی، اس کے دل کو حیاتِ طیبہ حاصل ہو گئی اور اس کا نفس صفاتِ ذمیمہ (بری خواہشات وغیرہ) سے بچ گیا، گویا کہ نفس کو موت حاصل ہو گئی اور دل کو حیات مل گئی، یہی جہادِ حقیقی یعنی جہادِ اکبر کے اثرات ہیں، جو شخص نفس کی قید سے چھوٹا اور اپنے اختیار سے نفس کو موت دی وہی حقیقی زندگی پا گیا۔

مولانا رومی رحمہ اللہ مثنوی میں تحریر فرماتے ہیں۔

ای بسا نفس شہید معتمد

مردہ در دنیا وزندہ می رود

کتنے ہی نفوس کے شہید ہونے پر کامل اعتماد ہو سکتا ہے۔ وہ دنیا میں مردہ سمجھے جاتے ہیں اور حقیقت میں زندہ ہو کر جا رہے ہوتے ہیں۔ (از روح البیان)

☆☆☆☆☆

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۰۸)

۱

اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو، اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۲

اے ایمان والو! داخل ہوا اسلام میں کامل طور پر، اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی، بے شک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا۔

شانِ نزول:

اس آیۂ کریمہ میں بھی شانِ نزول کی چند وجوہ ہیں، جو تمام ہی مجموعی طور پر معتبر ہیں۔

(۱) یہ آیۂ کریمہ منافقوں کے متعلق نازل ہوئی، کیونکہ اس سے پہلے "ومن الناس من يعجبك" آیۂ بھی منافق کے متعلق نازل ہوئی۔ اس آیۂ کریمہ میں منافقوں کو نفاق چھوڑنے اور دل سے ایمان لانے کے متعلق کہا گیا۔ اب آیۂ کریمہ کا مفہوم یہ ہو گیا۔

"یایھا الذین امنوا بالسنتکم ادخلوا بکلیتکم فی الاسلام و لا تتبعوا خطوات الشیطن ای آثار تزیینه وغروره فی الاقامة علی النفاق"

اے زبان سے ایمان لانے والو! دل سے بھی ایمان لاؤ، اور مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو، شیطان جو تمہارے لئے کفر یہ راہ مزین کرتا ہے اور منافقت پر قائم رہنے کے لئے تمہیں دھوکا دیتا ہے، اس راہ پر نہ چلو، کیونکہ شیطان کے قدموں کے نشانوں پر چلنا بہت برا ہے۔ لہٰذا شیطان کی پیروی نہ کرو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

(۲) یہ آیۃ کریمہ اہلِ کتاب کے لئے نازل ہوئی، جنہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لایا۔
اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اے اہلِ کتاب جو تم نے پہلی کتابوں پر ایمان لایا ہے، اسلام میں بھی مکمل طور پر داخل ہو جاؤ، کیونکہ تمہارا اپنی کتابوں پر بھی ایمان اسی وقت مکمل ہوگا جب ان کتابوں کے اس حکم پر ایمان لاؤ گے کہ تمام انبیاء کرام اور تمام آسمانی کتب پر ایمان لاؤ۔
لہٰذا محمد ﷺ پر ایمان لاؤ اور قران پاک پر ایمان لاؤ، تا کہ اسلام میں تم مکمل طور پر داخل ہوسکو۔
" ولا تتبعوا خطوات الشیطن فی تحسینه عند الاقتصار علی دین التوراۃ"
شیطان جو تمہیں توراۃ پر ہی فقط ایمان لانے کی راہ حسین وجمیل کر کے دکھاتا ہے تم اس کی تابعداری نہ کرو۔

(۳) آیۃ کریمہ کے شانِ نزول کی اور وجہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالی عنہ اور ان کے ساتھی جو یہودیت سے اسلام میں داخل ہوئے وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کے بعد بھی موسی علیہ السلام کی شریعت کے چند احکام پر عمل کرتے تھے، یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے، اونٹ کا گوشت نہیں کھاتے تھے، اور اونٹ کا دودھ نہیں پیتے تھے، اور کہتے یہ تھے ان چیزوں کو چھوڑنا اسلام میں مباح ہے اور توراۃ میں واجب ہے، ہم احتیاطی طور پر ان کو چھوڑتے ہیں۔ اللہ تعالی نے ان کو کہا کہ اسلام میں کامل طور پر داخل ہو جاؤ، جب پہلی شریعتیں اسلام کے آنے کے بعد منسوخ ہوگئیں تو اسلام قبول کرنے کے بعد جاننے کے باوجود ان پر چلنا شیطانی راہ ہے۔ لہٰذا شیطانی راہ پر نہ چلو، یعنی شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

(۴) اس آیۃ کریمہ کے نزول کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے، کیونکہ اس میں خطاب عام مسلمانوں کو ہے، اس لحاظ پر مفہوم یہ ہوگا۔
" یایها الذین امنو" بالالسنة" "ادخلوا فی السلم کافة" ای دوموا علی الاسلام فیما تستأنفوه من العمر ولا تخرجوا عنه ولا عن شئ من شرائعه"
اے زبان سے ایمان لانے والو! اسلام میں کامل طور پر داخل ہو جاؤ، یعنی جس طرح ابتداء میں تم

نے اسلام قبول کیا ہے، اسلام پر پیدا ہوئے ہو، اسی طرح اسلام پر قائم دائم رہو، اسلام سے نہ نکلو اور شریعت کے کسی قانون سے باہر نہ جاؤ۔

"ولا تتبعوا خطوات الشیطان" ای ولا تلتفتوا الی الشبهات التی تلقیها الیکم اصحاب الضلالة والغوایة"

اور گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگ جو شبہات ڈالتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ کرو، کیونکہ یہ شیطانی راہ ہے، اس لئے شیطان کی تابعداری نہ کرو اور اس کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ (از کبیر)

اس آخری شانِ نزول کو دیکھیں اور یہود و نصاریٰ کے آلہ کار نام نہاد مسلمانوں کو دیکھیں جو چند روز حکمرانی کے نشہ میں خدا اور اس کے رسول ﷺ سے برگشتہ ہو کر دینی مدارس کے پیچھے پڑے ہوئے، دینی نصاب کو کم کرنے کی فکر میں ہیں کہ جدید علوم پڑھیں اور دینی علوم کم پڑھیں تا کہ ہماری ہاں میں ہاں ملاتے چلے جائیں۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا، رب تعالیٰ علوم دینیہ کی خود حفاظت خود فرمائے گا۔

" یاایها الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافة " اے ایمان والو! داخل ہو اسلام میں کامل طور پر۔

اللہ تعالیٰ نے جب مومنین اور کفار اور منافقین کا ذکر فرمایا تو گویا کہ اس آیۃ میں تمام کو حکم دے دیا کہ جو اسلام نہیں لائے ہو وہ کامل طور پر سلام لے آؤ، اور جو صرف زبان سے اسلام کے دعویدار ہو دل سے ایمان لے آؤ اور جو زبان اور دل سے ایمان لا چکے ہو وہ اسلام پر قائم و دائم رہو۔

راقم نے یہ مفہوم قرطبی کی اس عبارت سے اخذ کیا ہے۔

"لما بین الله سبحانه الناس الی مؤمن و کافر و منافق فقال کونوا علی ملة واحدة واجتمعوا علی الاسلام واثبتوا علیه" ۔

قبلہ استاذی المکرم حضرت علامہ محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی کے ارشاد کے مطابق اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی تحقیق کو دیکھتے ہوئے راقم اسی کا قائل ہے کہ شانِ نزول کی تمام وجوہ مجتمع ہیں۔

"السلم" بفتح السین و کسرها، قراء تان سبعیتان هنا وفی الانفال والقتال لکن

الاکثر ھنا الکسر وما ھناک العکس وقولہ الاسلام اشارۃ لمعناہ ھنا عن القراء تین

واما فی الانفال والقتال فمعناہ الصلح "

لفظ" السلم " کے سین میں فتحہ اور کسرہ دونوں حرکتیں پڑھی گئی ہیں۔ دونوں قرأتیں قراء سبعہ (سات قاریوں) سے مروی ہیں، اسی طرح سورۃ انفال اور سورۃ قتال میں بھی دونوں حرکتیں پڑھی گئی ہیں۔ البتہ یہاں کسرہ زیادہ مشہور ہے اور وہاں فتحہ زیادہ مشہور ہے۔

دو قرأتوں کے مطابق اس لفظ کا معنی اسلام بھی ہے اور صلح بھی، یہاں جمہور حضرات نے اسلام معنی لیا ہے اور دوسرے دونوں مقاموں میں معنی صلح لیا ہے۔ (از جلالین وصاوی)

☆ "واخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن عباس قال السلم الاسلام والزلل ترک الاسلام"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں" السلم "کا معنی اسلام ہے اور" الزلل" کا معنی ترک اسلام ہے۔ (در منشور)

شاعر کندی نے بھی " السلم " کو اسلام کے معنی استعمال کیا ہے۔ کندہ قبیلہ کے لوگ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد اشعث بن قیس کندی کے ساتھ " العیاذ باللہ "مرتد ہو گئے تھے۔ تو کندہ قبیلہ کے ایک شاعر نے کہا۔

دعوت عشرتی للسم لما رائیتھم تو لو امدبر ینا

میں نے اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی جبکہ، میں نے ان کو پیٹھ پھیرتے ہوئے (مرتد ہوتے ہوئے) دیکھا۔

فائدہ: "یا ایھاالدین امنوا ادخلو افی السلم" کے دو معنی ہیں۔ ایک عام اور ایک خاص۔

<u>عام معنی</u> یہ ہے کہ اس آیۃ میں خطاب عام مؤمنین کو ہے۔

"ادخلوا فی شرائط الاسلام فی الباطن کما فی الظاھر ".

اسلام کی شرائط میں جس طرح ظاہراً داخل ہوئے ہو اسی طرح باطنا بھی داخل ہو جاؤ۔

"ومن شرائطہ ماقال النبی ﷺ " المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ والمؤمن من امنہ الناس "

اسلام کی شرائط میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد یاد رکھا جائے کہ کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامتی میں رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ امن میں رہیں۔

خاص معنی یہ ہے کہ یہ خطاب انسان کی ذات اور اس کے ظاہری اور باطنی اعضاء سے ہے۔

" فینبغی ان ید خل ار کانه فی الاسلام با لفعل "

کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے تمام اعضاء کو حقیقی طور پر اسلام میں داخل کرے۔

آنکھ کو حق راہ کے دیکھنے میں لگائے اور کانوں کو حق بات کے سننے میں لگائے، اور منہ کو حلال اشیاء کے کھانے میں لگائے، اور فرج کو جائز شہوت کے پورا کرنے میں لگائے، اور ہاتھ سے جائز چیزوں کو پکڑے، اور پاؤں سے نیکی کی راہ پر چلے۔

یعنی تمام اعضاء کو رب تعالیٰ کے اوامر کے مطابق چلائے اور نواہی سے اجتناب کرے، یعنی لایعنی چیزوں کو چھوڑ دے اور ضروری کاموں پر عمل کرے۔

چونکہ ظاہری طور پر تو منافقین بھی اپنے اعضاء کو اسلام کے مطابق استعمال کرتے ہیں لیکن باطنی طور پر نہیں، اس لئے حکم دیا گیا کہ کامل طور پر یعنی ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی اسلام میں داخل ہو۔

نفس کو اسلام میں داخل کرنا:

نفس کو اسلام میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کفر سے باز آجائے، بری صفات کو چھوڑ دے، خواہشات کو چھوڑ دے، اور اپنے آپ کو عبودیت میں مطمئن سمجھے تاکہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہو جائے، اور اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے اس خطاب کا مستحق بنالے۔ "یاایتها النفس المطمئنة"

دل کو اسلام میں داخل کرنا:

دل کو اسلام میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو برے اخلاق سے پاک وصاف کرے اور روح کی اچھی عادات سے اپنے آپ کو مزین کرے۔

روح کواسلام میں داخل کرنا:

روح کواسلام میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے اپنے آپ کومتصف کرنا اور ازلی حکام کوتسلیم کرنا، اور اللہ تعالیٰ کے ماسواء سے قطع تعلق کر کے اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنا، اور روح کواسلام میں داخل کرنا یہاں تک کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں گم کر کے اور اللہ تعالیٰ سے وصال حاصل کر کے ہمیشہ کی بقاء حاصل کر لینا۔ (روح البیان)

" السلم " بمعنی صلح:

اس آیۂ کریمہ " السلم "کوصلح کے معنی میں بھی لیا جاسکتا ہے، یعنی لڑائی جھگڑا نہ کرو بلکہ آپس میں صلح اور اتفاق واتحاد سے رہو۔

اب معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یہ ہوگی۔

" (یایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کا فة)ای کونوا موافقین و مجتمعین فی نصرة الدین و احتمال البلو ی فیه ""

اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ صلح میں کامل طور پر، یعنی آپس میں اتفاق رکھو، دین کی امداد کرنے میں سب مجتمع ہو جاؤ، جب کسی قسم کے کفار کی طرف سے حملہ وغیرہ میں مبتلاء ہونے کا خطرہ ہوتو ان کے مقابلہ کے لئے تمام مسلمان متفق اور مجتمع ہو جاؤ۔

" (و لا تتبعوا خطوات الشیطن) بان یحملکم علی طلب الدنیا و المنازعة مع الناس "

اور شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو، کیونکہ وہ تمہیں دنیا کی طلب اور لوگوں کے ساتھ جھگڑا کرنے پر برانگیختہ کرے گا۔

" و لا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ریحکم (الانفال،۴۵)

اور آپس میں جھگڑا نہ کرو پھر بزدل ہو جاؤ گے تمہاری ہوا چلی جائے گی۔

یعنی آپس میں جھگڑا کرنا بزدلی کا ذریعہ ہے اور کفار کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب جو چھایا ہوتا ہے ان کی جرأت اور بہادری کی شہرت کا جو چرچا ہوتا ہے، آپس میں لڑنے سے اس چرچے کی ہوا جاتی رہتی ہے۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا۔ " واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا " (آل عمران ۱۰۳)
اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ نہ پیدا کرو۔

"السلم" بمعنی معرفت وتصدیق قلب:

اس آیۃ کریمہ کا اور مفہوم یہ ہے کہ نیکی کے کاموں پر عمل کر کے اور برائیوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے مطیع ہو جاؤ، کیونکہ معصیت کے ارتکاب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت لازم ہوتی ہے، معصیت کو چھوڑنے اور طاعت پر عمل کرنے سے ہی رب تعالیٰ کی کامل معرفت لازم آتی ہے اور کامل تصدیق قلبی حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اصل ایمان تو گناہوں کے ارتکاب سے بھی باقی رہتا ہے لیکن کمال ایمان کا حصول اسی وقت ہوتا ہے جب معاصی سے دور رہے۔

" السلم " بمعنی رضاء بر تقدیر:

یعنی اس آیۃ کریمہ کا ایک اور مطلب یہ بھی ہے۔ "اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہو"
یعنی رب تعالیٰ کی قضاء وتقدیر پر صابر و شاکر رہے، کسی قسم کا دل میں کوئی اضطراب نہ ہو۔ قضاء وقدر پر مضطرب ہونے سے شیطان خوش ہوتا ہے، اس لئے شیطان کی پیروی سے منع کیا گیا ہے۔

" السلم " بمعنی ترک انتقام:

یعنی آیۃ کریمہ کا اور مفہوم یہ ہے کہ انتقام لینے سے منع کیا گیا ہے۔ اب مطلب یہ ہوا۔
"اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ ترکِ ایمان میں کامل طور پر"

رب تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی تعریف فرمائی۔ " واذامروا باللغو مروا کراما " (الفرقان، ۷۲)

اور جب بیہودہ پر گذرتے ہیں تو اپنی عزت سنبھالے گزر جاتے ہیں۔

یعنی اللہ کے نیک بندے بیہودہ لوگوں کی بیہودہ باتوں اور ان کی بیہودہ حرکات کا انتقام نہیں لیتے بلکہ اپنی عزت کا پاس کرتے ہوئے ان کی مجالس سے یوں ہی گزر جاتے ہیں جیسا کہ انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا۔" خذالعفو وامر بالمعرف واعرض عن الجاهلین "

اے محبوب معاف کرنا اختیار کرو اور بھلائی کا حکم دو اور جاہلوں سے منہ پھیرلو۔ (از کبیر)

"کافة":" معناه جميعا فهو نصب على الحال من السلم اومن ضمير المسلمين "

یعنی " کافة" کا معنی ہے تمام، مکمل وغیرہ، جب یہ " السلم " سے حال ہو تو معنی ہوگا" اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے۔ یعنی مکمل طور پر، ایسا نہیں کہ زبان سے اسلام ہو دل میں نہ ہو۔ یا اسلام کے بعض شعائر پر عمل ہو اور بعض پر نہ ہو۔

اور اگر "امنوا" کی ضمیر سے حال ہو تو معنی یہ ہوگا" اے ایمان والو! تم تمام اسلام میں ثابت قدم رہو"

یا معنی یہ ہوگا" اے زبان سے ایمان لانے والو! تم تمام لوگ دل سے ایمان میں داخل ہو جاؤ"

یا یہ معنی ہوگا" اے اہل کتاب! اپنی کتاب پر ایمان لانے والو! تم تمام لوگ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

" کافة " لیا ہوا ہے " کف " جس کا معنی ہے روکنا۔

" کفة القمیص " (کاف کے ضمہ سے) قمیض کو بٹن وغیرہ لگا کر انتشار سے روکنا۔

"کفة المیزان " (بکسر الکاف) ترازو کا پلڑا جس میں اس چیز کو روکا جاتا ہے جس کا وزن کیا جاتا ہے۔

"کف الانسان" انسان کی ہتھیلی جس میں منافع اور نقصان دہ چیزوں کو جمع کر کے روکا جاتا ہے۔

اور ہر گول چیز کو " کفة " (کاف کے فتحہ سے) اور ہر لمبی چیز کو " کفة "(بضم الکاف) کہا جاتا ہے۔

"رجل مکفوف البصر" وہ شخص جس کو نظر کرنے سے روکا جائے۔

اور" کافة "جماعت کو کہا جاتا ہے کہ وہ بھی متفرق ہونے سے روکے جاتے ہیں۔ (از قرطبی)

" کافة " یصح ان یر جع الی المامورین با لدخول ای ادخلوا باجمعکم فی السلم"

یعنی ایک احتمال یہ ہے کہ " کافة " کا تعلق ان لوگوں سے ہو جن کو حکم دیا جارہا ہے کہ تم تمام اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

" ولا تتفرقوا ولا تختلفوا " کہ متفرق نہ ہو اور آپس میں اختلاف نہ کرو۔

قطرب نے کہا، عرب حضرات کہتے ہیں۔

" رأیت القوم کافة و کافین و رأیت النسوة کافات "

میں نے قوم کو مجتمع دیکھا، میں نے عورتوں کو مجتمع دیکھا۔

" ویصح ان یر جع الی الا سلام ای ادخلوا فی الاسلام کله ای فی کل شرائعه "

اور ایک احتمال یہ ہے کہ " کافة " کا تعلق اسلام سے ہو، اب معنی یہ ہوگا کہ اسلام کے تمام شرائع میں داخل ہو جاؤ۔ (از کبیر)

علامہ واحدی رحمہ اللہ نے اس معنی کو ترجیح دی ہے۔ تقریباً عام مترجمین اور مفسرین نے یہی معنی ذکر کیا ہے۔

"ولاتتبعوا خطوات الشیطٰن": اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی۔

یعنی اس راہ پر نہ چلو جس کی شیطان تمہیں دعوت دیتا ہے۔

"فان اتباع السنة اولی بعد ما بعث محمد ﷺ من خطوات الشیطن "

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے اور اعلان نبوت کے بعد آپ کی اتباع زیادہ بہتر ہے۔ لہٰذا شیطان کی تابعداری نہ کرو، اس کی راہ سے مکمل اجتناب کرو۔ (از قرطبی)

" ولا تتبعوا خطوات الشیطن " ای لا تکونوا علی سیرته وصفته وهی الاباء والاستکبار فانه ضد الاسلام "

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "ولا تتبعوا خطوات الشیطان" کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کی سیرت اور اس کے طریقہ پر نہ چلو، اور شیطان کی صفات کو حاصل نہ کرو، شیطان کی صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرنا اور تکبر کرنا، یہ دونوں صفات اسلام کے مخالف ہیں، یعنی جو شخص اسلام میں مکمل طور پر داخل ہوگا اور کامل مومن ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار نہیں کرے گا اور نہ ہی تکبر کرے گا۔ (روح البیان)

"فانہ لکم عدو مبین": پھر بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا۔

وہ پیدائشی طور پر ہی تمہارا دشمن ہے، کیونکہ اس کی جبلت (پیدائشی عادت) تمہاری پیدائشی عادت سے مختلف ہے، اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے فطرت اسلامیہ پر پیدا کر کے جو نور عطا فرمایا وہ اسے حاصل نہیں۔

"لکونہ ناری الخلقۃ لا یطلب منکم الا ان تکونوا ناریین مثلہ لا نوریین فھو عدو فی الحقیقۃ فی صورۃ المحب"

وہ چونکہ آگ سے پیدا کیا گیا ہے وہ تمہیں بھی آگ کا مستحق بنانا چاہتا ہے یعنی وہ چاہتا ہے کہ تم بھی میری طرح آگ والے بن جاؤ، تم نوری مخلوق کی طرح جنتی نہ بنو، وہ بظاہر محبت کرتا ہے کہ تم بھی میرے جیسے بنو، لیکن حقیقت میں وہ تمہارا دشمن ہے، کہ تمہیں جہنمی بنانا چاہتا ہے۔ (از روح البیان)

اعتراض: شیطان کا وصف ذکر کیا گیا ہے "مبین" کھلا۔ کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

"کیف یمکن وصف الشیطان بانہ مبین مع انا لا نری ذاتہ ولا نسمع کلامہ"

شیطان کو کھلا دشمن کہنا کیسے صحیح ہے؟ جبکہ ہم اس کی ذات کو دیکھ نہیں رہے اور اس کے کلام کو سن نہیں رہے۔ اگر وہ کھلا دشمن ہوتا تو ہم اسے دیکھتے اور اس کی باتوں کو سنتے۔

پہلا جواب: ایمان کامل وہی ہے جو ایمان بالغیب ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس کے رسول ﷺ کے ذریعے پہنچے تو اسے تسلیم کر لیا جائے، اپنا دیکھنا یا سننا ضروری نہیں۔

"ان اللہ تعالیٰ لما بین عداوته لآدم و نسله فلذ لک الأمر صح ان یو صف با نه عدو مبین و ان لم یشاهد"

بیشک اللہ تعالیٰ نے جب بیان فرمایا کہ شیطان حضرت آدم علیہ السلام اوران کی اولاد کا دشمن ہے تو اسی سے اس کی کھلی دشمنی واضح ہوگئی۔ اگرچہ ہم اسے نہیں دیکھ رہے، لیکن اس کی دشمنی چھپی ہوئی نہیں۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے علاقہ کا دشمن ہمیں نظر نہ آئے، لیکن جب اس کی عداوت اور ہمیں نقصان پہنچانا واضح ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارا کھلا دشمن ہے۔

آجکل تمام دنیا کے مسلمانوں کا بچہ بچہ امریکی صدر بش کو اپنا کھلا دشمن سمجھتا ہے، حالانکہ اسے دیکھا نہیں، اس کے کلام کو براہِ راست ہر شخص نے نہیں سنا، لیکن اس کی عداوت ظاہر ہے، اس لئے کہ وہ مسلمانوں کا کھلا دشمن ہے۔

اگر ہم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے مسلمانوں کو یہ بتائیں۔

" ان فلا نا عدو مبین لک و ان لم تشاهد ہ فی الحال "

کہ بیشک فلاں شخص تمہارا کھلا دشمن ہے اگرچہ تم اسے دیکھ نہیں رہے۔

ہمارا یہ کلام درست ہوگا، دکھ درد رکھنے والے اور اسلام اور اپنے وطن سے محبت کرنے والے بتارہے ہیں کہ دشمن سے خبردار ہوجاؤ۔ افسوس کہ کچھ لوگ اس کی دوستی کا دم بھرنے والے ٹس سے مس نہیں۔

دوسرا جواب " مبین " کے دو معنی ہیں۔ جب یہ لفظ " بیانٌ " سے لیا جائے تو اس کا معنی ہے ظاہر کرنا اور جب یہ " بینو نة و ابانة " سے لیا جائے تو اس کا معنی ہے منقطع کرنا۔ بلکہ......

" والبیان انما سمی بیانا لهذاالمعنی فانه یقطع بعض الاحتمالات عن بعض "

بیان کو بیان بھی انقطاع کے معنی سے ہی کہا جاتا ہے، کیونکہ "بیان" بھی بعض سے بعض احتمالات کو ختم کردیتا ہے۔

شیطان کو مبین کہنے کی وجہ یہ ہے "انه يقطع المكلف بو سوسته عن طاعة الله و ثوابه و رضوانه"

کہ وہ عاقل و بالغ شخص کو وسوسہ ڈال کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے ثواب اور اس کی رضاء مندی سے منقطع کرتا ہے۔

اس جواب کے لحاظ سے " انه لكم عدو مبين " کا معنی یہ ہے۔ بیشک وہ تمہارا نیکیوں سے منقطع کرنے والا دشمن ہے۔ (از کبیر)

اظہارِ تشکر:

علامہ رازی رحمہ اللہ کے دوسرے جواب سے استاذی المکرم حضرت علامہ محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی کا "سبعہ معلقہ، نفحۃ الیمن، مقامات حریری، حماسہ اور متنبی" پڑھانے کا انداز یاد آیا کہ آپ آج کی طرح ان کتب کو قصے کہانیوں کے طور پر نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ ایک ایک لفظ کی اسی طرح وضاحت فرماتے جیسے علامہ رازی رحمہ اللہ نے "مبین" کی وضاحت کی۔

یقین جانئے کہ میرے ذہن میں پہلے ہی یہ باتیں ثابت تھیں، یہ سب استاذی المکرم کی مہربانیاں ہیں، جن کا میں شکر گزار ہوں، اگر چہ ان مہربانیوں کا کما حقہ شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔

اعتراض : شیطان کا دشمن ہونا کیسے؟ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہمیں تکالیف اور دکھ درد پہنچاتا ہے، تو یہ کہنا اس لئے درست نہیں کہ اس کا کبھی دشمنی کرنا اور کبھی دشمنی نہ کرنا تو ممکن نہیں بلکہ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشمن ہے۔ حالانکہ ہمیں صحت بھی حاصل رہتی ہے، آرام بھی، ہم تمام اوقات میں تکالیف میں نہیں ہوتے، تو وہ ہمارا کھلا دشمن کیسے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ وسوسہ ڈال کر دین اور ثواب سے دور کرتا ہے تو اس آیۃ کریمہ کا مطلب کیا ہوگا۔

" وما كان لي عليكم من سلطان الا ان دعوتكم فا ستجبتم لي " (ابراهيم، ۲۲)

اور مجھے تم پر کوئی غلبہ حاصل نہ تھا مگر یہ کہ میں نے تمہیں بلایا تو تم نے میری بات قبول کر لی۔

جواب: شیطان کی دشمنی دو وجہ سے مجموعی طور پر پائی جاتی ہے، کیونکہ وہ ہمیں مصائب و آرام میں ہمیشہ مبتلا رکھنے کا ارادہ کرتا ہے۔ "الا ان اللہ تعالٰی منعه عن ذلک "مگر اللہ تعالٰی اسے اس سے روک دیتا ہے، اجازت نہیں عطا فرماتا۔

" ولیس یلزم من کو نه مریدا لایصال الضرر الیا ان یکو ن قادرا علیها "

اگر چہ وہ نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کے نقصان پہنچانے کے ارادہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حقیقۃً نقصان پہنچانے پر قادر بھی ہو۔

اور دوسری وجہ ساتھ ہی یہ پائی گئی ہے کہ وہ وسوسہ ڈالتا ہے۔ یعنی

" ان تزیینه المعاصی و القاء الشبهات کل ذلک سبب لو قوع الانسان فی الباطل "

اس کا گناہوں کو مزین کر کے دکھانا اور شبہات ڈالنا، یہ تمام سبب ہیں کہ انسان کو باطل راہ پر چلایا جائے اور اس کو ثواب سے محروم کیا جائے۔

" فکان ذلک من اعظم جهات العداوة " یعنی اس کی بہت بڑی عداوت ہے۔

جہاں تک قیامت میں شیطان کا یہ کہنا کہ "مجھے تو کوئی تم پر غلبہ حاصل نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں بلایا تم نے میری بات مان لی" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہے گا میں نے وسوسہ تو ڈالا تھا، تم اپنے اختیار سے میرے داؤ میں پھنس گئے تھے، میرا تم پر زور نہیں تھا۔

اس آیۃ کریمہ سے بھی اس کا وسوسہ ڈال کر گمراہی کی طرف لانا واضح ہے جو باعث عداوت ہے۔ (ازکبیر)

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِمَاجَاءَ تْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۰۹)

﴿۱﴾

اور اگر اس کے بعد بھی پچلو کہ تمہارے پاس روشن حکم آ چکے تو جان لو کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

﴿۲﴾

پھر اگر پھسل جاؤ تم اس کے بعد کہ آ چکے ہیں تمہارے پاس واضح دلائل تو جان لو بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا۔

شانِ نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شانِ نزول میں وہ تمام احتمال پائے گئے ہیں جو اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر کیے گئے ہیں۔

ایک احتمال یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں خطاب منافقین کو ہے، یعنی اے منافقو! جب تم ظاہری طور پر زبان سے ایمان لا چکے ہو تو دل سے بھی ایمان لے آؤ، جبکہ نبی کریم ﷺ تمہارے پاس معجزات اور واضح دلائل لا چکے ہیں تو اس کے بعد اگر تم ایمان نہ لائے بلکہ متزلزل رہے تو جان لو اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس میں خطاب اہلِ کتاب میں سے ایمان لانے والوں کو ہو کہ اے اہلِ کتاب جو ایمان لا چکے ہو۔

"(فان زللتم) فی تحریم السبت و لحم الابل (من بعد ما جاء تکم البینات) محمد ﷺ وشرائعه"

اگر تم ہفتہ کے دن کی تعظیم کر کے اور اونٹوں کے گوشت کو حرام سمجھ کر پھسل گئے جبکہ نبی کریم ﷺ

تمہارے پاس شریعت کے احکام لے آئے ہیں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔ (از کبیر)

تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب اہلِ کتاب کو ہے کہ اے اہلِ کتاب! جب تم نے اپنی کتب پر ایمان لایا لیکن نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کے بعد اور احکام شرائع لانے کے بعد تم ایمان نہ لا کر اگر پھسل گئے تو جان لو اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا۔ (از تفسیر ابی السعود)

چوتھا احتمال یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں خطاب مسلمانوں کو ہو۔

" یعنی انحرفتم عن الطریق الذی امرتم به "

کہ اگر تم اس راستہ سے پھر گئے جس کا تمہیں حکم دیا ہے تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

اس صورت میں ہر قسم کے گناہ مراد ہوں گے خواہ صغائر ہوں یا کبائر۔

" فان الانحراف کمایحصل بالکثیر یحصل بالقلیل "

اس لئے کے سیدھی راہ سے انحراف قلیل سے بھی ہے اور کثیر سے بھی۔

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعید ہر قسم کے گناہوں پر زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کے لئے ہے، تاکہ مومن تھوڑے اور چھوٹے گناہوں سے بھی بچ جائیں اور زیادہ گناہوں سے بھی بچ جائیں اور بڑے گناہوں سے بھی بچ جائیں۔

"لان ما کا ن من جملة الکبائر فلا شک فی و جو ب الاحتراز عنه و ما لم یعلم کو نه من الکبا ئر فانه لا یؤمن کو ن العقاب مستحقابه و حینئد یجب الاحترا ز عنه "

اس لئے کہ تمام بڑے گناہوں سے بچنا ضروری ہے، اور جن کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ یہ گناہ کبیرہ ہے یا صغیرہ تو ان سے بچنا بھی ضروری ہے تاکہ انسان عذاب کا مستحق نہ بن جائے۔ (از کبیر)

پھر یہ ہے کہ صغائر اور کبائر کی حد بیان نہیں کی گئی کہ انسان ہر گناہ کو کبیرہ ہی سمجھ کر اجتناب کرے، خاص کر کے صغائر کو بار بار کرنا اور ان پر قائم رہنا کبیرہ گناہ بن جاتا ہے۔

گویا کہ آیۃ کریمہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہو جاؤ تو توبہ کرو اور اگر صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کرلو تو عبادات کے ذریعے ان کو رب تعالیٰ سے معاف کراؤ۔

”فان زللتم“ : پھر اگر تم پھسل جاؤ۔

پہلے لام پر فتحہ بھی پڑھا گیا ہے اور کسرہ بھی، یعنی دونوں لغتوں کا اس میں استعمال ہے۔ جس طرح ”ضللت“ میں دونوں لغتوں کا استعمال ہے۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔

” زل یزل زلو لاوزلزالا “ اذادحضت قدمه “یعنی قدم کا پھسل جانا۔

” زل فی الطین “ کہا جاتا ہے کہ وہ کیچڑ میں پھسل گیا۔

اگر کوئی شخص ایک حال سے پھسل کر دوسرے حال میں آجائے تو اس کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ” زلت به الحال “ اور گناہ پر ” زلة “ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ” یریدون به الزلة للزوال عن الواجب “ واجب سے پھسل جانے کو ” زلة “ کہا جاتا ہے۔

اب آیۃ کریمہ میں معنی یہ ہوگیا۔ ” فان زللتم ای اخطأتم الحق وتعد یتمو ہ “

پھر اگر تم پھسل گئے یعنی تم نے حق سے خطاء کرلی اور حق سے تجاوز کرلیا یعنی باطل راہ کو تم نے اختیار کرلیا۔ (کبیر)

شان نزول کی مختلف صورتوں کو دیکھ کر ہی خازن نے یہ تفسیر کی۔

” (فان زللتم) ای ملتم وضللتم وقال ابن عباس اشرکتم “

اگر تم راہ راست سے ہٹ کر دوسری جانب میلان کرلو، اور اگر تم راہِ راست بھٹک جاؤ، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق اگر تم مشرک ہو جاؤ۔

”من بعد ما جاء تکم البینا ت“: اس کے بعد کہ آچکے ہیں تمہارے پاس واضح دلائل۔

” البینات “ ای الدلات الواضحات “ (خازن) ای الحجج الواضحة والشواهد اللائحة “

یعنی "بینات" کا معنی ہے واضح دلائل اور ظاہر چمکدار شواہد۔

صاوی نے اعتراض وجواب کی صورت میں ذکر کیا ہے کہ پھسلنا تو ہوتا ہی اس وقت ہے جب دلائل آ جائیں تو "من بعدماجاء تکم البینات" کا کیا مطلب ہوگا؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا۔"ان المراد بمجیئھاظھور رھا ظھور ابینا"

بے شک مراد دلائل کے آنے سے صرف دلائل کا آنا نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ دلائل کے واضح اور بہت زیادہ ظاہر طور پر آنے کے بعد۔

واضح دلائل کیا ہیں؟

واضح دلائل کا تعلق دلائل عقلیہ سے بھی ہے اور دلائل نقلیہ سے بھی ہے۔

دلائلِ عقلیہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے تسلیم کرنے کے بغیر نبی کریم ﷺ کی نبوت کو ماننا صحیح نہیں ہوسکتا، وہ یہ ہیں کہ" عالم کے حادث ہونے کا علم ہو۔ اور یہ معلوم ہو کہ تمام جہان ایک خالق و مالک و صانع کا محتاج ہے۔ اور یہ پتہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، کوئی چیز اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں۔ اور یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے، اور خود ہر ایک سے بے پرواہ ہے، یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اور یہ علم حاصل ہو کہ جادو اور چیز ہے اور معجزہ اور چیز ہے، ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ (پہلے پارہ میں جادو اور معجزہ کو ذکر کر دیا گیا ہے) اور یہ معلوم ہو کہ معجزہ انبیاء کرام کے صدق کی علامت ہے۔

یہ تمام دلائل عقلیہ ہیں۔ جن کا علم پہلے حاصل ہوگا، اور نبی کی نبوت پر علم یقین اور ایمان بعد میں حاصل ہوگا۔

دلائل نقلیہ یہ ہیں جو کہ قرآن پاک اور حدیث پاک سے حاصل ہوں۔

"فکل ھذہ البینات داخلۃ فی الآیۃ من حیث ان عذر المکلف لا یزول الاعند حصول کل ھذہ البینات "

یہ تمام دلائل عقلیہ اور نقلیہ اس آیۃ کریمہ میں داخل ہیں، اس لئے کہ جب تک ان تمام دلائل کا

مکلف (عاقل و بالغ) کو علم حاصل نہ ہو تو وہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے تو علم ہی حاصل نہیں تھا، میں راہِ راست پر کیسے قائم ہو سکتا۔

مسئلہ: اسی سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ بچے اور مجنون (پاگل) سے باز پرس (پوچھ) نہیں ہو گی اور نہ ہی ان کو وعید کی گئی ہے، کیونکہ ان کو قدرت کاملہ ہی حاصل نہیں کہ وہ تمام عبادات پر عمل کریں۔ (از کبیر)

''فاعلموا ان اللّٰہ عزیز حکیم'': پھر جان لو بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفتوں کا ذکر فرمایا ایک عزیز اور دوسری حکیم۔ اسی وجہ سے راقم نے ترجمہ میں ''غالب ہے حکمت والا'' لفظ ''ہے'' درمیان میں رکھا تاکہ دو صفتیں علیحدہ علیحدہ سمجھ آجائیں۔

کیونکہ اگر ترجمہ کیا جائے ''غالب حکمت والا ہے'' تو اس سے عام انسان سمجھتا ہے کہ شائد ایک ہی صفت حکمت غالبہ کا ذکر ہے۔

''فاعلموا'' کہہ کر رب تعالیٰ نے اپنی آگے ذکر ہونے والی صفات پر متنبہ کیا ہے کہ غور کرو، جان لو۔ پھر ''ان'' سے اور تاکید ذکر فرمائی، پھر جملہ اسمیہ سے اور دوام و استمرار کی طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اسے ہمیشہ حاصل ہیں۔

''عزیز ''فان العزیز ھو المنیع القادر علی ان یمنع و لا یمنع لان اصل العزۃ الامتناع''

اللہ تعالیٰ عزیز ہے یعنی منیع و قادر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود منع کرنے پر قادر ہے اور اس کو منع کرنے پر کوئی قادر نہیں، اس لئے کہ اصل میں ''عزۃ'' کا معنی ہی ''روکنا'' ہے۔

اسی وجہ سے کہا جاتا ہے ''الارض عزاز'' یہ اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ زمین بہت سخت ہو جسے کھودنا دشوار ہو۔ اور اس میں ہل چلانا مشکل ہو تو گویا کہ وہ روکنے والی ہے کھدائی سے۔ (از جصاص)

یہاں ''عزیز'' کا معنی کیا ہے۔ یہاں معنی یہ ہے۔

'' عزیز ''لا یعجزہ شیٔ عن انتقامہ منکم ای لا تفلتون منہ ''

یعنی اللہ تعالیٰ تم سے گناہوں کا انتقام لینے والا ہے اور تمہیں عذاب دینے والا ہے، تم اپنے آپ کو اس کے عذاب سے چھڑا نہیں سکتے اور نہ ہی بھاگ سکو گے۔ (جلالین، صاوی)

اسی معنی کی مناسبت سے معنی کیا جاتا ہے ''غالب''

''حکیم'' کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ جب ''حکمت'' سے ماخوذ ہو تو معنی ہوگا ''علم'' کہ وہ عالم ہے۔

''علم'' چونکہ رب تعالیٰ کی صفت ذاتیہ ہے۔ اس معنی کے لحاظ پر ''جازان یقال لم یزل حکیما'' جائز ہے کہ کہا جائے کہ وہ ہمیشہ ہی حکیم ہے۔ (یہاں یہی معنی مناسب کہ وہ ہمیشہ ہی حکمت والا ہے)

البتہ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ ''حکم'' سے مشتق ہو، اور معنی یہ ہو '' فعلہ المتقن المحکم'' کہ اس کا فعل پختہ اور یقینی ہے۔ اس معنی کے لحاظ پر یہ رب تعالیٰ کی صفت اضافیہ ہوگی۔

'' واذااريد به ذلک لم يزل ان يقال حکيما کما لايجوزان يقال لم يزل فاعلا ''

جب یہ معنی لیا جائے اور صفت اضافیہ ہو تو پھر یہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ ہمیشہ حکیم ہے، جیسا کہ یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ ہمیشہ کام کرتا ہے۔

پھر مطلب یہ ہوگا کہ وہ جب بھی کوئی کام کرتا ہے تو اس کا کام پختہ اور یقینی ہوتا ہے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

دو صفات ذکر کرنے کی وجہ:

پہلی صفت میں وعید پائی گئی ہے اور دوسری صفت میں وعد پایا گیا ہے۔

وعید کا مطلب ہوتا ہے دھمکی دینا اور وعد کا مطلب ہوتا ہے تسلی دینا۔

اپنی صفت ''عزیز'' بیان کر کے رب تعالیٰ نے کئی دھمکیوں کو اس ایک لفظ میں جمع فرما دیا جو لفظ ''عقاب'' ذکر کرنے سے بھی حاصل نہ ہوتیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہوا۔

''فاعلموا ان الله مقتدر عليکم، لايمنعه مانع عنکم فلا يفوته ما يريده منکم وهذا نهاية في الوعيد''

کہ رب تعالیٰ نے فرمایا، جان لو، متنبہ ہو جاؤ، بے شک اللہ تعالیٰ تم پر قادر ہے۔ جب وہ تمہیں عذاب دینا چاہے تو کوئی اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ جو ارادہ فرماتا ہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا، یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھاگ کر اس سے چلا جائے۔

رب تعالیٰ کا یہ ارشاد بہت زیادہ وعید پر مشتمل ہے، رب تعالیٰ کے اس ارشاد کو عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ سے سمجھئے۔ جب باپ اپنے بیٹے کو یہ کہے " ان عصیتنی فانت عارف لی " "اگر تم نے میری نافرمانی کی تو تم مجھے جانتے ہو" اس کا یہ مطلب ہوتا ہے۔ "وانت تعلم قدرتی علیک وشدة سطوتی" اور تم جانتے ہو کہ مجھے تم پر قدرت حاصل ہے اور مجھے تم پر دبدبہ حاصل ہے۔

" فیکون هذاالکلام فی الزجر ابلغ من ذکر الضرب وغیره"

اس کلام میں زیادہ دھمکی پائی گئی جو یہ کہنے میں نہیں کہ اگر تم نے میری نافرمانی کی تو میں تمہیں ماروں گا۔

دوسری صفت "حکیم" بیان فرمائی، اس صفت میں رب تعالیٰ نے وعدہ کا ذکر فرمایا۔

"فان اللائق بالحکمة ان یمیز بین المحسن والمسئ فکما یحسن من الحکیم ایصال العذاب الی المسئ فکذلک یحسن منه ایصال الثواب الی المحسن بل هذا الیق بالحکمة واقرب للرحمة "

اس لئے کہ رب تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ نیک اور گنہگار میں فرق کرے۔ اور ساتھ ہی یہ واضح ہوا کہ جس طرح گنہگار کو عذاب دینا اس کے حکیم ہونے کے مناسب ہے، اسی طرح نیک کو ثواب عطاء کرنا بھی اس کی حکمت کے لائق ہے، بلکہ نیک کو ثواب عطاء کرنا زیادہ ہی حکمت کے مناسب ہے اور اس کی رحمت کے زیادہ ہی قریب ہے۔ (از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس تحقیق کے مطابق خلاصہ کلام یہ ہوا۔" کہ اگر تم عقلی اور نقلی دلائل کے آجانے کے بعد

پھسل گئے تو متنبہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ غالب قدرت کا مالک ہے۔ اس کے عذاب سے تم اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے، کوئی اور بھی رب تعالیٰ پر غالب آ کر تمہیں نہیں چھڑا سکے گا۔ کیونکہ اس پر کسی کے غالب آنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اور ساتھ ساتھ ہی اپنی صفت ''حکیم'' ہونا ذکر فرما کر یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر تم نے دلائل کو دیکھ کر رب تعالیٰ کے احکام پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں ثواب عطاء فرمائے گا، تم پر رحمت فرمائے گا۔

حکیم ہونے کا ایک اور مطلب:

''حکیم''ای لا یعذب الابحق'' اللہ تعالیٰ حکیم ہے کہ وہ کسی کو ناحق عذاب نہیں دیتا، اور نہ ہی کسی کو جرم سے زیادہ سزا دیتا ہے، اس کے تمام امور حکمت کے مطابق ہیں۔ کوئی کام اس کا حکمت کے خلاف نہیں۔

(مدارک و خازن)

ایمان افروز واقعہ:

ایک قاری قرآن یہی آیۃ کریمہ پڑھ رہے تھے، انہوں نے بھول کر ''فاعلموا ان اللہ غفور رحیم'' پڑھ لیا، ایک عرابی قرآن پاک سن رہا تھا، اس نے قرآن پاک نہیں پڑھا ہوا تھا، لیکن زبان اس کی عربی تھی، وہ سن کر کہنے لگا۔

'' لیس ھذامن کلام اللہ اذاالحکیم لایذکرالغفران عند الزلل والعصیان لا نہ اغراء علیہ ''

کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا، کیونکہ پہلے لغزش کا ذکر ہے اور گناہوں میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے، اگر اس کے بعد یہ ذکر ہو ''فاعلموا ان اللہ غفور رحیم'' (تو جان بے شک اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے) تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی گناہ پر ابھارا ہے کہ تم گناہ کرتے رہو اور میں بخشتا رہوں گا اور رحم کرتا رہوں گا۔

یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ہی خلاف ہے کیونکہ وہ نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے اور گناہوں سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔

(ازمدارک)

مسئلہ : جب تک شریعت کا کوئی حکم نافذ نہ ہو اس وقت تک وہ واجب نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ "من بعد ماجاء تکم البینات" سے واضح ہوا۔ (کبیر بتغیر)

اعتراض : جب رب تعالیٰ "حکیم" ہے تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ کافر کفر کرتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کا اردہ پایا جاتا ہے اور سفیہ (بے وقوف) سفاہت کرتا ہے تو اس کے اردہ کے مطابق ہے، حالانکہ یہ کہنا تو اس کی حکمت کے خلاف ہے۔

جواب : یہ ذہنی الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ارادہ اور رضاء میں فرق نہ کیا جائے، رب تعالیٰ کافر سے کفر اور سفیہ سے سفاہت کو پسند نہیں فرماتا، بلکہ انسان کو ہر کام کا اختیار دے رکھا ہے، انسان جو کام کرتا ہے وہ اس کے دیئے ہوئے اختیار کے مطابق کرتا ہے، یہی اس کا اردہ ہے۔

یہ ارادہ اس کی حکمت کے خلاف نہیں، کیونکہ اس نے ان کاموں سے روک رکھا ہے، وہ تمام امور کو جانتا ہے اور باطل راہ پر چلنے والوں کو عذاب دے گا اور عذاب بغیر جرم کے نہیں دے گا اور عذاب جرم سے زائد نہیں دے گا۔ یہی اس کی حکمت ہے۔ (از کبیر بتغیر)

٭٭٭٭٭٭

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ☆ (سورة البقرة أیت نمبر ۲۱۰)

○ ا ○

کاہے کے انتظار میں ہیں مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں اور فرشتے اتریں اور کام ہو چکے اور سب کاموں کی رجوع اللہ کی طرف ہے۔

○ ۲ ○

وہ نہیں انتظار کررہے ہیں مگر یہی کہ آجائے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب بیچ سائے بادلوں کے اور (آجائیں) فرشتے اور فیصلہ کردیا جائے کام کا، اور طرف اللہ کے لوٹائے جاتے ہیں تمام کام۔

شانِ نزول:

یہ آیۃ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ کچھ لوگ شیطان کے قدموں کی تابعداری کرنے والے ہیں اور اسلام میں مکمل طور پر داخل نہیں ہوتے ان کے متعلق اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ شیطان کے قدموں کی تابعداری کر کے اور اسلام میں مکمل طور پر داخل نہ ہو کر وہ نہیں انتظار کررہے ہیں، ہاں مگر اسی کی انتظار کررہے ہیں کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے اور وہ عذاب بادلوں کی طرح چھا جائے، اور اس عذاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فرشتے بھی آجائیں۔ ان کو ہلاک کر کے ان کا فیصلہ ہی کرلیا جائے، یعنی ان کا کام ہی تمام کردیا جائے اور سب کام اور سب امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جانے ہیں، کیونکہ وہی ان کا خالق و مالک ہے۔

"هل ينظرون": وہ انہیں انتظار کررہے ہیں۔

"هل ينظرون" استفهام في معنى النفي ولذلك جاء بعده (الا ان يا تيهم الله) اى يأتى امره اوبأسه" (بيضاوى)

اس مقام میں " ھــل " استفہام انکاری کے طور پر استعمال ہے جس کا معنی نفی والا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بعد " الا " استثناء کے لئے استعمال ہے۔

مطلب یہ ہوگا کہ وہ نہیں انتظار کر رہے مگر یہ کہ ان کے پاس اللہ تعالی کا عذاب آجائے۔

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ حقیقی ہے جس میں استفہام کا معنی کیا گیا، اور راقم نے مقصد کے مطابق تفسیر بیضاوی کے مطابق مجازی معنی کیا ہے۔

"ینظرون" کا معنی ہے " ینتظرون " وہ انتظار کر رہے ہیں۔ اس معنی میں عام استعمال ہے۔ کہا جاتا ہے " نظرتہ " کہ میں نے اس کی انتظار کی۔ اور قرآن پاک میں " انظرونا نقتبس من نورکم" میں بھی "انظرونا" انتظار کے معنی میں استعمال ہے۔ اور "فناظرۃ بم یرجع المرسلون" میں بھی "ناظرۃ" انتظار کے معنی میں استعمال ہے۔ (شیخ زادہ)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کے لئے:

"نظر" کے استعمال کے لحاظ سے مختلف معنی ہیں۔

نظر (ن، س) دیکھنا، غور سے دیکھنا۔ نظر (ن) فی الامر، سوچنا، فکر کرنا، اندازہ کرنا، الشیٔ، انتظار کرنا، بین الناس حکم کرنا، فیصلہ کرنا، للقوم، رحم کرنا، مدد کرنا، فلانا، متوجہ ہونا، فلانا الدین قرضہ کی مہلت دینا۔ نظر الدھر الی بنی فلان زمانہ نے فلاں کی اولاد کو ہلاک کر دیا۔ (المنجد)

"الا ان یاتیھم اللہ": مگر یہ کہ ان کے پاس اللہ تعالی کا عذاب آجائے۔

اس کا ظاہری معنی یہ ہے "مگر یہ کہ ان کے پاس اللہ آجائے"

لیکن اس پر اتفاق ہے اہل علم کا اللہ تعالی آنے جانے سے پاک ہے، اس لئے ان الفاظ مبارکہ کے دو مطالب مفسرین کرام نے بیان کئے ہیں۔

ایک مطلب یہ ہے کہ اگر ان الفاظ کا ظاہری معنی کیا جائے تو پھر یہ متشابہات کی اس قسم سے ہیں جن کے ظاہری معانی تو معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس لئے ظاہری معنی ذکر کرنے کے بعد یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان کی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

اسی طرح بعض آثار کا بھی ظاہری معنی تو معلوم ہوگا لیکن ان کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ جیسا کہ تفسیر طبری میں ذکر ہے۔

"عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال من الغمام طاقات یأتی اللہ عز و جل فیھا محفوفا"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بادلوں کے پردے میں لپٹا ہوا آئے گا۔

اس حدیث پاک سے بھی ظاہری معنی سمجھ آ رہا ہے لیکن حقیقی مراد وہ نہیں جو ظاہر ہے۔ لہٰذا ظاہری معنی کو دیکھ کر کہنا پڑے گا" اللہ و رسولہ اعلم مرادہ " اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس کی مراد کو جانتے ہیں۔

ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے:

خازن رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ آیت صفات اور احادیث صفات یعنی جن آیات اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہو اور ان کی مراد میں اشتباہ ہو جیسا اس آیۃ کریمہ میں ہے تو اس کا حکم یہ ہے۔

"وانہ یجب علینا الایمان بظاھرھا ونؤمن بھا کما جاءت ونکل علمھا الی اللہ تعالی والی رسول اللہ ﷺ"

کہ ہم پر واجب ہے کہ ہم اس کے ظاہر پر ایمان لائیں کہ ظاہری معنی تو اس کا یہ سمجھ آتا ہے لیکن حقیقی علم ان آیات و احادیث کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیں کہ حقیقی مراد ہی جانتے ہیں۔

واضح ہوا کہ متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کو بھی حاصل ہے اور اس کے رسول ﷺ کو بھی حاصل ہے۔

خوبصورت اشعار:

ابھی جس عقیدہ کا ذکر کیا کہ آیات صفات اور احادیث صفات کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کو ہے۔ اس کو اہل علم نے نظم کی صورت میں پیش کیا۔

عقید تنا ان لیس مثل صفاته　　　　ولا ذاته شئ عقیدة صائب

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بیشک نہیں مثل اس کی صفات کے۔ اور نہ ہی اس کی ذات کے کوئی چیز، یہی عقیدہ درست ہے۔

نسلم آیا ت الصفات با سر ها　　　　واخبارها للظا هر المتقارب

ہم تسلیم کرتے ہیں آیات صفات کو مکمل طور پر۔ اور تسلیم کرتے ہیں ان کی خبروں کو جو ظاہر کے قریب ہیں۔ (سمجھنے کے لحاظ پر)

ونؤیس عنها کنه فهم عقولنا　　　　وتاویلنا فعل اللبیب المغالب

اور ہم نا امید ہیں ان سے کہ ہماری عقلیں ان کی حقیقت کو سمجھ لیں۔ اور ہم اپنی تاویلوں سے ناامید ہیں یہی عقلمند مغالب شخص کا فعل ہے۔

ونرکب للتسلیم سفنا فانها　　　　لتسلیم دین المرء خیر المراکب

اور ہم تسلیم کی کشتیوں پر سوار ہو رہے ہیں، بے شک، کہ انسان کا دین کو تسلیم کرنا ہے بہتر سواریاں ہیں۔

جمہور علماءِ متکلمین کا مذہب:

آیات صفات اور احادیث صفات میں جمہور علماء متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ اس میں تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ آنے، جانے سے پاک، لہٰذا اس قسم کے الفاظ یعنی آنے جانے کی نسبت......

" فیستحیل ذلک فی حقه تعالی فثبت بذلک ان ظاهر الآیة لیس مرادا فلا بد من التاویل علی سبیل التفصیل "

......اللہ تعالیٰ کی طرف محال ہے۔لہٰذا واضح ہوا کہ آیۃ کریمہ کا جب ظاہری مطلب مراد نہیں تو سیاق وسباق کی تفصیل کے مطابق ان آیات کی تاویل کی جائے۔

اسی وجہ سے مفسرین کرام نے تفسیر میں مختلف الفاظ نکالے ہیں۔

"(الاان یاتیھم اللہ)ای بآیات اللہ. ای بامرہ ، ای یاتیھم عذاب اللہ ، ای بأسه وغیرھا"

سب کا مطلب یہی ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے۔ (ماخوذ از خازن)

جمہور علماء متکلمین کا مذہب ہی صحیح ہے اور اسی کے مطابق مطلب کو سمجھنا آسان ہے،اور اسی کو سمجھنا آسان، اسی مذہب کے صحیح ہونے کے مطابق راقم کی تسکین الجنان کا ایک ورق دیکھئے۔

تراجم میں تقابلی جائزہ:

"ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ فی ظلل من الغمام"

کیا وہ اس کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں۔ (محمود الحسن صاحب)

کیا یہ لوگ یہی انتظار رکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس آویں۔ (اشرف علی صاحب)

(یہ لوگ) تو بس اسی کا انتظار کررہے ہیں کہ ان کے پاس خدا بادل کے سائبانوں میں آجائے۔ (عبدالماجد صاحب)

نہیں انتظار کرتے مگر یہ کہ آوے ان کے پاس اللہ بیچ سایوں کے بادلوں سے۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

کاہے کے انتظار میں ہیں مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں۔

(مولانا احمد رضا خان بریلوی ....)

اس مقام پر بھی اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے، لیکن دوسرے تراجم میں یہ ذکر ہے کہ اللہ آئے، خود سامنے آموجود ہو، یہ سب تراجم اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اور تفاسیر کے برخلاف ہیں۔

کسی مفسر نے خود اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر (بغیر تاویل کے) نہیں کیا، توحید کے دعویدار شانِ الوہیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

''(الاان یأتیھم اللہ)ای امرہ کقولہ (اویأتی امر ربک)ای عذابہ(فی ظلل)جمع ظلة(من الغمام)السحاب'' (جلالین)

مگر یہی کہ اللہ کا امر (عذاب) آئے، جس طرح دوسرے مقام پر ''اویأتی امر ربک'' ہے۔

وہاں بھی اس کا عذاب مراد ہے، یعنی اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں۔

''(الاان یا تیھم اللہ)ای یا تیھم امرہ او بأسہ'' (بیضاوی)

مگر یہی کہ اللہ کا امر اور عذاب آئے۔

مدارک میں بھی بیضاوی کی طرح ہی تفسیر ہے۔ یعنی دونوں تفاسیر کے الفاظ ایک ہی ہیں۔

(از تسکین الجنان صفحہ نمبر ۶۴، ۶۵)

اللہ تعالیٰ آنے جانے سے کیوں پاک ہے؟

اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ آنا جانا حادث کا کام ہے، اللہ تعالیٰ قدیم ہے، اس لئے وہ آنے جانے سے پاک ہے۔

حادث اسے کہتے ہیں جس کی ابتداء بھی ہو اور انتہاء بھی ہو، وہ اپنے قیام میں واجب الوجود (اللہ تعالیٰ) کا محتاج ہو۔ اور قدیم وہ ہے کو خود قائم ہو، نہ اس کی ابتداء ہو اور نہ انتہاء۔

تفصیلی جواب میں کئی وجوہ پائی گئی ہیں، جو علامہ رازی رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہیں، ان کو مختصر طور پر ذکر کیا جارہا ہے۔ سب سے پہلے تو اہلِ علم کا عقیدہ سمجھا جائے۔

"اجمع المعتبرون من العقلاء علی انه سبحانه وتعالیٰ منزه عن المجی و الذهاب "

کامل عقل رکھنے والے اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ آنے اور جانے سے پاک ہے۔

(۱) علمِ اصول میں یہ بات ثابت ہے کہ ہر وہ چیز جس کا آنا اور جانا صحیح ہو۔

"لا ینفک عن الحرکۃ والسکون وھمامحدثان "

وہ حرکت اور سکون سے جدا نہیں ہوتے اور حرکت وسکون حادث ہیں۔

اور یہ بھی ضابطہ واضح ہے۔ "و امالا ینفک عن المحدث فھو محدث "

کہ جو حادث سے جدا نہ ہو وہ حادث ہے۔

لہٰذا واضح ہو کہ آنے اور جانے والی ہر چیز حادث ہے۔ "والا لہ القدیم یستحیل ان یکون کذلک "

لیکن اللہ تعالیٰ قدیم ہے، اس لئے اس کا آنا اور جانا اس کی شان کے لائق نہیں بلکہ محال ہے۔

(۲) آنے جانے والی چیزیں اتنی چھوٹی تو ہو نہیں سکتیں جن کو" جزء لا یتجزی ' (ایسی جزء جس کی تقسیم نہ ہو سکے) کہا جائے، لازم طور وہ چیزیں بڑی اور مرکب ہوں گی، ہر مرکب چیز اپنے اجزاء کی محتاج ہوتی ہے اور جو چیز اپنے اجزاء کی محتاج ہو وہ ممکن اور حادث ہوتی ہے۔

اور رب تعالیٰ اپنے افعال میں فاعل مختار ہے اور قادر مطلق ہے، وہ ممکن محتاج وحادث نہیں۔

" فالا لہ القدیم الازلی یمتنع ان یکون کذلک "

اللہ تعالیٰ قدیم ازلی ذات ہے اس لئے وہ آنے جانے سے پاک ہے۔

(۳) ہر وہ چیز جو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہو وہ محدود ہوتی ہے، اور متناہی ہوتی ہے، یعنی اس کا ایک حد تک اختتام ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ محدود اور متناہی ہونے سے پاک ہے۔ لہٰذا وہ آنے جانے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ سے منتقل ہونے سے بھی پاک ہے۔

(۴) اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے آنا جانا جائز مانا جائے تو کیا وجہ ہے کہ سورج اور چاند کو معبود نہ مانا جائے، اور چاند اور سورج اور ستاروں کو اللہ ماننے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر طعن لازم آئے گا۔ اور ان کی تکذیب

لازم آئے گی، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نبی پر کذب کا گمان کرنا کفر ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ کے متعلق یہ خیال کیا جائے کہ وہ آنے جانے والا ہے تو کفر لازم آئے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر طعن کیوں لازم آئے گا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے چاند، سورج اور ستاروں کے معبود ہونے کی نفی پر یہ دلیل قائم فرمائی۔ " لا احب الآفلین " " میں پسند نہیں کرتا چھپ جانے والوں کو" یعنی چھپ جانے والے معبود نہیں بن سکتے۔ اسی سے واضح ہوا کہ آنے جانے والا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والا معبود نہیں بن سکتا۔

(۵) فرعون نے جب موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا "ومارب العالمین" سب جہانوں کا رب کیسا ہے؟

اس کا خیال تھا کہ رب کی ماہیت بیان کی جائے گی۔ اس کا جنس ہونا یا جوہر ہونا اور اس کا جسم ہونا بیان کیا جائے گا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کی صفات بیان کر کے اس کا جواب دیا۔ ارشاد فرمایا "رب السماوات والارض " وہ آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے۔

اور ارشاد فرمایا " ربکم ورب آبا نکم الاولین " وہ تمہارا رب ہے اور تمہارے پہلے آباء کا رب ہے۔

اور ارشاد فرمایا " رب المشرق والمغرب " وہ مشرق ومغرب کا رب ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو رب تعالیٰ کی صفات سے جواب دے کر اس کے نظریات باطلہ کا رد کر دیا۔

"علمنا انه تعالیٰ منزہ عن ان یکو ن جسما وان یکو ن فی مکا ن ومنزہ عن ان یصح علیه المجی والذھاب "

فرعون کے سوال اور موسیٰ علیہ السلام کے جواب سے ہمیں بھی پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے اور کسی مکان میں ہونے سے پاک ہے اور آنے جانے سے پاک ہے۔

(۶) جو چیز جسم ہو وہ عرض اور اشارہ کے لحاظ سے دو جزؤں کی طرف منقسم ہوتی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت بیان فرمائی " قل ھو اللہ احد" فرمادو اللہ ایک ہے۔

"فلما کا ن تعالیٰ احدا امتنع ان یکو ن جسما اومتحیزا فلمالم یکن جسما ولا متحیزا امتنع علیه المجی والذھا ب "

جب اللہ تعالیٰ ایک ہے تو اس کا جسم ہونا یا اس کا کسی حیز (مکان) میں ہونا ممتنع ہے۔ جب اس کا جسم ہونا اور کسی مکان میں ہونا ممتنع ہے تو یقیناً اس کا آنا اور جانا بھی ممتنع ہے، کیونکہ آنے جانے والا جسم ہوتا ہے اور مکان میں پایا جاتا ہے۔

پھر جسم دوسرے جسموں کا مشابہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کوئی مشابہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بیان کرتے ہوئے یوں سوال کیا ہے"(هل تعلم له سميا) اى شبيها" کیا تم اس کی شبیہ کو جانتے ہو؟ یعنی اس کا کوئی مشابہ نہیں۔ وہ مشابہت سے پاک ہے۔ پھر اور فرمایا "ليس كمثله شئ" اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔

"فثبت انه تعالىٰ ليس بجسم ولا متحيز وانه لا يصح المجئ والذهاب عليه"

ثابت ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ جسم نہیں اور کسی مکان میں نہیں پایا جاتا تو اسی سے واضح ہوا کہ وہ آنے اور جانے سے پاک ہے۔ (از کبیر)

"فی ظلل من الغمام والملٰئكة":

(مگر یہ کہ ان کے پاس اللہ کا عذاب آجائے) بادلوں کے سائے میں اور فرشتے آجائیں۔

دینی طلباء کی توجہ کے لئے:

"والملائكة" کا عطف ہے لفظ "الله" پر اس لئے یہ فاعل ہوا "ياتى" کا۔

"والمراد العذاب الذى ياتيهم فى الغمام مع الملائكة"

مراد یہ ہے کہ ان کے پاس اللہ کا عذاب بادلوں میں آئے اور اس عذاب کے ساتھ فرشتے بھی آئیں۔

یعنی وہ عذاب لانے کی ذمہ داری فرشتوں کے سپرد کر دی جائے۔

"ظلل" جمع ہے "ظلة" کی۔ جس چیز کے ذریعے کسی پر سایہ کیا جاتا ہے "ظلة" کہا جاتا ہے۔

"والغمام اى السحاب لايكون كذلك الا اذا كان مجتمعا متراكما"

غمام اس بادل کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ مجتمع ہو کر بادل چھا جائیں۔

"ظلل من الغمام" کا مجموعی معنی یہ ہے کہ بادل کے کئی ٹکڑے آپس میں مل جائیں اور گتھم گتھا ہو جائیں۔ (از کبیر)

اعلیٰ حضرت نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے "چھائے ہوئے بادل"

راقم نے حقیقی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے "فی ظلل من الغمام" کا ترجمہ کیا ہے "بادلوں کے سائے میں"

مطلب اس کا بھی یہی ہے کہ جب گہرے اور گھنے بادل بہت زیادہ چھا جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے "بادلوں نے سایہ ڈال دیا" بادلوں نے رات ڈال دی۔

بادلوں میں عذاب کرنے کی حکمت:

"ان الغمام مظنة الرحمة" بادلوں کو دیکھ کر رحمت کا اعتبار کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کی بارش آ رہی ہے۔

شر اور مصیبت کا گمان نہ ہو تو اچانک مصیبت واقع ہو جائے تو وہ زیادہ ہولناک اور پریشان کن ہوتی ہے۔

اسی طرح خیر اور مہربانی کا گمان نہ ہو تو اچانک مہربانی حاصل ہو تو اس سے بہت زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔

" فكيف اذا جاء الشر من حيث يحتسب الخير "

جب ایک چیز کو خیر سمجھا جائے اور اس میں رحمت کی امید لگائی گئی ہو وہی جب عذاب بن جائے تو یقیناً وہ بہت ہولناک منظر ہوگا، بہت زیادہ گھبراہٹ کا سبب بنے گا۔

بادلوں میں عذاب کے آنے کو ذکر کر کے اور اس طرف اشارہ کیا گیا کہ جس طرح بارش کے قطرات کو شمار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مقدار کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ (از کبیر)

"وقضی الامر": اور فیصلہ کر دیا جائے کام کا۔

"قضی" ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔لیکن معنیٰ مستقبل کا ہے۔اس سے اشارہ اس طرف پایا گیا ہے کہ قیامت کے امور دفعۃً واحدۃً (ایک مرتبہ ہی) پائے جائیں گے۔ (از کبیر)

"اتم امر العباد و حسابھم فاثیب الطائع و عوقب العاصی"

بندوں کا معاملہ مکمل کر دیا جائے اور ان کا حساب کر لیا جائے مطیع کو ثواب دے دیا جائے اور نافرمان کو عذاب۔

"واتم امر ھلا کھم و فرغ منه "ان کی ہلاکت کا معاملہ مکمل کر دیا جائے اور اس سے فارغ ہو جائے۔ (روح المعانی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی کی اس آخری عبارت کے مطابق ہے"اور کام ہو چکے"

راقم کا ترجمہ بھی تقریباً اسی کے مطابق ہے لیکن لغوی معانی کا ذکر کیا گیا ہے"اور فیصلہ کر دیا جائے کام کا"

روح البیان نے ماضی کا معنیٰ کیا ہے۔"(وقضی)فی اللوح (الأمر)امر ھلا کھم"

لوح محفوظ میں ان کی ہلاکت کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔

"والی الله ترجع الامور": اور طرف اللہ کے لوٹائے جاتے ہیں تمام کام۔

مجسمہ فرقہ کی غلط فہمی:

وہ فرقہ جو اللہ تعالیٰ کا جسم مانتا ہے،انہوں نے اس آیۂ کریمہ میں استعمال لفظ "الی" سے دلیل پکڑی ہے کہ "الی" انتہاء غایت کے لئے آتا ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکان میں ہوگا،جس کی طرف تمام امور کو لوٹایا جائے گا۔جب مکان میں ہوگا تو جسم بھی ہوگا۔

ان کی غلط فہمی کا ازالہ:

یہاں "الی" غایت مکانیہ کے لئے استعمال نہیں بلکہ غایۃ تقرب کے لئے استعمال ہے،دنیا میں بندوں کے

کثیر امور اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں تو آخرت میں صرف رب تعالیٰ کا حکم بندوں پر چلے گا، جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا "والا مریو منذللہ " اس دن حکم صرف رب تعالیٰ کا ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوں گے، وہی ان کا بصیر ہوگا' اس کے بغیر کسی کی ملکیت وہاں نہیں ہوگی۔

جس طرح ہم کہتے ہیں " رجع امرنا الی الامیر " ظاہری معنی تو اس کا بھی یہ ہے کہ ہمارا معاملہ امیر کی طرف لوٹ گیا' لیکن مراد اس کی یہ ہے کہ "ہمارا معاملہ امیر کے پاس ہے" یعنی اس کی نظر میں ہے۔

یہی مطلب "والی اللہ المصیر" کا ہے کہ مخلوق کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہوگا " لان الخلق الساعة فی ملکه و سلطا نه " کیونکہ ہر گھڑی میں مخلوق اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کی بادشاہی میں موجود ہے۔

اس لئے رب تعالیٰ کی طرف پھیرے جانے کا یہی مفہوم ہے۔

دوسرا مطلب "اللہ تعالیٰ کی طرف امور لوٹائے جانے" کا یہ ہے کہ دنیا مقام امتحان ہے، جب یہ سلسلہ امتحان ختم ہو جائے گا تو دار آخرت جو ثواب وعقاب کا مقام ہے وہاں انسان پہنچ جائیں گے۔ " کان الامر کله لله" تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوں گے۔ اس لئے بندے کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے' اور مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جائے' اور رب تعالیٰ کی نہی کے مطابق شیطان کی تابعداری نہ کرے' یعنی اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں تمام امور کا ہونا ہی "اس کی طرف امور کو لوٹائے جانے" کا مطلب ہے۔ (از کبیر)

مجسمہ کی طرح سندھی کی غلط فہمی:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جب اہل قریظہ نے سعد بن معاذ کو حکم بنانے پر رضامندی کا اظہار کیا تو رسول ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا، وہ اپنے گدھے پر سوار ہو کر آئے، جب مسجد کے قریب آئے۔

" قال رسول اللہ ﷺ للانصار قوموا الی سید کم او خیر کم "

تو رسول اللہ ﷺ نے انصار کو فرمایا اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ یا آپ نے فرمایا جو شخص تم سے بہتر ہے اس کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

اس حدیث پر عبداللہ سندھی نے حاشیہ لکھا۔

" لا دلیل فیہ علی قیام التعظیم و التکریم اذلو ارید ذاک لقیل قوموا لسید کم و اماھذا الحدیث فانما یدل علی القیام للمریض عند النزول او القیام لاستقبال العظیم و نحو ذلک "

کہ اس حدیث میں کسی کی تعظیم کے لئے کھڑے ہونے پر کوئی دلیل نہیں پائی گئی اگر یہ مقصد ہوتا تو یہ کہا جاتا "**قوموا لسید کم**" اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ" **قوموا الی سید کم** " نہ کہا جاتا کیونکہ اس کا معنی تو یہ ہے کہ اپنے سردار کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ ہاں البتہ اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ سعد چونکہ مریض تھے تو حکم دیا کہ مریض کے اترتے وقت اس کے پاس کھڑے ہو جاؤ (تاکہ اتارنے میں اس کی امداد کرو) یا اس سے ایک بڑے آدمی کے استقبال کے لئے کھڑا ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

سندھی کی عجیب غلطی:

سندھی پر تو ایک مشہور مثال بچی آتی ہے۔

" **فرمن المطر وقر تحت المیزاب** " بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

تعظیم کے لئے کھڑا ہونے کا انکار اور عظیم شخص کے استقبال کے لئے کھڑا ہونے کا اقرار کیسی عجیب غلطی ہے۔ استقبال کے لئے کھڑا ہونے کا نام ہی تو قیام تعظیمی ہے، کیا یہ بھی کسی مسلمان سے سنا گیا ہے کہ وہ کسی بندے کو معبود سمجھ کر اس کے لئے بطور عبادت کھڑا ہوا ہو؟ ایسا ہرگز نہیں۔

سندھی کی دوسری غلطی:

وہی ہے جو مجسمہ نے " الی " کی وجہ سے غلطی کی ہے۔ سندھی کو یہ بات سمجھ نہ آئی کہ اس مقام میں " الی "

غایت مکانی کے لئے نہیں بلکہ غایۃ تقرب کے لئے ہے، جس کا مقصد یہ ہے اپنے سردار کے استقبال کے لئے ان کے قریب ہوکر کھڑے ہوجاؤ، صرف کھڑے ہونے کی بنسبت قریب ہوکر کھڑے ہونے میں اور ہی کمال پایا گیا ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ کی تحقیق:

" قولہ ﷺ " قوموا الی سید کم او خیر کم " فیہ اکرام اھل الفضل وتلقیھم با لقیام لھم اذااقبلو اھذا احتج بہ جما ھیر العلماء لا ستحباب القیام "

اس حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہورہا ہے کہ فضلیت والے حضرات کی عزت کی جائے اور کھڑے ہوکران سے ملاقات کی جائے، جمہور علماء کرام کی یہی تحقیق ہے اور یہی حدیث ان کی دلیل ہے کہ اہلِ فضل کے لئے کھڑا ہونا مستحب ہے۔

اس کے بعد علامہ نووی اپنا مختار بیان کرتے ہیں۔

" قلت القیام للقادم من اھل الفضل مستحب وقد جاء فیہ احادیث ولم یصح فی النھی عنہ شئ صریح " (نووی شرح مسلم ج۲ ص ۱۰۳)

میں کہتا ہوں کہ اہلِ فضل کے آنے پر کھڑا ہونا مستحب ہے۔ جو احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، ممانعت پر کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں۔

استدلال لازوال:

سید الاولیا، حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ نے اسی حدیث کو بیان فرماتے ہوئے شاندار دلیل قائم فرمائی، آپ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا" قوموا الی سید کم "(اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو)

لفظ"سید"مشتق ہے، قانون یہ ہے کہ مشتق میں مبداء اشتقاق علت ہوتا ہے، اس لئے حدیث پاک کا مطلب ہی یہ ہے" قوموا لسید کم لسیادتہ "اپنے سردار کے لئے ان کی سرداری کی وجہ سے کھڑے ہوجاؤ۔

اگر حضرت سعد کو سواری سے اتارنا مقصود ہوتا تو تمام انصار کو حکم نہ دیا جاتا۔ اور یہ کہا جاتا ''قوموا الی سعد'' سعد کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے کسی کے سامنے کھڑے ہونے سے منع فرمایا، ان ممانعت والی احادیث کو دیکھ کر تو یہی پتہ چلتا ہے سندھی کا حاشیہ درست، ممانعت والی احادیث کو دیکھئے۔

☆ ''عن ابی امامة قال خرج رسول الله ﷺ متکئا علی عصا فقمناله فقال لا تقوموا کما تقوم الاعاجم یعظم بعضها بعضا'' رواه ابو داؤد (مشکوة باب القیام)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ عصا پر سہارا لگا کر نکلے، ہم آپ کے لئے کھڑے ہو گئے تو آپ نے فرمایا تم نہ کھڑے ہو جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں، بعض بعض کی تعظیم کرتے ہیں۔

☆ ''عن معاویة قال قال رسول الله ﷺ من سره ان یتمثل له الرجال قیاما فلیتبوا مقعده من النار'' (رواه ابو داؤد والترمذی مشکوة باب القیام)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو یہ خوش لگے کہ لوگ اس کے سامنے بت کی طرح کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے۔

جواب: ان احادیث میں مطلقاً قیام سے منع نہیں کیا گیا، بلکہ اس میں تفصیل ہے، آیئے علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی وضاحت دیکھئے۔ '' قیل هذا الوعید لمن سلک فیه التکبر بقرینة السرور للسئول ''

اس وعید کا تعلق اس شخص سے ہے جو تکبر کے طور پر لوگوں کو کھڑے ہونے کا حکم دے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے ''من سره '' جس کو خوش لگے کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوں۔ تو اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ کھڑا ہونے کا سوال کرے، مطالبہ کرے کہ میرے سامنے کھڑے رہو۔

'' وقدروی البیهقی فی شعب الایمان عن الخطابی فی معنی الحدیث هو ان یأمرهم بذلک ویلزمه ایاهم علی مذهب الکبر والفخر '' (بیهقی فی شعب الایمان)

علامہ خطابی رحمہ اللہ نے حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا'' کہ کوئی شخص کسی کو حکم دے کہ تم میرے سامنے کھڑے رہو تو یہ منع ہے کیونکہ اس میں تکبر اور فخر پایا گیا ہے''۔

" واما اذالم یطلب ذلک وقاموا من تلقاء انفسھم طلباللثواب اولارادة التواضع فلا باس به "

لیکن جب کوئی دوسرے سے کھڑے ہونے کا مطالبہ نہ کرے بلکہ لوگ خود کھڑے ہو جائیں کہ یہ بزرگ ہیں، عالم ہیں ان کے لئے کھڑا ہونا ثواب ہے، یا اس کے لئے کوئی شخص کھڑا ہو جائے کہ میں تو اس بلند ہستی کے سامنے کم درجہ رکھتا ہوں، اس کے کھڑے ہونے کا مقصد اظہار عجز ہو تو یہ جائز ہے اس میں کسی قسم کی کوئی حرج نہیں۔

" وفی حدیث سعد دلالة علی ان قیام المرء بین یدی الرئیس الفاضل والوالی العادل وقیام المتعلم للمعلم مستحب غیر مکروہ "

جس حدیث میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لئے کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ کوئی انسان اپنی مرضی سے کسی صاحب رئیس کے سامنے کھڑا ہو جائے یا عادل حاکم کے سامنے کھڑا ہو جائے یا شاگرد استاد کے لئے کھڑا ہو جائے یہ قیام مستحب ہے مکروہ نہیں۔

" وقال البیھقی ھذا القیام یکون علی وجه البر والاکرام کما کان قیام الانصار لسعد وقیام طلحة لکعب بن مالک "

بیہقی نے بیان کیا ہے کہ مشائخ، فضلاء، اساتذہ اور عادلین حضرات کے لئے کھڑا ہونا ان کے اکرام کے لئے ہے اور ثواب حاصل کرنے کے لئے ہے یہ ایسے ہی جائز اور مستحب ہے جیسے انصار حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لئے کھڑے ہوئے اور طلحہ کعب بن مالک (رضی اللہ عنہما) کے لئے کھڑے ہوئے (جب ان کی توبہ قبول ہوئی)۔

قیام ممنوع پر فیصلہ کن بات:

"ولاینبغی للذی یقام له ان یرید ذلک من صاحبه حتی ان لم یفعل حقدعلیه اوشکاه اوعاقبه"

اس شخص کے لئے کھڑا ہونا منع ہے جو چاہے کہ میرے لئے لوگ کھڑے ہو جائیں جو نہ کھڑے ہوں ان کے خلاف کینہ رکھے یا اس پر شکایت کرے تم کیوں کھڑے نہیں ہوئے یا سزا دے۔

(ماخوذ از مرقاة)

فائدہ: "والی اللہ ترجع الامور" کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے اموراور اعمال قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور ہوں گے، وہ مطیع لوگوں کو ثواب عطاء فرمائے گا اور نافرمانوں کو عذاب دے گا۔

اس لئے مومن کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع بن کر رہے۔اور ناجائز خواہشاتِ نفسانیہ سے دور رہے، اور شیطان کی تابعداری نہ کرے۔

"وعن النبی ﷺ انہ قال (ان اللہ تعالٰی اظھر الشکایۃ من امتی) وقال(انی طردت الشیطان لا جلھم فھم یعصو ننی ویطیعون الشیطان "

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں، بے شک رب تعالیٰ نے میری امت کے متعلق شکایت ظاہر کی کہ میں نے شیطان کو انسانوں (آدم علیہ السلام) کی وجہ سے اپنی درگاہ سے راند دیا،لیکن وہ میری نافرمانی کرتے ہیں،اور شیطان کی فرمانبداری کرتے ہیں۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

کجا سر برآریم ازیں عار وننگ   کہ بااو بصلحیم وباحق بجنگ

کب سراوپر لائیں گے ہم شرم وحیاء کی وجہ سے۔کہ اس کے ساتھ (شیطان کے ساتھ) ہم صلح رکھیں اور رب تعالیٰ سے جنگ۔

نظر دوست نادر کند سوئے تو   چودر روی دشمن بود روی تو

دوست تیری طرف کم ہی نظر کرے گا، جب تیرا منہ دشمن کے منہ کی طرف ہوگا۔

ندانی کہ کمتر نہد دوست پائے   چو بیند کہ دشمن بود در سرائے

تونہیں جانتا کہ بہت کم ہی رکھے گا دوست اپنے پاؤں۔ جب تیری سرائے میں دشمن کو دیکھے گا۔

(از روح البیان)

☆☆☆☆☆☆

سَلْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ کَمْ آتَیْنَاهُمْ مِّنْ آیَةٍ بَیِّنَةٍ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِمَاجَاءَ تْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۱۱)

۱

بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے کتنی روشن نشانیاں انہیں دیں اور جو اللہ کی آئی ہوئی نعمت کو بدل دے تو بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔

۲

سوال کرو بنی اسرائیل سے کتنی دی ہیں ہم نے ان کو نشانیاں کھلی، اور جو شخص تبدیل کر دے اللہ کی نعمت اس کے بعد کہ آچکی ہے (وہ نعمت) اس کے پاس، تو بیشک اللہ سخت عذاب والا ہے۔

ماقبل سے رابطہ:

اللہ تعالی نے پہلے ارشاد فرمایا۔ " یاایھاالذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطن " اس آیۃ کریمہ میں تہدید پائی گئی، یعنی ڈرایا دھمکایا گیا ہے، کیونکہ اس میں اسلام کے احکام پر مکمل طور پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان کی تابعداری سے منع کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے وہ تمہیں جہنم میں لے جائے گا۔

دوسری آیۃ کریمہ " فان زللتم من بعد ما جاء تکم البینات فاعلموا ان اللہ عزیز حکیم " میں بھی تہدید پائی گئی ہے، کیونکہ اس میں گناہوں میں مبتلا ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ غالب ہے اور حکمت والا ہے، کہ وہ عذاب دے تو کوئی اس کے عذاب کو روکنے والا نہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں ظاہر طور پر تہدید پائی گئی ہے کیونکہ فرمایا "فان اللہ شدید العقاب " بیشک اللہ سخت عذاب والا ہے۔ (از کبیر)

شانِ نزول و مختصر مطلب:

جب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے اہل کتاب کے پادریوں نے آسمانی کتب میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو تبدیل کر دیا، کتب میں تحریف کر دی تو ان کو ڈرانے کے لئے نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کے مسلمان لوگوں کو کہا گیا کہ بنی اسرائیل سے پوچھوان کے آباؤ اجداد کو کتنی عظیم نعمتیں دی گئیں، پھر ان گنت نعمتوں سے ہر انسان کو نوازا گیا، حق تو یہ تھا کہ ان نعمتوں کا شکریہ ادا کیا جاتا، لیکن تم نے ان نعمتوں کو بدل ڈالا، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف کا تمہاری کتب میں ذکر کرنا، تمہارے لئے عظیم نعمت تھی، لیکن تم نے اس نعمت کو تبدیل کر کے عظیم جرم کیا، لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک دن فیصلہ کی گھڑی بھی آنے والی ہے، جبکہ تمہیں اس وقت شدید نقصان میں مبتلا ہونا پڑے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ شدید عذاب والا ہے۔ (از خازن)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"سل" امر کا صیغہ ہے، اصل میں "اسئل" ہے، ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دی گئی، ہمزہ کو گرا دیا، اور شروع میں ہمزہ وصل کو بھی گرا دیا گیا "سل" رہ گیا۔

خیال رہے کہ ابتداء کلام میں تخفیف کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا ابتداء میں یہاں بھی "سل" ذکر کیا گیا۔ اور "سلھم" میں بھی "سل" ذکر کیا گیا لیکن درمیان میں ہمزہ وصل درج کلام کی وجہ سے خود ہی گر جاتا ہے، اس لئے بغیر تخفیف کے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "واسئل القریة" میں، اور "فاسئل الذین یقرؤن الکتاب" میں اور "واسئلوا اللہ من فضله" میں تخفیف نہیں کی گئی، البتہ کسائی نحوی ہر جگہ پر ہمزہ کو ساقط کر کے تخفیف سے پڑھتے ہیں (تاہم ان کی قرات جمہور کے خلاف ہے)۔ (از کبیر)

"سل بنی اسرائیل":

"اعلم انه لیس المقصود "سل بنی اسرائیل" لیخبروک عن تلک الآیات فتعلمها و

ذلک لان الرسول ﷺ کان عالمابتلک الاحوال با علام اللہ تعالیٰ ایاہ "

یہ خطاب براہِ راست نبی کریم ﷺ کو ہے اور آپ کے واسطہ سے آپ کی امت کے مسلمانوں کو بھی ہے۔ بظاہر یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے کہ آپ بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ ہم نے ان کو کتنی کھلی نشانیاں دی ہیں۔ اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو علم حاصل نہیں تھا۔

تو اس کا جواب علامہ رازی رحمہ اللہ نے دیا کہ اس کا یہ مقصد نہیں کہ نبی کریم ﷺ ان سے پوچھیں تو آپ کو علم حاصل ہو جائے، بلکہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی علم عطاء کر رکھا ہے۔

" بل المقصود منه المبالغة فی الزجر عن الاعراض عن دلائل اللہ تعالیٰ "

بلکہ مقصد ان کو بہت زیادہ زجر و توبیخ کرنا (ڈانٹ ڈپٹ دینا) ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دلائل سے اعراض کر رہے تھے، یعنی یہاں سوال توبیخ اور تقریع کے لئے ہے۔ (تقریع، کانوں پر کھٹکانا) (از کبیر)

"کم آتینا ھم من آیۃ بینۃ": کتنی دی ہیں ہم نے ان کو نشانیاں کھلی۔

دینی طلباء کرام کے فائدہ کے لئے:

لفظ " کم " میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ کم استفہامیہ ہو۔ اور دوسرا یہ کہ کم خبریہ ہو۔ (مدارک)

کم استفہامیہ کے مطابق زجر و توبیخ پر مبنی سوال ہوگا۔ اور کم خبریہ کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ "ان سے پوچھ کر ان کو بتائیں ہم نے ان کو کتنی ہی کھلی نشانیاں دی ہیں۔

کھلی نشانیوں سے مراد کیا ہے:

اس کے معنی میں وسعت پائی گئی ہے۔ اس سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دلالت کرنے والی نشانیاں ہیں، جیسے آپ کو عصا بطور معجزہ دیا گیا۔ اور ید بیضاء اور دریا کا پھٹ جانا، اور من وسلویٰ اتارنا، جن سے ان کے آباء واجداد نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

کھلی نشانیوں سے اور مراد یہ ہے۔

" ھی حجج اللہ الدالۃ علی نبوۃ محمد ﷺ وذلک انھم انکروھا و بدلوھا "

کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو دلائل دیئے گئے تھے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے ان کا انکار کر دیا تھا اور ان کو تبدیل کر دیا تھا۔

کھلی نشانیوں سے اور مراد یہ ہے " عھدہ الذی عھد الیھم فلم یفوابہ "

کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو عہد لئے تھے کہ ان کو پورا کرنا، لیکن انہوں نے ان کی وفا نہ کی۔

کھلی نشانیوں سے مراد مطلق اللہ تعالیٰ کی وہ آیات ہیں جو ان کو ہدایت دینے والی ہیں اور گمراہی سے بچانے والی ہیں، لیکن انہوں نے ان کو تبدیل کر دیا۔

" ومن یبدل نعمۃ اللہ من بعد ما جاءتہ ":

اور جس نے تبدیل کر دیا اللہ کی نعمتوں کو اس کے بعد کہ وہ آ گئیں ان کے پاس۔

" فان اللہ شدید العقاب ": تو بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے۔

جن کھلی نشانیوں کا پہلے ذکر کیا ان تمام کو انہوں نے اور ان کے آباء واجداد نے تبدیل کر دیا۔ کیونکہ جابجا ان کے آباء واجداد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکام کی مخالفت کرتے رہے گویا کہ ان کے معجزات کو خاطر خواہ نہ لاتے رہے۔ من وسلویٰ کے کھانے سے انہوں نے انکار کیا، دریا ان کے گذرنے کے لئے پھٹا تھا، حق تو یہ تھا کہ وہ کٹر پختہ ایمان والے ہوتے، لیکن انہوں نے ظاہر دیکھے جانے والے خدا پر ایمان لانے کا اصرار شروع کر دیا، یہ سب نعمتوں کو تبدیل کرنے کے مترادف تھا۔ اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو کتب سے بدلا۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد کی وفاء نہ کر کے ایفاء عہد کے حکم کو پس پشت ڈال کر بدل دیا۔ اور انہوں نے نجات دینے والی آیات کو بدل کر گمراہی کو حاصل کر لیا۔

(ارحارن)

نعمت سے اور مراد یہ ہے:

کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو اسباب صحت اور اسبابِ امن اور اسباب کفایت عطاء فرمائے، جب انہوں نے کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے بطور انتقام ان نعمتوں کو تبدیل کر دیا۔ اگر چہ ان کو تبدیل تو اللہ تعالیٰ نے کیا، لیکن سبب یہی لوگ تھے کہ انہوں نے رب تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کو تبدیل کرنے کی نسبت ان کی طرف دی۔ (از کبیر)

مقام توجہ:

جب نعمتوں سے مراد آیات اور دلائل ہو تو "من بعد ماجاء ته" کا معنی ہوگا "من بعد ما تمکن من معرفتها" ان کی معرفت پر قدرت رکھنا، ان کی معرفت کا حاصل ہونا۔ کیونکہ جب تک آیات و دلائل کی معرفت حاصل نہیں ہوگی وہ غائب کے درجہ میں ہوں گے۔

اور اگر نعمتوں سے مراد صحت و امن کفایت ہوں تو پھر ظاہری معنی '' آنا'' ہی ہوگا۔

"فلا شک ان عند حصول هذه الاسباب یکون الشکر اوجب فکان الکفر اقبح"

تو یقیناً ان نعمتوں کے حاصل ہونے پر شکر واجب ہوگا اور کفر قبیح ہوگا۔ (از کبیر)

تنبیہ: علامہ واحدی رحمہ اللہ نے فرمایا" فان الله شدید العقاب" میں لفظ "له" پوشیدہ ہے۔ معنوی لحاظ پر اصل عبارت یہ ہے۔ "فان الله شدید العقاب له" بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ یعنی "شدید" صفت ہے " عقاب " کی اصل میں " العقاب الشدید" تھا، صفت کو مضاف بنایا۔ (یہ تمام ضوابط دینی مدارس کے طلباء کرام سے مخفی نہیں، اور یہ بھی خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، عبد القاہر نے '' دلائل الاعجاز'' میں ذکر کیا" ان ترک هذا الاضمار اولی " بے شک یہ پوشیدہ عبارت مراد نہ لینا زیادہ بہتر ہے۔

" وذلک لأن المقصود من الآیة التخویف یکون فی ذاته وموصوفاباًنه شدید العقاب من غیر التفات الی کونه شدید العقاب لهذااو لذلک"

کیونکہ آیۃ کریمہ میں اصل مقصود اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات سے ڈرانا ہے، کہ وہ رب تعالیٰ سخت عذاب دینے سے متصف ہے، یہ بیان کرنا مقصود نہیں کہ اس کا عذاب سخت اس کے لئے یا اس کے لئے۔

(از کبیر)

راقم نے ترجمہ علامہ عبدالقاہر کی تحقیق کے مطابق کیا ہے "تو بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے"

اصل مقصود طلباء کرام کو مختلف بحثیں ذہن نشین کرانا ہے تاکہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھ کر علامہ واحدی رحمہ اللہ کی تحقیق یاد ہو جائے، اور راقم کا ترجمہ دیکھ علامہ عبدالقاہر کی تحقیق کا پتہ چل جائے۔

عقاب کی وجہ تسمیہ:

عقب کا معنیٰ ہوتا ہے پیچھے آنا، اسی وجہ سے ایڑی کو عقب کہا جاتا ہے کہ وہ بھی پاؤں کے پچھلے حصہ میں ہوتی ہے، عذاب کو عقاب اس لئے کہا جاتا ہے" والعقاب عذاب یعقب الجرم" کہ وہ جرم کے بعد پیچھے بطور سزا دیا جاتا ہے۔

(از کبیر)

فائدہ: "والمقصود من ذکر هذه الحکایة ان یعتبروا بغیرهم" اس آیۃ کریمہ سے تمام مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم بھی عبرت پکڑو، اگر تم نے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تبدیل کیا تو تم بھی اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آؤ گے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

" لقد کان فی قصصهم عبرة لأولی الالباب "

تحقیق ان کے قصے بیان کرنے میں عقل والوں کے لئے عبرت ہے۔ (کبیر)

☆☆☆☆☆☆

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۱۲)

﴿۱﴾

کافروں کی نگاہ میں دنیا کی زندگی آراستہ کی گئی اور مسلمانوں سے ہنستے ہیں اور ڈر والے ان سے اوپر ہوں گے قیامت کے دن اور خدا جسے چاہے بے گنتی دے۔

﴿۲﴾

مزین کر دیا ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا "دنیا کی زندگی کو"۔ اور وہ ہنسی اڑاتے ہیں ان لوگوں کی جنہوں نے ایمان لایا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے تقوی اختیار کیا وہ اوپر ہوں گے ان کے قیامت کے دن، اور اللہ عطاء کرتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے۔

ماقبل سے رابطہ:

پچھلی آیت کریمہ میں ذکر کیا "ومن يبدل نعمة الله من بعد ما جاء ته" اور جو شخص اللہ کی نعمتوں کو تبدیل کرتا ہے ان کے آجانے کے بعد تو بے شک اللہ عزیز وحکیم ہے۔ یعنی وہ انتقام لینے والا ہے غالب ہے، کوئی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تبدیل کرنا کافروں کا وطیرہ تھا۔ اس لئے اس آیۃ کریمہ میں ان کافروں کی تبدیلی کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ وہ دنیا کی مزین زندگی میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بدل دیتے ہیں۔

"ومحصول هذا الكلام تعريف المومنين ضعف عقول الكفار والمشركين في ترجيع الفاني من زينة الدنيا على الباقي من درجات الآخرة"

اس کلام کا مقصد یہ ہے کہ مومنوں کو بتایا جائے کہ کفار ومشرکین کی عقلیں ضعیف ہیں کہ وہ دنیا کی

زندگی اوراس کی زیب وزینت کو باقی رہنے والی اور فضیلت والی اخروی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔

(کبیر)

شانِ نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شانِ نزول میں چند وجہ ذکر کی گئی ہیں، جو تمام ہی مجموعی طور پر مراد ہیں، کہ چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیۃ کریمہ ابوجہل اور قریش کے رئیس لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی "کانوا یسخرون من فقراء المسلمین" کہ وہ فقیر مسلمانوں سے طنز کرتے تھے اور ہنسی اڑاتے تھے۔ یعنی وہ عبداللہ بن مسعود، عمار، خباب، ابو حذیفہ کے غلام سالم، عامر بن فہیرہ اور ابو عبیدہ بن جراح جیسے غریب صحابہ کرام سے وہ ہنسی اڑاتے تھے۔

(۲) یہ آیۃ کریمہ بنو قریظہ اور بنو نضیر اور بنو قینقاع کے متعلق نازل ہوئی، جبکہ انہوں نے مہاجرین صحابہ کرام کا تمسخر (مزاح) اڑایا، کیونکہ مہاجرین صحابہ کرام اپنے گھر اور مال چھوڑ کر آئے، اس لئے وہ غربت کی حالت میں بہت سادہ لباس رکھا کرتے تھے، جس کی وجہ سے یہود کے رئیس اور پادری ان سے ہنسی اڑاتے تھے۔

(۳) یہ آیۃ کریمہ منافقین کے متعلق نازل ہوئی، کیونکہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی کمزور حال مسلمانوں سے اور فقراء مہاجرین سے ہنسی اڑاتے تھے اور مزاح کیا کرتے تھے۔ (از کبیر)

تمام صورتوں کا مجموعہ ہی شان نزول ہے:

یعنی تمام واقعات کے درپیش آنے کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

" واعلم انه لا مانع من نزولها في جميعهم "

جان لو بے شک تمام واقعات کو مجموعی طور پر آیۃ کریمہ کے شان نزول ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ (از کبیر)

''زین للذین کفرواالحیوۃ الدنیا'': مزین کی گئی کافروں کے لئے دنیا کی زندگی۔

'' زین '' ماضی مجہول ہے، جس کا فاعل ذکر نہیں ، اس کا فاعل کیا ہے؟ اس کے فاعل میں دو احتمال ہیں ۔ایک فاعل حقیقی ۔اور دوسرا فاعل مجازی۔

فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔اس لئے کہ ہر چیز کا خالق و مالک وہی ہے۔ جب اس کی نسبت حقیقی فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتو اس کا مطلب یہ ہوگا۔

'' او جدت حسنة و جعلت محبو بة فی قلو بهم فتهافتوا علیهاتها فت الفراش علی النار واعرضوا عماسواها''

دنیا کی زندگی کو(کفار کے لئے) حسین طور پر ایجاد کیا گیا ہے اور ان کے دلوں میں اسے محبوب بنادیا گیا، وہ اس پر ایسے گرتے ہیں جیسے پتنگ آگ پر گرتے ہیں اور اس کے ماسواء سے اعراض کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کی آیات سے روگردانی کی(منہ پھیرلیا) اور آیات کو تبدیل کرلیا۔اس معنی کے لحاظ پر فاعل اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ موجد و خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور کسی کے دل میں کسی چیز کو اثر انداز کردینا بھی اللہ تعالیٰ کا ہی وصف ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ فاعل مجازی مراد ہو۔وہ شیطان ہے۔

'' وان فسر بالتحسین با لقول ونحوه من الوسوسة کما فی قوله تعالیٰ '' لا زینن لهم فی الارض و لأغوینهم'' کا ن فاعل ذلک هو الشیطان ''

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ باتوں سے اور وسوسہ سے دنیا کی زندگی کو مزین کرنے والا شیطان ہے۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے شیطان کے قول کا ذکر کیا(ترجمہ) میں ضرور بر ضرور زمین میں ان کے لئے مزین کروں گا اور ان کو بھٹکاؤں گا۔ (روح المعانی)

راقم کے نزدیک دونوں معانی بیک وقت مختلف حیثیات سے مراد ہیں، اس طرح حقیقت ومجاز کا اجتماع بھی لازم نہیں آئے گا۔

یعنی کفار کے لئے دنیا کی زندگی اقوال اور وسوسہ سے شیطان مزین کرتا ہے جو ظاہری سبب ہے، اور حقیقت میں اس تزین کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

"ویسخرون من الذین امنوا": اور ہنسی اڑاتے ہیں ایمان والوں سے۔

"فانھم کانوا یعظمون حالھم من الدنیا ویغتبطون بھا ویستخرون من اتباع محمد ﷺ"

بیشک کافروں کو دنیا میں عظیم مال حاصل ہوتا ہے کہ وہ دولت مند ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ان کے مال ودولت کو دیکھ کر کمزور ایمان والے ان پر رشک کرتے ہیں اور ان کو دیکھ کر للچاتے ہیں، یہی وجہ تھی نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے مشرکین اور منافقین اور یہودی بھی کہ وہ اپنے مال ودولت پر ناز کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے متبعین سے تمسخر (ہنسی ومزاح) اڑاتے تھے۔

"والذین اتقوافوقھم یوم القیامۃ": اور متقی لوگ ان کے اوپر ہوں گے قیامت کے دن۔

فوقیت حاصل ہونے کی وجوہ:

(۱) متقی لوگوں کو کفار پر فوقیت کی ایک وجہ یہ حاصل ہوگی کہ متقی لوگوں کا مقام علیین ہوگا جو آسمانوں میں ہوگا اور بلند ہوگا۔ اور کفار کا مقام سجین ہوگا جو زمین کی پستی میں ہوگا۔ یعنی یہ بلندی مکان کے لحاظ پر حاصل ہوگی۔

(۲) دوسری وجہ فوقیت کی درجات اور کرامت کے لحاظ پر ہوگی کہ متقی لوگوں کے درجات بلند ہوں گے۔

اعتراض: "فلان فوق فلان فی الکرامۃ" اس وقت کہا جاتا ہے جب دونوں کو کرامت حاصل ہو لیکن ایک کو دوسرے پر زیادہ فوقیت حاصل تو یہ کہا جاتا ہے "فلان زائدالفوقیۃعلی فلان فی الکرامۃ" کہ فلاں کو فلاں پر زیادہ فوقیت حاصل ہے، لیکن کفار کو تو کرامت حاصل ہوتی ہی نہیں، تو پھر یہ کہنا کیسے درست ہے کہ مومنوں کو کفار پر

کرامت و درجات کے لحاظ پر فوقیت حاصل ہے۔

جواب: کفار کو دنیا میں مال و دولت کی وجہ سے عزت حاصل ہوتی ہے، لیکن آخرت میں معاملہ الٹ ہوگا کہ مومنین کو عزت حاصل ہوگی، یعنی ان کو ثواب حاصل ہوگا اور درجات بلند ہو جائیں گے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ مومنین متقین کو قیامت کے دن کفار کی دنیاوی عزت کی نسبت زیادہ عزت حاصل ہوگی۔

(۳) فوقیت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ متقین حجت و دلیل کے لحاظ پر کفار سے اوپر ہوں گے، کیونکہ دنیا میں کفار شبہات ڈالتے ہیں جو مومنین کے دل پر بظاہر اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد سے ان کے دلوں سے ان شبہات کو دور کر دیا جاتا ہے، لیکن قیامت کے دن کفار کو شبہات ڈالنے کی طاقت ہی حاصل نہیں ہوگی، ان کے شبہات خود بخود زائل ہو جائیں گے، شیطانوں کے وسوسے اثر انداز نہیں ہوں گے۔

یہ دلائل کی فوقیت مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے جس کے مقابل کفار کو پستی و ذلت حاصل ہوگی۔

(۴) فوقیت کی چوتھی وجہ یہ ہوگی کہ مومنین کفار سے قیامت کے دن ہنسی اڑائیں گے جو کافروں کی دنیا میں ہنسی اڑانے سے اوپر ہوگی، کیونکہ کافروں کی مومنین سے ہنسی باطل ہے اور دنیا میں ہی ختم ہو جانے والی ہے، لیکن مومنین کا تمسخر (مزاح اڑانا) حق ہوگا اور دائمی ہوگا۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"والذین اتقوا فوقھم یوم القیامۃ" یہ جملہ معطوفہ ہے جس کا عطف ماقبل پر ہے۔ اور یہ جملہ اسمیہ جو دوام و استمرار پر دلالت کر رہا ہے۔ "وفی ذلک من تسلیۃ المؤمنین ما لا یخفی" اس میں مومنین کی تسلی پائی گئی ہے جو پوشیدہ نہیں۔ یعنی اس جملہ سے ہی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن مومنین کو جو فوقیت حاصل ہوگی وہ دائمی ہوگی، اس میں کسی قسم کا کوئی انقطاع نہیں ہوگا۔ (روح المعانی)

"واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب": اور اللہ عطا کرتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے۔

قرآن پاک کی عظمت:

یہ مختصر الفاظ بہت بڑے مطالب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

رزق سے مراد دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ متقین کو جو آخرت میں عطاء ہونا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں رزق کا مطلب دنیا کی مختلف نعمتیں ہوں، جو مومنین اور کفار سب کو حاصل ہیں۔

رزق اخروی کے چند مطالب:

(۱) ان میں سے ایک مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ آخرت میں مومنوں کو بغیر حساب کے رزق عطاء فرمائے گا، یعنی وہ رزق وسیع ہوگا، اس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اور وہ فنا نہیں ہوگا، اور اس نے ختم نہیں ہونا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

" فاولئک ید خلو ن الجنة یرزقو ن فیھا بغیر حساب "

تو وہ لوگ (نیک لوگ) جنت میں داخل ہوں گے ان کو اس میں رزق دیا جائے گا بغیر حساب کے۔

جو چیز حساب میں ہو اور شمار میں ہو اور ایک مقدار میں ہو وہ ختم ہو جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو قیامت کو عطا کرنا ہے اس نے ختم نہیں ہونا۔

" فمالا یکو ن متنا ھی کان لامحالة خار جا عن الحساب "

جو چیز ختم نہ ہونے والی ہو وہ حساب سے باہر ہے۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں متقین کو جو منافع عطاء کئے جانے ہیں ان کو رزق سے تعبیر کر دیا گیا، وہ منافع ثواب اور فضل ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فیو فیھم اجو رھم و یزید ھم من فضلہ" تو ان کو پورا پورا اجر عطاء فرمائے اور اپنے فضل سے اور (بھی) زیادہ عطا فرمائے گا۔

"فالفضل منہ بلا حساب" یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن متقین پر بغیر حساب کے فضل فرمائے گا۔

(۳) بغیر حساب کے رزق دینے کا اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطاء میں نہ کمی ہوتی ہے اور نہ ختم ہوتا ہے کہ وہ حساب کرے، حساب وہ کرتا ہے جسے یہ خوف ہو کہ میرا خزانہ ختم ہو جائے گا۔ تو وہ مقدار سے زیادہ دینے سے ڈرتا ہے کہ میں کہیں محتاج ہو کر نہ بیٹھ جاؤں

" واللہ لایحتاج الی الحساب لأنه عالم غنی لا نهاية لمقدوراته "

اللہ تعالیٰ حساب کا محتاج نہیں کیونکہ وہ عالم ہے اور غنی ہے، اس کی قدرت میں جو چیزیں ہیں ان کی کوئی انتہا نہیں۔

(۴) "بغیر حساب " ای بغیر استحقاق " بغیر حساب کے دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بغیر استحقاق کے دے گا، یعنی کسی کو رب تعالیٰ پر کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے حق کا مطالبہ کرے اور اس سے حساب کرے۔

" بل کل ما اعطاه فقد اعطاه بمجرد الفضل والا حسان لابسبب الاستحقاق "

بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہر عطاء اس کے فضل واحسان سے حاصل ہوتی ہے۔ کسی کے مستحق ہونے کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتی۔

(۵) "بغیر حساب ای یزید علی قدر الکفاية " یعنی اللہ تعالیٰ ضرورت سے زیادہ عطاء فرماتا ہے کیونکہ جب ضرورت کے مطابق کوئی شخص کسی کو دے تو اس وقت کہا جاتا۔ "فلان ینفق بالحساب" فلاں شخص حساب کے ساتھ خرچ کرتا ہے لیکن ضرورت سے زائد کوئی شخص کسی کو عطاء کرے تو اس وقت یہ کہا جاتا ہے۔ "فلان ینفق بغیر حساب" فلاں شخص بغیر حساب کے خرچ کرتا ہے۔

(۶) " بغیر حساب " ای یعطی کثیرا لا ن مادخله الحساب فهو قلیل "

اللہ تعالیٰ بغیر حساب کے عطاء کرتا ہے اس کا اور مطلب یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ عطا کرتا ہے جو حساب میں نہیں آسکتا، حساب میں وہی چیز آتی ہے جو قلیل ہو۔

یہ تمام احتمالات جن کا ذکر کیا ہے' اللہ تعالیٰ کی عطاء ان تمام کے مطابق ہے' اسی لئے علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ "فیجوز ان یکون المراد کلها " جائز ہے کہ تمام وجوہ ہی مراد لی جائیں۔

دنیاوی رزق کے چند مطالب:

جب آیۃ کریمہ کا یہ معنی لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں رزق مومنین کو بھی عطا کرتا ہے اور کفار کو بھی تو اس میں چند مطالب پائے جاتے ہیں۔

(۱) اس میں ایک وجہ تو یہ ہے۔ "وھو الیق بنظم الآیۃ" کہ وہ آیۃ کریمہ کے باقی مضمون کے بظاہر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ کفار فقیر مسلمانوں سے مزاح اڑاتے تھے' اور وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ہمیں دنیا کا زیادہ مال حاصل ہے، لہٰذا ہم حق پر ہیں۔ لیکن مسلمان غریب اور فقیر ہیں ان کے پاس مال و دولت نہیں، اس لئے وہ باطل راہ پر ہیں۔

رب تعالیٰ نے ان کی اس دلیل کو رد فرمایا اور ارشاد فرمایا " واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب "

اور اللہ عطا کرتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے۔

یعنی دنیا میں رب تعالیٰ کی عطا کا تعلق صرف اس کی مشیت (چاہنے) پر ہے' جسے مال دیا گیا وہ خواہ حق پر ہو یا باطل پر ہو' خواہ برا ہو یا نیک۔

"فقد وسع الدنیا علی قارون وضیقھا علی ایوب علیہ السلام"

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں قارون کو بہت مال عطاء فرمایا حالانکہ وہ کافر تھا' اور حضرت ایوب علیہ السلام پر مال کی تنگی رکھی حالانکہ وہ نبی تھے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی کو مال دینا اس کی مقبولیت کی علامت نہیں' بلکہ وہ مردودوں کو بھی مال کی وسعت عطاء فرماتا ہے۔

لہٰذا کافروں کی یہ دلیل باطل ہوگئی کہ وہ مال و دولت کی وجہ سے حق پر ہیں۔ اور مسلمان غربت کی وجہ سے باطل پر ہیں۔

" بل الکافر قد یوسع علیہ زیادۃ فی الاستدراج والمؤمن قد یضیق علیہ زیادۃ فی الابتلاء والامتحان "

بلکہ کافر کوکبھی زیادہ مالی وسعت عطاء کی جاتی ہے تا کہ اس کی استدراجی قوت شعبدہ بازی اورزیادہ ہو۔اور مومن کوامتحان میں مبتلاء کرنے کے لئے تھوڑا مال دیا جاتا ہے۔اوراس کے رزق میں تنگی کی جاتی ہے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ولو لاان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر با لرحمن لبیو تهم سقفامن فضة ومعارج علیهایظهرون" (سورة الزخرف ، ۳۳)

اوراگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک دین پر ہو جائیں تو ہم ضرور رحمٰن کے منکروں کے لئے چاندی کی چھتیں اور سیڑھیاں بناتے جن پر چڑھتے۔

(۲) اور دنیا میں رزق بغیر حساب کے دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں اور کافروں میں سے جب چاہے بغیر حساب کے رزق عطاء فرماتا ہے ، نہ وہاں طلب کی کوئی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی سائل کا کوئی سوال ہوتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے بغیر حساب کے عطاء کردے تا کہ کافروں کو یہ کہنے کی جرأت حاصل نہ ہو سکے کہ مومن اگر حق پر ہوتے تو ان کو مال میں وسعت عطاء ہوتی ،اسی طرح کوئی ضعیف ایمان والا یہ نہ کہہ سکے کہ اگر کافر باطل راہ پر ہوتے تو ان کو وسیع مال کیوں دیا جاتا۔

"والا مر امره والحکم حکمه (لا یسئل عما یفعل وهم یسأ لو ن)"

امرامر ہے،اور حکم حکم ہے۔اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ وہ کیا کرتا ہے اوران لوگوں سے پوچھا جائے گا وہ کیا کرتے رہے۔

(۳) اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے دنیا میں اتنا مال عطا کردے جو اس کے حساب میں ہی نہ آ سکے، جس طرح کسی آدمی کے پاس مال بہت ہو تو وہ کہے۔ " لم یکن هذافی حسابی " یہ میرے حساب میں ہی نہیں۔

یہ کثیر مال اللہ تعالیٰ کافروں کو عطاء کرتا ہے اور مومنوں کو بھی ، تاہم مومنین کو کثیر مال دینا درحقیقت ان کا امتحان ہوتا ہے، کچھ لوگوں کو تو مال کی کثرت سے کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ وہ نیک ہی رہتے ہیں اوراللہ تعالیٰ

کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ مال و دولت کی ہوس میں گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)
اس ساری بحث کو دیکھیں تو اعلیٰ حضرت کا ترجمہ خوب تر نظر آئے گا ''اور خدا جسے چاہے بے گنتی دے''

مومن کی تذلیل پر وعید:

"روی علیّ ان النبی ﷺ قال "من استذل مؤمنا او مؤمنة او حقّره لفقره و قلة ذات يده شهره الله يو م القيامة ثم فضحه و من بهت مؤمنا او مؤمنة او قال فيه ما ليس فيه اقامه الله تعالى على تلّ من نار يو م القيامة حتى يخرج مماقال فيه و ان عظم المؤ من اعظم عند الله و اكرم عليه من ملك مقرب و ليس شي احب الى الله من مؤ من تا ئب او مؤ منة تائبة وان الرجل المؤ من يعرف في السماء كمايعرف الرجل اهله و ولده " (بحو اله قرطبی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مومن مرد یا عورت کی تذلیل کی (ذلیل کیا) یا اسے غریب ہونے کی وجہ سے حقیر سمجھا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے (لوگوں پر) مشہور کرے گا، پھر اسے رسوا کرے گا (عذاب دے گا) اور جس شخص نے کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان باندھا یا اس کے متعلق وہ کہا جو اس میں نہیں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے آگ کے ٹیلے پر کھڑا کرے گا یہاں تک کہ وہ نکل جائے اس سے جو اس نے کہا، اور بے شک مومن کی عظمت اور اکرام اللہ تعالیٰ کے ہاں مقرب فرشتے سے بھی زیادہ عظیم ہوگا، اور توبہ کرنے والے مومن مرد اور مومن عورت سے اللہ تعالیٰ کو کوئی اور چیز زیادہ پسند نہیں، اور بے شک مومن شخص کو اس طرح پہچان لیا جائے گا جیسا کہ انسان اپنے اہل و عیال کو پہچانتا ہے۔

غریب کی شان:

"عن حارثة بن وهب انه سمع رسول الله ﷺ يقول الا اخبركم باهل الجنة كل ضعيف مستضعف لو اقسم على الله لأ بره الا اخبركم با هل النار كل عتل جواظ جعظری مستكبر" (متفق عليه)

حضرت حارثہ بن وھب رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے میں نے سنا، کیا میں تمہیں جنتی لوگوں کی خبر نہ دوں؟ (ہاں جنتی لوگ) وہ غریب جنہوں نے اپنے آپ کو غربت میں رہنا پسند فرمایا، اگر وہ اللہ پر قسم اٹھائیں تو اللہ تعالی ان کی قسم کو پورا فرمادے گا، کیا میں تمہیں جہنمی لوگوں کی خبر نہ دوں؟ (ہاں جہنمی لوگ) وہ ہوں گے جو سخت جھگڑالو ہوں گے، بھلائی کا کوئی کام نہیں کریں گے اور فاجر ہوں گے، نازنخرے سے چلنے والے، اور اپنی جھوٹی تعریف کرنے والے ہوں گے۔

(العتل الفظ الغليظ الشديد فى الخصومة الذى لا ينقاد لخبر والجواظ الفاجر المختال فى مشيته وقيل هو القصير البطين والجعظرى الفظ الغيظ وقيل هو الذى يتمدح بماليس فيه اوعند)

(ترجمہ حدیث کے ترجمہ میں دیکھیں)

☆ "عن اسامة بن زيد عن النبى ﷺ قال قمت على باب الجنة فكان عامة من دخلها المساكين، واصحاب الجد محبوسون غير ان اصحاب النار قد امر بهم الى النار وقمت على باب النار فاذا عامة من دخلها النساء" (متفق عليه)

اسامہ بن زید رضی اللہ تعالی عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو (دیکھا) کہ اس میں عام لوگ داخل ہونے والے مسکین (غریب) لوگ ہیں، اور مال داروں کو دروازے پر روک لیا گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ ان میں سے جو جہنمی ہیں ان کو آگ میں داخل کر لیا گیا، اور میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اس میں زیادہ عورتوں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔
(خازن)

عن سهل بن سعد رضى الله تعالى عنه قال مر رجل على رسول ﷺ فقال لرجل عنده جالس ما رأيك فى هذا؟ فقال رجل من اشرف الناس هذا والله، حرى ان خطب ان ينكح وان شفع ان يشفع، قال فسكت رسول ﷺ ثم مر رجل فقال له رسول ﷺ

مارأيک فی هذا فقال یا رسول الله هذا رجل من فقراء المسلمین هذا حری ان خطب ان لا ینکح وان شفع ان لا یشفع وان قال ان لا یسمع لقوله فقال رسول ﷺ هذا خیر من ملأ الارض" (مثل هذا رواه البخاری)

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص رسول کریم ﷺ کے قریب سے گزرا تو آپ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ تو اس شخص نے کہا یہ بڑے امیر لوگوں سے ہے، قسم ہے اللہ کی یہ شخص ایسی صلاحیت کا مالک ہے کہ کہیں سے اپنے لئے رشتہ پوچھے تو اسے رشتہ دے دیا جائے (اس کی شادی کردی جائے) اور اگر یہ کسی کی سفارش کر دے تو اس کی سفارش کو قبول کرلیا جائے۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔ پھر ایک اور شخص کا گزر ہوا تو آپ نے اس شخص سے پوچھا اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے تو اس نے کہا یہ تو ایک غریب مسلمان ہے اس کی صلاحیت تو اتنی ہی ہے کہ اگر رشتہ پوچھے تو رشتہ نہ ملے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو سفارش قبول نہ کی جائے اور کوئی بات کرے تو نہ سنی جائے۔ تو (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ (فقر) بہتر ہے بھری ہوئی زمین کے خزانوں سے۔ (مظہری)

نصیحت آموز واقعہ:

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سفر میں ایک یہودی بھی تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس تین روٹیاں تھیں، آپ نے وہ روٹیاں یہودی کو دیں، ان کو اپنی حفاظت میں رکھو، کچھ دیر کے بعد یہودی نے ایک روٹی کھالی۔ جب عیسیٰ علیہ السلام نے روٹیاں طلب کیں تو اس نے آپ کو دو روٹیاں دیں، آپ نے پوچھا تیسری روٹی کہاں ہے؟ وہ کہنے لگا روٹیاں ہی دو تھیں، اس سے زائد کوئی روٹی نہیں تھی۔ (آپ اس کی بات سن کر خاموش رہے) دونوں چلے یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کی قدرت کے عجائب دیکھے، تو آپ نے اس یہودی سے قسم دلا کر سوال کیا کہ روٹیاں کتنی تھیں؟ خیال کیا شاید یہ اقرار کرلے، لیکن اس نے اقرار نہ کیا۔ آگے چلے تو عیسیٰ علیہ السلام کو

سونے کی تین اینٹیں ملیں' یہودی کہنے لگا ان کو تقسیم کرو۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے ایک میری اور ایک تمہاری اور ایک جس شخص نے روٹی کھائی' وہ یہودی کہنے لگا، تیسری روٹی تو میں نے ہی کھائی تھی۔ آپ نے فرمایا جا مجھ سے دور ہو جا' رب تعالیٰ کے قدرت کے عجائب دیکھ کر قسم طلب کرنے پر تو نے اقرار نہ کیا' اب دنیا کے مال کو دیکھ کر تو نے اقرار کر لیا۔ آپ نے وہ سونے کی تینوں اینٹیں اس کو دے دیں' اور آپ خود چلے گئے۔

یہودی اپنے ساتھ سونے کی تین اینٹیں لے کر چل رہا تھا، اسے راستے میں تین چور مل گئے' انہوں نے یہودی کو قتل کر دیا اور سونے کی تینوں اینٹیں لے لیں۔

پھر انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو کھانا لینے کے لئے شہر بھیجا' جب وہ چلا گیا تو دونوں نے مشورہ کیا کہ جب کھانا لے کر وہ ہمارا ساتھی آئے گا تو ہم اس کو قتل کر دیں گے تاکہ یہ سونا دو حصوں میں تقسیم ہو جائے' تین حصے نہ کرنے پڑیں۔ ادھر کھانا لینے کے لئے جانے والے کے دل میں خیال آیا کہ کھانے میں زہر ملا دیا جائے تاکہ وہ دونوں مر جائیں اور سونا سارا میرے ہاتھ آ جائے' اس نے زہر خرید کر کھانے میں ملا دیا۔ جب وہ کھانا لے کر آیا تو ان دونوں نے اسے قتل کر دیا۔ اور یہ دونوں زہر آلود کھانا کھا کر مر گئے۔

پھر عیسیٰ علیہ السلام کا واپسی میں وہاں سے گزر ہوا، دیکھا کہ یہودی اور تین شخص مرے ہوئے ہیں' آپ نے تعجب فرمایا کہ ان کو کیا ہوا، تو جبرائیل نے آ کر آپ کو اصل تمام واقعہ کی خبر دی۔ (روح البیان)

فوائد:

"فینبغی للعاقل ان لا یغتر بکثرة الدنیا و ان لا یهتم فی جمعها بل یزرع فیها بذر العمل کی یحصد فی الآخرة لان الدنیا مزرعة الآخرة"

عقل مند شخص کو چاہئے کہ وہ زیادہ دنیا کے مال پر دھوکا نہ کھائے' اور نہ ہی زیادہ مال جمع کرنے کا اہتمام کرے، بلکہ دنیا میں نیک عمل کا بیج بوئے تاکہ آخرت میں کاٹ لے' کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

" ولا ینبغی للاغنیاء ان یحقرو الفقراء بالغرور بکثرة دنیا هم ولا یسخروا منهم لان هذه الصفة من صفات الکفرة "

غنیوں کو یہ نہیں چاہئے کہ وہ مال ودولت کی کثرت کے نشہ میں غریبوں کو حقیر سمجھیں، یہ صفت تو کافروں کی ہے۔ (روح البیان)

فائدہ جلیلہ:

آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں پر ملکوت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اوران کو اپنے ملک وملکوت کی نشانیاں دکھا دیتا ہے، جب بندہ اپنے احوال کو بدل دے اور سب کچھ اپنا ہی مال سمجھنا ہی شروع کر دے، اوراپنی خواہشات نفسانیہ کے مطابق عمل کرے، بلکہ اپنی خواہشات کے مطابق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بدل دے تو اس کے لئے یہ وعید ہے " فان الله شديد العقاب " بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی بندے کے احوال کو بدل دیتا ہے اوراپنی نعمتیں اوراسے دیئے ہوئے کمالات اس سے دور کر دیتا ہے۔

" ان الله لا يغير مابقوم حتى يغيروامابانفسهم "

بے شک اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کو یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو بدل لیں۔

جب بندہ گناہوں سے توبہ نہیں کرتا، گناہوں پر قائم رہتا ہے۔

" فیعاقبه الله بزوال نعمته فی الدنیا و دوام النعمة فی العقبی "

تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اس سے اپنی نعمتوں کو زائل کر کے اسے عذاب دیتا ہے اور آخرت میں اسے دائمی عذاب دے گا۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ دنیا دار کا دنیا سے محبت کرنا اور دنیا سے مزین کر کے دکھانا اوراس کا غریبوں سے مزاح اڑانا، یہ اس کے لئے شدید عذاب ہے کیونکہ یہ شدید عذاب کے ذرائع ہیں۔ (روح البیان)

☆☆☆☆☆☆

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۳)

﴿۱﴾

لوگ ایک دین پر تھے پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوشخبری دیتے اور ڈر سناتے اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری کہ وہ لوگوں میں ان کے اختلافوں کا فیصلہ کر دے، اور کتاب میں اختلاف انہوں نے ڈالا، جن کو دی گئی بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن حکم آ چکے آپس کی سرکشی سے تو اللہ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سوجھا دی جس میں جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ جسے چاہے سیدھی راہ دکھا دے۔

﴿۲﴾

تھے لوگ ایک گروہ، تو بھیجا اللہ نے نبیوں کو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے (بنا کر) اور اتاری ان کے ساتھ کتاب حق کے ساتھ (سچی کتاب) تاکہ فیصلہ کرے درمیان لوگوں کے اس چیز میں جس میں وہ اختلاف رکھتے، اور نہیں اختلاف کیا اس میں سوائے ان لوگوں کے جن کو عطاء کی گئی وہ (کتاب) اس کے بعد جب آ گئیں ان کے پاس روشن دلیلیں، آپس میں سرکشی کرتے ہوئے، تو ہدایت دی اللہ نے ایمان والوں کو اس چیز کی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے

(ہدایت دی ان کو) حق کی اپنے حکم سے، اور اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا کہ کفار کا اپنے کفر پر اصرار تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دنیا سے محبت کرتے تھے، یعنی دنیا کی محبت کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے دور رہے۔

اب اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا کہ ان لوگوں کا کفر پر قائم رہنا اس زمانہ سے خاص نہیں بلکہ وہ پہلے زمانہ میں بھی یہی کرتے رہے کہ لوگ ایک گروہ تھے، دین حق پر قائم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تبلیغ کے لئے انبیاء کرام کو بھیجا، تا کہ وہ سیدھی راہ پر چلنے اور نیکی پر قائم رہنے والوں کو جنت کی اور جزاء خیر کی بشارت دیں اور ان انبیاء کرام کے ساتھ سچی کتاب نازل فرمائی کہ جب ان کی امتوں کا اختلاف ہو جائے تو وہ کتاب کے احکام سے فیصلہ کریں، لیکن انہوں نے روشن دلائل اور واضح نشانیاں آجانے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف شروع کر دیا۔

"وما کان اختلافھم الا بسبب البغی والتحاسد والتنازع فی طلب الدنیا"

اور ان کا اختلاف صرف سرکشی اور حسد کی وجہ سے تھا، اور ان کا جھگڑا دنیا کی طلب کے لئے تھا۔

البتہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اختلاف کرنے کے باوجود اپنی مہربانی اور توفیق سے حق راہ کی ہدایت دی جس کی وجہ سے ان کے وہ اختلافات نہ رہیں جو کفر تک پہنچا دینے والے تھے اللہ تعالیٰ جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

یہ بھی خیال رہے جو اختلافات کی وجہ سے کفر تک پہنچے وہ کافر ہی ہوئے ایمان والے رہے ہی نہیں۔

قرآن پاک عظیم کتاب ہے:

"کان الناس امۃ واحدۃ" (لوگ ایک گروہ تھے) یہ جملہ بہت مختصر ہے لیکن بہت بڑے مطالب کو حاوی ہے۔

" امة " کا لفظ ائتمام سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے اقتداء کرنا' مطلب یہ ہوا۔

" القوم المجتمعون علی الشئ الواحد یقتدی بعضهم ببعض "

کہ تمام قوم ایک چیز پر متفق تھی بعض لوگ دوسرے بعض کی اقتداء کرتے تھے۔

(۱) اس کے مختلف مطالب میں سے ایک یہ ہے کہ......

" انهم کانوا علی دین واحد وهوالایمان والحق "

وہ تمام ایک دین یعنی ایمان اور حق پر قائم تھے' پھر انہوں نے آپس میں اختلاف شروع کر لئے۔ ان کے معمولی اختلافات پر اللہ تعالیٰ نے انبیا کرام کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ فیصلہ کرنے کے لئے کتاب بھی نازل کر دی لیکن انہوں نے ان واضح دلائل کے آجانے کے بعد زیادہ ہی اختلاف شروع کر دیا۔ وجہ اس کی ان لوگوں کی سرکشی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے انبیاء کرام سے حسد شروع کر دیا اور حسد کی وجہ سے ہی وہ کفر تک پہنچ گئے۔ اس وجہ کے مطابق "فبعث الله" میں "فا" کا تعقیب کے لئے ہونا بھی واضح ہو گیا ان کے کچھ اختلافات کے بعد انبیا کرام کو بھیجا گیا۔

(۲) یہ آیۃ اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے کہ آدم علیہ السلام کو جب ان کی اولاد کی طرف مبعوث فرمایا تو اس وقت تمام ایک گروہ تھے، دین حق پر قائم تھے، کوئی دین باطل پر نہ تھا' یہاں تک قابیل نے ہابیل کو حسد اور سرکشی کی وجہ سے قتل کر دیا۔ اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ بھی ہو گیا۔

" ان الناس وهم آدم و اولاده من الذکور والاناث کانوا امة واحدة علی الحق ثم اختلفوا بسبب البغی والحسد "

بیشک لوگ یعنی آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد مذکر اور مونث سب ایک گروہ تھے، دین حق پر قائم تھے، پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے سرکشی اور حسد کی وجہ سے اختلاف کیا۔

(۳) اس آیۃ کریمہ کا ایک مطلب یہ ہے۔

" لما غرقت الأرض بالطوفان لم یبق الا اهل السفینة وکلهم کانوا علی الحق والدین الصحیح ثم اختلفو بعد ذلک "

کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا تو کافر تمام غرق ہو گئے، صرف کشتی والے باقی رہ گئے وہ تمام ہی ایک دین حق پر قائم تھے، بعد میں انہوں نے ایک دوسرے سے اختلاف شروع کر دیئے۔

ان دلائل سے واضح ہوا کہ تمام لوگ پہلے دین حق پر تھے، اختلاف بعد میں پیدا کئے گئے۔

تنبیہ: آدم علیہ السلام کے وصال کے بعد اور نوح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے اکثر لوگ کافر ہو گئے تھے، یہ آیہ کریمہ اپنے مفہوم سے ان کو بھی شامل ہے کہ کسی ایک وقت میں سب لوگ کفر پر متفق ہو گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بشیر ونذیر بنا کر مبعوث فرمایا اور ان کے ساتھ کتاب کو نازل کیا، لیکن پھر بھی وہ تمام ایمان نہ لائے بلکہ کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے سرکشی اور حسد کی وجہ سے اختلاف کیا۔

ایک اور مطلب:

اہل کتاب نے موسیٰ علیہ السلام پر جب ایمان لایا تو تمام ہی ایک گروہ تھے، ایک دین اور ایک مذہب پر قائم تھے۔" ثم اختلفوا بسبب البغي والحسد فبعث الله النبيين"

پھر انہوں نے سرکشی اور حسد کی وجہ سے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ (ماخوذ از کبیر)

فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين وانزل معهم الكتاب بالحق:

(۱) تو بھیجا اللہ نے نبیوں کو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے (بنا کر) اور اتاری ان کے ساتھ کتاب حق کے ساتھ (سچی کتاب)۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو ایمان والوں کے لئے اور نیک، متقی لوگوں کے لئے بشارت دینے والا بنا کر بھیجا، اور کافروں اور گنہگار لوگوں کے لئے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔

رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں انبیاء کرام کی تین صفات بیان فرمائی ہیں۔

پہلی صفت: "کو نهم مبشرین"

دوسری صفت: "کو نهم منذرین"

یعنی ان کا بشارت دینے والا ہونا، اور ان کا ڈرانے والا ہونا۔

بشارت کو پہلے ذکر کرنے کی وجہ:

انبیاء کرام کے بشیر ہونے کا ذکر پہلے کیا، اس لئے کہ بشارت حفظ صحت کے قائم مقام ہے، اور "انذار" (ڈرانا) مرض کو زائل کرنے کے قائم مقام ہے۔

"و لا شک ان المقصود بالذات هو الاول دون الثانی فلا جرم تقدیمه فی الذکر"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مقصود بالذات صحت کی حفاظت ہے، اسی کے لئے مریض ہونے کے بعد دوا لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اسی طرح انبیاء کرام کو بھیجنے کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ ان کی دعوت پر لوگ ایمان لے آئیں، اور یہ ان کو بشارت دیں، لیکن اگر وہ اپنے دل کی مرض کی وجہ سے ایمان نہ لاسکیں تو پھر ان کو ڈرانے کی دوا دیں، اگر وہ ڈانے سے بھی اپنی مرض کو زائل نہ کرسکیں تو لا علاج مریض کی طرح ہلاکت کے گڑھے میں پہنچ جائیں۔

تیسری صفت: انبیاء کرام کی تیسری صفت۔

"وانزل معهم الکتاب بالحق" اور نازل کی ان کے ساتھ سچی کتاب۔

اعتراض:

"ظاهر هذه الآیة یدل علی انه لا نبی الامعه کتاب منزل فیه بیان الحق"

اس آیۃ کریمہ کے ظاہری مضمون سے تو یہ پتہ چل رہا ہے کہ ہر نبی کو کتاب دی گئی جو حق و سچ پر مشتمل تھی،

حالانکہ کتابیں کل ایک سو چار نازل ہوئیں، چار مشہور ہیں۔ تورات، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر، اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر، اور قرآن پاک نبی کریم ﷺ پر، اور ایک سو صحیفے نازل ہوئے جن میں دس حضرت آدم علیہ السلام پر اور تیس حضرت شیث علیہ السلام پر، اور پچاس ادریس علیہ السلام پر اور دس حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئے، تو آیت کریمہ کا مطلب کیا ہوگا کہ تمام انبیاء کرام کے ساتھ کتاب نازل ہوئی۔

جواب:

یہاں کتاب سے مراد احکام ہیں کہ ہر نبی کو سچے احکام (اوامر ونواہی) عطاء کئے گئے۔

" والمراد انه طال ذلک الکتاب ام قصر، ودون ذلک الکتاب اولم یدون وکان ذلک الکتاب معجزا اولم یکن کذلک لان کون الکتاب منزلا معهم لا یقتضي شیأ من ذلک "

یہاں جس کتاب کا ذکر ہے اس سے مراد عام ہے کہ وہ کتاب بڑی ہو یا چھوٹی ہو، اس کی تدوین کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو، وہ کتاب معجز ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ کتاب کا نازل کیا جانا ان میں سے کسی چیز کا بھی تقاضا نہیں کرتا۔ لہٰذا واضح ہوا کہ مراد احکام ہیں جو ہر نبی کو عطا کئے گئے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

انبیاء کرام کی تعداد کے متعلق عقیدہ:

اگرچہ مشہور روایت یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، لیکن ایک روایت میں دو لاکھ چوبیس ہزار کا ذکر ہے اور ایک روایت میں آٹھ ہزار کا بھی ذکر ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ عقیدہ یہ ہو کہ جتنے انبیاء کرام رب تعالیٰ کی طرف سے آئے ان پر میرا ایمان ہے، وہ سب برحق تھے، سب ہی سچے نبی تھے۔ لیکن معین تعداد نہ ذکر کی جائے کیونکہ ایسا نہ ہو کہ یہ تعداد کم ذکر کرے اور واقع میں زائد ہوں۔ یا ایسا نہ ہو کہ یہ تعداد زائد ذکر کرے واقع

میں کم ہوں۔

پہلی صورت میں کئی انبیاء کرام پر ایمان نہیں ہوگا اور دوسری صورت جو نبی نہیں ہوں گے ان کو نبی ماننا لازم آئے گا۔

اس لئے دونوں صورتوں میں خرابی لازمی آتی ہے۔ لہٰذا یہی صورت بہتر ہے کہ ایمان رکھے، اے اللہ تیری طرف سے بھیجے ہوئے تمام انبیاء کرام پر میرا ایمان ہے کہ وہ برحق تھے۔ (از شرح عقائد)

وہ انبیاء کرام جن کے اسماء گرامی قرآن پاک میں ہیں:

وہ کل چھبیس ہیں۔ اٹھارہ کا ذکر ان آیات میں موجود ہیں۔

" وتلک حجتنا ابراهیم علی قومه نرفع درجات من نشاء ان ربک حکیم علیم☆ ووهبنا له اسحاق ویعقوب کلا هدینا ونوحا هدینا من قبل ومن ذریته داؤد وسلیمان وایوب ویوسف وموسی وهارون وکذلک نجزی المحسنین☆ وزکریا ویحیی وعیسی والیاس کل من الصالحین☆ واسمعیل والیسع ویونس ولوطا وکلا فضلنا علی العالمین☆ (سورة الانعام آیات، ۸۳تا ۸۶)

اور آٹھ کا ذکر مختلف آیات میں ہے۔

آدم، ادریس، ہود، صالح، شعیب، ذوالکفل، عزیر اور محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ (از مظہری)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"بالحق" حال من الکتاب ای متلبسا بالحق شاهدا به "

یعنی "بالحق" الکتاب سے حال واقع ہو رہا ہے، معنی یہ ہے کہ نازل کی ان کے ساتھ کتاب جو حق کے ساتھ متلبس (ملی ہوئی ہے)، اور حق کی شہادت دیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت نے آسان ترجمہ فرمایا ''اتاری ان کے ساتھ سچی کتاب''

ذرا اور توجہ:

'' لیحکم بین الناس '' تاکہ فیصلہ کرے درمیان لوگوں کے۔

''لیحکم '' میں ضمیر فاعل کے مرجع میں تین احتمال ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ ضمیر '' الکتاب '' کی طرف لوٹے جو قریب ہے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر ''النبین'' میں واحد ''النبی'' کی طرف لوٹے۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر لفظ ''اللہ'' کی طرف لوٹے۔

ہر ایک احتمال درست ہے، بلکہ راقم کے نزدیک تمام احتمالات ہی بیک وقت پائے گئے ہیں۔

جب ضمیر '' اللہ '' کی طرف لوٹے تو معنی یہ ہوگا '' تاکہ فیصلہ کرے اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان''

یہ معنی اس لئے بہتر ہے کہ حقیقی حاکم اور فیصلہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کتاب حقیقی طور پر فیصل تو نہیں۔

اور اگر ضمیر ''النبی'' کی طرف لوٹے تو یہ اس لئے بہتر ہے کہ رب قدوس کے فیصلہ کو ظاہر کرنے والے انبیاء کرام ہی ہیں۔

''الکتاب'' کی طرف لوٹے تو یہ بھی بہتر ہے، اگرچہ حقیقی حاکم تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن یہ مجاز بھی زیادہ مشہور ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے ''حکم الکتاب بکذا'' کتاب کا فیصلہ اس طرح ہے۔ اور کہا جاتا ہے ''قضی کتاب اللہ بکذا'' اللہ کی کتاب کا فیصلہ اس طرح ہے، اور کہا جاتا ہے ''رضینا بکتاب اللہ'' اللہ کی کتاب کے فیصلہ پر ہم راضی ہیں۔

تنبیہ: راقم نے ترجمہ میں مطلق ذکر کیا ہے '' تاکہ فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان''

اس لئے کہ اگر یوں کہہ دیا جائے تو حسین وجمیل مطلب نکھر کر واضح ہو جائے گا، اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات میں فیصلہ فرما کر انبیاء کرام کے

ذریعے اس فیصلہ کو ظاہر کردے، یعنی انبیاء کرام ان کو مطلع کردیں۔

طلباء کرام راقم کی اس وضاحت کو غور سے پڑھیں تو واضح ہو جائے گا کہ اس مطلب میں حقیقۃ ومجاز کا کوئی اجتماع نہیں، بلکہ معنی فقط حقیقی ہے، البتہ اس کی وضاحت کردی گئی۔

"فیما اختلفوا فیه": (تاکہ فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان) اس چیز میں جس میں وہ اختلاف رکھتے۔

"فیہ" کی ضمیر میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ "الکتاب" کی طرف لوٹے، وہ کتاب میں اختلاف رکھتے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "الحق" کی طرف لوٹے کہ وہ دین حق میں اختلاف رکھتے۔ اس احتمال کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے راجح قرار دیا۔

"وما اختلف فیه الا الذین اوتوه":

اور نہیں اختلاف کیا اس میں سوائے ان لوگوں کے جن کو دی گئی وہ (کتاب)۔

"فیہ" کی ضمیر "حق" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور "اوتوہ" میں ضمیر منصوب "الکتاب" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اب معنی یہ ہوا۔ "وما اختلف فی الحق الا الذین اوتوا الکتاب"

اور نہیں اختلاف کیا دین حق میں سوائے ان لوگوں کے جن کو کتاب دی گئی۔

حالانکہ کتاب کے نازل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس میں وہ اختلاف نہ کریں اور دین میں جھگڑا ختم کردیں، لیکن انہوں نے مقصد سے ہٹ کر اختلاف شروع کرلیا۔

"من بعد ماجاء تهم البینات": اس کے بعد جب آگئیں ان کے پاس روشن دلیلیں۔

یعنی ان کو دلائل عقلیہ عطاء فرمائے جو ان کے لئے روشن دلیلیں تھیں۔ پھر ان پر کتاب نازل کر کے اور روشن دلائل سمعیہ عطاء فرمائے۔

"بغیابینھم": آپس میں سرکشی کرتے ہوئے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کتاب نازل فرما کر دلائل سمعیہ عطاء فرمائے، اور اس سے پہلے ان کو عقلی دلائل عطاء فرمائے، جو ان کے لئے روشن اور واضح دلائل تھے۔ جب رب تعالیٰ نے ان کو واضح اور مکمل دلائل عطاء فرما دیئے۔" ولم یبق فی العدول عذر و لاعلة " تو ان کے لئے اس سے منہ پھیرنے کے لئے کوئی عذر نہ رہا۔ اور نہ ہی ان کے لئے کوئی وجہ رہی کہ وہ کیوں اختلاف کر رہے ہیں۔

"فلو حصل الاعراض و العدول لم یکن ذلک الابحسب الحسد و البغی و الحرص علی طلب الدنیا "

لیکن ان کا پھر اعراض کرنا اور رب تعالیٰ کے احکام ماننے سے عدول کرنا اور دین حق میں اختلاف صرف حسد اور سرکشی اور دنیا کے مال کے حرص کی وجہ سے تھا۔

"فھدی اللّٰہ الذین آمنوا لما اختلفوا فیه من الحق باذنه":

تو ہدایت دی اللہ نے ایمان والوں کو اس چیز کی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے (ہدایت دی ان کو) حق کی اپنے حکم سے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب اور کفار کا حال بیان کیا کہ وہ کامل اور روشن دلائل حاصل کرنے کے بعد سرکشی اور حسد کی وجہ سے سرکشی اور کفر پر قائم رہے۔

اب ان الفاظ مبارکہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کا حال بیان فرمایا جا رہا ہے۔

"فان اللہ عصمھم عن الزلل وھداھم الی الحق فی الاشیاء التی اختلف فیھا اھل الکتاب "

کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حق سے عدول کرنے سے بچا لیا ہے اور جن چیزوں میں اہل کتاب نے اختلاف کیا تھا ان میں ایمان والوں کو حق کی ہدایت دے دی۔ (ماخوذ از کبیر)

" با ذنه " ای با مره اوبتوفیقه وتیسیره "

یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ہدایت دی حق کی جس میں وہ اہلِ کتاب اختلاف رکھتے تھے، یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے حکم اور اپنی توفیق سے دی، اور مومنوں کے لئے دین حق کی راہ آسان کر کے ان کو ہدایت عطاء فرمائی۔

اہلِ کتاب کے اختلاف کی وجوہ:

اہلِ کتاب کے اختلاف کی چند وجوہ تھیں، ان تمام اختلافات میں ایمان والوں کو حق راہ عطاء فرمائی۔

(۱) ان کا اختلاف تھا جمعہ کے دن کی عظمت میں، یہود نے ہفتہ کو معظم سمجھا، اور نصاریٰ نے اتوار کو معظم سمجھا۔

" فهدى الله تعالى امة محمد ﷺ ليوم الجمعة"

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو جمعہ کے دن کی ہدایت عطاء فرمائی کہ انہوں نے جمعہ کے دن کی عظمت کو سمجھا۔

(۲) اہلِ کتاب کا اختلاف قبلہ کے متعلق تھا۔ "فاستقبلت النصاری المشرق و اليهود بيت المقدس "

نصاری نے مشرق کی جانب قبلہ بنایا، اور یہود نے بیت المقدس قبلہ بنایا۔

یعنی اگر چہ قبلہ دونوں فریقوں کا بیت المقدس ہی تھا، لیکن نصاریٰ نے اس کی مشرقی جانب کو قبلہ بنا رکھا تھا۔ اور یہود نے صخرۂ یعقوبی کی جانب کو قبلہ سمجھ رکھا تھا۔

" وهدى الله تعالى امة محمد ﷺ للقبلة "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو قبلہ کی ہدایت عطاء فرمائی کہ تمہارا قبلہ کعبہ شریف ہے۔

(۳) "واختلفوا فی الصلوة فمنهم من یرکع و لایسجد ومنهم من یسجد و لا یرکع ومنهم یصلی وهو یمشی"

اہلِ کتاب کا نماز میں اختلاف تھا، ان میں سے کچھ لوگ نماز میں رکوع کرتے تھے اور سجدہ نہیں

کرتے تھے، اور کچھ لوگ سجدہ کرتے تھے، رکوع نہیں کرتے تھے اور کچھ لوگ نماز پڑھتے ہوئے آگے پیچھے چل لیتے تھے۔

" فهدی الله تعالٰی امة محمد ﷺ للحق من ذلک "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو نماز کے متعلق حق راہ کی ہدایت فرمائی کہ نماز ادا کرو تو اس میں رکوع کرو اور سجدہ بھی کرو اور نماز اطمینان سے ادا کرو، نماز میں چلنے سے نماز فاسد ہوگی۔ یہ تمام ہدایت مصطفیٰ کریم ﷺ کی زبان مبارک سے دی، کیونکہ نماز کی وضاحت حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء نے فرمائی۔

(۴) "واختلفوا فی الصیام فمنهم من یصوم النهار و اللیل و منهم من یصوم عن بعض الطعام"

اہلِ کتاب کا روزوں میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ بعض لوگ دن کو بھی روزہ رکھتے تھے اور رات کو بھی، اور ان میں سے بعض لوگ کچھ کھانے کی چیزوں سے روزہ رکھتے تھے کہ یہ چیزیں نہیں کھانی، اور کئی کھانے کی چیزیں روزے میں بھی کھا لیتے تھے ان سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔

" فهدی الله تعالٰی امة محمد ﷺ للحق من ذلک "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو روزہ کے متعلق حق راہ کی ہدایت دی کہ روزہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک ہے، اور کوئی چیز بھی نہیں کھانی، ورنہ روزہ ٹوٹ جائے گا۔

(۵) "واختلفوا فی ابراهیم علیه الصلوة والسلام فقالت الیهود کان یهودیا و قالت النصاری کان نصرانیا"

اہلِ کتاب کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اختلاف پایا جاتا تھا، یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ آپ یہودی تھے اور نصرانیوں کا دعویٰ تھا کہ آپ نصرانی تھے۔

" فهدی الله تعالٰی امة محمد ﷺ من ذلک انه کان حنیفا مسلما "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو اس میں ہدایت عطاء فرمائی کہ ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی تھے، بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے۔

(۲) "واختلفوا فی عیسیٰ علیه السلام فکذبت به الیهود وقالوا الامه بهتاناعظیماو جعلته النصاری الھاوولدا"

اہلِ کتاب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اختلاف کیا، یہود نے آپ کی تکذیب کی اور معاذ اللہ آپ کی والدہ پر بہتان لگایا اور نصرانیوں نے آپ کو معبود اور خدا کا بیٹا مانا۔

" فھدی اللہ امة محمد ﷺ للحق من ذلک انه روح اللہ و کلمته "

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو اس معاملہ میں حق کی راہ عطاء کی کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے نبی اور روح اللہ اور کلمۃ اللہ تھے۔ ان کو جھوٹا کہنے والے جھوٹے ہیں۔ اور ان کو معبود اور خدا کا بیٹا کہنے والے بھی جھوٹے اور باطل راہ پر ہیں۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: زیادہ مناسب یہ ہے کہ "باذنه" کا تعلق "فاھتدوا" محذوف سے ہو جائے، تا کہ ھدایۃ اور اھتداء میں مغایرت ثابت ہو جائے، جس طرح ایمان اور ہدایت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور توفیق ایمان اور ایمان دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، اسی طرح ہدایت دینا اور ہدایت حاصل کرنا دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔

اب اس تقدیر سے مطلب یہ ہو گا، اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حق کی ہدایت دی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی توفیق سے ہدایت حاصل کر لی۔ (از کبیر)

"واللّٰه یهدی من یشاء الی صراط مستقیم":

اور اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی طرف۔

یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے۔ کیونکہ پہلے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اب فرمایا کہ اس کے قبضہ اختیار میں ہے جسے چاہے ہدایت دے۔

ایمان والوں کی شان حدیث پاک سے:

"واخرج عبدالرزاق وابن جریر وابن المنذروابن ابی حاتم عن ابی هریرة فی قوله

فهـدى الله الـذين آمنو الماا ختلفوا فيه من الحق با ذنه قال قال النبی ﷺ نحن الاولون والآخـر ون،الاولون يو م القيامة و اول النا س دخولا الجنة بيدانهم اوتو االكتاب من قبلناواو تينا ه من بعد هم فهد انا الله لمااختلفوافيه من الحق فهذااليو م الذی اختلفوا فيه فهد اناالله فالنا س لنا فيه تبع فغد لليهو د و بعد غد للنصاری "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہم اول بھی ہیں اور آخر بھی۔ قیامت کے دن ہم اول ہوں گے، کیونکہ سب لوگوں سے پہلے جنت میں ہم داخل ہوں گے، اور لوگ ہمارے پیچھے ہوں گے۔ سوائے اس کے کہ ان لوگوں کو کتاب ہم سے پہلی دی گئی اور ہمیں ان سے بعد دی گئی، اللہ تعالیٰ نے ہمیں حق راہ کی ہدایت کی جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے، یہود ایک دن کے وقفہ سے ہمارے پیچھے ہوں گے اور نصاریٰ دو دن کے وقفہ سے پیچھے ہوں گے۔ (درمنثور)

یہ خیال رکھیں کہ یہود ونصاریٰ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ سے تشریف لانے سے پہلے انبیاء کرام پر ایمان لانے والے تھے اور اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ان کی وفات ہوئی۔

نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کے بعد پہلی شریعتیں منسوخ ہو گئیں، جن یہود ونصاریٰ نے آپ پر ایمان نہیں لایا وہ کافر ہیں، کافروں کی بخشش نہیں ہوگی، اس لئے ان کا جنت میں داخلہ نہیں ہوگا۔

تنبیہ:

اہلِ کتاب کے اختلاف کی جو وجوہ بیان کی گئیں روح المعانی کے حوالے سے وہ تمام وجوہ ابن شیخ نے عبدالرحمٰن بن زید کی اپنے باپ کی روایت سے بیان کی ہیں۔

نبی کریم ﷺ دعاء فرماتے تھے:

"عن عائشة ان رسول الله ﷺ کا ن اذا قام من الليل يصلی بقول" اللهم ر ب جبريل

ومیکائیل واسرافیل فاطر السموات والارض عالم الغیب والشهادة انت تحکم بین عبادک فیما کانو افیه یختلفون اهدنی لما اختلف فیه من الحق با ذنک انک تهدی من تشاء الی صراط مستقیم " (بخاری مسلم)

اے اللہ جبریل ومیکائیل واسرافیل کے رب، زمین وآسمان کو پیدا کرنے والے، ہر چھپی ہوئی اور ہر ظاہر چیز کو جاننے والے! تو اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، مجھے اپنی توفیق سے ہدایت پر قائم رکھ، بے شک تو جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

" اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارناالباطل باطله وارزقنا اجتنابه ولاتجعله متلبساعلینا فنضل واجعلنا للمتقین اماما " (بخاری ومسلم)

اے اللہ ہمیں حق راہ پر قائم رکھ، اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرما، کہ ہم باطل کو باطل سمجھیں، اور ہمیں باطل سے دور رہنے کی توفیق عطا فرما، ایسا نہ ہو کہ ہم باطل پر چل کر گمراہ ہو جائیں، اور ہمیں متقی لوگوں کا امام بنا۔ (ابن کثیر)

یہ دعائیں تعلیم امت کے لئے تھیں، اور بلندی درجات کے لئے تھیں، ورنہ نبی کا مقام بہت بلند ہے، باطل راہ پر چلنے اور گمراہ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۴)

۱

کیا اس گمان میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر اگلوں کی سی روداد نہ آئی، پہنچی انہیں سختی اور شدت اور ہلا ہلا ڈالے گئے یہاں تک کہ کہہ اٹھا رسول اور ان کے ساتھ کے ایمان والے کب آئے گی اللہ کی مدد سن لو بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔

۲

کیا گمان کیا تم نے کہ تم داخل ہو جاؤ گے جنت میں، حالانکہ نہیں آئی تمہارے پاس مثل ان لوگوں کی جو گزر گئے تم سے پہلے، پہنچی ان کو شدت اور تکلیف، اور جھنجھوڑے گئے وہ، یہاں تک کہ کہنے لگے رسول، اور جن لوگوں نے ان کے ساتھ ایمان لایا کب آئے گی امداد اللہ کی خبردار (آگاہ ہو جاؤ) بیشک مدد اللہ کی قریب ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے سابقہ انبیاء کرام اور ان کی امتوں کے اختلاف کو ذکر فرمایا، اور ان کے اختلاف کے انجام کو ذکر کیا، ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ جب انبیاء کرام اور ان کے ساتھ والوں کو کفار کی جانب سے مصائب و آلام پہنچے تو انہوں نے صبر سے کام لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی امداد سے نوازا۔

تو اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کو خطاب کیا گیا کہ کفار کی طرف سے پہنچائی جانے والی مصیبتوں اور تکلیفوں میں صبر سے کام لو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح و نصرت تمہیں ہی حاصل ہو گی۔ (تفسیر ابی السعود)

شانِ نزول:

نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو مشرکین اور یہود اور منافقین کی طرف سے بہت مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا، پھر جنگوں میں کئی حضرات زخمی ہوئے اور مال اور جان کی قربانیاں پیش کی گئیں۔ جو بظاہر تکلیف دہ چیزیں تھی، اس لئے صحابہ کرام کی تسلی کے لئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا کہ تم سے پہلے بھی انبیاء کرام اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے بہت تکالیف برداشت کیں، صبر سے کام لیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی امداد فرمائی، تم بھی صبر سے کام لو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں بھی امداد حاصل ہوگی۔

پہلے لوگوں کی تکالیف کے ذکر سے تسلی کیسے حاصل ہوتی ہے؟ ''والمصيبة اذاعمت طابت'' مصیبت جب عام ہو جاتی ہے تو اس کو برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ ڈالے جانے کا ذکر کیا، اور حضرت ایوب علیہ السلام پر تکالیف کے آنے کا ذکر کیا۔

'' ومن امر سائر الانبياء عليهم السلام فى مصابر تهم على انواع البلاء ماصار ذلك فى سلوة المومنين''

اور دوسرے کئی انبیاء کرام پر تکالیف کے آنے اور ان پر صبر کرنے کا ذکر کر کے مومنوں کو تسلی دی۔

آیۃ کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر کئی واقعات پر مشتمل ہے:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام جب مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو آپ پر وہ بہت سخت مشکل وقت تھا، کیونکہ وہ اپنے مال مکہ مکرمہ میں چھوڑ آئے تھے اور ان کے مکانات پر بھی مشرکین قابض ہو گئے تھے اور ادھر (مدینہ طیبہ میں) یہود آپ سے عداوت کر رہے تھے، تو آپ کو اور آپ کے صحابہ کرام کو اس آیۃ کریمہ سے تسلی دی گئی۔

(۲) اسی طرح غزوۂ احد میں مسلمان زخمی ہوئے اور ستر کی تعداد میں شہید ہوئے تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی،

نبی کریم ﷺ کے صحابہ کو کہنے لگا۔

"الی متی تقتلون انفسکم وترجو ن الباطل ولو کان محمد نبیالماسلط اللہ علیکم الأسرو القتل"

کب تک تم اپنے آپ کو قتل کراتے رہو گے اور باطل باتوں پر (معاذ اللہ) کب تک امید لگائے رکھو گے، اگر محمد نبی ہوتے تو اللہ تعالیٰ تم پر قید اور قتل مسلط نہ کرتا۔

اس آیہ کریمہ میں منافقوں کا بھی رد کیا گیا اور مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی۔

(۳) غزوۂ خندق میں مسلمانوں کو بہت مشقت برداشت کرنا پڑی، سخت سردی، کھانے پینے کی بہت کمی اور خندق کی کھدائی اور تمام کفار کی اتحادی فوجوں سے مقابلہ، اس پریشان کرنے والی حالت سے مسلمانوں کا حال یہ تھا "وبلغت القلوب الحناجر" اور دل گلوں کے پاس آ گئے۔

اس آیہ کریمہ میں اس مشکل حال میں صحابہ کرام کو تسلی دی گئی کہ یہ تمہارے قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔

مختصر مطلب:

مسلمانوں کو تسلی دی گئی اور ساتھ ہی یہ سمجھایا گیا کہ کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ جنت جیسی عظیم نعمت تمہیں یوں ہی مل جائے نہیں یہ خیال نہ کریں، بلکہ یہ سمجھ لو کہ جنت کے حصول کے لئے تو بہت بڑی مشکلات سے گذرنا پڑتا ہے، ابھی تک تو تم پر وہ مصیبتیں نہیں آئیں جو تم سے پہلے لوگوں پر آئیں۔ جب وہ شدید مشکلات میں آئے تو اس وقت کے رسول اور ایمان والے کہنے لگے اللہ کی امداد کب آئے گی؟ تو بتایا گیا خبردار اللہ کی مدد قریب ہے۔

"ام حسبتم ان تدخلواالجنة": کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

جلالین میں لفظ "ام" کا معنی "لکن" (لیکن) سے کیا گیا ہے کہ یہ "ام" منقطعہ ہے۔ لیکن علامہ رازی رحمہ

۔۔ نے اس مقام پر ''ام ''کو استفہام کے معنی میں رکھا ہے۔

آپ فرماتے ہیں''ھل ''اور''ھمزہ'' استفہام کے لئے استعمال ہوتے ہیں جو ابتداء میں آتے ہیں۔جیسے کہا جائے''ھل عندک رجل'' یا کہا جائے''اعندک رجل'' (کیا کوئی مرد تمہارے پاس ہے)لیکن ''ام'' درمیان میں واقع ہوتا ہے،ابتداء میں نہیں آتا،اس لئے''ام عندک رجل'' کہنا صحیح نہیں،ہاں البتہ ''ام'' سے پہلے کبھی استفہام ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔

پہلے استفہام ہو جیسا کہ کہا جائے''انت رجل لا تنصف افعن جھل تفعل ھذا ام لک سلطان'' تو وہ شخص ہے کہ انصاف نہیں کرتا کیا جہالت کی وجہ سے یہ(بے انصافی) کرتا ہے یا تجھے بادشاہی حاصل ہے۔

جب پہلے استفہام نہ ہو جیسا کہ قرآن پاک میں'' الم ، تنزیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین ام یقولو ن افتراہ'' یہاں '' ام'' درمیان میں ہے لیکن اس سے پہلے بظاہر استفہام نہیں۔

البتہ بعض حضرات یہاں بھی اس پہلے استفہام مقدر مانتے ہیں،وہ مکمل تقدیر عبارت کی یوں مانتے ہیں۔

'' افیو منون بھذا ام یقولو ن افتراہ''

اس ضابطہ کے مطابق زیر بحث آیت کی وضاحت بھی اس عبارت سے کرنے پڑے گی۔

''(فھدی اللہ الذین امنو الما اختلفو افیہ من الحق باذنہ) فصبرو اعلی استھزاء قومھم، افتسلکون سبیلھم ام تحسبو ن ان تد خلو ا الجنۃ من غیر سلوک سبیلھم''

تو اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اپنی توفیق سے حق راہ کی ہدایت کی کہ وہ جس میں اختلاف کر رہے،تو ایمان والوں نے اپنی قوم کے مزاح اڑانے پر صبر کیا،کیا تم ان کی راہ پر چلو گے یا یونہی گمان کرو گے کہ ان کی راہ پر چلنے کے بغیر ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

البتہ یہ خیال رہے کہ یہاں استفہام انکاری ہے۔جس کا مطلب یہ کہ تمہیں مصائب وآلام کے برداشت کرنے کے بغیر،پہلے ایمان والوں کی راہ پر چلنے کے بغیر جنت میں داخل ہونے کا گمان نہیں کرنا چاہئے۔

ایک اور توجہ:

"حسب" کا جب مصدر "حسبان" (بالکسر) اور محسبة (بفتح المیم وکسر السین) ہو تو ماضی اور مضارع دونوں مکسور العین ہوں گے، اس وقت معنی ہوتا ہے سمجھنا اور گمان کرنا۔

لیکن جب مصدر "حسب" (بفتح الحاء وسکون السین) ہو۔ یا "حسبان" (بالضم) ہو تو اس وقت اس کی ماضی مکسور العین اور مضارع مفتوح العین ہوگا۔ اس صورت میں معنی ہوگا۔ "شمار کرنا، حساب کرنا"۔

لہٰذا طلباء کرام فرق ذہن میں رکھیں تا کہ معنی سمجھنے میں اور تلفظ صحیح کرنے میں آسانی ہو۔

البتہ ترجمہ کرتے وقت مصادر کا لحاظ کیا جائے گا، باب کا نہیں، کیونکہ "علم یعلم" باب سے بھی گمان کرنے کا معنی آتا رہتا ہے۔

"ولما یا تکم مثل الذین خلوا من قبلکم":

حالانکہ نہیں آتی تمہاری پاس مثل ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گذر گئے۔

اس مقام میں "لما" نافیہ ہے، جس کا معنی ہوتا ہے "نہیں" یہاں "لما" ظرفیہ نہیں جس کا معنی ہوتا ہے "جبکہ"۔

"مثل" میم کے فتحہ اور کسرہ سے دولغتیں ہیں، جس طرح "شبہ" شین کے فتحہ سے بھی استعمال ہوتا ہے اور کسرہ سے بھی۔

البتہ "مثل" میم کے فتحہ سے واقعہ عجیبہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "وللہ المثل الاعلی" میں استعمال ہوتا ہے "ای الصفة التی لھاشأن عظیم" یعنی رب تعالیٰ کی صفات کو عظیم حالت حاصل ہے۔

"مستھم البأساء والضراء": پہنچی ان کو شدت اور تکلیف۔

"البأساء" اسم ہے "البؤس" کا جس کا معنی ہے "شدت" یعنی فقر اور مسکینی۔

"والضراء": اس کا معنی "البأساء" کے معنی کے قریب ہے، یعنی ضرر انداز (نقصان دینے والی) چیزوں کا وارد ہونا، یعنی مصائب و آلام کا پہنچنا اور خوف لاحق ہونا۔

یعنی "البأساء" کا مطلب ہے خیر اور منفعت کی وجوہ میں تنگی کو واقع ہونا، اور "الضراء" کا مطلب شر اور آفات اور تکالیف وغیرہ کے دروازے کھل جانا۔

یہاں تک مطلب:

اے مومنو! کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ صرف مجھ پر ایمان لاکر اور میرے رسول کی تصدیق کر کے تم سب سے پہلے جنت میں داخل ہو جاؤ گے، جبکہ تم ہر قسم کی عبادت بھی نہ کرو، اور پہلے ایمان والے لوگ جس طرح بہت بڑی تکالیف میں مبتلا ہوئے اسی طرح تمہیں کفار سے تکالیف بھی نہ پہنچیں اور تم فقر و فاقہ اور معیشت کی تنگی میں بھی مبتلاء نہ ہو، اور تم پر دشمن کے مقابل تکالیف بھی نہ آئیں۔

نہیں یہ تمہارا گمان درست نہیں، سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے کے لئے اور رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے تمہیں کفار کی طرف سے پہنچائی جانے والی تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان سے تمہیں مال و جان کی بازی لگا کر مقابلہ کرنا ہوگا اور فقر و فاقہ اور معیشت کی تنگی میں مبتلا ہو کر صبر کرنا ہوگا اور ہر قسم کے مصائب و آلام کو برداشت کرنا ہوگا، جب تم اس حال سے گذرو گے پھر تمہارا گمان درست ہوگا کہ ہمیں قرب الٰہی حاصل ہے، اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

"وزلزلوا": اور وہ جھنجھوڑے گئے۔

"وزلزلوا" ای حرکوا بانواع البلایا والرزایا"

وہ مختلف قسم کی بلاؤں اور مصیبتوں سے حرکت دیئے گئے۔ زلزلہ میں مبتلاء ہوئے ہلا دیئے گئے۔

خیال رہے کہ یہ ہمارے محاورہ میں بھی استعمال ہے کہ فلاں شخص کو مصیبتوں نے ہلا کر رکھ دیا گیا۔

”حتی یقول الرسول والذین آمنوامعه متی نصراللّٰه الا ان نصر اللّٰه قریب“ :

یہاں یہاں تک کہ کہنے لگے رسول اوران کے ساتھ ایمان والے کب آئے گی اللہ کی مدد، خبر دار بیشک اللہ کی مدد قرب ہے۔

یعنی تم سے پہلے ایمان والوں کو شدت اور تکلیف پہنچی اوران کو مصائب وآلام سے جھنجوڑا گیا، ان کو ہلا کر رکھ دیا گیا، یہاں تک کہ اس وقت کے رسول اوران کے ساتھ ایمان لانے والے کہنے لگے، اللہ کی مدد کب آئے گی، تو ان کو جواب دیا گیا تم آگاہ ہو جاؤ بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔

اعتراض:

”کیف یلیق بالرسول القاطع بصحة وعده ووعیده ان یقول علی سبیل الاستبعاد (متی نصر اللّٰه)“

یہ کس طرح کہنا صحیح ہوگا کہ اللہ کے رسول اس کی امداد کو بعید سمجھ کر یہ کہیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، حالانکہ اللہ کے رسولوں کو تو یقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امداد اور اجر و ثواب کا وعدہ کر رکھا ہے اس نے واقع ہونا ہی ہے، اور گناہوں کی وجہ سے اس نے جن سزاؤں کا ذکر کیا ہے اگر اس نے فضل نہ کیا بلکہ عدل کیا تو ان سزاؤں نے واقع ہونا ہی ہے۔

پہلا جواب : کفار کی طرف سے تکالیف کا پہنچایا جانا رسولوں کی شان کے منافی نہیں بلکہ رسول اپنی عظمت شان کی وجہ سے زیادہ ہی تکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

” ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولو ن “

اور البتہ تحقیق ہم جانتے ہیں بے شک آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے اس سے جو وہ کہتے ہیں۔

رسول اللہﷺ کوخطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کفار کی باتوں سے جو آپ کے دل کو تکالیف پہنچتی ہے وہ ہمارے علم میں ہوتی ہے۔

رسولوں کا سوال اس لئے نہیں تھا کہ وہ مایوس ہو گئے تھے، بلکہ سوال اس لئے تھا کہ امت کے لوگوں کو رب تعالیٰ سے جواب ملنے پر تسلی ہو جائے، اور وقت کا تعین ہو جائے، اگر چہ رب تعالیٰ کی طرف سے امداد تو حاصل ہونی ہی ہونی ہے۔ جب رب تعالیٰ کی طرف سے جواب مل گیا " الا ان نصر الله قريب " (خبردار اللہ کی مدد قریب ہے) تو وہ لوگ مطمئن ہو گئے، رسولوں کے سوال کا یہی مقصد تھا۔

دوسرا جواب: یہی جواب خوب سے خوب تر اور زیادہ تحقیق پر مبنی یہی جواب ہے۔ آیئے جواب سنیئے۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی " حتى يقول الرسول والذين امنوا معه " یہاں تک کہ رسول کہنے لگے، اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے وہ کہنے لگے۔ (یعنی رب تعالیٰ نے یہ بتایا کہ رسول بھی کلام فرما رہے تھے اور ایمان والے بھی کلام فرمارہے تھے) اس کے بعد رب تعالیٰ نے دو کلاموں کا ذکر فرمایا۔ ایک "متى نصر الله" اور دوسرا کلام "الاان نصر الله قريب" ذکر فرمایا۔

- "فو جب اسناد كل واحدمن هذين الكلامين الى واحد من ذينك المذكورين "

اس لئے ضروری ہے کہ دونوں کلاموں میں ہر ایک کا تعلق پہلے جو دو قول ذکر کئے ہیں ان کے ساتھ کیا جائے۔ ایک کا تعلق ایک قول سے ہو جائے اور دوسرے کا تعلق ایک اور سے ہو جائے۔

حاصل کلام یہ ہے۔

"فالذين امنوا قالوا "متى نصر الله " والرسول قال " الاان نصر الله قريب "

ایمان والوں نے کہا" متى نصر الله" اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اور رسولوں نے کہا " الا ان نصر الله قريب " خبردار بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔

اسی کے قریب رب تعالیٰ کا ایک اور ارشاد گرامی ہے۔

" ومن رحمته جعل لكم الليل والنهار لتسكنوا فيه ولتبتغوا من فضله" والمعنى لتسكنوا فى الليل ولتبتغوا من فضله النهار "

یعنی دو چیزوں کا پہلے ذکر کیا، کہ رب تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن بنائے۔
پھر اس کے بعد دو چیزوں کا ذکر کیا ایک کا تعلق رات سے کیا اور ایک کا دن سے، یعنی "لتسکنوا فی اللیل" تم رات کو سکون حاصل کرو، "ولتبتغوا من فضله فی النهار" اور دن کو رب تعالیٰ کا فضل یعنی مال حاصل کرو۔

اسی کے قریب ایک شاعر کا قول ہے۔

کان قلوب الطیر رطبا و یابسا لدی و کرها العناب والحشف البالی

گویا کہ پرندوں کے دل ترا ور خشک۔ان کے گھونسلوں کے قریب عناب اور پرانی خشک کھجوریں ہیں۔
شاعر نے پہلی دو چیزوں کا ذکر کیا "رطبا" اور "یابسا" کا، پھر دو چیزوں کا ذکر کیا "عناب" اور "الحشف البالی" کا۔

"فالتشبیه بالعناب للرطب و با لحشف البالی للیابس"

یعنی تر دلوں کو تشبیہ دی عناب سے، اور خشک دلوں کو تشبیہ دی خشک پرانی کھجوروں سے۔ (از کبیر)

تنبیہ:

طلباء کرام یہ بات ذہن میں رکھیں کہ زیر بحث آیۃ میں کلام "لف ونشر غیر مرتب" ہے۔اور دوسری آیۃ اور شعر میں کلام "لف نشر مرتب" ہے۔اسی لئے "اسی کے قریب" کے الفاظ بڑھائے گئے ہیں۔ (راقم)

ایک حدیث پاک سے تائید:

اسی دوسرے جواب کی تائید میں ایک حدیث پاک بھی راقم کو سمجھ آئی، جو اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں مفسرین کرام نے ذکر کی۔اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امت کے لوگوں کے کلام میں اور اللہ کے نبی کے کلام میں فرق ہوتا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث صحابہ کرام اور رسول اللہ ﷺ کے کلام میں فرق ہے۔

☆ "عن خباب بن الارت قال شکو نا الی رسول الله ﷺ وهو متوسد بردةله فی ظل الکعبة فقلنا الا تنتصرلنا الاتد عولنا فقال قد کان من قبلکم یؤخذ الرجل فیحفر له فی الارض فیجعل فیها ثم یو تی با لمنشار فیو ضع علی رأ سه فیجعل نصفین ویمشط بامشاط الحدید مادون لحمه وعظمه مایصد ذلک عن دینه والله لیتمن الله هذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضرموت لا یخاف الاالله والذئب علی غنمه ولکنکم تستعجلون" (بخاری)

خباب بن ارت کہتے ہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی جبکہ آپ کعبہ شریف کی دیوار کے سایہ میں چادر سر کے نیچے رکھ کر لیٹے ہوئے تھے، ہم نے کہا آپ ہمارے لئے امداد کیوں نہیں طلب کرتے، آپ ہمارے لئے دعاء کیوں نہیں کرتے؟ تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے لوگوں کو (دین پر عمل کرنے کی وجہ سے) گڑھے میں کھڑا کر کے آری سے سر سے لیکر قدموں تک چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے گئے، اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کی ہڈیوں سے گوشت کو اتار دیا گیا، لیکن وہ دین سے نہ ہٹے (بلکہ دین پر ثابت قدم رہے)۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اللہ تعالیٰ اس دین کی تکمیل فرمائے گا، یہاں تک کہ سوار (بلاخوف) صنعاء سے حضرموت تک چلا جائے گا، اسے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کا خوف نہیں ہوگا، اور بھیڑ بکری کو بھیڑیئے کا ڈر نہیں ہوگا، لیکن تم جلدی کررہے ہو۔ (خازن)

اس حدیث پاک سے واضح ہورہا ہے کہ صحابہ کرام نے تکالیف سے بے قرار ہوکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دعاء کرنے اور امداد طلب کرنے کی درخواست کی، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کو صبر کرنے کی تلقین کی۔ اسی طرح پہلے ایمان والے لوگوں نے بے قراری سے کہا" اللہ کی امداد کب آئے گی" تو رسولوں نے ان کو صبر کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا، خبردار اللہ کی امداد قریب ہے۔ واللہ اعلم با لصواب (راقم)

☆☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۵)

﴿۱﴾

تم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں تم فرماؤ جو کچھ مال نیکی میں خرچ تو وہ ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور راہ گیر کے لئے ہے اور جو بھلائی کرو بیشک اللہ اسے جانتا ہے۔

﴿۲﴾

سوال کرتے ہیں آپ سے خرچ کرنے کے متعلق، فرمادو جو خرچ کرو تم مال نیکی میں تو وہ ہو واسطے ماں باپ کے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے اور یتیموں کے لئے اور مسکینوں اور مسافروں (کے لئے ہو) اور جو کرو تم بھلائی تو بیشک اللہ اسے جانتا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ اس سے پہلے بیان فرمایا کہ ہر مکلّف کے لئے واجب ہے کہ وہ دنیا کے جلدی حاصل ہونے والے منافع سے اعراض کریں، اور آخرت کے دائمی منافع میں مشغول ہو جائیں، اور وہ اخروی منافع اللہ کی راہ میں مال اور جان قربان کرنے سے حاصل ہوں گے۔

اب اس آیۃ کریمہ سے لے کر "الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم" تک احکام بیان کئے جار ہے ہیں۔ قرآن پاک کا انداز بیان یہ ہے کہ توحید کا ذکر ہوتا ہے اور وعظ و نصیحت کو بیان کیا جاتا ہے اور پھر احکام کو بیان کیا جاتا ہے، وہ احکام مختلف ہوتے ہیں جو آپس میں ملتے جلتے ہوتے ہیں۔

اس انداز بیان سے بعض کو بعض سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور تاکید حاصل ہوتی ہے۔

شانِ نزول:

عطاء کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ آیۃ کریمہ ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"ان لی دینار افقال انفقه علی نفسک،قال ان لی دینارین قال انفقهما علی اهلک، قال ان لی ثلاثة قال انفقها علی خادمک،قال ان لی اربعة قال انفقها علی والدیک، قال ان لی خمسة قال انفقها علی قرابتک ، قال ان لی ستة قال انفقها فی سبیل الله و هو احسنها "

بیشک میرے پاس ایک دینار ہے (میں کہاں خرچ کروں؟) تو آپ نے فرمایا، اپنے آپ پر وہ خرچ کرو، پھر اس شخص نے عرض کیا بیشک میرے پاس دو دینار ہوں تو؟ آپ نے فرمایا وہ دو دینار (اپنے آپ پر) اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرو، پھر عرض کیا بے شک میرے پاس تین دینار ہوں تو؟ آپ نے فرمایا وہ تین دینار (اپنے آپ پر اور اپنے اہل وعیال پر اور) اپنے خادم پر خرچ کرو۔ پھر عرض کیا بے شک میرے پاس چار دینار ہوں (تو میں کیا کروں؟) آپ نے فرمایا وہ چار دینار (اپنے آپ پر اپنے اہل وعیال پر، اور اپنے خادم پر اور) اپنے والدین پر خرچ کرو، پھر عرض کیا بے شک میرے پاس پانچ دینار ہوں (تو میں کیا کروں؟) آپ نے فرمایا وہ (اپنے آپ پر، اور اپنے اہل وعیال پر، اور اپنے خادم پر، اور اپنے والدین پر اور) اپنے قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرو۔ پھر عرض کیا بے شک میرے پاس چھ دینار ہوں (تو میں کیا کروں؟) آپ نے فرمایا وہ (اپنے آپ پر، اپنے اہل وعیال پر، اپنے خادم پر، اپنے والدین پر، اپنے قریبی رشتہ داروں پر اور) اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اللہ کی راہ میں خرچ بہت اچھا بھلائی کا کام ہے۔

(۲) شانِ نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ حضرت عمرو بن جموح کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ بہت زیادہ بوڑھے ہو گئے تھے، اور بہت زیادہ مال دار تھے، غزوۂ احد میں دوران جنگ حضور ﷺ سے سوال کیا۔

" ماذاننفق من اموالنا واین نضعها " ہم اپنا کتنا مال خرچ کریں اور کن پر خرچ کریں۔

ان کے اس سوال کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''سوال کرتے ہیں آپ سے خرچ کرنے کے متعلق آپ فرمادیں جو بھی بھلائی کی راہ میں مال خرچ کرو، یعنی جتنا مال تم خرچ کرنا چاہو وہ خرچ کرو، لیکن جائز کاموں پر خرچ ہو، ناجائز کاموں پر نہیں، وہ مال والدین کو، اور قریبی رشتہ داروں کو دو اور تیموں کو دو، اور مسکینوں کو دو، اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو، اور جو بھی تم بھلائی کا کام کرو گے بے شک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ یعنی وہ تمہاری نیتوں کو جانتا ہے، اس لئے تم جو مال بھی خرچ کرو اس میں صرف اللہ تعالیٰ رضاء مندی مقصود ہو، اور نیت خالص ہو۔ (از کبیر)

تنبیہ: علم معانی میں ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ کبھی سائل کے سوال کو اس کے غیر سوال کے درجہ میں رکھ کر جواب دیا جاتا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ بہتر یہ تھا کہ سوال اس طرح ہوتا، یا یہ بتانا مقصود ہوتا کہ اہم سوال یہ تھا۔

اس کی ایک مثال یہی آیۃ کریمہ ذکر کی جس کی بحث جاری ہے کہ سوال تھا ''کیا خرچ کیا جائے'' جواب دیا کہ کن پر خرچ کرنا ہے، گویا کہ یہ بتایا گیا کہ وہی خرچ کرنا اللہ کے ہاں معتبر ہوگا جو صحیح مصرف میں خرچ ہوگا۔

لیکن کبیر سے شان نزول کی جو دو وجہ بیان کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جواب سوال کے مطابق ہے۔ کیونکہ سوال میں ''کن پر خرچ کرنا ہے'' بھی موجود تھا۔

راقم نے تلخیص المفتاح کے اپنے عربی حاشیہ ''ضوء المصباح'' میں ''تفسیر ابی السعود'' سے ذکر کیا کہ سوال جواب کے مطابق ہے۔ ابوالسعود نے بھی پہلے علم معانی کے قانون کے مطابق بیان کیا لیکن پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے وہی الفاظ ذکر کئے جو کبیر سے نقل کئے جاچکے ہیں، عمرو بن جموح نے حضور ﷺ سے ''ماذا ننفق من اموالنا واین نضعها'' ہم اپنے کون سے مال خرچ کریں اور کن پر خرچ کریں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ تفصیل بیان فرماتے ہیں:

(۱) اس میں ایک وجہ یہ ہے کہ سوال کا جواب دے کر پھر اور زیادہ وضاحت کر دی گئی تاکہ مقصد کو حاصل کرنے میں آسانی ہو۔

سوال کا جواب " ما انفقتم من خیر " سے دیا، "ای ای شئی انفقتم من ای خیر کان " یعنی جو چیز بھی تم خرچ کرو، جس طرح بھی اس میں بھلائی پائی جائے۔ یہ بیان ہے اور جواب ہے کہ کیا چیز خرچ کی جائے، اس کی بعد زیادہ وضاحت کردی گئی کہ مال خرچ کرنا اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک صحیح مصرف اور صحیح مستحق پر نہ خرچ کیا جائے۔

" فلهذا الماذکر الله تعالیٰ الجواب اردفه بذکر المصرف تکمیلا للبیان "

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب جواب ذکر فرمایا تو اس کے پیچھے مصرف کو ذکر فرمایا کہ مال کن لوگوں پر خرچ کرنا ہے، اس طرح ایک مسئلہ کو مکمل طور پر بیان فرمادیا گیا۔

مال کو خیر کہنے کی وجہ:

"والمال یسمی خیرا لان حقه ان یصرف الی جهة الخیر فصار بذلک کأنه نفس الخیر"

مال کو خیر اس لئے کہا گیا ہے کہ حق یہ ہے کہ مال کو بھلائی کی راہ میں خرچ کیا جائے، جب نیکی کی راہ میں مال خرچ کیا جائے گا وہ مال بھی خیر بن جائے گا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ سوال میں لفظ "ما" واقع ہے، لیکن مقصد سوال یہ ہے کہ کیفیت بیان کی جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے، جب انہیں یہ معلوم تھا تو یہ سوال کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ وہ کونسا مال خرچ کریں۔ لہٰذا واضح ہوا۔

"ان المطلوب بالسؤال ان مصرفه ای شئ هو وحینئذ یکون الجواب مطابق للسؤال "

کہ سوال کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ بتایا جائے کہ مال کن لوگو پر خرچ کیا جائے۔

" وجب ان یقطع بأن مرادهم من قولهم (ما ذا ینفقون) لیس هو طلب الماهیة بل طلب المصرف "

یہ ضروری بات ہے کہ یقین کیا جائے کہ ان کا سوال " ما ذا ینفقون " ماہیت کی طلب کے لئے نہیں تھا کہ کونسا مال خرچ کریں بلکہ مصرف کے متعلق سوال تھا۔

(۳) تیسری وجہ وہی بیان کی گئی جس کا ذکر علم معانی کے ضابطہ میں کیا جاچکا ہے۔ (از کبیر و روح البیان)

رب کے کلام میں حکمت:

مصارف بیان کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے جس ترتیب سے والدین وغیرہ کا ذکر کیا وہ عجیب وغریب حکمت پر مبنی ہے۔

والدین کا سب سے پہلے ذکر کیا کیونکہ وہ انسان کے عالم اسباب میں عدم سے وجود کی طرف لانے کا ذریعہ ہیں، پھر والدین ہی اولاد کی تربیت کرتے ہیں اس حال میں جبکہ اولاد بہت کمزور ہوتی ہے۔ جتنا انعام والدین کا اولاد پر ہے اتنا کسی اور کا نہیں، اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد والدین پر احسان کرنے کا حکم دیا۔

" وقضی ربک ان لا تعبد وا الاایا ہ وبا لو الدین احسانا"

اور آپ کے رب نے فیصلہ فرمایا کہ تم اس کے سواء کسی اور کی عبادت نہ کرو اور والدین سے احسان کرو۔

والدین کے بعد قریبی رشتہ داروں کا ذکر کیا کیونکہ ایک انسان تمام فقیروں کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا، اس لئے ضروری ہے کہ کوئی وجہ ترجیح پائی جائے۔ "والقرابة تصلح ان تکون سبباللترجیح "

قریبی رشتہ دار جب محتاج ہوں تو ان پر مال خرچ کرنے کی وجہ ترجیح موجود ہے کہ وہ قریبی رشتہ دار ہیں۔

"وان الانفاق علی القریب اولی من الانفاق علی البعید "

قریبی رشتہ دار پر خرچ کرنا زیادہ بہتر ہے بنسبت دور والے رشتہ دار کے۔

اس کے بعد یتیموں کا ذکر کیا کیونکہ وہ اپنے صغر (چھوٹی عمر) کی وجہ سے کسب (کمانے) پر قادر نہیں۔ چونکہ وہ یتیم ہے اس کا باپ نہیں جو اسے مال حاصل کر کے دے۔

" فالطفل الذی مات ابو ہ قد عدم الکسب والکا سب واشرف علی الضیا ع "

وہ بچہ جس کا باپ فوت ہو جائے وہ بربادی کے کنارے پر ہوتا ہے کیونکہ اس کا کوئی کسب نہیں اور نہ ہی اس کو کوئی کمانے والا ہے، اس لئے اس کی امداد کرنا ضروری ہے اور باعث اجر وثواب ہے۔

یتیموں کے بعد مسکینوں کا ذکر کیا کیونکہ وہ وقتی طور پر محتاج ہیں، مالی امداد کے مستحق ہیں، لیکن یتیموں کے بعد

ذکر کرنے کی وجہ ہے کہ یہ ان سے کم حاجت مند ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں مال کمانے کی صلاحیت ہوتی ہے، وقتی طور پر عوارضات کی وجہ سے وہ محتاج ہو گئے ہیں۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ صرف عمر رسیدہ شخص کو حاجت مند سمجھنا اور نوجوان ادھیڑ عمر والے شخص کی اس لئے امداد نہ کرنا کہ یہ کمانے کے قابل ہے، یہ غلط ہے۔ جب وہ وقتی طور پر محتاج ہے تو اس کی امداد کی جائے خواہ وہ کسی عمر میں ہے۔ ہاں البتہ مستحق ہونے کا پتہ ہو تو امداد کی جائے، پیشہ ور بھکاریوں کی امداد نہ کر کے ان کی حوصلہ شکنی ضروری ہے تا کہ ان کی یہ عادت ختم ہو جائے۔

مسکینوں کے بعد اللہ کی راہ میں سفر کرنے والوں کا ذکر کیا کہ کبھی ایسا ہو جاتا ہے جہاد کرنے والے حضرات یا حج کرنے والے بے خرچ ہو جاتے ہیں، اس لئے ان کی وقتی حاجت کو پورا کرنے کے لئے ان کی مالی معاونت کی جائے، لیکن ایسی ضرورت بہت کم پیش آتی ہے، اس لئے ان کا ذکر سب سے آخر میں کیا۔

" فهذا هو الترتيب الصحيح الذى رتبه الله تعالى فى كيفية الانفاق "

یہ وہ صحیح ترتیب ہے اور با کمال اور عجیب وغریب ترتیب ہے جس کو رب تعالٰی نے خرچ کرنے کی کیفیت میں مرتب فرمایا ہے۔

"وماتفعلوامن خيرفان الله به عليم": اور جو کرو تم بھلائی بے شک اللہ اسے جانتا ہے۔

خیال رہے کہ " ما انفقتم من خير " میں "خیر" کا معنی مال ہے، جیسا کہ "وانه لحب الخير لشديد" میں، اور "ان ترک خيرا الوصية" میں "خیر" سے مراد مال ہے۔ البتہ مال کو خیر کیوں کہا؟ اس کی وجہ پہلے روح البیان کے حوالہ سے بیان ہو چکی ہے کہ مال کو بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنے سے مال بھی خیر بن جاتا ہے۔

البتہ "وما تفعلوا من خير" میں "خیر" سے مراد عام ہے صرف مال نہیں، جیسا کہ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"(وما تفعلوا من خير) يتناول هذا الانفاق وسائر وجوه البر والطاعة "

اس مقام میں یعنی ''وما تفعلوا من خیر''میں''خیر''سے مراد ہر قسم کی بھلائی ہے۔

والدین اور قریبی رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ضرورت مند مسافرین کی امداد کرنا، ان پر مال خرچ کرنا بھی بھلائی ہے اور نیکی اور اطاعت کے تمام کام ہی خیر ہیں۔لہذا مطلب واضح ہوا کہ جو بھلائی تم کرو بے شک اللہ اسے جانتا ہے۔

مسئلہ: والدین پر اور اصول (دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ) پر، اور فروع (بیٹا، بیٹی، نواسہ، نواسی، پوتا، پوتی وغیرہ) پر زکوۃ کا مال خرچ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے یہاں خرچ کرنے سے مراد زکوۃ کا مال نہیں۔والدین کے پاس اپنا مال ہے تو ان کی مالی معاونت مستحب ہے، اور اگر ان کے پاس اپنا مال نہیں وہ محتاج ہیں۔تو ان کی مالی معاونت فرض ہے۔

مسئلہ: مندرجہ بالا رشتہ داروں (یعنی اصول وفروع) کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کو حاجت مند ہونے کی صورت میں، اور یتیموں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ کے مسافرین کو زکوۃ کا مال بھی دیا جا سکتا ہے۔

اس لئے جب ''ماانفقتم من خیر'' سے مراد بھلائی میں مال خرچ کرنا مراد ہو تو عام ہوگا جو صدقات فرضیہ اور نفلیہ دونوں کو شامل ہوگا۔

لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی رضا مندی کے لئے جو مال بھی تم والدین اور قریبی رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ کے مسافروں پر خرچ کر سکتے ہو وہ خرچ کرو۔

اسی سے خود بخود واضح ہو جائے گا کہ والدین اور باقی اصول اور فروع کو زکوۃ کے بغیر مال دیا جائے اور باقی حضرات کو خواہ زکوۃ کا مال دو یا صدقات نفلیہ دو جائز ہے۔

راقم کی وضاحت کے بعد طلباء کرام آپ تفاسیر کی ان بحثوں کو دیکھ کر یہ آیت منسوخ ہے یا نہیں، اور آیت کا تعلق زکوۃ سے ہے یا نہیں، خود سمجھ لو گے کہ راقم کا انداز بیان اگر خوب تر نہیں تو آسان ضرور ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۶)

☆ ۱ ☆

تم پر فرض ہوا خدا کی راہ میں لڑنا اور وہ تمہیں ناگوار ہے اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں پسند آئے اور وہ تمہارے حق میں بری اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

☆ ۲ ☆

فرض کیا گیا تم پر (اللہ کی راہ) میں لڑائی کرنا، اور وہ شاق ہے تم پر اور قریب ہے تم شاق سمجھو جس چیز کو وہی بہتر ہو تمہارے لئے۔ اور قریب ہے تم پسند کرو کسی چیز کو وہی تمہارے لئے شر (غیر بہتر) ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

احکام بیان کئے جارہے ہیں۔ پہلے ایک حکم خرچ کرنے کے متعلق بیان کیا گیا، اب دوسرا حکم جہاد کے متعلق بیان کیا جارہا ہے۔

"کتب علیکم القتال": "کتب" کا معنی ہے فرض کیا گیا۔

"والمراد بالقتال قتال الاعداء من الکفار" اور "قتال" سے مراد کافر دشمنوں سے جنگ کرنا ہے۔

اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "خدا کی راہ میں لڑنا" ترجمہ کیا ہے۔ راقم نے بھی تقریباً وہی نقل کیا ہے۔

عمرو بن ابی ربیعہ نے کہا۔

کتب القتل والقتال علینا   وعلی الغانیات جرّ الذیول

فرض کیا گیا ہے ہم پر قتل اور لڑائی کرنا، اور گانے والی عورتوں پر دوپٹے کا دامن کھینچنا۔

جہاد اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے امتحان کے لئے فرض کیا ہے" وجعل وصلة الى الجنة "اور جنت میں جانے کا ذریعہ بنایا۔ نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں تھے، اس وقت آپ کو کفار سے لڑائی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب مدینہ طیبہ میں آئے تو اجازت دی گئی۔ (مکمل تفصیل پہلے بیان کی جاچکی ہے" وقاتلو افی سبیل الله الذین یقاتلو نکم " آیۃ کی بحث میں دیکھیں) (از قرطبی)

اب جہاد کا حکم یہ ہے۔

" قتال الكفار وهو فرض عين ان دخلوا بلا دنا و فرض كفاية ان كونوا ببلادهم "

مسلمانوں کے شہروں اور ملک پر چڑھائی کردیں تو جہاد فرض عین ہو جاتا ہے یعنی ہر شخص پر جہاد فرض ہو جاتا ہے اور جب تک وہ اپنے علاقہ میں رہیں تو مسلمانوں پر جہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔

(روح المعانی)

جب کفار اسلامی ملک پر حملہ کریں تو ان لوگوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ کفار سے لڑائی کر کے ان کے شہر کو ختم کریں اور اپنے اسلامی ملک اور اسلام کی حفاظت کریں۔

زھری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جب جہاد فرض ہو جائے تو اس کی فرضیت پر عمل جہاد میں شریک ہو کر بھی ہو سکتا ہے اور گھر بیٹھ کر بھی، گھر بیٹھنے والے کو جہاد میں اس وقت شریک سمجھا جائے گا۔

" اذا استعين ان يعين، واذا استغيث ان يغيث 'واذا استنفر ان ينفر 'وان لم يحتج اليه قعد "

جب اس سے امداد طلب کی جائے تو امداد کرے، جو اس سے فریاد کی جائے تو وہ فریاد کو پہنچے، اور اس سے جب مطالبہ کیا جائے کہ اب تم میدان جنگ میں آجاؤ تو وہ وہاں پہنچ جائے، ہاں جب تک شدید ضرورت نہیں تو اس کا گھر بیٹھنا بھی جائز ہے۔

صحیح بخاری میں ہے "من مات ولم يغزو ولم يحدث نفسه بالغزو مات ميتة جاهلية " (رواہ مسلم)

جو شخص اس حال میں فوت ہو گیا کہ اس نہ جہاد کیا اور نہ ہی اس کے دل میں جہاد کرنے کا خیال آیا تو جاہلیت کی موت مرا۔

نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا۔"لاھجرۃ بعدالفتح ولکن جھادونیۃواذااستنفرتم فانفروا"
فتح مکہ کے بعد ہجرت فرض نہیں رہی، لیکن جہاد کرنا اور جہاد کی تمنا دل میں رکھنا برقرار ہے۔ جب
تمہیں جہاد کے لئے طلب کیا جائے تو تم جہاد میں شریک ہو جاؤ۔ (ابن کثیر)

"وھو کرہ لکم": اور وہ ناپسند ہے تمہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وھو کرہ لکم" یہ جملہ اسمیہ ہے، اس کا عطف ہے "کتب علیکم القتال" پر جو جملہ فعلیہ ہے
"وعطف الاسمیۃ علی الفعلیۃ کما نص علیہ" نحویوں نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ جملہ اسمیہ کا عطف
جملہ فعلیہ پر جائز ہے۔

بعض حضرات نے "وھو کرہ لکم" کو جملہ حالیہ بنایا ہے لیکن یہ مناسب نہیں اس لئے کہ "حال مؤکدہ"
واؤ سے نہیں آتا، اور "حال منتقلہ" کا یہاں کوئی فائدہ نہیں۔ (روح المعانی)

"کرہ": میں دو لغتیں ہیں، ایک کاف کے ضمہ سے اور دوسری فتحہ سے۔ دونوں مختلف معانی میں استعمال ہیں،
کسی کام کو باعث مشقت سمجھنا، اور مکروہ سمجھنا، ناپسند کرنا۔

بعض حضرات نے فرق بیان کیا ہے۔" الکرہ (بالضم) المشقۃ والکرہ (بالفتح) ماا کرھت علیہ.
جب کاف پر پیش ہو تو معنی ہوگا، مشقت، اور جب زبر ہو تو معنی ہوگا مکروہ سمجھنا۔ (قرطبی)

اسی طرح جب کاف پر زبر ہو تو معنی ہوگا وہ مشقت جو انسان کو خارج سے حاصل ہو، اور جب پیش ہو تو معنی
ہوگا وہ مشقت جو انسان کو اپنی ذات سے حاصل ہو۔ (روح المعانی)

اعتراض: "کتب علیکم القتال" میں خطاب مومنین کو ہو کہ تم پر اللہ کی راہ میں لڑنا فرض کیا گیا ہے تو اس کے
بعد "وھو کرہ لکم" کہنا کس طرح صحیح کہ "وہ تمہیں ناپسند ہے" اس سے تو یہ پتہ چلا کہ مومنوں کو رب تعالیٰ کا حکم

پسند نہیں آیا، حالانکہ "ان المؤمن لایکون ساخطا لاوامر اللہ وتکالیفہ بل یرضی بذلک ویحبہ" مؤمن کی شان کے لائق تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو خوشی اور رضامندی سے قبول کرتا ہے، ان کو ماننے میں ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا۔

جواب اول : یہاں "کرہ" کا معنی ہے مشقت اگر چہ مکلّف (عاقل وبالغ) کو معلوم بھی ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، لیکن جب وہ کام نفس کو مشکل نظر آئے تو مشقت آمیز کام اسی طرح رہے گا، جبکہ جہاد میں بھی جان اور مال قربان کرنے پڑتے ہیں جو بظاہر مشکل کام ہے تو فرمایا گیا" وهو کره لکم " جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے نفس جہاد کو مشقت آمیز سمجھتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہی پسند نہیں۔

جواب دوم : جہاد کے فرض ہونے سے پہلے لڑائی کرنے کا خوف تھا، کیونکہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اس وجہ سے طبعی طور پر جہاد ناپسند تھا۔ رب تعالیٰ نے پہلے ہی متنبہ کر دیا کہ تم اگر چہ لڑائی کرنے کو ناپسند کرتے تھے، لیکن "ان الذی تکرھونہ من القتال خیر لکم من ترکہ لئلا تکرھونہ بعدان فرض علیکم" وہ چیز جسے تم ناپسند سمجھتے ہو وہ تمہارے لئے بہتر ہے، لہٰذا جہاد کے فرض ہونے کے بعد جہاد کو ناپسند سمجھ کر نہ چھوڑنا۔ یہ سارا کلام پہلے ہے اس کے بعد فرمایا" جہاد تم پر فرض کیا گیا"۔

یعنی اعتراض کا دارومدار لفظی ترتیب پر ہے، اور جواب کا دارومدار معنوی ترتیب پر ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

"وعسی ان تکرھوا شیأ وھو خیر لکم وعسی ان تحبوا شیأ وھو شر لکم"

اور قریب ہے کہ تم شاق سمجھو جس چیز کو وہ تمہارے لئے بہتر ہو۔ اور قریب ہے تم پسند سمجھو کسی چیز کو وہ تمہارے لئے شر (غیر بہتر) ہو۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"عسی" افعال مقاربہ سے، عام طور پر شک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے " عسی ان یخرج " اس کا

نکلنا قریب ہے، یعنی اس کے نکلنے کی امید کی جاسکتی ہے، ہوسکتا ہے وہ نکل جائے۔ البتہ کبھی یقین کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اسی مثال کا یہ معنی بھی آتا ہے کہ اس کے نکلنے کا یقین ہے۔

"عسی" کی نسبت جب بندوں کی طرف کی جائے تو اس وقت معنی "شک" والا ہوتا ہے، اور جب رب تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے تو "یقین" والا معنی ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں جہاں بھی لفظ "عسی" استعمال ہوا وہ یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے، صرف "عسی ربه ان طلقکن الخ" کے وہاں شک کے معنی میں استعمال ہے۔ (از قرطبی و کبیر)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "قریب ہے" یہ مطلق ہے چاہے تو اس کا معنی شک والا کرلیا جائے اور چاہے تو اس کا معنی یقین والا کرلیا جائے، راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔

وضاحت: اکثر اوقات ایک چیز کو وقتی طور پر مشقت والا سمجھا جاتا ہے، لیکن مستقبل میں اس پر منافع مرتب ہوتے ہیں، جیسا کہ کڑوی دوا پینا وقتی طور پر ناپسند سمجھا جاتا ہے، لیکن اس پر صحت حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔ تجارت کی غرض سے سفر کرنا اگرچہ بظاہر مشکل ہوتا ہے اس میں خطرات بھی پائے جاتے ہیں لیکن اس پر نفع حاصل ہونے کی امید ہوتی ہے۔

"وحسن تحمل المشاق فی طلب العلم للفوز بالسعادة العظیمة فی الدنیا والعقبی"

علم دین حاصل کرنے میں اگرچہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے جو بظاہر طبیعت پر ناگوار گزرتی ہے لیکن مستقبل میں اس سے سعادت دنیوی اور اخروی حاصل ہوتی ہے، اس لئے تکلیف اٹھانے پر بہتری کا حصول مرتب ہے۔

اسی طرح جہاد کو چھوڑنا وقتی طور پر مفید نظر آتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو قتل کے خطرات سے بچالیتا ہے اور اپنے مال کو بچالیتا ہے لیکن اس پر عظیم نقصان مرتب ہوتا ہے، کیونکہ جب دشمن کو پتہ چلتا ہے کہ مسلمان جہاد چھوڑ بیٹھے ہیں اور سہل پسند ہو چکے ہیں اور عیاش ہو چکے ہیں، تو وہ حملہ آور ہو جاتے ہیں، مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیتے ہیں، ان کے مال لوٹ کر لے جاتے ہیں، ان کے علاقہ پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کہتا ہے مسلمانوں کی اسی حالت نے فلسطین میں یہودیوں کو ڈیرے جمانے کا موقع عطا کیا ہے اور مسلمانوں کی اسی حالت نے یعنی عیسائیوں سے ڈرنے کی وجہ نے عیسائیوں کو موقعہ ملا کہ وہ سعودیہ میں ڈیرے جما چکے ہیں۔ مسلمانوں کی اسی حالت نے عراق کو تباہ کر دیا، آج عراق پر عیسائی قابض ہیں، عراق کے غدار جرنیل اگر نہ بکتے تو امریکہ کو آسانی سے وہاں قبضہ حاصل نہ ہو سکتا۔

" وهذا صحيح لا غبار عليه كما اتفق في بلا دا لا ندلس تركوا الجهاد وجبنوا عن القتال واكثروا من الفرار، فاستولى العدو على البلاد "

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد روز روشن کی طرح جگمگا رہا ہے۔ جس کی صحت بلا غبار ہے کہ اندلس کے شہروں میں مسلمانوں نے جہاد چھوڑ دیا، بزدلی دکھائی، اور راہ فرار اختیار کی تو دشمن ان کے شہروں پر غالب آ کر قابض ہو گئے۔

کتنے ہی شہروں میں مسلمانوں کا خون بہایا گیا، قید کیا گیا، اور غلامیت کی زندگی بسر کرنے پر مسلمان مجبور ہو گئے۔ "انا لله وانا اليه راجعون " ذلك بما قدمت ايديناو كسبته" یہ سب کچھ مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں ہی اپنی بربادی کی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے آیت کریمہ کا مطلب ان الفاظ سے بیان کیا۔

"لا تكر هوا الملمات الواقعة فلربّ امر تكرهه فيه نجاتك ولرب امر تحبه فيه عطبك "

واقع ہونے والے مصائب کو ناپسند نہ سمجھو، کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جن کو تم نہ پسند سمجھتے ہو وہی تمہاری نجات کا سبب ہیں۔ اور کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جن کو تم پسند کرتے ہو ان میں ہی تمہاری بربادی ہے۔

ابو سعید ضریر نے کہا۔

رب امر تتقيه جرا مرا ترتضيه

خفي المحبوب منه وبدا المكروه فيه

کتنے ہی کاموں کو تو پسند کر کے لاتا ہے۔ کتنے ہی کاموں سے تو بچتا ہے۔

اور مکروہ چیز تجھ پر ظاہر ہوتی ہے۔ محبوب چیز تجھ سے مخفی رہتی ہے۔ (از قرطبی)

جہاد کے فوائد:

جہاد کرنے سے امن حاصل ہوتا ہے، کیونکہ مومن کے جذبہ ایمانی اور جنگی شجاعت کو دیکھ کر کافر کے حملہ کر کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

یہ مقصد عظیم وقتی سلامتی کے نفع سے زیادہ بہتر ہے۔ اور جہاد سے مال غنیمت حاصل ہوتا ہے۔

اور جہاد سے کافر پر غلبہ حاصل ہونے سے مسلمانوں کو بہت زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ تمام فوائد دنیا میں حاصل ہوتے ہیں۔

اخروی اور دینی فوائد کثیر ہیں، ان گنت ہیں، مختصر یہ کہ جہاد اللہ تعالیٰ کے قرب حاصل کرنے کے لئے کیا جائے تو اس پر عظیم ثواب مرتب ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل ہوتی ہے اور اس انسان کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کا یقین ہو جاتا ہے، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "ان اللہ لایضیع اجر المحسنین" بے شک اللہ ضائع نہیں کرتا احسان کرنے والوں کا اجر۔ (از کبیر)

"الشر "السوء، یعنی " شر" کا معنی برائی ہے، اصل اس کا معنی ہے "پھیلانا" کہا جاتا ہے " شررت اللحم و الثوب لیجف" میں نے گوشت اور کپڑے کو پھیلایا تا کہ خشک ہو جائے۔

"الشرر "اللھب لانبساطه، آگ کے شعلے بھی چونکہ پھیل جاتے ہیں، اسی لئے ان کو "الشرر "کہا جاتا ہے۔ "الشرر " انبساط الاشیاء المضارة، نقصان دینے والی چیزوں کا پھیلانا "الشر "(برائی) کہلاتا ہے۔

"واللہ یعلم وانتم لا تعلمون": اور اللہ جانتا اور تم نہیں جانتے۔

اس ارشاد گرامی کا مقصد جہاد کی عظیم ترغیب دینا ہے۔ اس لئے کہ جب انسان یہ اعتقاد رکھے کہ میرا علم

ناقص ہے، میں کوتاہ علم ہوں اور کامل علم اللہ تعالیٰ کا ہے، اس کے علم میں نقص کا تصور کرنا بھی کفر ہے۔ اور انسان کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا حکم دیتا ہے جو بہتر ہو اور ان میں مصلحت پائی جائے۔

" علم قطعاان الذی امرہ اللہ تعالیٰ بہ وجب علیہ امتثالہ سواء کان مکروھا للطبع اولم یکن "

تو یقینی طور پر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرنا واجب ہے، وہ انسان ان کاموں میں حکمت سمجھ کر ان پر عمل کرتا ہے خواہ اس کی طبیعت پر ناگوار گذریں یا ناگوار نہ سمجھے۔

گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے۔

" یا ایھا العبد اعلم ان علمی اکمل من علمک فکن مشتغلا بطاعتی ولا تلتفت الی مقتضی طبعک "

اے بندے میرا علم تیرے علم سے زیادہ کامل ہے، تو میری طاعت میں مشغول ہو جا، اپنی طبیعت کے مطابق کام نہ کر۔ (کبیر)

ذوالنون مصری رحمہ اللہ کا ارشاد:

آپ فرماتے ہیں کہ مخلوق میں چھ چیزوں کی وجہ سے فساد پایا جاتا ہے۔

(۱) آخرت کے عمل میں اس کے ارادہ میں کمی پائی جائے، یعنی عبادات و جہاد کا مشکل سمجھ کر روگردانی کرنا۔

(۲) انسان خواہشات نفسانیہ میں مبتلاء ہو کر رہ جائے۔

(۳) لمبی لمبی امیدیں رکھنا باوجود اس کے کہ اس کی موت کا وقت قریب ہو۔

(۴) رب تعالیٰ کی رضاء پر مخلوق کی رضا، کو ترجیح دینا، یعنی یہ خیال کرنا کہ حاکم راضی رہے، سردار راضی رہے، چوہدری راضی رہے، خدا ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے، آجکل اسی چیز نے اسلامی ممالک کو اور اسلامی اداروں کو تباہ کر رکھا ہے، خوشامدی لوگوں نے ہر شعبہ زندگی کو برباد کر رکھا ہے۔

(۵) خواہشات کی تابعداری کرنا اور نبی کریم ﷺ کی سنت کو پس پشت ڈال دینا۔ یعنی اس کی پرواہ نہ کرنا کہ نبی کریم ﷺ نے کیا فرمایا ہے، بلکہ اپنے مفادات کو حاصل کی کوشش میں رہنا۔

(۶) " جعلو اقلیل زلات السلف حجة انفسھم و دفنوا کثیر مناقبھم "

سلف صالحین کی معمولی لغزش کو اپنے افعال پر دلیل بنالینا اور ان کے کثیر قابل تعریف کاموں کو دفن کر دینا۔

حقیقت میں سب سے زیادہ نقصان اسی میں ہے کہ کسی بزرگ کی لغزش کو اپنے لئے دلیل بنالیا جائے کہ فلاں بزرگ نے بھی وہی کام کیا تھا نہیں نہیں یہ کوئی طریقہ نہیں، راہ راست یہ ہے کہ بزرگ کے کام کو سنت کے مطابق پرکھنا ہوگا۔ اگر سنت کے مطابق ہے تو بہتر، اگر سنت کے خلاف ہے تو اسے چھوڑ دینا ہوگا۔ کیونکہ مشائخ سنت کے تابع ہیں۔ سنت مشائخ کے تابع نہیں۔ (روح البیان مع وضاحت)

عقلمند کو چاہئے:

"فعلی العاقل ان یجاھد مع النفس والطبیعة لیرتفع الھوی والشھوات والبدعة ویتمکن فی القلوب حب العمل بالکتاب والسنة "

عقلمند شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس اور اپنی طبیعت سے جہاد کرے تاکہ اس کی تمنا اور خواہشات اور بدعات اس سے دور ہو سکیں، اور اس کے دل میں قرآن اور حدیث کے مطابق عمل کرنے کی محبت جاگزیں ہو سکے۔ (روح البیان)

ابراہیم خواص رحمہ اللہ کا ارشاد:

آپ فرماتے ہیں میرا ایک جگہ سے گذر ہوا تو میں نے وہاں انار دیکھے، ایک انار میں نے لے لیا، اسے توڑا وہ ترش نکلا، میں نے اسے پھینک دیا۔

آگے چلا تو ایک شخص کو دیکھا جو زمین پر پراگندہ حال (پریشان حال) ہے، اس پر بھڑ جمع ہیں، میں نے کہا"

السلام علیکم "اس نے کہا" وعلیکم السلام یا ابراھیم "اے ابرہیم تم پر بھی سلام ہو۔

میں نے اسے کہا،تم نے مجھے کیسے پہچانا ہے؟اس نے کہا" من عرف الله لایخفی علیه شی" جوشخص اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ پھر میں نے اسے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل ہے۔اگرتم اس سے سوال کروکہ وہ تمہیں بھڑ کی اذیت (تکلیف) سے بچالےتو یہ تمہارے لیا اچھا ہوگا۔

اس شخص نے کہا، میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے،تم اگررب تعالیٰ کے حضور عرض کرو کہ وہ تمہیں انار کی خواہش سے بچالےتو تمہارے لئے بہتر ہے۔

" فلدغ الرمان یجدالانسان المه فی الآخرة ولدغ الزنابیر یجدالمه فی الدنیا "

انار کا ڈسا ہوا شخص آخرت میں درد محسوس کرے گا، کیونکہ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ جنگل میں پائے جانے والے اناروں کا کوئی مالک بھی ہے یا نہیں کہ مالک سے اجازت لے لی جائے، پھر خواہش نفسانی کے مطابق وہ شخص چل رہا ہے۔

لیکن بھڑ کا ڈسا ہوا شخص تو صرف دنیا میں محسوس کرے گا،آخرت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے محفوظ رہے گا۔

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ نفس سے جہاد کرنا جہاد اکبر ہے۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

مبر طاعت نفس شہوت پرست   کہ ہر ساعتش قبلہ دیگر ست

کند مرد را نفس امارہ خوار   اگر ہوشمندی عزیزش مدار

نفس شہوت پرست کی فرمانبرداری نہ کر۔ کہ ہر گھڑی اس کا قبلہ دوسرا ہے۔

مرد حق نفس امارہ کو ذلیل رکھتا ہے۔ اگر تو عقلمند ہے تو اسے عزیز نہ رکھ۔ (روح البیان)

روحِ جہاد:

تاویلات قاشانیہ میں ہے کہ نفس اور شیطان سے جہاد کرنا بھی فرض کیا گیا ہے اور حقیقت میں جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے وجود مجازی کو درمیان سے ہٹا دے، فناء فی اللہ کے درجہ میں آ جائے، کیونکہ انسان کا وجود اس کے اور رب تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

"وجودک ذنب لا یقاس علیه ذنب آخر"

تمہارا اپنا وجود ایسا گناہ ہے کہ اس پر کوئی اور گناہ قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

ابن منصور نے کہا۔

بینی وبینک انی قد یزاحمنی

فارفع بجودک لی انی من البین

اے اللہ میرے اور تیرے درمیان بے شک میرا وجود ہی مزاحم ہے۔

تو اپنی مہربانی سے میرے وجود کو درمیان سے ہٹا دے۔

یعنی روحِ جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے اور رب تعالیٰ کے درمیان دوئی کو مٹا دے، رب تعالیٰ کی تجلیات میں اپنے آپ کو گم کر لے، یہی نفس سے جہاد ہے، جو عظیم جہاد ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

☆☆☆☆☆

يَسْـئَـلُوْنَکَ عَـنِ الشَّهْـرِ الْـحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَـدٌّعَنْ سَبِيْلِ اللهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِالْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِـنْـهُ اَكْبَرُ عِنْدَاللهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُمِنَ الْقَتْلِ وَلَايَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰـى يَـرُدُّوْكُـمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْاوَمَنْ يَّرْتَدِدْمِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَكَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ النَّارِهُمْ فِيْهَاخَالِدُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۷)

﴿۱﴾

تم سے پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنے کا حکم تم فرماؤ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس پر ایمان نہ لانا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے بسنے والوں کو نکال دینا اللہ کے نزدیک یہ گناہ اس سے بھی بڑے ہیں، اور ان کا فساد قتل سے سخت تر ہے اور ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر بن پڑے اور تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے پھر کافر ہو کر مرے تو ان لوگوں کا کیا اکارت گیا دنیا میں اور آخرت میں اور وہ دوزخ والے ہیں انہیں اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔

﴿۲﴾

سوال کرتے ہیں آپ سے عزت والے مہینے کے متعلق لڑنا اس میں (کیسا ہے) تم فرمادو لڑنا اس میں بڑا (گناہ) ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے، اور کفر کرنا اس کے ساتھ، اور (روکنا) مسجد حرام سے، اور نکالنا اس کے باشندوں کو اس سے بڑا (گناہ)

ہے اللہ کے ہاں، اور فتنہ بڑا (گناہ) ہے قتل سے، اور ہمیشہ لڑتے رہیں کہ تم سے یہاں تک کہ وہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر وہ طاقت رکھیں، اور جو شخص پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے پھر مرا حالت کفر میں تو ان لوگوں کے ضائع ہو گئے عمل دنیا میں اور آخرت میں، اور وہ لوگ جہنم والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

جن احکام کا ذکر کیا جا رہا ہے ان میں سے یہ تیسرا حکم ہے۔ دو کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

شانِ نزول:

اس آیۃ کریمہ کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر سے دو ماہ پہلے اپنے پھوپھی زاد حضرت عبداللہ بن جحش کی زیر قیادت ایک چھوٹا سا لشکر روانہ فرمایا، جو صرف آٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر جمادی الاخری میں بھیجا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو ایک بند خط دیا، اور ارشاد فرمایا کہ خط کو نہ کھولنا، بلکہ دو دن تک چلتے رہنا، پھر خط کو کھول کر پڑھنا، اور اپنے ساتھیوں کو بھی سنانا، پھر جس چیز کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا، اور ساتھیوں کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرنا، جو خوشی سے چلے اسے ساتھ لینا، انہوں نے دو دن چلنے کے بعد خط کھولا اس میں لکھا ہوا تھا۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم اما بعد فسر علی برکۃ اللہ تعالی بمن معک من اصحابک حتی تنزل بطن نخلۃ فارصد بھا عیر القریش لعلک تا تینا منھا بخیر"

اللہ کے نام سے شروع جو رحمٰن و رحیم ہے، اس کے بعد (آپ کو حکم دیا جاتا ہے) تم اللہ تعالیٰ کی برکت سے چلو تمہارے ساتھی بھی جو تمہارے ساتھ چلنا چاہیں چلیں، یہاں تک کہ وادی بطن نخلہ میں پہنچ جاؤ، وہاں کفار کے ایک قافلہ کی انتظار کرنا، ہوسکتا ہے کہ تم ہمارے پاس کوئی بہتر خبر لے آؤ۔

آپ نے خط کھولا تو کہا "سمعاً و طاعۃً" نبی کریم ﷺ کا ارشاد دل و جان سے قبول ہے۔

پھر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا نبی کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں مجبور کر کے اپنے ساتھ نہ

لے جاؤں۔ جو شخص شہادت کو پسند کرتا ہے وہ میرے ساتھ چلے، اور جو شخص شہادت کو ناپسند کرتا ہے وہ میرے ساتھ نہ چلے، آپ یہ کہہ کر چل پڑے، آپ کے ساتھ تمام ساتھی خوشی سے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق چلے، جب یہ حضرات نجران میں پہنچے تو سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کے اونٹ گم ہو گئے، وہ ان کی تلاش میں نکلے، تو عبداللہ بن جحش اپنے باقی ساتھیوں کو ساتھ لے کر مکہ اور طائف کے درمیان وادی بطن نخلہ میں پہنچ گئے، وہاں سے جب قریش کا قافلہ گزرا جن کے پاس سامان تجارت بھی تھا۔

اس قافلہ میں عمرو بن حضرمی اور حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی اور نوفل بن عبداللہ مخزومی تھے، جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو دیکھا تو ڈر گئے۔

عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو کہا، یہ لوگ تم سے ڈر گئے ہیں (کہیں ڈر کی وجہ سے تم پر اچانک حملہ کر کے تمہیں نقصان نہ پہنچائیں) اس لئے تم میں سے ایک شخص اپنا سر منڈا کر ان کے سامنے ہوتا کہ وہ یہ سمجھیں کہ یہ عمرہ سے واپس آ رہے ہیں، اس طرح وہ تمہیں نقصان پہنچانے سے باز رہیں گے۔

صحابہ کرام نے اپنے ہی ایک ساتھی عکاشہ بن محصن کا سر مونڈ دیا، پھر یہ کافروں کے سامنے سر ننگا کئے ہوئے گئے، تو وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے، ان سے ہمیں کوئی خوف نہیں، کیونکہ یہ تو عمرہ کر کے واپس آ رہے ہیں۔

"وکان ذلک فی آخر یوم من جمادی الآخرۃ وکانوا یرون انہ رجب"

وہ دن جمادی الاخری کی آخری تاریخ تھی، البتہ کفار اس دن کو رجب کی پہلی تاریخ کہہ رہے تھے۔

ادھر حضرت عبداللہ بن جحش نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ آج اگر ان کو قتل نہیں کیا جائے گا، تو کل رجب کی پہلی تاریخ آ جائے گی اور یہ لوگ حرم میں داخل ہو جائیں گے، تو ان کو قتل کرنا مشکل ہو جائے گا۔

سب حضرات نے اس پر اتفاق کیا کہ ان پر ہمیں حملہ کر دینا چاہئے، اس طرح ایک صحابی واقد بن عبداللہ سہمی نے تیر چلا کر ایک کافر عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا۔ یہ مشرکوں کا مسلمانوں کی طرف سے پہلا قتل تھا۔

اور دو کافروں یعنی حکم بن کیسان اور عثمان کو قیدی بنالیا گیا۔ اسلام میں یہی پہلے قیدی تھے۔

صحابہ کرام قیدیوں کو اوران کا سامان ساتھ لئے مدینہ طیبہ میں آ گئے۔

ادھر کافروں نے یہ شور مچانا شروع کر دیا کہ محمد (ﷺ) نے عزت والے مہینہ میں لڑائی کرنا اور قتل کرنا حلال سمجھ لیا ہے، حالانکہ اس مہینہ میں قتال حرام ہے۔ ہمارے آدمیوں کو قیدی بنالیا گیا اور مال لوٹ لیا گیا۔ اور مکہ مکرمہ میں جو مسلمان رہ گئے تھے، ہجرت نہیں کر سکتے تھے، ان کو کافر عار دلاتے تھے، اور یہ کہتے تھے۔

"یا معشر الصلوۃ استحللتم الشهر الحرام وقاتلتم فيه"

اے نمازیو! تم نے حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنا حلال سمجھ لیا، اس مہینے کی عزت کے منافی کام کئے۔

نبی کریم ﷺ کو جب پتہ چلا تو آپ نے فرمایا اے عبداللہ بن جحش میں نے تمہیں یہ تو نہیں کہا تھا کہ حرمت والے مہینہ میں تم نے لڑائی کرنی ہے، کچھ دیر کے لئے نبی کریم ﷺ نے قیدی اور مال وصول کرنے میں توقف اختیار کیا۔

مسلمانوں نے بھی لشکر والوں پر کچھ سخت الفاظ استعمال کئے، سختی کے انداز میں یہ کہا "لم صنعتم ما لم تؤمروا بـه" تم نے یہ کام کیوں کیا جس کا تمہیں حکم نہیں دیا گیا تھا، یہ سن کر لشکر والے حضرات کافی پریشان ہو گئے کہ شاید ہمارے عمل برباد نہ ہو جائیں۔

"وقالوا يا رسول الله اناقتلنا ابن الخضرمي ثم امسينا فنظرنا هلال رجب فلا ندرى افي رجب اصبناه ام في جمادى واكثر الناس في ذلك"

انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے ابن خضرمی کو قتل کیا، شام بعد میں ہوئی، پھر بھی ہمیں رجب کا چاند نظر نہ آیا، لہٰذا ہمیں معلوم نہیں کہ ہم نے اسے رجب میں قتل کیا ہے یا جمادی میں۔ (اکثر حضرات نے یہی وضاحت کی ہے)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی تائید میں اور کفار کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی۔

کہ اے محبوب یہ لوگ آپ سے شہر حرام (حرمت والے مہینے) میں لڑائی کرنے کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس مہینے میں جنگ کرنا گناہ ہے کہ نہیں؟ آپ فرما دیجئے کہ ہاں اس میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے، لیکن اے محبوب آپ ان لوگوں کے کرتوتوں کو بھی دیکھو، اللہ کی راہ سے آپ کو اور مسلمانوں کو یہ روکتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے کفر یہ کرتے ہیں۔ اور

مسجد حرام سے یہ روکتے ہیں، حرم کے باشندوں کو وہاں سے یہ نکالتے ہیں، ان لوگوں کے یہ جرائم اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا گناہ ہے، پھر ان لوگوں کو یہ تمام کام اور مسلمانوں کو تکالیف پہنچانا فتنہ ہے، اور فتنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حرمت والے مہینے میں کفار کو قتل کرنے سے بھی شدید اور عظیم جرم ہے، اور پھر یہ کفار اے محبوب اور مومنین تم سے اس وقت تک لڑائی کرنے کی کوشش میں رہیں گے کہ ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں یعنی وہ اپنے باطل گمان کے مطابق تمہیں دین سے پھیر دینے تک لڑائی جاری رکھیں گے، ہاں یہ بھی سن لو کہ جو شخص ان کے کہنے پر دین سے پھر گیا، مرتد ہو گیا، اور اس کی موت کفر پر آ گئی، یعنی اس نے پھر توبہ نہ کی اور مسلمان نہ ہوا تو اس کے عمل دین و دنیا میں برباد ہو کر رہ جائیں گے، وہ لوگ جہنم والے ہوں گے اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ (ماخوذ از خازن)

تنبیہ : خازن کی دو عبارتوں کی طرف ذرا پھر سے غور کریں۔

" وكان ذلك في آخر يوم من جمادى الآخرة وكانوا يرون انه من رجب "

جس دن ابن حضرمی کو قتل کیا گیا وہ جمادی الاخری کی آخری تاریخ تھی ، جسے کفار رجب کی پہلی تاریخ سمجھ رہے تھے۔

" وقالوا يارسول الله اناقتلنا ابن الحضرمي ثم امسينا فنظرنا هلال رجب فلا ندري افي رجب اصبناه ام في جمادى "

اور لشکر والے حضرات نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے ابن حضرمی کو قتل کیا، شام اس کے بعد ہوئی ،

"ثم" کا لفظ تراخی پر دلالت کر رہا ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ قتل جمادی الاخری کے آخری دن کیا گیا اور شام بعد میں ہوئی پھر " فاء" بھی تراخی بلا مھلۃ پر دلالت کر رہی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شام ہونے کے بعد ہم نے رجب کا چاند دیکھ لیا، اب ہمیں تو معلوم نہیں کہ ہم نے جمادی الاخری میں قتل کیا ہے یا رجب میں؟

یہ کام تجاہل عارفانہ کے طور پر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو جمادی الاخری میں قتل کیا ہے، کفار اس کو رجب کہہ رہے ہیں۔

راقم کو بھی خازن کی تحقیق سے ہی اتفاق ہے۔ آیۃ کریمہ کا مفہوم واضح ہے کہ آپ سے عزت والے مہینہ میں

لڑائی کرنے کا حکم پوچھتے ہیں آپ وہ ان کو بتادیں، ان کے کرتوتوں کے متعلق بھی بتادیں کہ وہ کتنے بڑے جرم ہیں۔
لیکن آیۃ کریمہ میں یہ ذکر نہیں کہ صحابہ کرام کا کافر کو قتل کرنا یا دوسرے کافروں کو قیدی بنانا اور ان کا مال چھیننا حرمت والے مہینہ میں واقع ہوا۔

اس سے تو یہ پتہ چلا کہ مقصد بیان یہ ہے کہ اگر حرمت والے مہینہ میں قتل کیا جاتا تو پھر بھی تمہارے فتنہ کو ختم کرنے کے لئے جائز ہوتا، اگرچہ بغیر فتنہ کے وہ بڑا گناہ ہوتا، لیکن صحابہ کرام نے تو حرمت والے مہینہ میں قتل ہی نہیں کیا۔

بعض مفسرین کرام نے کہا:

بعض تفاسیر میں اس طرح ذکر ہے کہ یہ قتل رات کو ہوا، صحابہ کرام کو پتہ نہ چل سکا کہ رجب کا چاند نظر آگیا ہے، جبکہ واقع میں چاند نظر آچکا تھا۔ " واللہ اعلم بالصواب "

آیۃ کریمہ کے نزول کے بعد:

نبی کریم ﷺ نے قیدیوں کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا اور لائے ہوئے سامان سے خمس وصول فرمایا، اسلام میں یہ سب سے پہلا خمس تھا، باقی مال لشکر والوں پر بطورِ مالِ غنیمت کے تقسیم کردیا۔ اسلام میں یہ پہلا مالِ غنیمت تھا۔

قیدیوں کا معاملہ:

کفار نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لئے فدیہ بھیجا، لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر قیدیوں کو چھڑانا ہے تو ہمارے پاس سعد اور عقبہ کو بھیجو، اگر وہ نہ آئے تو ہم ان کو قتل کردیں گے۔
جب وہ دونوں آئے تو قیدیوں کو ان کے ساتھ بھیجنے کے متعلق حکم فرمایا، لیکن حکم بن کیسان نے اسلام قبول کرلیا، ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا اور نبی کریم ﷺ کے پاس رہنے کا فیصلہ کرلیا۔
لیکن عثمان بن عبداللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں چلا گیا، اور وہیں حالت کفر میں فوت ہوگیا۔

نوفل جو قید ہونے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا، یہ غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے مخالف کفار کے ساتھ تھا، کیونکہ خود بھی کافر تھا، اس نے اپنے گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لئے ایڑی لگائی تا کہ خندق سے پار ہو جائے لیکن یہ اپنے گھوڑے سمیت خندق میں گر کر مر گیا۔ کافروں نے پیسے دے کر اس کی لاش کو حاصل کرنے کی کوشش کی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "خذوہ فانہ خبیث الجیفۃ خبیث الدیۃ" اس کی لاش لے لو بے شک یہ خبیث مردار ہے اور اس کی دیت بھی ناپاک ہے۔ (لہٰذا ہمیں ناپاک چیز کے لینے کی کوئی غرض نہیں)۔

سوال کس نے کیا؟

حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنے کا کیا حکم ہے؟ یہ سوال کس نے کیا مسلمانوں نے یا کفار نے؟

اصل میں سوال کافروں نے ہی کیا تھا، اس واقع کے بعد تمام ذکر کفار کا ہی آ رہا ہے، جو ان کو جواب دیا گیا ہے۔ لیکن کفار کی باتوں کے بعد مسلمانوں نے بھی پریشان ہو کر سوال کر لیا تھا کہ حرمت والے مہینوں میں لڑائی کا حکم کیا ہے تو، جب جواب دیا گیا تو کفار کا جواب بھی آ گیا اور مسلمانوں کی پریشانی کا اندفاع ہو گیا۔

اس لئے مندرجہ ذیل روایت سے اس غلطی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ سوال کفار نے نہیں کیا تھا، صرف مسلمانوں نے ہی کیا تھا۔

☆ "عن سعیدبن جبیر عن ابن عباس انہ قال ما رأیت قوما کانوا خیرا من اصحاب رسول اللہ ما سألوہ الا عن ثلاث عشرۃ مسألۃ حتی قبض کلھن فی القرآن (منھا "یسئلونک عن الشھر الحرام)"

حضرت سعید بن جبیر کہتے ہیں حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کے صحابہ کرام سے بہتر کسی قوم کو نہیں دیکھا، کیونکہ انہوں نے ہی تو آپ کے وصال سے پہلے تیرہ مسئلے پوچھے۔

یعنی صحابہ کرام کا مسلمانوں پر عظیم احسان ہے کہ انہوں نے تیرہ مسائل پوچھے جو تمام "یسئلونک" سے شروع ہو رہے ہیں۔ ان میں ہی "یسئلونک عن الشھر الحرام" بھی ہے۔

یہ روایت بھی اپنی جگہ درست ہے، کیونکہ کفار کے سوال کے بعد اوران کے شوروغل کے بعد مسلمانوں نے بھی پوچھ لیا تھا، آیۃ کریمہ بعد میں نازل ہوئی۔لہٰذا جواب کفار اور مسلمانوں کے سوال کا مشترک تھا۔

" الشھر الحرام " حرمت والامہینہ، یہاں سے مراد رجب ہے، البتہ کل حرمت والے مہینے چار ہیں۔ رجب، شوال، ذیقعد، ذی الحج۔

حرمت والے مہینوں میں لڑائی کا حکم اب کیا ہے؟

اگر چہ تفصیل پہلے ذکر کر دی گئی " وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم الخ " کی وضاحت کے ضمن میں دیکھیں۔تاہم مختصر حکم یہ ہے کہ ابتداء میں حرمت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کی مطلقاً ممانعت تھی، پھر " واقتلوھم حیث ثقفتموھم " سے پہلا حکم منسوخ کر دیا گیا اور حرمت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ البتہ اگر اشد ضرورت درپیش نہ آئے اور ان مہینوں میں کسی وجہ سے لڑائی ٹل سکے تو لڑائی نہ کرنا بہتر ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" قل قتال فیه کبیر " میں " قتال " مبتداء ہے، اور " کبیر " خبر ہے۔اگر چہ " قتال " نکرہ ہے لیکن " فیه " کے ذریعے اس کی تخصیص کر دی گئی، اس لئے مبتداء بنانا صحیح ہے۔" کبیر " کا معنی " عظیم مستنکر " ہے، بہت قبیح یعنی بہت برا، اسی وجہ سے بڑے گناہ کو " کبیر ۃ " کہا جاتا ہے۔

اور نکتہ کی طرف طلباء کرام توجہ فرمائیں:

نکرہ کا جب تکرار آئے تو پہلے نکرہ سے مراد حکم ہوتا ہے اور دوسرے سے مراد اور ہوتا ہے۔اور معرفہ کا تکرار ہو تو دونوں کا حکم ایک ہوتا ہے۔اسی لئے "فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا " کا مطلب یہ ہے کہ ایک مشکل میں دو آسانیاں ہوتی ہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں سوال میں بھی " قتــال " نکرہ ہےاور جواب میں بھی نکرہ ہے، دونوں میں فرق یہ ہے کہ سوال عبداللہ بن جحش اور آپ کے ساتھیوں کا ابن حضرمی کو قتل کرنے کے متعلق تھا، جس میں ذکر "قتــال "نکرہ ہے، اور جواب میں ارشاد ہوا۔

"(قـل قتـال فيـه كبيـر) " وفيه تنبيه على ان القتال الذى يكو ن كبير ليس هوهذا القتال الـكبيـر الـذى سـألـتـم عـنـه بل هوقتال آخرلان هذاالقتال كان ا لغرض به نصرة الاسلام واذلال الـكـفر فكيف يكو ن هذا من الكبائر انماالقتال الكبير هو الذى يكون لغرض فيه هدم الاسلام وتقوية الكفر، فكان اختيار التنكير فى اللفظين لأجل هذه الدقيقة "

اس میں بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ حرمت والے مہینے میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے' لیکن وہ قتال بڑا گناہ نہیں جس کے متعلق تم نے سوال کیا ہے بلکہ وہ اور قتال ہے، کیونکہ جو قتل عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں نے کیا ہے وہ تو اسلام کی امداد کے لئے تھا اور کافروں کو ذلیل کرنا مقصود تھا' وہ کس طرح بڑا گناہ ہوسکتا ہے؟ بڑا گناہ تو اس قتال (لڑائی) میں ہوتا ہے جس میں اسلام کی بنیادوں کو کمزور کرنا ہوتا ہے اور کفر کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے۔ اس بیان کے بعد واضح ہو گیا کے دو جگہ پر " قتال "کو نکرہ ذکر کرنے میں یہی باریک نکتہ ہے۔

اور اگر ایک مرتبہ خازن کی وضاحت جو راقم نے نقل کی ہے اس پر پھر نظر کریں تو " قتــال "کو دو مرتبہ نکرہ ذکر کرنے سے ایک اور عجیب چاشنی پائیں گے۔

"فسبحـا ن مـن له تـحت كل كلمة من كلمات هذا الكتاب سر لطيف لايهتدى اليه الا اولوالا الباب "

وہ ذات پاک جس نے اس کتاب کے ہر کلمہ میں لطیف راز رکھا ہے، اس کی طرف سوائے عقل والوں کے کوئی راہنمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وصد عن سبیل اللہ و کفر بہ والمسجد الحرام" اس مقام میں "المسجد الحرام" کا عطف ہے "سبیل اللہ" پر، لھذا معنوی طور پر عبارت یہ ہوگی "وصد عن المسجد الحرام" اب معنی مکمل یہ ہوگئے، اور روکنا اللہ کی راہ سے، اور کفر کرنا اس کے ساتھ، اور روکنا مسجد حرام سے۔

اللہ کی راہ سے روکنے کا مطلب؟

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں، تمام کو یہ آیۃ کریمہ شامل ہے۔

(۱) ایک وجہ یہ پائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایمان لانے سے منع فرماتے تھے۔

(۲) مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرنے سے وہ روکتے تھے، یہ دوسری وجہ ہے۔

(۳) اور اس میں تیسری وجہ یہ پائی گئی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو حدیبیہ میں عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔

اس تیسری وجہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ عبداللہ بن جحش کا واقعہ غزوۂ بدر سے بھی پہلے کا ہے اور حدیبیہ کا واقعہ بہت بعد میں ہجرت کے چھٹے سال در پیش آیا۔ تو کس طرح یہ آیۃ کریمہ اسے شامل ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے۔ "ما کان فی معلوم اللہ تعالیٰ کان کالواقع"

اللہ تعالیٰ کے علم میں جب حدیبیہ کا واقع بھی تھا تو وہ اس کے نزدیک ایسا ہی تھا جیسا کہ واقع ہو چکا ہے۔

"وکفربہ": اگرچہ بظاہر معنی تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا، کیونکہ ضمیر لفظ اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے، البتہ اللہ سے کفر کرنے والا رسولوں سے بھی کفر کرتا ہے، اور عبادت اور قیامت وغیرہ سے بھی کفر کرتا ہے۔ اس لئے "وکفربہ" مختصر الفاظ وسیع مضمون کو شامل ہیں۔

تنبیہ: "والمسجد الحرام" کا تعلق "کفر" سے بھی ہوسکتا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا مسجد حرام سے کفر کرنا،

یعنی وہ لوگ مسلمانوں کو مسجد حرام سے نماز ادا کرنے سے روکتے تھے اور بیت اللہ شریف کا طواف کرنے سے روکتے تھے، جسے وہ اپنا حق سمجھتے اور جائز سمجھتے تھے، جو باعث کفر تھا۔

"واخراج اهله منه": اور اس کے اہل کو اس سے نکالنا۔

یعنی کفار کا اور عظیم جرم یہ تھا کہ مسجد حرام کے باشندوں کو مسجد حرام سے نکال دیتے تھے، بلکہ شہر حرم مکہ مکرمہ سے مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔

"اکبر عندالله": بہت بڑا گناہ ہے اللہ کے ہاں۔

ان الفاظ مبارکہ کا تعلق ان کے تمام جرائم سے ہے، یعنی اللہ کی راہ سے روکنا، حرمت والے مہینے میں لڑائی کرنے سے بڑا گناہ ہے۔ اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنے سے بڑا گناہ ہے۔ اور مسجد حرام سے روکنا اور مسجد حرام سے کفر کرنا حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنے سے بڑا گناہ ہے۔ (از کبیر)

"والفتنة اکبر من القتل": اور فتنہ بڑا گناہ ہے قتل سے۔

"ان الفتنة عن الدین تفضی الی القتل الکثیر فی الدنیا والی استحقاق العذاب الدائم فی الآخرة فصح ان الفتنة اکبر من القتل"

بے شک دین میں فتنہ دنیا میں کثیر قتل کی طرف پہنچاتا ہے۔ اور آخرت میں دائمی عذاب کا مستحق بناتا ہے۔ لہٰذا واضح ہوا کہ فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔

آج ہم اپنے ملک پاکستان میں فتنہ کو دیکھتے ہیں تو سمجھ آتا ہے کہ شائد اس فتنہ کا اصل سبب علماء ہیں؟ لیکن یہ غلط ہے، علماء کے اختلافات قتل و غارت تک نہیں پہنچاتے، اس کی اصل وجہ وقت کے حکام اور ان کے پیچھے کڑ چھے ہیں، جو پیسہ دے کر جہلاء کو خرید کر فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں، بظاہر وہ مولوی نظر آتے ہیں۔ عالم دین بک جائے یہ ممکن نہیں۔ بکنے والے جھکنے والے علماء نہیں جہلاء ہیں۔

”ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا“

اور وہ ہمیشہ لڑیں گے تمہارے ساتھ یہاں تک تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر وہ طاقت رکھیں۔

یہ کلام فرض کے طور پر ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا۔

”قل ان کان للرحمن ولد فانا اول العابدین“

فرمادو اگر رحمٰن کی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں اس کی عبادت کرنے والا ہوتا۔

یعنی اس کی کوئی اولاد نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے، اگر فرض کیا جاتا کہ اس کی اولاد ہوتی وہ مستحق عبادت ہوتی۔

اسی طرح یہاں مطلب یہ ہے کہ وہ کافر اپنے باطل خیال میں تو یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ لڑائی جاری رکھیں تاکہ تمہیں دین سے پھیر لیں، لیکن یہ اسی وقت ہوتا جب ان کو طاقت ہوتی۔ ان کو تو اس کی طاقت ہی نہیں کہ تمہیں لڑائی کر کے دین سے پھیر دیں۔

آج بھی کافر اور کافروں کے ہمنوا یہی چاہتے ہیں کہ دینداروں سے لڑائی کر کے اور ان کو قتل کر کے لوگوں کو دین سے پھیر دیں، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جتنا انہوں نے مساجد میں قتل عام کیا اتنا ہی نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

ان شاء اللہ غدار مسلمان اپنے آقاؤں کی طرح ذلیل ہوتے رہیں گے، اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کا ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔

”ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والآخرۃ واولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون“

اور جو شخص پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے، پھر مرا حالت کفر میں تو ان لوگوں کے ضائع ہو گئے عمل دنیا اور آخرت میں اور وہ لوگ جہنم والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

جب پہلے ذکر فرمایا کہ کافروں کا مسلمانوں سے لڑائی کرنا صرف اس لئے ہے کہ وہ مسلمان کو دین سے پھیر

دیں۔اور ضمناً یہ بھی بیان کیا گیا کہ وہ کامل مسلمانوں کو دین سے نہیں پھیر سکیں گے۔اب بیان کیا جارہا ہے کہ اگر وہ ضعیف اعتقاد والے مسلمانوں کو ڈرانے یا لالچ دینے کی وجہ سے دین سے پھیر لیں ،تو جو شخص مرتد ہو گیا اس کے اعمال دین و دنیا میں برباد ہو جائیں گے ،اور وہ لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے اور اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تنبیہ : ایمان اور کفر کی دارومدار وقت وفات پر ہے۔

"الایمان لایکون ایمانا الا اذ امات المومن علیه والکفر لایکون کفرا الا اذ امات الکافر علیه"

ایمان اس وقت تک ایمان نہیں ہو گا جب تک کہ مومن کی موت ایمان پر نہ آئے۔اور کفر اس وقت تک کفر نہیں ہو گا جب تک کافر کی موت کفر پر نہ آئے۔

یعنی اگر کوئی شخص مومن تھا لیکن "العیاذ باللہ" وہ کافر ہو گیا اور توبہ کر کے دوبارہ اسلام میں داخل نہیں ہوا، حالت کفر میں وہ مر گیا تو اس کے اعمال برباد ہو گئے ،ایمان رائیگاں (ضائع) ہو گیا۔اسی طرح ایک شخص کافر تھا ،لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور توفیق سے اسے ایمان حاصل ہو گیا ،اور وہ حالت ایمان میں ہی فوت ہو گیا تو " ان الایمان یھدم ماقبله "(بے شک ایمان پہلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے) کا مصداق بن گیا۔

مختصر مطلب یہ ہے کہ انسان کے ایمان و نجات اور کفر و عذاب کی دارومدار خاتمہ پر ہے۔جس حال میں مرے گا ،اسی حال والے احکام بھی مرتب ہوں گے۔

اعتراض:

جب ایک شخص کتنا عرصہ مومن رہا تو وہ ایمان اور اس کے اعمال ضائع کیسے ہو گئے؟

جواب:

"فذلک الایمان السابق وان کنا نظنه ایمانا الا انه ما کان عندالله ایمانا فظهر ان الموافاة شرط لکون الایمان ایمانا والکفر کفرا"

اس کا ایمان جسے ہم ایمان سمجھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہی نہیں تھا اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی ایمان مقبول ہے جب اسی ایمان پر خاتمہ ہو، اسی طرح وہی کفر اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اور اسی کفر پر دائمی عذاب مرتب ہوتا ہے جس پر موت آجائے، اگر ساری عمر کفر کرتا رہا موت ایمان پر آگئی تو وہ کفر مٹ گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دارومدار خاتمہ پر ہے۔

مسئلہ:

اگر کوئی شخص (العیاذ باللہ) مرتد ہوگیا، اسے قید کرلیا جائے اور اس کے شبہات کو زائل کیا جائے، اگر وہ تین دنوں تک توبہ کرلے اور پھر اسلام قبول کرلے تو بہتر، ورنہ اسے قتل کرلیا جائے۔ اگر عورت مرتد ہوجائے تو اسے قید کرلیا جائے جب تک وہ توبہ کرکے اسلام قبول نہ کرلے، اس وقت تک اسے قید میں رکھا جائے۔ خواہ تمام عمر ہی اسے قید میں رکھنا پڑے تو اسے قید میں رکھا جائے۔

مسئلہ:

مرتد مسلمان کا وارث نہیں اور مسلمان مرتد کا وارث نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ:

اگر کوئی شخص کسی وقت کی نماز ادا کرکے العیاذ باللہ مرتد ہوگیا، پھر اسی نماز کے وقت ختم ہونے سے پہلے توبہ کرکے اسلام قبول کرلیا جائے تو اسے پھر دوبارہ وہ نماز ادا کرنی پڑے گی۔

☆☆☆☆☆

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۱۸)

۱

وہ جو ایمان لائے اور وہ جنہوں نے اللہ کے لئے اپنے گھر بار چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے وہ رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

۲

بیشک وہ لوگ جنہوں نے ایمان لایا' اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی' اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں' وہ لوگ امید کرتے ہیں اللہ کی رحمت کی۔ اور اللہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

(۱) جب اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کو ابن حضرمی کے قتل کے جرم سے بری قرار دیا کہ وہ گنہگار نہیں، تو انہوں نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ کیا ہمیں اس پر اجر بھی حاصل ہوگا؟ تو اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر بتادیا کہ وہ اللہ کی رحمت کی امید کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو رحمت عطاء فرماتا ہے۔

(۲) جب پہلے جہاد کا ذکر فرمایا "کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم" تو اس میں وعید پائی گئی تھی' اب اس آیۃ کریمہ میں وعدکا ذکر فرمایا گیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ ہے کے وعید کے بعد وعدکا ذکر فرماتا ہے۔

"ان الذین آمنوا والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ":

بیشک وہ لوگ جنہوں نے ایمان لایا اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں۔

"ھاجروا" وطن اور قبیلہ کو چھوڑا' اصل میں "ھجر یھجر ھجرا" کا معنی ترک کرنا' اور چھوڑنا ہے' جو

وصل کی ضد ہے۔ اسی وجہ سے قبیح کام کو "ھجر" کہا جاتا " لانہ مما ینبغی ان یھجر " کیونکہ مناسب یہی ہوتا ہے کہ برے کلام کو ترک کر دیا جائے۔ "ھاجرۃ " دوپہر کے وقت کو کہا جاتا ہے کہ اس میں ہر قسم کی نماز یعنی فرض، نفل، نماز جنازہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے، بلکہ سجدۂ تلاوت بھی نہیں کیا جاتا۔

"جاھدوا" ماخوذ ہے "جھد" سے، جس کا معنی ہے مشقت کرنا، محنت کرنا، اسی وجہ سے جہاد اور مجاہدہ کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے " بذل الجھد فی قتال العدو " دشمن کے قتل کرنے میں کوشش کرنا۔

" اولئک یرجون رحمت اللہ " : وہ امید کرتے ہیں اللہ کی رحمت کی۔

امید کرنے کا ذکر کیا ہے، یقین کرنے کا ذکر نہیں، اس کی کیا وجہ ہے۔ اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) ہمارا مذہب یہ ہے کے ایمان پر اور اعمال پر ثواب عطا کرنا عقلاً کوئی واجب نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے وعدہ کے مطابق اپنے فضل و کرم سے اپنے ذمہ لگا دیا۔ اس لئے امید کا ذکر کیا ہے، یقین کا نہیں۔

(۲) اور وجہ یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے وعدہ فرما کر اپنے ذمہء کرم پر لگایا ہے کہ وہ ثواب عطاء فرمائے گا لیکن گزشتہ آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ ثواب اس وقت حاصل ہوگا کہ جب موت حالت ایمان پر آئے، انسان کے لئے یہ حالت مشکوک ہے کہ اس نے ایمان پر مرنا ہے یا کفر پر، اس لئے وہ اللہ کی رحمت کی امید کرتے ہیں، یقین نہیں کرتے۔

(۳) اس آیت کریمہ میں تین چیزوں کا ذکر فرمایا گیا، ایمان، ہجرت، اور اللہ کی راہ میں جہاد، لیکن اس کے ساتھ ساتھ " لابدللانسان مع ذلک من سائر الاعمال " انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام اعمال پر عمل کرے۔ یہ صورت انسان کے لئے یقینی نہیں بلکہ امید پر مبنی ہے کہ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ باقی اعمال کی بھی توفیق عطاء فرمائے گا " فلا جرم علقۃ علی الرجاء " اسی لئے یقیناً اس نے اللہ کی رحمت کو امید کے ساتھ متعلق کر لیا ہے۔

تنبیہ: امید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں " لیس المراد من الآیۃ ان اللہ شکک العبد فی ھذہ

المغفرة " یعنی آیۃ کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کی مغفرت میں شک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نسبت بندوں کی طرف ہے کہ وہ ہجرت کرتے اور جہاد کرتے ہیں، لیکن اپنے نفسوں میں کوتاہی سمجھتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی طرح نہیں کی جیسا کہ کرنے کا حق تھا۔ ہم نے دین کی امداد اس طرح نہیں کی جیسا کہ ہم پر لازم تھا۔ اپنی اسی حالت کو دیکھ کر وہ رب تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کی رحمت کی امید تو کرتے ہیں لیکن یقین نہیں کرتے ۔

ایک اور وجہ:

"ان المراد من الرجاء القطع و الیقین فی اصل الثواب ، و الظن انما دخل فی کمیته وفی وقته"

ایمان والے لوگ جو ہجرت بھی کرتے ہیں اور جہاد بھی ان کو یہ تو یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق ثواب تو عطا کرنا ہے لیکن انہیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ کتنا ثواب عطا کرنا ہے اور کس وقت عطا کرنا ہے، گویا کہ امید کی نسبت مقدار ثواب اور وقت ثواب کی طرف ہے، اصل ثواب کی طرف نہیں۔ (از کبیر)

"واللہ غفور رحیم": اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کی امید کو ثابت فرمادیا کہ جب ان کی موت ایمان پر آئی اور اچھے عمل کئے تو بیشک اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا اور رحم فرمائے گا۔

اسی سے یہ واضح کر دیا کہ عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کی اللہ تعالیٰ نے اسی وقت مغفرت فرمادی جب وہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلے تھے۔ اور اسی وقت ان پر رحم فرمادیا۔ یعنی ان کی اس وقت مغفرت کی اور اس وقت ان پر رحم فرمایا، جب ان کو اس کا علم بھی نہیں تھا۔ (از کبیر)

رحمت کی امید پر اللہ کا کرم:

ابوعمرو ایک دن ایک گلی سے گزر رہے تھے، وہاں دیکھا کہ محلہ کے چند لوگ جمع ہیں جو ایک جوان کو اس کے فساد کی وجہ سے محلہ سے نکالنا چاہتے ہیں، اس کی ماں رو رہی ہے۔

ابوعمرو کندی کو اس پر رحم آیا۔ آپ نے لوگوں کو کہا اس مرتبہ میری وجہ سے اسے معاف کردو، اگر پھر اس نے فساد برپا کیا تو تم جو چاہو اس سے سلوک کرنا۔ انہوں نے معاف کردیا۔

کچھ دنوں کے بعد آپ پھر اس محلہ اور اسی گلی سے گزرے تو دیکھا اس نوجوان کے گھر سے بڑھیا (اس کی ماں) کی رونے کی آواز آرہی ہے، آپ نے سمجھا شاید جوان نے پھر کوئی فساد برپا کیا، تو لوگوں نے اس کو گھر سے نکال دیا ہے، دروازہ کھٹکھٹایا، اس بڑھیا سے اس کے بیٹے کا حال پوچھا، تو اس نے بتایا کہ وہ فوت ہوگیا۔ اس کے متعلق کچھ تفصیل پوچھی تو اس عورت نے بتایا کہ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے مجھے کہا اے میری ماں! میری موت کی خبر کسی کو نہ دینا، کیونکہ میں نے اپنے اردگرد کے لوگوں کو ستایا ہے، وہ مجھے گالی دیں گے، میرے جنازہ پر حاضر نہیں ہوں گے، مجھے خود ہی دفن کردینا، اور میری انگوٹھی پر " بسم اللہ الرحمن الرحیم " لکھا ہوا ہے، وہ انگوٹھی میرے ساتھ دفن کردینا۔ میں نے اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا، جب دفن سے فارغ ہوئی۔

" سمعت صوته یقو ل انصرفی یا اماه قدمت علی رب کریم "

تو میں نے یہ آواز سنی کہ وہ میرا بیٹا مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ اے میری ماں! چلی جا، میں اپنے مہربان رب کے پاس آگیا ہوں۔

یعنی میرے خوف اور میری اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ مجھے " بسم اللہ الراحمن الوحیم " کے وسیلہ اور برکت سے معاف فرمائے گا، اس نے مجھے معاف کردیا ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا " بہانہ میدہد بہانمید ہد " وہ بہانے سے عطا کرتا ہے، قیمت سے عطا نہیں کرتا۔

(روح البیان)

فائدہ:

"ولا سبیل الی المھا جرۃ الا بعدا لایمان ولا الی جھادالابعد ھجران الشھوات"

جب تک ایمان حاصل نہ ہواس وقت تک ہجرت کا کوئی فائدہ نہیں اور جب تک انسان خواہشات کو نہ چھوڑے اس وقت جہاد کا کوئی فائدہ نہیں۔ (روح البیان)

ہجرت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ہجرت کی ایک قسم وہ ہے جسے ہجرت صوریہ کہا جاتا ہے، یعنی ظاہری طور پر اپنے وطن کو چھوڑنا ہے۔ اس ہجرت کی فرضیت فتح مکہ کے بعد ختم ہو چکی ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "لا ھجرۃ بعد الفتح" فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں۔

ہاں البتہ کسی ملک کے کافر مسلمانوں کو شعائرِ اسلام پر عمل نہیں کرنے دیتے تو اب بھی اس حال میں ہجرت فرض ہوگی۔ لیکن یہ ہجرت بھی اس وقت معتبر ہوگی جب اللہ تعالیٰ کی رضاء مقصود ہو، دنیاوی مقاصد اور دنیاوی منافع پیش نظر نہ ہوں۔ جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"فمن کا نت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا"

جس نے ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف کی اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف پائی گئی، اور جس نے ہجرت دنیا کی طرف کی اس نے دنیا کو ہی پایا۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھیں خوب تر نظر آئے گا۔

"اور وہ جنہوں نے اللہ کے لئے گھر بار چھوڑے"

(۲) ہجرت کی دوسری قسم وہ ہے جسے ہجرت معنویہ کہا جاتا ہے، یہ وہ ہے کہ انسان بت پرستی کو چھوڑ کر اور گناہوں کو چھوڑ کر اور خواہشات نفسانیہ کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے، اور اسی ذات کی طرف اس کی توجہ ہو۔

جہاد کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک قسم جہاد کی وہ ہے جسے جہادِ اصغر کہا جاتا ہے، یہ کافروں سے جہاد کرنا ہے۔

(۲) دوسری قسم جہاد کی وہ ہے جسے جہادِ اکبر کہا جاتا ہے، یہ نفس سے جہاد کرنا ہے۔

☆ جہاد اصغر میں ظاہر کی اصلاح کرنا ہے اور جہاد اکبر میں باطن کی اصلاح کرنا ہے، اور یہ جہاد بہت مشکل اور بہت قوی ہے۔

☆ جہاد اصغر سے انسان جنت اور رحمت تک پہنچتا ہے۔ اور جہاد اکبر سے انسان رب تعالیٰ کے مشاہدہ اور اس کے جمال مطلق تک پہنچتا ہے۔

☆ جہاد اصغر سے شہادت حاصل ہوتی ہے اور جہاد اکبر سے صدیقیت حاصل ہوتی ہے، صدیقین کا مقام شہداء کے مقام سے بلند ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین و الصدیقین و الشہداء"

اس ارشاد گرامی میں صدیقین کا ذکر انبیاء کے ذکر کے بعد اور شہداء سے پہلے کر کے واضح کر دیا کہ انبیاء کرام کے بعد مقام ہے صدیقین کا اور اس کے بعد مقام ہے شہداء کا۔ (روح البیان بزیادۃ)

اگر تو رب تعالیٰ کی رحمت چاہتا ہے تو مخلوق پر رحم کر:

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

مکن تا توانی دل خلق ریش   وگر میکنی میکنی بیخ خویش

جب تک تو طاقت رکھتا ہے مخلوق کا دل زخمی نہ کر۔ اگر مخلوق کا دل زخمی کرے گا تو اپنی جڑوں کو اکھیڑ دے گا۔

یعنی مخلوق کو ستانے میں اپنی بربادی ہے۔ اور مخلوق پر رحم کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل ہوتی ہے۔

(روح البیان)

☆☆☆☆☆

يَسْـئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۹)

﴿۱﴾

تم سے شراب اور جوے کا حکم پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ دنیوی نفع بھی اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔

﴿۲﴾

وہ پوچھتے آپ سے شراب اور جوے کے متعلق، فرمادو ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور (دنیاوی) منافع ہیں لوگوں کے لئے، اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔

شراب کو تدریجاً (آہستہ آہستہ) حرام کیا گیا:

سب سے پہلے یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

"ومن ثمرات النخیل والا عناب تتخذ ون منه سکرا ورزقا حسنا ان فی ذلک لآیة لقوم یعقلو ن" (سورۃ النحل آیت ۶۷)

اور کھجوراور انگور کے پھلوں میں سے کہ اس سے نبیذ بناتے ہو اور اچھا رزق بے شک اس میں نشانی ہے عقل والوں کو۔

ابھی تک شراب کو حرام نہیں کیا گیا تھا بلکہ " فطفق المسلمون یشربو نها وهی لهم حلا ل یو مئذ " مسلمان (صحابہ کرام) شراب پیتے رہے اور یہ ان کے لئے حلال تھی۔

" ثم ان عمر و معاذ اونفرامن الصحا بة (رضی الله عنهم) قالو افتنا یا رسو ل الله فی الخمر فانها مذ هبة للعقل ومسلبة للمال "

پھر حضرت عمر اور حضرت معاذ اور چند صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے

اورعرض کیا یارسول اللہ شراب کے متعلق کوئی حکم جاری فرمائیں کیونکہ یہ عقلوں کو زائل کر دیتی ہے اور مال کو ضائع کر دیتی ہے۔

ان کے عرض کرنے پر یہ آیۃ کریمہ (جس کی وضاحت جاری ہے) نازل ہوئی۔ " یسئلو نک عن الخمر والمیسر " الخ

اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد لوگ دو قسم پر منقسم ہو گئے۔

" قوم وقالو انأخذ منفعتها ونترک اثمها" بعض لوگ شراب پیتے رہے کہ ہم اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔اوراس کے گناہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔

"وترکها آخرون وقالوا لاحاجة لنافیما فیه اثم کبیر" اور کچھ حضرات نے مکمل طور پر شراب کو چھوڑ دیا کہ جس چیز میں بڑا گناہ ہے اس کی ہمیں حاجت نہیں۔

"ثم ان عبدالرحمن بن عوف رضی الله عنه دعاناسامنهم فشربوا وسکروا قام احدهم فقرأ قل یا ایها الکافرون اعبد ما تعبدون الی آخر السورة بدون لا فی لااعبد"

پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کی دعوت کی، تو انہوں نے دعوت میں شراب پیا،نشہ میں آ گئے،ان میں سے ایک صاحب نے نماز پڑھائی، تو نماز کے قیام میں "سورۃ الکافرون " پڑھی،لیکن "لاا عبد "کی جگہ " اعبد " پڑھا، بلکہ تمام سورۃ میں جہاں جہاں " لا " مذکور تھا اسے چھوڑ دیا۔

اس واقع کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ "یاایها الذین امنوا لا تقربوا الصلوة وانتم سکاری "

اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ ایسے حال میں جب تم نشہ میں ہو۔

اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد زیادہ حضرات نے شراب کو چھوڑ دیا کہ "لاخیرفی شئ یحول بیننا وبین الصلوة" اس چیز میں کوئی بھلائی اور بہتری نہیں جو ہمارے اور ہماری نماز کے درمیان میں حائل ہو جائے۔

لیکن کچھ لوگ عشاء کی نماز کے بعد شراب پی لیتے تھے تا کہ صبح کی نماز تک نشہ اتر جائے ،اسی طرح بعض لوگ صبح کی نماز کے بعد شراب پی لیتے تھے تا کہ ظہر تک نشہ اتر جائے۔

"ثم ان عتبان بن مالک اتخذ صنیعا یعنی ولیمة ودعا رجا لا من المسلمین فیھم سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنه وکان قد شوی لھم راس بعیر فاکلوا منه وشربوا الخمر حتی سکر وامنھا ثم انھم افتخر وا عند ذلک وانتسبوا وتنا شد وا الا شعار فانشد سعد قصیدة فیھا ھجاء الانصار وفخر لقومه فاخذ رجل لحی البیعر فضرب به رأس سعد فشجه مو ضحة فانطلق سعد الی رسول اللہ ﷺ وشکا الیه الانصاری فقال عمر اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شافیا فنزل (انما الخمر والمیسر) فی المائدة الی قوله (فھل انتم منتھو ن) فقال عمر انتھینا یا رب "

پھر عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے چند صحابہ کرام کو دعوتِ ولیمہ دی، جب لوگ حاضر ہوئے تو ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اونٹ کا گوشت بھونا گیا، وہ دعوت میں شرکا، نے کھایا اور شراب پی یہاں تک کہ وہ نشہ میں آ گئے۔ اسی نشہ کی حالت میں انہوں نے اپنی اپنی قوم اور اپنے اپنے نسب کی تعریف میں فاخرانہ اشعار پڑھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس کے اشعار میں انصار کی ہجو (مذمت) بیان کی گئی اور اپنی قوم پر فخر کیا گیا، تو انصار میں سے ایک شخص نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی حضرت سعد کو اس زور سے ماری کہ ان کے سر اور چہرے پر گہرا زخم ہو گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں شکایت لے کر آئے، ادھر انصاری نے بھی شکایت پیش کی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے اللہ شراب کے متعلق کوئی واضح حکم نافذ فرما۔ تو رب تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں آیۃ کریمہ "یاایھاالذین امنوا انما الخمر و المیسر الخ" نازل فرما کر شراب کو مکمل طور پر حرام کر دیا۔

رب تعالیٰ کے ارشاد " فھل انتم منتھون "(کیا تم رک جاؤ گے) پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا" انتھینا یا رب "تو اے ہمارے رب ہم رک گئے۔

(از بغوی ، مظھری ، روح البیان ، خازن)

تنبیہ: حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی دعوت میں شراب پینے سے جب نشہ میں آگئے۔

" وحضرت صلوة المغرب فقد موا علیا کرم اللہ وجھہ فقرأ (قل یا ایھا الکافرون) الخ بحذف لا"

اور مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا تو حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کو آگے کیا گیا کہ آپ نماز پڑھائیں، تو آپ نے نشہ کی حالت میں سورۃ کافرون پڑھی " لا اعبد " کی جگہ " اعبد " پڑھا۔

(روح المعانی)

عزیز طلباء کرام! تنبیہ سے آپ کو اس بات سے خبردار کرنا مقصود ہے کہ جس طرح اکثر مفسرین کرام نے مبہم طور پر بیان کیا کہ ایک شخص کو آگے کیا گیا، اسی طرح آپ حضرات بھی اپنی تقاریر میں بیان کریں۔

آزاد کشمیر باغ سے ایک مرتبہ ایک مولانا صاحب جو سادات خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مجھ سے بذریعہ فون مشورہ طلب کیا کہ کالج میں ایک لیکچرار صاحب نے بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شراب کے نشے میں "لا اعبد " کی جگہ " اعبد " پڑھا تو اس پر ہنگامہ کھڑا ہوگیا، کچھ طلباء لڑائی میں زخمی ہوگئے، معاملہ پولیس کے پاس چلا گیا۔

میں نے شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ وقتی طور پر یہ کہہ کر ٹال دیں کہ مسئلہ کی تحقیق کریں گے، اگر لیکچرار صاحب نے غلط کہا تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لیں گے۔

معاملہ کو رفع دفع کرنے کے لئے اور جذبات کو ٹھنڈا کرنے کا یہ حیلہ ہے ورنہ مسئلہ ٹھیک بتایا گیا ہے۔

اصل میں سمجھانے کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو لوگوں کے ذہن قبول کرلیں گے، کہ اسلام سے پہلے لوگ بت پرست تھے، مشرک تھے جب اسلام لے آئے، تو کامل مسلمان بن گئے، اسلام سے پہلے سودخوار تھے، اسلام کے بعد متقی بن گئے، اسلام سے پہلے چور تھے، اسلام کے بعد پرہیز گار بن گئے، اسلام سے پہلے جھگڑالو تھے، اسلام کے بعد بھائی بھائی بن گئے، شراب کی حرمت سے پہلے شراب پینا جائز تھا، اس لئے جب تک جائز رہا صحابہ کرام شراب پیتے رہے، جب شراب حرام ہوگیا تو مٹکے توڑ دیئے گئے۔

شراب کی حرمت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تقویٰ:

"وعن علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ لو وقعت قطرۃ منہا فی بئر فبنیت فی مکانہا منارۃ لم اؤذن علیہا ولو وقعت فی بحر ثم جف فنبت فیہ الکلأ لم ارعہ دابتی"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر ایک قطرہ شراب کا کنوئیں میں گر جائے اور اس جگہ پر (یعنی کنوئیں کو بند کر کے وہاں) مینار بنا دیا جائے تو میں اس مینار پر اذان نہیں دوں گا۔ اور اگر ایک قطرہ دریا میں یا سمندر میں گر جائے تو وہاں گھاس اُگ آئے تو میں اپنے کسی جانور کو وہ گھاس نہیں چراؤں گا۔ (روح المعانی)

یہی واقعہ روح البیان اور مدارک التنزیل اور کتب وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

شراب کب حرام ہوئی؟

"وحرمت الخمر فی السنۃ الثالثۃ من الہجرۃ بعد غزوۃ الاحزاب بایام"

ہجرت کے تیسرے سال میں غزوۂ احزاب سے چند دنوں کے بعد شراب حرام کر دی گئی۔

شراب کو تدریجاً حرام کرنے میں فائدہ:

شراب کو ایک مرتبہ ہی حرام نہیں کیا گیا [illegible]
بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور وہ اس میں بہت نفع سمجھتے تھے [illegible]
دیا گیا تو ان پر مشکل ہوتی۔

"فلا جرم استعمل فی تحریمہا ہذا التدریج [illegible]"

[illegible]

[illegible]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا کمال:

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔

" ما شربت الخمر قط لا نی رائیتها تزیل العقل "

میں نے شراب کبھی نہیں پیا، بے شک میں نے دیکھا کہ یہ عقل کو زائل کر دیتی ہے۔

" وما عبدت صنما قط لأنی رأیته لایضر ولاینفع "

میں نے کسی بت کی عبادت نہیں کی، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ یہ کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتے۔

" وما زنیت قط لغیر تی علی اهلی "

اور میں نے کبھی زنا نہیں کیا کہ میری زوجہ کو غیرت حاصل نہ ہو۔

" وما کذبت قط لانی رائیته دناءة" میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا کیونکہ میں نے جھوٹ کو گھٹیا سمجھا۔

یعنی یہ تمام اوصاف حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو زمانہ جاہلیت میں بھی حاصل تھے۔ (ماخوذ از روح البیان)

مومن کی شان کی لائق یہ ہے:

"فینبغی للمسلم ان لایخطر بباله شرب الخمر فضلا عن شربها "

مسلمان کی شان کے لائق یہ ہے کہ اس دل میں یہ نہ آئے کہ میں نے شراب پینا ہے۔ یعنی شراب کا تصور اور خیال آنا بھی غلط کام ہے شراب پینا تو دور کی بات ہے۔ (روح البیان)

شرابی سے قطع تعلقی کی جائے:

"وینقطع عن شاربها فانه اذا خالط شارب الخمر یخاف علیه ان یصیبه من عثاره "

مسلمان کو چاہئے کہ وہ شرابی سے قطع تعلقی رکھے، اس لئے کہ شرابی سے میل جول پر خطرہ ہے کہ اسی طرح یہ بھی اس لغزش میں مبتلا نہ ہو جائے۔ کیونکہ جس طرح کی صحبت اسے حاصل ہوگی وہ ہی اثرات اس پر مرتب ہوں گے۔

شرابی کو رشتہ نہ دیا جائے۔

"وعن بعض الصحابة انه قال من زوج ابنته لشارب الخمر فكأنما ساقها الى الزنا معناه ان شارب الخمر يقع منه الطلاق وهو لا يشعر"

بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کا نکاح شرابی سے نہ کرے۔ کیونکہ شرابی سے نکاح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیٹی کو زانیہ بنانا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شرابی نشہ کی حالت میں طلاق دے تو وہ طلاق واقع ہو جاتی ہے، لیکن شرابی لوگ اکثر اوقات تین طلاقیں بھی دے دیتے ہیں، پھر وہ میاں بیوی اکھٹے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے، تین طلاق کے بعد ان کا میاں بیوی کی حیثیت میں رہنا زنا کرنے کے مترادف ہے۔ (از روح البیان)

تنبیہ:

" فالذی یجب علی الولی ان لا یزوج ابنته ولا اخته من فاسق ولا ممن یتعاطی المنکرات"

اسی سے ایک اور مسئلہ واضح ہو گیا کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا بہن کا نکاح فاسق سے نہ کرے اور ایسے شخص سے نہ کرے جو ناجائز کاموں کا ارتکاب کرنے والا ہو۔ (از روح البیان)

انگوری شراب اور دوسرے شرابوں میں فرق:

انگور کا نچوڑ جسے آگ پر نہ پکایا جائے بلکہ کچا ہی ہو اس پر جھاگ پیدا ہو جائے اور نشہ دے اسے فقہاء کرام کی اصطلاح میں "خمر" کہا جاتا ہے۔ جس کا ایک قطرہ پینا بھی حرام ہے اور زیادہ مقدار پینا بھی حرام ہے۔ ایک قطرہ پینے سے بھی حد لگے گی اور زیادہ مقدار پینے سے بھی حد لگے گی۔

خمر (انگوری شراب) نجاست غلیظہ ہے اور باقی مشروبات نجاست خفیفہ ہیں، بلکہ باقی مشروبات میں طہارت اور نجاست غلیظہ کا بھی قول پایا جاتا ہے۔

ہر نشہ آور مشروب قلیل وکثیر حرام ہے:

"وعن عائشة ان رسول الله ﷺ قال كل مسكر حرام وما اسكر منه الفرق فملؤ الكف منه حرام" (اخرجه ابو داؤد والنسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے، وہ چیز جس سے ایک فرق پینے سے نشہ آئے وہ چلو بھر پینے میں بھی حرمت ثابت ہے۔

" الفرق با لتحريک مكيال يسع تسعة عشر رطلا بالبغدادی "

فرق کی را پر حرکت فتحہ ہے۔ یہ ایک پیمانہ ہے جس میں انیس رطل (تقریباً نو کلو) سما جائیں۔

واضح ہوا کہ ایسا مشروب جو زیادہ مقدار میں پئیں تو نشہ آئے اور تھوڑی مقدار میں پئیں تو نشہ نہ آئے، وہ حقیقت میں نشہ آور ہی ہے، اس کا تھوڑی مقدار میں پینا یا زیادہ مقدار میں پینا حرام ہے۔ (خازن)

☆ **"عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قال كل مسكر خمر وكل مسكر حرام ومن شرب الخمر فی الدنيا وهو بد منها لم يتب منها لم يشهر بها فی الآخرة"**

(بخاری ومسلم، واللفظ للمسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے۔ اور جس نے دنیا میں شراب پیا اور اس سے بچنے کا چارہ اس کے لئے تھا اور اس نے توبہ بھی نہیں کی تو وہ آخرت میں "شراب طہور" (جنتی پاکیزہ مشروب) نہیں پیے گا۔

ایک تو یہ خیال کیا جائے کہ لغوی معنی کے لحاظ سے ہر نشہ دینے والا مشروب خمر کہلاتا ہے اور اصطلاح فقہاء میں خمر انگوری شراب کو کہا جاتا ہے، وہ بھی اس وقت تک جب اسے آگ پر نہ پکایا جائے۔

اگر شراب پینے سے کوئی چارہ نہ ہو، یعنی بھوک سے مرنے کا خطرہ ہو، اور کوئی چیز نہ ملے صرف شراب ہی میسر ہو، تو اس حالتِ اضطراری (مجبوری کی حالت) میں شراب پینا جائز ہے۔

کبھی شراب پیا تھا، اس کے بعد توبہ کرلی تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ توبہ کے بعد کسی کو عار نہ دلائی جائے۔

☆ "عن جابر ان رجلا قدم من جیشان من الیمن فسأل النبی ﷺ عن شراب یشربو نه بارضهم من الذرة یقال له المزر فقال رسول الله ﷺ او مسکر هو قال نعم قال رسول الله ﷺ کل مسکر حرام وان علی الله عهدا لمن یشرب المسکر ان یسقیه من طینة الخبال قالوا وما طینة الخبال یا رسول الله قال عرق اهل النار او عصارة اهل النار" (مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک ایک شخص جیشان سے آیا، جیشان یمن کا ایک علاقہ ہے، اس نے نبی کریم ﷺ سے ایک شراب کے متعلق پوچھا، جو ان کے علاقہ میں پیا جاتا تھا اور جوار کے دانوں سے بنایا جاتا تھا، جسے مزر (شراب کا نام) کہا جاتا تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے بے شک اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جو شخص نشہ والی چیز پئے گا "طینة الخبال" پلایا جائے گا۔ صحابہ کرام نے فرمایا یا رسول اللہ "طینة الخبال" کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ جہنمیوں کا پسینہ اور ان کا نچوڑ یعنی خون اور پیپ ہے۔ (از خازن)

☆ "قال عمر بن الخطاب فی خطبته نزل تحریم الخمر وهی من خمسة اشیاء العنب التمر والحنطة والشعیر والعسل ما خمر العقل" (بخاری و مسلم)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ شراب حرام ہونے کے متعلق قرآن پاک کا حکم نازل ہو چکا ہے، وہ پانچ چیزوں سے بننے والا شراب ہے، انگور اور کھجور اور گندم اور جو اور شہد سے، ہر وہ چیز جو عقل ڈھانپ دے وہ خمر (شراب) ہے۔

آپ کے آخری الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ ہمارے علاقہ میں شراب پانچ چیزوں سے بنتا ہے، کسی اور علاقہ میں ان پانچ چیزوں کے بغیر کسی اور چیز سے بنے تو وہ بھی حرام ہوگا۔

☆ "وعن ابن عمر عن النبی ﷺ من الحنطة خمر ومن الشعیر ومن التمر خمر ومن الزبیب خمر ومن العسل خمر"

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا گندم سے بننے والا خمر ہے، اور جو سے بننے والا خمر ہے، اور کھجور سے بننے والا خمر اور کشمش سے بننے والا خمر ہے اور شہد سے بننے والا خمر ہے۔

☆ "وعن سعد بن ابی وقاص انه ﷺ نهی عن قلیل ما اسکر کثیره"

(رواه النسائی وابن حبان والبزار ورجاله رجال الصحیح)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بے شک نبی کریم ﷺ نے اس چیز کے قلیل مقدار کو استعمال سے منع فرمایا جس کا کثیر نشہ دے۔

یعنی کثیر مقدار سے نشہ آئے اور قلیل مقدار سے نشہ نہ آئے تو پھر بھی رسول اللہ ﷺ نے قلیل مقدار کے استعمال سے منع فرمایا۔

☆ "وعن دیلم الحمیری قال قلت لرسول ﷺ انا بارض باردة ونعالج فیها عملا شدیدا وانا نتخذ شرابا من هذا القمح نتقوی به علی عملنا وعلی برد بلادنا قال هل یسکر قلت نعم قال فاجتنبوه قلت ان الناس غیر تارکیه قال ان لم یترکوه قاتلوهم"

(رواه ابوداؤد)

دیلم حمیری کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا بے شک ہم ٹھنڈی زمین (ٹھنڈے علاقہ) میں ہوتے ہیں، بہت محنت ومشقت والا کام کرتے ہیں، بیشک ہم گندم سے ایک شراب تیار کرتے ہیں جس سے ہم اپنے کام کے لئے تقویت حاصل کرتے ہیں، اور اس کی حرارت سے علاقہ کی برودت (ٹھنڈک) کو زائل کرتے ہیں۔

☆ "وعن ابی مالک الاشعری انه سمع رسول الله ﷺ یقول لیشربن ناس من امتی الخمر یسمونها بغیر اسمها" (رواه ابوداؤد)

ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ میری امت میں سے کئی لوگ خمر کا اور نام رکھ کر پئیں گے۔

یعنی نبی کریم ﷺ نے واضح طور پر فرمایا کہ ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے خواہ اسے خمر کہا جائے یا اس کا کوئی اور نام رکھا جائے، کوئی اور نام رکھنے سے اس کی حرمت ختم نہیں ہوگی۔

تنبیہ:

''وفی فتاوی النسفی ان البنج حرام وطلاق البنجی واقع ومن یعتقد حلیته یقتل ویحد شاربه کما یحد شارب الخمر ، ویدل علی ان کل مسکر حرام''

فتاوی نسفی میں ذکر ہے کہ بھنگ پینا حرام ہے۔ بھنگ پینے والا نشہ میں طلاق دے تو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی (جس طرح ہر نشہ والی چیز سے نشہ میں آنے والے شخص کی طلاق واقع ہو جاتی ہے) اور جو شخص بھنگ کو حلال سمجھنے کا عقیدہ رکھے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ نہ کرے، ارتداد سے باز نہ آئے، بلکہ بھنگ کے جواز کا ہی قول کرتا رہے تو حاکم وقت اسے قتل کرا دے، اور بھنگ پی کر نشہ میں آجانے والے شخص کو بھی اسی طرح حد لگائی جائے جس طرح کسی نشہ والی چیز سے نشہ آنے پر حد لگائی جاتی ہے۔ (ماخوذ از مظهری)

شراب کی حرمت پر صحابہ کرام کا شراب انڈیل دینا:

''عن انس بن مالک قال کنت ساقی القوم یوم حرمت الخمر فی بیت ابی طلحة وماشرابهم الا الفضیح البسر والتمر فاذا منادینادی فقال اخرج فانظر فخرجت فاذامنادینادی الا ان الخمر قد حرمت قال فجرت فی سکک المدینة فقال لی ابوطلحة اخرج فاهرقها فهرقتها'' الخ (مسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس دن شراب حرام ہوئی اس سے پہلے میں ابوطلحہ کے گھر لوگوں کو شراب پلا رہا تھا، اس وقت شراب بسر (سرخ، پیلی) کھجور اور خشک کھجور سے تیار کی جاتی تھی۔ اچانک آواز دینے کی آواز کو سنا، تو ابوطلحہ نے کہا نکلو، دیکھو (یہ آواز دینے والا کیا آواز دے

رہا ہے اس کی آواز سنو) میں نکلا تو آواز دینے والا یہ آواز دے رہا ہے" خبردار بے شک شراب بہادو" (اس کی آواز کو سننے سے ہی) شراب مدینہ کی گلیوں میں بہنے لگی۔ مجھے ابوطلحہ نے کہا نکلو شراب بہادو، میں نے بہادی۔

نبی کریم ﷺ کا نبیذ پینا:

"عن ابن عباس قال کان رسول اللہ ﷺ ینتبذلہ اول اللیل فیشربہ اذااصبح یو مہ ذاک واللیلۃ التی تجیٔ والغد واللیلۃ الآخری والغدالی العصر فان بقی شیٔ سقاہ الخادم او امر بہ فصب"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے لئے نبیذ تیار کیا جاتا تھا، جو آپ تین دن پی لیتے تھے۔ تیسرے دن کے ختم ہونے سے پہلے ہی آپ کسی خادم کو دے دیتے تھے، یا انڈیل دیتے تھے۔

یعنی اگر اس میں نشہ نہ ہوتا تو کسی خادم کو دے دیتے اور اگر نشہ اس میں پیدا ہو جاتا تو انڈیل دیتے تھے۔ آپ خود نشہ پیدا ہونے سے پہلے ہی تقوی کے طور پر چھوڑ دیتے تھے۔

☆ "عن ثمامۃ یعنی ابن خزن القشیری قال لقیت عائشۃ فسألتھا عن النبیذ فدعت عائشۃ جاریۃ حبشیۃ فقالت سل ھذہ انھا کانت تنبذ لرسول اللہ ﷺ فقالت الحبشیۃ کنت انبذلہ فی سقاء من اللیل واوکیہ واعلقہ فاذااصبح شرب منہ" (مسلم)

ثمامہ یعنی ابن حزن قشیری بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملا، میں نے نبیذ کے متعلق سوال کیا، آپ نے ایک حبشیہ غلامہ کو بلایا کہ اس سے سوال کرو، یہ نبی کریم ﷺ کے لئے نبیذ تیار کرتی تھی۔ اس حبشیہ نے بتایا میں آپ کے لئے چھوٹے مشکیزہ میں نبیذ تیار کرتی تھی، رات کے وقت نبیذ تیار کر کے مشکیزہ کا منہ بند کر کے لٹکا دیتی صبح آپ پیتے۔

ایک روایت میں ہے "نبذ ہ غدوۃ فیشربہ عشاء نبیذہ عشاء فیشربہ غدوۃ"

ہم صبح نبیذ تیار کرتے اور شام کو پیتے اور شام کو تیار کرتے اور صبح پیتے۔

خیال رہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں تیسرے دن تک پینے کا ذکر ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ایک دن کا ذکر ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ گرمیوں میں صبح کا تیار کیا نبیذ شام تک اور شام کو تیار کیا ہوا نبیذ صبح تک پیا جاتا، اور سردیوں میں تین دن تک پی لیا جاتا تھا۔

یا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کا ذکر ہے، زیادہ وقت کی نفی نہیں۔

نبیذ کیا ہے؟

پانی میں کشمش کو ڈال لیا جاتا ہے، یا کھجوروں کو ڈال لیا جاتا، پانی میں مٹھاس پیدا ہو جاتی اور اس میں تقویت بھی پیدا ہو جاتی، نشہ کی حالت میں پہنچنے سے پہلے نبیذ پینا جائز ہے، اور نشہ کی حالت میں جب نبیذ پہنچ جائے تو اس کا پینا ناجائز ہے۔

اگر چہ نبیذ نشہ نہ دے اس کا پینا بھی صرف تقویت حاصل کرنے کے لئے ہو، ایسا نہ ہو کہ اس لئے نبیذ پیئے کہ یہ شراب کا نمونہ ہے، لہو ولعب کی نیت نہ ہو۔

راقم نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کو اسی طرح سمجھا جیسا کہ قلمبند کر دیا۔

شراب کی خرید وفروخت ناجائز ہے:

اجماع امت ہے اس پر کہ شراب کی خرید وفروخت حرام ہے اور شراب سے حاصل ہونے والی رقم کا استعمال کرنا حرام ہے۔

☆ "عن جابر قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول عام فتح مکۃ ان اللہ تعالٰی حرم بیع الخمر والانتفاع بها والمیتۃ والخنزیر والاصنام" (اخرجاہ فی الصحیحین مع زیادۃ اللفظ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ کے سال فرماتے ہوئے سنا، بیشک اللہ تعالیٰ نے شراب کی خرید وفرخت اور اس سے نفع حاصل کرنا اور مردہ جانور اور خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت اور نفع حاصل کرنا حرام کر دیا ہے۔

☆ ''عن ابن عباس قال بلغ عمر بن الخطاب فلانا باع خمرا فقال قاتل الله فلانا الم یعلم ان رسول اللہ ﷺ قال لعن الله الیھود حرمت علیھم الشحوم فحملوھا فباعوھا''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ملی کہ فلاں شخص نے شراب بیچا ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اسے برباد کرے کیا اسے معلوم نہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود پر کہ ان پر چربی حرام کر دی گئی تھی، لیکن انہوں نے پھر اسے اٹھایا اور بیچا۔ (ازخازن)

شراب سے متعلق دس شخصوں پر نبی کریم ﷺ کی لعنت:

''عن انس قال لعن رسول اللہ ﷺ فی الخمر عشرۃ عاصرھا ومعتصرھا وشاربھا و ساقیھا وحاملھا والمحمولۃ الیھا وبائعھا ومبتاعھا وواھبھا وآکل ثمنھا''

(اخرجه الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے شراب کے متعلق دس شخصوں پر لعنت فرمائی، شراب کے لئے رس نچوڑنے والے پر، اور جس کے لئے نچوڑا گیا ہے، اور پینے والے پر، اور پلانے والے پر، اور اٹھانے والے پر، اور جن کے لئے اٹھایا گیا ہے، اور بیچنے والے پر، اور خریدنے والے پر، اور ہبہ کرنے والے پر، اور شراب سے حاصل ہونے والی رقم کو استعمال میں لانے والے پر۔ (ازخازن)

شراب (خمر) نجاستِ غلیظہ ہے:

رب تعالیٰ نے شراب کے متعلق فرمایا: "رجس عن عمل الشیطان فاجتنبوہ. والرجس فی اللغۃ النجس"
شراب رجس ہے، شیطانی عمل ہے اس سے اجتناب کرو۔ اور لغت میں رجس کا معنی ہے نجاست۔
(بخاری)

شراب کے مختلف نام اوران کی حرمت:

"عن عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ سئل عن البتع فقال کل شراب اسکر فھو حرام البتع شراب یتخذ من العسل کان اھل الیمن یشربو نہ" (بخاری ومسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ سے "بتع" کے متعلق سوال کیا گیا آپ نے فرمایا ہر نشہ دینے والا مشروب حرام ہے، "بتع" وہ شراب ہے جو یمن والے لوگ شہد سے بناتے تھے، اور پیتے تھے۔

☆ "عن ابن عباس انہ سئل عن الباذق قال فمااسکر فھو حرام علیک" (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے باذق کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا جو چیز بھی نشہ دے تم پر حرام ہے۔

"قال صاحب المطالع الباذق بفتح الذال المعجمۃ ھو الطلاء المطبوخ من عصیر العنب"

صاحب مطالع نے بیان کیا کہ انگور کا نچوڑ جسے پکالیا جائے اسے طلاء اور باذق کہا جاتا ہے۔ (بخاری)

لیکن مظہری نے تفصیل بیان کی ہے۔ یعنی انگور کے نچوڑ کو جب پکایا جائے جب تہائی حصہ سے کم خشک ہو تو اسے طلاء کہا جاتا ہے۔ اگر نصف خشک ہو کر چلا جائے تو اسے "منصف" کہا جاتا ہے۔ تیسرے حصہ سے زائد اور نصف سے کم خشک ہو جائے تو اسے "باذق" کہا جاتا ہے۔ اور اگر کھجور کو پانی میں آگ پر پکایا جائے اس میں نشہ آجائے اور

جھاگ پیدا ہو جائے تو اسے ''سکر'' کہا جاتا ہے۔ اور اگر کشمش کو آگ پر پکایا جائے تو اس میں نشہ آ جائے اور جھاگ پیدا ہو جائے تو اسے '' نقیع الزبیب '' کہا جاتا ہے۔

آیۃ کریمہ میں خمر سے مراد:

قاضی مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ جمہور حضرات کا مذہب یہ ہے کہ خمر لغت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو عقل پر پردہ چھا دے۔ فقہاء کرام نے اپنی اصلاح میں خمر صرف انگوری شراب کو کہا۔

'' والتحقیق عندی ان الخمر لفظ مشترک بین الخاص والعام اما حقیقة واما بعموم المجاز والمراد فی الآیة ھوا لمعنی الاعم ''

میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ بیشک لفظ خمر خاص اور عام میں مشترک ہے، حقیقت کے لحاظ پر ہو یا عموم المجاز کے لحاظ پر ہو، آیۃ کریمہ میں بھی عام معنی لینا ہی مناسب ہے، جو ہر نشہ آور کو شامل ہے۔

'' قال صاحب القاموس الخمر ماا سکر من عصیر العنب او عام والعموم اصح ''

صاحب قاموس نے کہا ہے خمر اسے کہتے ہیں جو نشہ دے، وہ انگور کا نچوڑ ہو، یا کوئی چیز بھی نشہ دینے والی ہو، یہ عام معنی لینا ہی بہتر ہے۔ (مظھری)

''والمیسر'': جؤا۔

''واما المیسر فھوا القمار واشتقاقه من الیسر لانه اخذ مالا بسھولة من غیر تعب ''

جوئے کو میسر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ لفظ '' میسر '' مشتق ہے ''یسر'' سے، یسر کا معنی ہے آسانی، چونکہ جؤا باز بھی بغیر مشقت کے دوسرے کا مال آسانی سے لے لیتا ہے، اس لئے اسے میسر کہا گیا۔

☆ **'' عن ابن عباس کان الرجل فی الجاھلیة یخاطر الرجل علی اھله وما له فا یھما قمر صاحبه ذھب باھله وما له ''**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں زمانہ جاہلیت میں لوگ جؤا میں اپنی زوجہ اور مال لگاتے تھے۔ جو شخص جؤا جیت جاتا وہ دوسرے کی زوجہ اور مال لے جاتا۔ (خازن)

سورۃ مائدہ میں ان شاء اللہ شراب اور جوا کے متعلق مزید تفصیل آئے گی، یہاں صرف ایک ضابطہ سمجھ لیا جائے، ہر ایسا کھیل جس میں ہار جیت ہو، اور ہارنے والے پر مال دینا لازم ہو وہ جوا ہے۔

اگر مال نہ لگایا جائے تو وہ کھیل بظاہر تو جائز ہے لیکن درحقیقت وہ جوا کی طرف قدم بڑھانے کے مترادف ہے۔تاش کھیلنے والے،لڈو کھیلنے والے وغیرہ ہی جوا باز بنتے ہیں۔

☆ " عن ابن سيرين ومجاهد وعطاء كل شئ فيه خطر فهو من الميسر حتى لعب الصبيان بالجوز " ۔

ہر ایسا کھیل جس میں ہارنے اور جیتنے کا خطرہ ہو اور اس پر رقم وغیرہ لگادی وہ جوا ہی ہے یہاں تک کے بچوں کا اخروٹوں سے اسی شرط پر کھیلنا بھی جوا ہے۔

☆ "روى عن على عليه السلام انه قال النرد والشطرنج من الميسر"

حضرت رضی اللہ عنہ نے فرمایا نردشیر اور شطرنج جواء کی قسمیں ہیں۔(اس وقت یہ کھیل جوا بازی تھے)

☆ "وقال الشافعي رحمه الله اذاخلا الشطرنج عن الرهان واللسان عن الطغيان والصلوة عن النسيان لم يكن حراما وهو خارج عن الميسر لان الميسر ما يوجب دفع المال او اخذ مال وهذا ليس كذلك فلايكون قمارا ولاميسرا "

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب شطرنج پر پیسے نہ لگائے جائیں، زبان کو فحش کلامی سے بچایا جائے، نماز کو ترک نہ کیا جائے، تو یہ حرام نہیں۔اور نہ ہی جواء بازی ہے، کیونکہ جواء بازی میں مال دینا یا مال لینا ضروری ہوتا ہے۔جس میں مال نہ لگایا جائے وہ کھیل جائز ہے۔ (کبیر)

بہت خوب نتیجہ:

امام شافعی رحمہ اللہ کے قول سے یہ واضح ہوا کہ ہر کھیل جو کسی نہ کسی حرام فعل کو شامل ہو وہ حرام ہوگا۔ایسا کھیل جس پر ہار جیت اور مال لگایا جائے وہ حرام اور جواء ہے۔

ہر ایسا کھیل جس پر فحش کلامی مرتب ہو۔لڑائی جھگڑا پایا جائے وہ حرام ہوگا۔اور ہر ایسا کھیل جس سے نماز ضائع ہو وہ حرام ہوگا۔ ہر ایسا کھیل جس میں مرد کا جسم گھٹنے اور ناف کے درمیان ننگا ہو وہ کھیل حرام ہوگا۔ ہر ایسا کھیل جسے مرد اور عورتیں مل کر دیکھیں وہ حرام ہوگا۔

تنبیہ : بیل دوڑ، گھوڑے دوڑ کے مقابلوں پر جب شرط لگائی جائے جو دو طرفہ ہو، جو ہارے گا وہ اتنا مال دے گا وہ حرام ہے۔اگر یہ شرط نہ ہو تو حرام نہیں۔ (از کبیر)

"قل فیھا اثم کبیر": فرما دو ان دونوں میں گناہ ہے بڑا۔

ان مختصر الفاظ مبارکہ میں عظیم مطالب پائے گئے ہیں، یہ عظمت قرآن ہے کہ الفاظ مختصر اور مطالب عظیمہ پائے گئے۔

(۱) انسان کی تمام صفات میں سے اشرف صفت عقل ہے، اور شراب عقل کی دشمن ہے۔

"و کل ما کان عدو الاشرف فھو اخس" ہر وہ چیز جو کسی اعلیٰ اور اشرف چیز کی دشمن ہو وہ خسیس ترین ہوگی۔

اسی سے یہ واضح ہوا کہ شراب پینا تمام امور سے گھٹیا امر (کام) ہے۔

"عقال الناقۃ" اونٹنی کی رسی کو کہتے ہیں جو اسے روک کر رکھتی ہے۔اسی سے "عقل" کو لیا ہوا ہے۔

انسان کی طبیعت جب اس کو برائی کی طرف دعوت دیتی ہے تو عقل اسے روکتی ہے۔شراب پینے والے کی عقل کا زوال ہو جاتا ہے۔اسے برے کاموں سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی، بلکہ برائیوں کی طرف رغبت دلانے والی طبیعت ہی موجود ہوتی ہے۔

ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ ان کا ایک نشئی پر گزر ہوا، دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ پر پیشاب کر کے اپنے چہرے پر مل رہا ہے، جیسا کہ وضو کے لئے پانی چہرے پر ڈالا جاتا ہے، اور وہ یہ پڑھ رہا ہے۔

"الحمدللہ الذی جعل الاسلام نورا والماء طھورا"

حضرت عباس بن مرداس کو زمانہ جاہلیت میں کہا گیا تم شراب کیوں نہیں پیتے کہ اس سے تمہاری جرأت بڑھ

جائے۔تو انہوں نے جواب دیا" مـا انـا آخذ جهلي بيدى فادخله في جو في " شراب پینا تو جہالت ہے کیونکہ شرابی کا ہر کام جاہلوں کی طرح ہوتا ہے۔ میں جہالت کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے پیٹ میں داخل نہیں کرنا چاہتا۔

"ولا ارضى ان اصبح سيد قوم وامسى سفيههم"

شراب پینے والا تو ہر قسم کی بے وقوفی کرتا ،اور میں اپنی قوم کا سردار ہوں،، اس لئے میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں صبح کے وقت (نشہ کے بغیر) قوم کا سردار ہوں اور (شراب پی کر) شام کے وقت ان سب سے بے وقوف ہوں۔

(۲) شراب انسان کو دوسروں سے عداوت کرنے والا اور بغض کرنے والا بنا دیتی ہے۔اور شراب انسان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے۔

(۳) شراب پینا ایسا عظیم جرم ہے کہ جب انسان شراب پینے کا عادی ہو جاتا ہے تو وہ اس برے فعل میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔اور اس کی خوشی اور لذت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے،اسی وجہ سے شراب تمام برائیوں سے زیادہ بری چیز ہے۔ کیونکہ زانی جب زنا کرتا ہے تو اس کی رغبت میں آہستہ آہستہ کمی آتی جاتی ہے، آخر کار وہ زنا کو چھوڑ دیتا ہے۔

"فاذا واظب الانسان عليه صار الانسان غرقافى اللذات البدنية معرضا عن تذكر الآخر والمعاد حتى يصير من الذين نسوا الله فانساهم"

جب انسان شراب پینے پر ہمیشگی اختیار کرتا ہے تو لذات بدنیہ میں غرق ہو جاتا ہے اور آخرت کی یاد سے اعراض کر لیتا ہے۔تو ان لوگوں میں سے ہو جاتا ہے، جو رب تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہیں اور رب تعالیٰ ان کو چھوڑ دیتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ شراب سے عقل زائل ہو جاتی ہے، جب عقل زائل ہو جاتی ہے تو تمام قسم کی برائیاں اسے حاصل ہو جاتی ہیں، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا" الخمر ام الخبائث " شراب تمام برائیوں کی اصل ہے۔

(از کبیر)

جوا میں بڑا گناہ:

اس کی وجہ یہ ہے کہ جوا جواریوں کے درمیان عداوت پیدا کرتا ہے، اس لئے کہ جب ایک شخص دوسرے کا مال مفت ہی میں بٹور لیتا ہے تو وہ شخص اس کا دشمن بن جاتا ہے، ان کے درمیان بغض اور عداوت پیدا ہو جاتے ہیں، جو بہت بڑے گناہ کا سبب ہے۔ اسی طرح جوا بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روکتا ہے۔ لہٰذا عظیم گناہ کا سبب ہے۔

"ومنافع للناس": اور نفع ہے لوگوں کے لئے۔

شراب میں ان کا نفع یہ تھا کہ وہ اس کی تجارت کرتے تھے، دیہاتوں سے سستا خریدتے تھے اور شہروں میں مہنگا بیچتے تھے۔ اور شراب بظاہر جسمانی طاقت کا سبب بھی بنتا ہے۔ پینے والا چستی اور جرأت محسوس کرتا ہے۔

اور جوا میں ان کو نفع یہ تھا کہ وہ آسانی سے دوسرے کا مال حاصل کر لیتے تھے، جوا باز کبھی کبھی بہت زیادہ مال حاصل کر لیتے تھے، ایک محفل میں سو اونٹ ذبح کر دیتے تھے، کبھی محتاجوں کی امداد بھی کر دیتے تھے۔ (از کبیر)

"واثمهما اكبر من نفعهما": اور ان دونوں کا گناہ زیادہ بڑا ہے ان کے نفع سے۔

اس لئے کہ ان دونوں میں منافع عارضی ہیں، لیکن ان دونوں میں گناہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لعنت کا مستحق ہونا، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا ان پر ناراض ہونا، اور شرابی اور جوا باز کا نماز اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دور ہونا یہ سب بہت بڑے گناہ ہیں، معمولی اور عارضی منافع کی کوئی حیثیت نہیں۔ لہٰذا منافع کو لات مار دے اور اپنے آپ کو بہت بڑے گناہ اور رب تعالیٰ کے عذاب سے بچالے۔

☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ☆ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (سورة البقرة آيات ۲۱۹، ۲۲۰)

﴿۱﴾

اورتم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں تم فرماؤ جو فاضل بچے، اسی طرح اللہ تم سے آیتیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم دنیا اور آخرت کے کام سوچ کر کرو۔

﴿۲﴾

اور سوال کرتے ہیں تم سے کتنی مقدار خرچ کریں، تم فرماؤ جو آسان ہو، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے آیات کو تاکہ تم فکر کرو دنیا میں اور آخرت میں۔

جن تیرہ احکام کو ذکر کیا جارہا ہے، ان میں یہ چوتھا حکم اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا جارہا ہے۔ (از کبیر)

شانِ نزول:

"واخرج ابن ابی حاتم من طريق ابان عن يحيى انه بلغه ان معاذ بن جبل وثعلبة اتيا رسول الله ﷺ فقالا يا رسول الله ان لنا ارقاء واهلين فما ننفق من اموالنا فانزل الله تعالى هذه الآية"

یحیٰ بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی کہ حضرت معاذ بن جبل اور ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے غلام بھی ہیں اور اہل وعیال بھی ہم کتنی مقدار میں مال خرچ کریں؟ تو ان کے سوال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

" وقيل نزلت في عمرو بن الجموح كنظير تها "

بعض حضرات نے کہا یہ آیۃ کریمہ حضرت عمرو بن الجموح کے سوال کے بعد نازل ہوئی جبکہ انہوں نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے غلام بھی ہیں اور اہل وعیال بھی ہم کتنی مقدار میں مال خرچ کریں؟۔ (روح المعانی)

تاہم مسئلہ واضح ہے کہ معاذ بن جبل اور ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بھی سوال کیا، اور حضرت عمرو بن الجموع نے بھی سوال کیا، ان تینوں حضرات کے سوال کے جواب میں آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

مختصر مطلب:

نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے کہ آپ سے صحابہ کرام سوال کرتے ہیں کہ وہ کتنی مقدار میں مال خرچ کریں؟ آپ ان کو فرمادو جتنی مقدار میں مال خرچ کرنے میں تم آسانی سمجھو، اتنی مقدار میں مال خرچ کرو، اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت کے معاملات میں فکر کرو۔

"ویسئلونک ماذاینفقون": " ای ما قدرہ " اور وہ آپ سوال کرتے ہیں وہ کتنی مقدار میں مال خرچ کریں۔

"قل انفقو **العفو** ای الفاضل عن الحاجة": آپ فرمادو خرچ کرو جو تمہاری حاجت سے زائد ہو۔

تمام مال خرچ نہ کردو کہ تم خود محتاج ہو جاؤ، اور اپنے آپ کو ضائع کرلو۔ (جلالین)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر جلالین کے مطابق ہے۔

" العفو " وھو نقیض الجھد وھو المشقة، ونقیضه الیسر والسھولة "

یعنی عفو نقیض ہے جہد کی۔ جہد کا معنی ہے مشقت اٹھانا، محنت سے کام کرنا، اور اس کے مقابل "یسر اور سہولت" کے الفاظ استعمال ہیں کہ آسانی سے کام کرنا۔

یہی مطلب ہے " العفو " کا، گویا کہ یہ کہا گیا ہے۔

" قل انفق ما سھل و تیسر ولم یشق علیک انفاقه فالعفو من المال ما یسھل انفاقه والجھد من المال ما یسعر انفاقه "

کہ آپ فرمادو اتنی مقدار میں مال خرچ کرو جو تمہیں آسان ہو، جس کا خرچ کرنا تم پر مشکل نہ ہو۔

واضح ہوا کہ " العفو من المال" کا یہ مطلب ہے جس کا خرچ کرنا آسان ہو، اوراس کے مقابل "الجھد من المال" کا مطلب یہ ہوگا جس کا خرچ کرنا مشکل ہوگا، ہاں البتہ مال کا خرچ کرنا آسان اسی وقت ہوگا۔ (روح البیان)

"العفو" کے تمام معانی ایک معنی میں سمٹ کرآ جاتے ہیں۔ وہی معنی جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بیان فرمایا۔

"العفو، یعنی الفضل" العفو کا معنی ہر چیز میں آسانی کا پایا جانا ہے۔

" وعن الربیع افضل مالک واطیبه "

حضرت ربیع رحمۃ اللہ فرماتے ہیں " العفو "کا معنی ہے تمہارا افضل اور پاکیزہ مال۔

" والکل یرجع الی الفضل " تمام معانی فضل کی طرف لوٹتے ہیں۔

یعنی تم اپنا پاکیزہ مال، حاجت سے زائد مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو، جس کا خرچ کرنا تم پر آسان ہو۔

(ابن کثیر)

☆ " عن ابن هريرة قال قال رجل یا رسول الله ﷺ عندی دینار قال انفقه علی نفسک ، قال عندی آخر ،قال انفقه علی اهلک ، قال عندی آخر ،قال انفقه علی ولدک ، قال عندی آخر ، قال فانت ابصر " (رواه ابن جریر)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک دینار ہے، آپ نے فرمایا، اپنے آپ پر خرچ کرلو، اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے، تو آپ نے فرمایا، وہ اپنی زوجہ پر خرچ کرلو، پھر اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے، آپ نے فرمایا، وہ اپنی اولاد پر خرچ کرلو، پھر اس نے کہا میرے پاس ایک اور بھی دینار ہے تو آپ نے فرمایا، تم جو بہتر سمجھو، یعنی جس جائز کام میں خرچ کرنا چاہو کرلو۔ (ابن کثیر)

تنبیہ: اس حدیث پاک میں اگرچہ صیغے خبر کے ہیں، لیکن معنی استفہام والا پایا گیا ہے، یعنی اس شخص کا مطلب یہ تھا کہ میرے پاس ایک دینار ہو تو کیا کروں؟ اگر دو ہوں تو پھر کیا کروں؟ اگر تین ہوں تو پھر کیا کروں؟ اور اگر چار ہوں تو پھر کیا کروں۔

☆ "وعن جابر ان رسول اللہ ﷺ قال لرجل ابدأ بنفسک فتصدق علیها فان فضل شئ فلأهلک فان فضل شئ عن اهلک فلذی قرابتک فان فضل عن ذی قرابتک شئ فهکذا فهکذا" (رواہ ابن جریر، ورواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو فرمایا ابتداء اپنے نفس سے کرو، یعنی اپنے نفس پر پہلے خرچ کرو، اگر مال بچ جائے تو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرو، پھر اپنے قریبی رشتہ داروں پر مال خرچ کرو، پھر اس طرح اور اس طرح، یعنی رشتہ داروں سے جو مال بچ گیا وہ اللہ کی راہ میں جہاں جہاں سمجھو خرچ کرو۔

☆ "عن ابن هریرة قال قال رسول ﷺ خیر الصدقة ما کان علی ظهر غنی والید العلیا خیر من الید السفلی وابدأ بمن تعول" (رواہ مسلم)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہتر صدقہ وہ ہے جو غنی ادا کرے (یعنی صدقہ کرنے کے بعد بھی محتاج نہ ہو) اوپر والا ہاتھ (دینے والا ہاتھ) نیچے والے ہاتھ (لینے والے ہاتھ) سے بہتر ہے، ابتداء خرچ کی اپنے اہل وعیال سے کرو۔ (ابن کثیر)

عفو کی تین قسمیں:

عبدالملک بن مروان نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف خط لکھا "العفو" کے متعلق سوال کیا گیا کہ "عفو" سے مراد کیا ہے؟

"فقال العفو علی ثلاثة انحاء نحو تجاوز عن الذنب ونحو فی القصد فی النفقة ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو ونحو فی الاحسان فیما بین الناس الا ان یعفو الذی بیده عقدة النکاح" (اخرجه ابن المنذر عن عطاء بن دینار الهذلی) (درمنشور)

تو انہوں نے فرمایا "عفو" کی تین قسمیں ہیں، ایک گناہ معاف کرنا، اور دوسری قسم خرچ میں میانہ روی اختیار کرنا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) اور وہ سوال کرتے ہیں آپ سے کتنی مقدار

میں خرچ کریں، آپ فرماؤ''العفو'' جتنا آسان ہو، (میانہ روی پر مبنی ہو) اور تیسری قسم ہے احسان کرنا، رب تعالیٰ کے ارشادگرامی " الاان یعفو الذی بیده عقدة النکاح " میں یہی معنی ہے (مگر یہ احسان کرے وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے)۔

☆ " واخرج البخاری والنسائی عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ افضل الصدقة ما ترک غنی والید العلیاء خیر من الید السفلی وابدأ بمن تعول تقول المرأة اما ان تطعمنی واماان تطلقنی ویقول العبد اطعمنی واستعملنی ویقول الابن اطعمنی الی من تدعنی" (درمنثور)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہتر صدقہ وہ ہے جس کے بعد انسان غنی رہے، اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے (دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے) اور ابتداء اپنے اہل وعیال سے کرو (ایسا نہ ہو کہ) عورت کہے یا مجھے خرچ دو یا مجھے طلاق دو، اور غلام کہے کہ مجھے کھانا دو تو مجھ سے کام لو، اور بیٹا کہے مجھے طعام دو تم مجھے کس کی کفالت میں چھوڑ رہے ہو۔

☆ "واخرج ابن سعد وابو داؤد والحاکم وصححه عن جابر بن عبدالله قال کنا عند رسول الله ﷺ اذ جاء رجل وفی لفظ قدم ابو حصین السلمی بمثل بیضة الحمامة من ذهب فقال یارسول الله اصبت هذه من معدن فخذ ها فهی صدقة ما املک غیر ها فاعرض عنه رسول الله ﷺ ثم اتاه من خلفه فاخذها رسول الله ﷺ فخذفه بها فلو اصابته لاوجعته اولعقرته فقال یاتی احدکم بما یملک فیقول هذه صدقة ثم یقعد یستکف الناس خیر الصدقة ماکان عن ظهر غنی وابدا بمن تعول " (درمنثور)

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ ایک شخص (ابوحصین سلمی) آپ کے پاس آئے ان کے پاس کبوتری کے انڈے کی مثل سونا تھا، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ میں نے معدن (کان) سے پایا ہے آپ یہ لے لیں، میں یہ صدقہ کرتا ہوں۔ اور اس کے سوا بھی

میں جس کا مالک ہوں، بعض حضرات نے ما نافیہ کا معنی بھی کیا ہے ''میں اس کے سواء کسی چیز کا مالک نہیں''، تو رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے اعراض فرمایا۔ پھر وہ آپ کے پاس دوسری جانب حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یہ صدقہ ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے وہ لے کر پھینک دیا، اگر اس شخص کو لگتا تو وہ زخمی ہو جاتا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے میں تمام مال صدقہ کرتا ہوں، پھر بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے شروع کر دیتا ہے، بہتر صدقہ وہ ہے جو دینے کے بعد بھی انسان غنی رہے۔ اور ابتداء اپنے اہل وعیال سے کرو۔

اعتراض: زیر بحث آیۃ کریمہ اور بیان کردہ احادیث سے یہ واضح ہوا کہ تمام مال خرچ کرنا مکروہ ہے، ناپسندیدہ عمل ہے، اور کم مال والا شخص مال خرچ کر کے اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالے۔

اور دوسری احادیث (جن کو قریب ہی ان شاء اللہ ذکر کیا جا رہا ہے) سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ تو ان احادیث میں تطبیق کیسے ہوگی کہ بعض احادیث میں کل مال صدقہ کرنے کی ممانعت ہے اور بعض میں کل مال صدقہ کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

جواب: ''الحکم یختلف باختلاف الاشخاص و الاحوال''، مختلف شخصوں اور مختلف حالات اور مختلف اوقات کے لحاظ پر احکام مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص کے لئے حکم اور ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے اور ہوتا ہے۔

''فمن کان بعد مایتصدق کل ماله یتکفف الناس و لا یستطیع الصبر علی الفقر لا یجوز له ذلک''

جو شخص کل مال صدقہ کرنے کے بعد لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا شروع کر دے اور فقر پر صبر کرنے کی طاقت نہ رکھے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا تمام مال صدقہ کر دے۔

''ومن یقدر علی الصبر ولیس علیه حق من حقوق الناس فالا فضل فی حقه البذل فی سبیل الله''

اور جو شخص اللہ تعالی کی راہ میں کل مال خرچ کر کے صبر کر سکے، لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے

اوراس پر لوگوں کے حقوق نہیں، تو اس کے لئے تمام مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا افضل ہے۔

لوگوں کے حقوق سے یہ مراد ہے کہ لوگوں کا قرض ادا کرنا ہے، اور اہل وعیال کا خرچ اور خادم کا خرچ یا رشتہ دار جو محتاج ہو جائیں ان کو اپنی طاقت اور رشتہ کے تعلق کی نسبت کے مطابق مال دینا۔

" (فهذه الحقوق)مقدم على التصدق على الاجنبي لامحالة فان ذلك فريضة وهذه نافلة ،،

یہ حقوق اس لئے مقدم ہیں کہ یہ فرض ہیں اور اجنبی لوگوں پر مال خرچ کرنا مستحب ہے، اس لئے اس کا حق بعد میں ہے۔ (از مظہری)

وہ احادیث جن میں تمام مال خرچ کرنے کی فضیلت کا بیان ہے:

" عن ابی امامة سئل عن النبی ﷺ ای الصدقة افضل قال جهد المقل و ابدأ بمن تعول" (رواہ ابو داؤد)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا تنگدست شخص مشقت سے صدقہ دے، اور ابتداء اپنے اہل وعیال سے کرو۔

☆ "عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لو كان لی مثل احد ذهبا لسرنی ان لا يمر علی ثلاث ليال" (رواہ البخاری)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ کی طرح سونا تو مجھے یہ پسند ہے کہ وہ میرے پاس (تین دن) تین راتیں نہ رہے۔

☆ " وعن اسماء قالتقالرسول الله ﷺ انفقی و لا تحصی فيحصی الله عليك و لا توعی فيوعی الله عليك ارضخی ما استعطت" (بخاری ومسلم)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے (مجھے) فرمایا، مال خرچ کرو، اور گنتی نہ کرو اللہ تعالیٰ بھی تم پر گنتی کرے گا۔ اور جمع کر کے نہ رکھو، اللہ تعالیٰ بھی تم پر روک کر رکھے گا، جتنی طاقت رکھتی ہو (اتنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر کے لوگوں کو) نفع پہنچاؤ۔ (از مظہری)

☆ "وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال امرنا رسول اللہ ﷺ ان نتصدق ووافق ذلک ما لاعندی فقلت الیوم اسبق ابابکر رضی اللہ عنہ فجئت بنصف مالی فتصدقت بہ فقال رسول اللہ ما ابقیت لا ھلک یا عمر قلت نصف مالی یا رسول اللہ ، ثم قال لابی بکر ماابقیت لاھلک قال لھم اللہ ورسولہ فقلت لا اسابقک بشیء بعدھا،روی ان النبی ﷺ قال عندذلک ما بینکما مابین کلامیکما" (روح البیان)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم فرمایا، اتفاقاً اس دن میرے پاس زیادہ مقدار میں مال تھا، میں نے کہا آج میں ابوبکر (رضی اللہ عنہ) سے سبقت لے جاؤں گا۔تو میں اپنا آدھا مال لے آیا، وہ صدقہ کردیا۔ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے اپنے اہل وعیال کے لئے کتنا مال باقی رکھا،اے عمر؟ میں نے عرض کیا آدھا مال یارسول اللہ۔ پھر آپ نے حضرت ابوبکر سے پوچھا تم نے اپنے اہل وعیال کے لئے کتنا مال باقی رکھا؟ انہوں نے کہا، اہل وعیال کے لئے تو اللہ اوراس کے رسول کافی ہیں۔حضرت عمر کہتے ہیں، میں نے ابوبکر کو کہا آج کے بعد میں تمہارے ساتھ مقابلہ نہیں کروں گا۔ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے درمیان وہی فرق ہے جو تمہارے کلاموں کے درمیان فرق ہے۔

فائدہ:

• "کان ابو بکر غالب المعرفۃ وعمر غالب الشریعۃ و عثمان غالب الطریقۃ وعلی غالب الحقیقۃ وان کانوا کاملین فی اللہ لمراتب الاربع" (روح البیان)

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم معرفت وشریعت وطریقت وحقیقت میں کمال درجہ رکھتے تھے،تاہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ معرفت میں باقی حضرات پر غالب تھے،اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بنسبت باقی حضرات کے شریعت غالب تھی،اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ طریقت میں باقی حضرات سے زیادہ کمال رکھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حقیقت میں باقی حضرات سے زیادہ کمال رکھتے تھے۔

غریب کے لئے خوشخبری:

"وحث النبی علیہ السلام اصحابہ علی الصدقۃ فجعل الناس یتصدق وکان ابوامامۃ الباھلی جالسا بین یدیہ علیہ السلام وھو یحرک شفتیہ فقال لہ النبی علیہ السلام ماذاتقول حیث تحرک شفتیک قال انی اری الناس یتصدقون ولیس معی شئ اتصدی بہ فاقول فی نفسی سبحان اللہ والحمدللہ ولاالہ الااللہ واللہ اکبر فقال ﷺ ھؤلاء الکلمات خیر لک من مد ذھبا تتصدق بہ علی المساکین"

(روح البیان)

نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کوصدقہ پر برانگیختہ کیا (ابھارا) لوگوں نے صدقہ دینا شروع کیا۔ ابوامامہ باہلی نبی کریم ﷺ کے سامنے بیٹھ کر اپنے ہونٹوں کوحرکت دے رہے تھے، تو ان سے نبی کریم ﷺ نے پوچھا تم اپنے ہونٹوں کوحرکت دے رہے تھے تو کیا کہہ رہے تھے؟ انہوں نے عرض کیا کہ بیشک میں نے لوگوں کوصدقہ کرتے ہوئے دیکھا، میرے پاس کوئی چیز نہیں تھی کہ میں اس کے درپے ہوتا۔ (یعنی میرے پاس مال نہیں تھا کہ میں صدقہ کرتا) تو میں اپنے دل میں یہ پڑھ رہا تھا" سبحان اللہ والحمدللہ ولاالہ الا اللہ واللہ اکبر" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ کلمات پڑھنا تمہارے لئے مد (صاع کا چوتھائی حصہ) سونا مساکین پر خرچ کرنے سے بہتر ہے۔

فائدہ: بیشک سب سے پہلے " سبحان اللہ " جبریل علیہ السلام نے کہا، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ان کی نظر عرش پر پڑی تو عرش کی عظمت کو دیکھ کر کہا" سبحان اللہ"

" فمن قالھا نال ثواب جبریل " جس شخص نے " سبحان اللہ " پڑھا اس نے جبریل علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔

حضرت آدم صفی اللہ میں جب روح پھونکی گئی تو سب سے پہلے آپ نے پڑھا "الحمدللہ"

"فمن قالھانال نصیبھامن فضل آدم" جس شخص نے "الحمدللہ" پڑھا اس نے حضرت آدم علیہ

السلام کی سنت پر عمل کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔

سب سے پہلے حضرت نوح نجی اللہ نے اس وقت " لا الــــہ الا اللہ " پڑھا جبکہ آپ نے طوفان اور شدید مصائب کا مشاہدہ فرمایا۔

" فمن قالھا اخذحظاوافرامن ثواب نوح " جس شخص نے " لا الہ الا اللہ " پڑھا اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے ثواب کا کامل اور وافر حصہ پالیا۔

سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت "اللہ اکبر " پڑھا جبکہ انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی جگہ رب تعالیٰ کی طرف سے دنبہ قربانی کرنے کے لئے بطور فدیہ مشاہدہ فرمایا۔

" فمن قالھا نال فیضامن فیض ابراھیم " جس شخص نے "اللہ اکبر" پڑھا اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنے کا فیضان حاصل کرلیا۔

"اللھم اجعلنا من الذاکرین الشاکرین آمین یا رب العلمین " (روح البیان)

"کذلک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تتفکرون فی الدنیا والآخرۃ:

اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات تاکہ تم فکر کرو دنیا اور آخرت میں۔

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ مشقت میں پڑ کر خرچ کرنے کی بجائے اتنی مقدار میں خرچ کیا جائے جس میں آسانی ہو اور جو اہل وعیال کی حاجت سے زائد ہو وہ خرچ کیا جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات کو بیان فرماتا ہے جو احکام شریعت پر دلالت کرتی ہیں۔

تنبیہ:

" تبیین الآیات تنزیلھا مبینۃ الفحوی واضحۃ المدلول لا انہ تبیینھا بعد ان کانت مشتبھۃ وملتبسۃ"

آیات کو بیان کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے آیات کو مشتبہ طور پر نازل کیا جاتا ہے اور ان سے مضامین کو خلط ملط کر کے نازل کیا جاتا، پھر ان کی وضاحت کی جاتی ہے اور ان کو بیان کیا جاتا ہے بلکہ بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آیات کریمہ کو واضح طور پر نازل فرماتا ہے جن سے مطالب واضح ہوتے ہیں۔

اعتراض:

" کذلک " میں کاف واحد ہے حالانکہ کاف محل نصب میں صفت ہے مصدر محذوف " تبییناً " ن۔ جب مخاطبین کی تعداد کثیر ہے تو " کذلکم " کیونکہ ذکر نہیں کیا گیا۔

جواب:

"وافراد حرف الخطاب مع تعداد المخاطبین با عتبار القبیل او الفریق او القوم مما هو مفرد اللفظ ومجموع المعنی "

" کذلک " میں حرف خطاب کو مفرد ذکر کیا گیا ہے باوجود اس کے کہ مخاطبین کی تعداد کثیر ہے اس لئے اس سے مراد قبیلہ یا فریق یا قوم ہے، جو لفظاً مفرد ہیں اور معنی جمع ہیں۔

دنیاو آخرت میں فکر کرنے سے مراد کیا ہے؟

اس سے مراد یہ ہے۔

" لکی تتفکروا فی امور الدارین فتأخذوا بما هو اصلح لکم واسهل فی الدنیا وانفع فی العقبی وتجنبوا عما یضمر کم فی العقبی "

کہ تم دنیا اور آخرت کے امور میں فکر و کر و اور سمجھو کہ تمہارے لئے نفع مند کیا ہے اور نقصان دہ کیا ہے، تم اس چیز کو حاصل کرو جو دنیا میں تمہارے لئے نفع مند اور آسان ہو۔ اور آخرت میں نفع مند

ہو۔ جو چیز آخرت میں تمہارے لئے نقصان دے ہو اس سے تم اجتناب کرو۔

"قال البغوی یبین الآیات فی امر الدنیا والآخرة لعلکم تتفکرون فی زوال الدنیا وفنائها فتزهدوا وفی اقبال الآخرة وبقائها فترغبوا فیها"

علامہ بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے امور دنیا اور امور آخرت کو بیان کرتا ہے۔ تاکہ تم دنیا کے زوال اور دنیا کے فانی ہونے میں تفکر کرو (سوچو) اور زہد اختیار کرو، یعنی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرو، اور آخرت کے آنے کو سوچو، اور آخرت سے باقی رہنے پر غور فکرو اور آخرت کی طرف رغبت کرو۔

"وهذه الآیة ترغب فی التصدق"

اور یہ آیۃ کریمہ صدقہ ادا کرنے کی رغبت دلاتی ہے، کہ جو تمہارے لئے آسان ہو اتنی مقدار میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ (روح البیان)

علامہ رازی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ آیۃ کریمہ کا مطلب یہ سمجھ آ رہا ہے جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ شراب اور جوا دنیا میں بظاہر کچھ نفع کا سبب بھی بنتے ہیں۔ لیکن آخرت میں گناہ اور نقصان کا سبب ہیں۔ جب تم دنیا اور آخرت کے احوال میں غور وفکر کرو گے تو تمہیں سمجھ آ جائے گا کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینا ضروری ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کی راہ میں مال خرچ کرنا آخرت میں کامیابی اور ثواب حاصل کرنے کے لئے ہے۔ اور مال کو جمع کر کے رکھنا اور نہ خرچ کرنا دنیا کے لئے ہے، تو تم دنیا اور آخرت کے احوال کو سوچو، خود بخود تمہیں یقین حاصل ہو جائے گا کہ دنیا پر آخرت کو ترجیح حاصل ہے۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتَامٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَمِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ☆ (سورة البقرة آيت نمبر ۲۲۰)

﴿۱﴾

اورتم سے یتیموں کا مسئلہ پوچھتے ہیں تم فرماؤان کا بھلا کرنا بہتر ہےاوراگراپناان کاخرچ ملالوتووہ تمہارے بھائی ہیں،اور خداخوب جانتا ہے بگاڑنے والے کوسنوارنے والے سےاوراللہ چاہتاتوتمہیں مشقت میں ڈالتا،بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

﴿۲﴾

اورسوال کرتے ہیں آپ سے یتیموں کے متعلق،فرمادو بھلائی کرناان سے بہتر ہے۔ اوراگرتم ملالوان کے(خرچ کواپنے خرچ سے)تو بھائی ہیں تمہارے،اوراللہ جانتا ہےفساد پھیلانے والے کو بھلائی کرنے والے سے،اوراگرچاہتااللہ تو مشقت میں ڈالتاتمہیں،بےشک اللہ غالب ہے(اور)حکمت والا ہے۔

ماقبل سے رابطہ:

یہاں چنداحکام ذکر کیئے جارہے ہیں،ان میں سے یہ پانچواں حکم ہے۔ (کبیر)

شانِ نزول:

" اخرج ابو داؤد والنسائی وابن جریر وجماعة عن ابن عباس رضی الله عنهما قال لما انزل الله تعالٰی "ولا تقربوامال الیتیم الابالتی هی احسن". "وان الذین یا کلو ن

اموال الیتا می ظلما انما یا کلون فی بطونھم نارا وسیصلو ن سعیرا " انطلق من کان عبدہ یتیم فعزل طعامہ من طعامہ و شرابہ من شرابہ فجعل یفضل لہ الشیٔ من طعامہ فیحبس لہ حتی یأکلہ او یفسد فیر می بہ فاشتد ذلک علیھم فذ کروا ذلک لرسول اللہ ﷺ فنزلت "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابوداؤد، نسائی اور جریر نے روایت بیان فرمائی، آپ فرماتے ہیں جب آیۃ کریمہ "ولا تقربو امال الیتیم الابالتی ھی احسن " (اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال سوائے احسن طریقہ کے) نازل ہوئی۔

اور آیۃ کریمہ "ان الذین یا کلون اموال الیتامی ظلما انما یا کلون فی بطونھم نارا وسیصلون سعیرا" (بے شک وہ لوگ جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ تو اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور وہ جلیں گے بھڑکتی آگ میں) نازل ہوئی، تو صحابہ کرام جن کی پرورش میں یتیم تھے، انہوں نے یتیموں کا مال یعنی کھانے پینے کی چیزیں اپنی کھانے پینے کی چیزوں سے جدا کر دیں۔ اگر یتیم کے کھانے سے کچھ کھانا بچ جاتا تو اسے علیحدہ ہی رکھ لیا جاتا یا وہ کھانا یتیم کھا لے۔ یا وہ گل سڑ جاتا اور اسے پھینک دیا جاتا۔ یہ صورت حال صحابہ کرام پر سخت تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس مشکل کا ذکر کیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

مختصر مطلب:

جب وہ آیات پہلے نازل ہوئیں جن میں یتیموں کے مال کھانے سے عذاب سے ڈرایا گیا تو صحابہ کرام نے یتیموں کا کھانا پینا علیحدہ کر دیا، لیکن پھر اسے مشکل سمجھ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو رب تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا، کہا کہ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں تو آپ ان کو بتا دیں کہ یتیموں کی بھلائی کے لئے جو کام بھی کریں وہی ان کے لئے اور تمہارے لئے بہتر ہے، اور وہ جانتا ہے کہ کون فساد پھیلانے والا ہے اور کون

اصلاح کرنے والا ہے، اور اگر ان کا خرچ اپنے خرچ سے ان کے فائدہ کے لئے ملا لو تو یہ بھی بہتر ہے کیونکہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے جس نے تمہارے لئے آسانی پیدا کر دی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ تم ان کا خرچ علیحدہ ہی رکھو اور اس وجہ سے مشقت میں پڑے رہو تو اللہ تعالیٰ ایسا بھی کر سکتا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے۔

"یسئلونک عن الیتامی":

"یسئلو نک عن القیام بأمر الیتامی او التصرف اموالھم او عن امرھم و کیف یکونون معھم"

آپ سے سوال کرتے ہیں یتیموں کے معاملات قائم کرنے کے متعلق، اور ان کے مالوں میں تصرف کرنے کے متعلق اور ان کے ساتھ معاملات رکھنے کے متعلق کہ وہ کیسے ان کے ساتھ رہیں۔

یتیم کون ہے؟

عام لوگوں کے عرف میں یتیم اسے کہا جاتا ہے جس کا باپ نہ ہو، یا جس کی ماں نہ ہو، لیکن اصطلاح شرع میں......

" ان الایتام ھم الفاقدون لآبائھم وھم صغار و لا یطلق ذلک علیھم بعد البلو غ الاعلی وجه المجاز لقرب عھد ھم با لیتیم "

یتیم ان کو کہا جائے گا جن کے باپ فوت ہو جائیں، اور وہ نابالغ ہوں، جب بالغ ہو جائیں تو ان کو یتیم نہیں کہا جائے گا، ہاں البتہ بالغ ہونے کے بعد ان کی یتیمی کے وقت کو قریب دیکھ کر مجازی طور پر یتیم کہہ لیا جاتا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

سوال حال سے یا قال سے:

صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ سے یتیموں کے متعلق سوال کیا، اس سوال میں دو احتمال ہیں۔

" ثم ھھنا یحتمل انھم سألوا الرسول عن ھذہ الواقعة"

ایک احتمال یہ ہے کہ صحابہ کرام نے زبان سے سوال کیا ہو۔

" ویحتمل ان السؤال کان فی قلبھم وانھم تمنوا ان یبین اللہ لھم کیفیة الحال فی ھذا الباب "

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ سوال ان کے دل میں تھا، اور ان کے دل میں تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے یتیموں کے متعلق مسائل بیان فرمادے۔

یعنی پہلے احتمال میں سوال زبان قال سے تھا اور دوسرے احتمال میں سوال زبان حال سے تھا۔ (از کبیر)

"قل اصلاح لھم خیر": فرمادو بھلائی کرنا ان سے بہتر ہے۔

یتیموں کی اصلاح کیا ہے؟

ایک معنی تو یہاں خاص ہے، جو آیۃ کریمہ کے شانِ نزول کے مطابق ہے، وہ یہ ہے کہ تم ان کے خرچ کو اپنے خرچ سے ان کی بھلائی کے لئے ملاؤ کہ ان کے خرچ میں بچت ہو اور اس لئے ان کے مال کو اپنے مال سے ملاؤ کہ تجارت وغیرہ سے ان کا مال بڑھتا رہے، اور ان کے مال کو اپنے مال سے اس لئے ملاؤ کہ ان کا مال محفوظ رہے تو یہ بہتر ہے، کیونکہ ان سب صورتوں میں ان کی بھلائی ہے اور ان پر احسان ہے یتیم کی بھلائی میں اپنی بھلائی ہے۔

(روح المعانی)

دوسرا معنی عام ہے جو ہر قسم کی بھلائی کو شامل ہے، یعنی یتیم پر ہر قسم کی بھلائی کرو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔

" ھذا الکلام یجمع النظر فی صلاح الیتیم با لتقویم والتا دیب وغیر ھما"

یتیم کی اصلاح اس میں بھی ہے کہ اس کی اچھی طرح پرورش کی جائے تا کہ اس کی جسمانی ساخت مضبوط ہو سکے، بھوک سے بلبلاتا نہ رہے، خوراک کی کمی سے اسے کمزور اور کوتاہ قد نہ کر دیا جائے۔ اور یتیم کی اصلاح یہ ہے کہ اسے ادب سکھایا جائے، اس کی تعلیم کا خصوصی خیال رکھا

جائے، اس کے افعال و اقوال پر نظر رکھی جائے، برے دوستوں اور بری مجالس سے اسے بچایا جائے، نیک لوگوں کی محافل میں اسے بھیجا جائے۔

"لکی ینشأ علی علم و ادب و فضل لان هذاالصنع اعظم تاثیرا فیه من اصلاح ماله بالتجارة"

تاکہ وہ بڑا ہو کر عالم بن جائے، مؤدب ہو اور صاحبِ فضل ہو جائے، یہ تعلیم و تربیت اس کے مال میں تجارت کر کے اصلاح کرنے سے زیادہ موثر اور نفع مند ہے۔

البتہ اس کے مال کی حفاظت اور اسے بڑھانے کی تدبیر بھی یتیم پر احسان ہے۔ حقیقی طور پر آیۃ کریمہ سے مراد وہی ہے۔

"فهذه الکلمة جامعة لجمیع مصالح الیتیم و الولی"

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی "قل اصلاح لهم خیر" مختصر جملہ ہے لیکن یتیم اور اس کے ولی کے حق میں ہر قسم کی بھلائی کو شامل ہے۔

اعتراض:

"اصلاح" کے لفظ کے لئے مشہور تو یہ ہے "لا یتناول الاتدبیر انفسهم دون مالهم" کہ یہ صرف جانوں کی تدبیر کو شامل ہے، مال کی تدبیر کو شامل نہیں، تو یہاں "اصلاح" کے ذکر کا کیا مطلب ہے؟

جواب:

"قلنالیس کذلک لأن مایؤدی الی اصلاح ماله بالتنمیة و الزیادة یکون اصلاحاله"

یہ قول جو مشہور ہے درست ہی نہیں، کیونکہ مال کی تجارت سے بڑھانا اور مال کی حفاظت کرنا اگرچہ بظاہر ہر مال کی اصلاح ہے، لیکن حقیقت میں مال والے کا ہی اس میں بھلا ہے، اس طرح مال کی اصلاح بھی جان کی ہی اصلاح ہے۔

یہ جملہ ولی کی بھلائی کوشامل ہے:

''اصلاح اموالھم من غیرعوض ولااجرۃ خیر للولی واعظم اجراله''

یتیموں کی ولیوں کا ان کے مال کی اصلاح کرنا اوراس کا معاوضہ نہ لیناولی کے لئے بہتر ہے اور عظیم اجر کا سبب ہے۔

''فوجب حملہ علی الخیرات العائدۃ الی الولی والی الیتیم فی اصلاح النفس و اصلاح المال''

یہ آیۃ کریمہ ہرقسم کی بھلائی کوشامل ہے،خواہ وہ بھلائی یتیم سے متعلق ہو یا یتیم کے ولی سے،اسی طرح اس بھلائی کاتعلق مال سے ہویاجان سے ہو۔ (از کبیر)

یتیم کی اصلاح کے متعلق چند مسائل:

مسئلہ : جب یتیم کے مال کواپنے مال سے ملانا جائز ہے،بشرطیکہ یتیم کے مال کی اصلاح مقصود ہو،تو اس سے یہ سمجھ آیا کہ اگر یتیم کے مال کی تجارت (خریدوفروخت) نفع مند ہوتواس کے مال کی خریدوفروخت جائز ہوگی۔

مسئلہ : یتیم کا ولی اس کا مال کسی شخص کوبطور مضاربت دے کہ تم اس مال سے تجارت کرواور نفع میں اتنا حصہ صاحب مال کا ہوگا،اوراتنا حصہ تمہارا،تو یہ جائز ہے،بلکہ ولی خودبھی مضاربت پریتیم کے مال میں تصرف کرسکتا ہے۔

مسئلہ: قاضی کوحق حاصل ہے کہ اگر یتیم (نابالغ) کا نکاح اس کے لئے مفید سمجھے،یعنی اب کفول رہی ہے،پھر ہو سکتا ہے نہ ملے۔اس قسم کا کوئی فائدہ نکاح میں سمجھا جائے تواس کا نکاح کردینااس کے حق میں اصلاح ہے۔

مسئلہ : یتیم کی اشیاء میں سے کسی چیز کوکرایہ پردینااوریتیم کے لئے کسی چیز کوکرایہ پرلینااگرمفید ہوتوولی کے لئے کرایہ کالین دین جائز ہوگا۔ (احکام القرآن للجصاص)

''وان تخالطوھم فاخوانکم'':

اوراگرتم ملاؤان (کے خرچ کواپنے خرچ سے) توبھائی ہیں تمہارے۔

"المخالطة" کا مطلب یہ ہے کہ چیزوں کو اس طرح ملا جلا دینا کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہو سکیں۔

"خلاط" بمعنی جماع بھی آتا ہے، اور خلاط کا معنی جنون بھی ہے، کہ جب کسی شخص کی عقل زائل ہو جاتی ہے، تو اس پر تمام امور خلط ملط ہو جاتے ہیں۔

ان الفاظ مبارکہ کی تفسیر میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں:

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے طعام، مشروبات، اور مسکن (ٹھہرنے کا مکان) اور خدام میں اختلاط کر لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ کیونکہ یتیموں کے مال کھانے پر جب عذاب کا ذکر کیا گیا تو صحابہ کرام نے ان کے مالوں کو اپنے مالوں سے جدا کر لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مباح کر دیا کہ جس طرح اپنی اولاد کے مال کو اپنے مال سے ملا لیا جاتا ہے، اسی طرح یتیموں کے طعام کو اپنے طعام سے اور ان کے مشروب کو اپنے مشروب سے اور ان کے مسکن کو اپنے مسکن سے ملا لو، اس سے ان پر مہربانی ہوگی، اور حسن معاشرت پائی جائے گی۔

" والمعنی وان تخالطوهم بما لا يتضمن افساد اموالهم فذلک جائز "

مطلب یہ ہوا کہ ان مال کو اپنے مال سے اس طرح ملاؤ کہ ان کا نقصان نہ ہو تو یہ جائز ہے۔

☆ "واخرج عبد بن حميد وابو حاتم عن ابن عباس المخالطة ان يشرب من لبنک و تشرب من لبنه ويا کل فی قصعتک وتا کل فی قصعته ويا کل من تمرتک وتا کل من تمرته"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "مخالطة" کی تفسیر یوں کی کہ وہ تمہارا دودھ پئے تم اس کا دودھ پیئو، وہ تمہارے پیالہ سے کھائے اور تم اس کے پیالہ سے کھاؤ، اور وہ تمہاری کھجوریں کھائے اور تم اس کی کھجوریں کھاؤ۔

(۲) دوسری وجہ اس میں یہ پائی گئی ہے۔

" المراد بهذه المخالطة ان ینتفعوا باموالهم بقدر ما یکون اجرة مثل ذلک العمل "

کہ مخالطة کا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے ولی جوان کے مال کی دیکھ بھال میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وہ اتنی اجرت لے سکتے ہیں جتنی عام انسان کسی دوسرے سے ایسے کام کی اجرت لیتا ہے۔

پھر اس میں دو مذہب ہیں۔ ایک یہ کہ ولی خواہ امیر ہو یا غریب ہو، یتیم کے مال سے مناسب اجرت لے سکتا ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ غریب شخص تو مناسب اجرت لے سکتا ہے۔ لیکن غنی شخص اجرت نہیں لے سکتا، کیونکہ یتیموں کی پرورش ان پر واجب ہے اور وہ حاجتمند نہیں اس لئے وہ اجرت نہیں لے سکتے۔

ان حضرات نے اپنے موقف پر دلیل یہ قائم کی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

" ومن کان غنیا فلیستعفف ومن کان فقیرا فلیاکل بالمعروف "

جو شخص غنی ہو وہ درگزر کرے اور جو شخص فقیر ہو وہ معروف طریقہ سے کھالے۔

بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے ان حضرات نے یہ بیان کیا کہ اگر یتیم کے غریب ولی نے اپنی حاجت کے مطابق اس کے مال سے کچھ لے لیا "ویردہ اذا الیسر فان لم یوسر تحلله من الیتیم" لیکن جب اسے مال لوٹانے کی آسانی ہو تو مال لوٹا دے، ہاں اگر آسانی نہ ہو تو یتیم کا جو مال بقدر حاجت لیا تھا وہ جائز اور حلال ہے۔

فائدہ جلیلہ:

"وروی عن عمر رضی اللہ عنه انه قال انزلت نفسی من مال اللہ تعالٰی بمنزلة ولی الیتیم ان استغنیت استعففت وان افتقرت اکلت قرضا بالمعروف ثم قضیت "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مجھے جس مال کا محافظ بنا رکھا ہے اس میں میں اپنے آپ کو ایسے سمجھتا ہوں کہ جیسا کہ یتیم کے مال پر ولایت رکھنے والے کو حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر میں بے پرواہ ہوں، یعنی مجھے مال کی ضرورت نہ ہو تو میں درگزر کرتا ہوں اور اگر مجھے ضرورت

درپیش آئے تو میں معروف طریقہ سے قرض لے لیتا ہوں، پھر مجھے جب وسعت ملتی ہے تو میں وہ قرض ادا کر دیتا ہوں۔

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے مال بغیر ضرورت کے کبھی نہیں لیا۔ اگر کبھی ضرورت درپیش آجاتی تو آپ بطور قرض مال لیتے، وسعت حاصل ہونے پر وہ مال واپس بیت المال میں دے دیتے۔

"وعن مجاهد اذا كان فقيرا واكل بالمعروف فلا قضاء عليه"

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں یتیم کے مال کا ولی جب فقیر ہو اور مناسب طریقہ سے مال بطور اجرت لے لے تو واپس لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

راقم کے نزدیک تین اقوال میں تعارض نہیں:

اختلاف صرف ظاہری الفاظ تک ہے، ورنہ مطلب سب کا ایک ہے، یعنی یتیم کے مال کا ولی، اس کے مال کی حفاظت کرنے والا، اور اس کے مال میں تجارت وغیرہ کرنے میں اپنا وقت صرف کرنے والا، اپنی جائز حد تک مناسب مقدار میں اجرت لے تو اس کے لئے جائز ہے، خواہ وہ غنی ولی ہو یا غریب۔ اس قول کا تعلق جواز سے ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ غنی اجرت نہ لے اور غریب اجرت لے لے، اور غریب پر کوئی لازم نہیں کہ وہ اجرت واپس لوٹائے اس قول کا تعلق استحباب سے ہے، جو پہلی صورت سے بہتر ہے۔

لیکن زیادہ باعث تقوی یہ صورت ہے کہ غنی یتیم کے مال میں کام کرنے کی اجرت نہ لے، کیونکہ رب تعالی نے اس اپنا مال دے رکھا ہے، جب وہ یتیم کے مال سے اجرت نہیں لے گا، اللہ تعالی اس کے مال میں برکت ڈالے گا۔

اور اگر یتیم کے مال کا ولی فقیر ہے تو وقتی ضرورت کے لئے یتیم کا مال بطور اجرت شرعی جواز کی حد تک لے لے لیکن جب اسے مالی وسعت مل جائے تو وہ مال واپس کر دے۔ (راقم)

(۳) مخالطت کی تیسری صورت یہ ہے۔

"معنى الآية ان يخلطوا اموال اليتامى باموال انفسهم على سبيل الشركة بشرط رعاية جهات المصلحة والغبطة للصبى"

کہ یتیموں کا مال اپنے مال سے شرکت کے لئے ملالو، یعنی ان کے مال اور اپنے مال کو ملا کر تجارت کرو تاکہ یتیم کو زیادہ نفع حاصل ہو اور اس کے مال میں ہر طرح کی اصلاح (بھلائی) کی کوشش کرو، اس طرح مصلحت کا لحاظ کیا جائے کہ بچے کو اس پر رشک آئے۔

(۴) مخالطت کی چوتھی وجہ ابو مسلم نے بیان کی جو ان کے نزدیک مختار وجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ان المراد با لخلط المصاهرة" کہ اس مخالطت سے مراد نکاح کی وجہ سے اجتماع اور میل جول حاصل کرنا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی زیر پرورش یتیم مالدار لڑکی سے خود نکاح کر لیتے، مقصد ان کا صرف مال حاصل کرنا ہوتا، وہ نکاح کرنے کے بعد ان کی طرف رغبت نہ کرتے، اور ان سے محبت نہ کرنے کی وجہ سے انصاف نہیں کرتے تھے۔

رب تعالیٰ نے بے انصافی سے یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے کی ممانعت فرمادی ارشاد فرمایا۔

- "وان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا ماطاب لکم الخ"

راقم کے نزدیک یہ تمام صورتیں جو ذکر کی ہیں وہ چار صورتیں مجموعی طور پر آیۃ کریمہ کا مفہوم ہیں۔ تاہم چوتھی صورت کے مختار ہونے پر دلائل بھی قائم کئے گئے ہیں۔

"احد هاان هذاالقو ل خلط للیتیم نفسه والشر کة خلط لما له"

ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ "خلط" کا مطلب ہی یہ ہے۔ کہ یتیم کو اپنے ساتھ ملانا، یہ صورت نکاح سے ہی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ مال کو مال سے ملانے کو شرکت کہا جاتا، مخالطت نہیں کیا جاتا۔

"وثانیها ان الشر کة داخلة فی قوله "قل اصلاح لهم خیر" والخلط من جهة النکاح"

دوسری دلیل کہ چوتھی وجہ زیادہ بہتر ہے کہ مال کو مال سے ملانے کو ذکر "قل اصلاح لهم خیر" میں آ گیا، کیونکہ "ان کی بھلائی بہتر ہے" کا یہی مطلب ہے کہ ان کے مال کو اپنے مال سے ملا کر فائدہ مند بناؤ۔

لیکن خلط کا تعلق ہی نکاح کی وجہ سے ہے ان کو اپنے ساتھ ملانا ہے، نکاح کی وجہ سے ان کو اپنے ساتھ ملانے کا ذکر بظاہر "قل اصلاح لهم خير" میں نہیں آیا تھا، اسے " و ان تخالطوهم فاخوانكم " سے بیان کر دیا۔

" وثالثها ان قوله تعالىٰ (فاخوانكم) يدل على ان المراد با لخلط هو هذا النوع من الخلط لان اليتيم لو لم يكن من اولاد المسلمين لو جب ان يتحرى صلاح امواله كما يتحراه اذا كان مسلما فوجب ان تكون الاشارة بقوله (فاخوانكم)الى نوع آخر من المخالطة"

تیسری دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے " و ان تخالطو هم" کے بعد " فاخوانكم "ذکر فرمایا، اس سے واضح ہوا کہ مخالطت سے یہی مراد ہے کہ اگر تم ان کو نکاح کی وجہ سے اپنے ساتھ ملالو تو وہ تمہارے (دینی بھائی) ہیں، چونکہ نکاح مسلمان سے ہوتا ہے مشرک سے نہیں۔ قانون یہ ہے کہ بچہ ماں باپ کے تابع ہوتا ہے۔ اگر یتیم کافروں کی اولاد سے ہے تو وہ کافر سمجھا جائے گا، اس وقت بھی اس کے مال کو اپنے ساتھ ملا کر اس کے مال کی اصلاح ضروری ہے، حالانکہ وہ مسلمان کا دینی بھائی نہیں۔

خیال رہے قرآن پاک میں اکثر الفاظ مبارکہ مذکر استعمال ہیں، جو مونث کو بھی شامل ہیں۔ یہاں بھی صیغے مذکر کے ہیں، لیکن مونث کو بھی شامل ہیں۔

"ورابعها انه تعالىٰ قال بعد هذه الآية (ولاتنكوا المشركات حتى يومن) فكان المعنى ان المخالطة المندوب اليها انماهي اليتامى الذين هم لكم اخوان با لاسلام فهم الذين ينبغي ان تنا كحوهم لتاكيد الألفة فان كان اليتيم من المشركات فلا تفعلوا ذلك "

چوتھی دلیل اس پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ذکر فرمایا " ولا تنكوا المشركات

حتی یومن '' (مشرکات سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ ایمان لے آئیں) تو اس پتہ چلا کہ جس مخالطت کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس سے مراد نکاح کی وجہ سے ان کو اپنے ساتھ ملانا لیکن جب وہ مسلمان ہوں، اگر یتیم بچے اور بچیاں مومن نہیں تو ان کے نکاح مسلمانوں سے نہیں ہو سکتے۔

(ماخوذ از کبیر و مختصر از روح المعانی)

تنبیہ : علامہ رازی رحمہ اللہ کی بحث کو راقم نے عظیم سمجھ کر ذکر کیا ہے، اور کچھ الفاظ روح المعانی کے قوی نہ سمجھتے ہوئے اعراض کر لیا ہے، اور حضرت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ کے مندرجہ ذیل اعتراض و جواب کو بھی ضروری نہ سمجھا۔

اعتراض: یہاں یتیموں کو بھائی کہنے سے معلوم ہوا کہ صرف مسلمان یتیموں کے ساتھ ہی سلوک کرنا چاہئے، اگر یہ حکم ہوتا تو انہیں بھائی نہ کہا جاتا۔

جواب: اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ یہاں سوال مسلمان یتیموں کے لئے ہی تھا، اس لئے انہیں بھائی فرمادیا گیا، دوسری آیۃ کریمہ میں ہر یتیم کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ تفسیر سے معلوم ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں خلط سے جانی شرکت یعنی نکاح اور مالی شرکت دونوں ہی مراد ہیں اور کافر یتیموں سے چونکہ نکاح جائز نہیں۔ لہٰذا انہیں بھائی فرمادیا گیا ہے۔ (نعیمی)

اخوت اسلامی اخوت نسبی سے بہتر ہے:

'' (فاخوانکم) ای فھم اخوانکم فی الدین الذی ھو اقوی من العلاقة النسبية ومن حق الأخ ان يخالط الأخ با لاصلاح والنفع ''

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا '' فاخوانکم '' وہ تمہارے بھائی ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ دینی بھائی کا مقام نسبی بھائی سے زیادہ ہے، اس لئے ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے محبت رکھنی چاہئے تا کہ اس سے بھلائی کر سکے اور اسے نفع پہنچا سکے۔ (روح البیان)

یہ حقیقت ہے کہ اگر ایک بھائی مسلمان ہو اور دوسرا بھائی (العیاذ باللہ) کافر ہو تو یہ نسبی بھائی غیر ہے، وہ

مسلمان کا اپنا نہیں، اور اگر اجنبی ہو لیکن مسلمان ہو تو وہ اپنا ہے، غیر نہیں۔

ایک رخ یوں سمجھئے: لپٹا جو دامنِ مصطفیٰ سے وہ یگانہ ہو گیا
جس کے حضور ہو گئے اس کا زمانہ ہو گیا

دوسرا رخ یہ ہے: جو ان سے یار پھرتے ہیں
یوں ہی در بدر خوار پھرتے ہیں

"واللہ یعلم المفسد من المصلح":

اور اللہ جانتا ہے فساد پھیلانے والے کو بھلائی کرنے والے سے۔

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کون سا شخص یتیم کے مال سے اپنے مال سے فساد کی خاطر ملا رہا ہے اور کون سا شخص اصلاح کے لئے ملا رہا ہے، اللہ تعالیٰ پر کچھ مخفی نہیں۔

"فیجازیه علی حسب مداخلته فاحذروه ولا تحروا غیر الاصلاح"

اس لئے رب تعالیٰ نے ہر شخص کو اس کے فعل کے مطابق جزا دینی ہے اگر اصلاح کی غرض سے کسی نے یتیم کے مال کو اپنے مال سے ملایا تو اللہ تعالیٰ اسے جزاء عطاء فرمائے گا۔ اور اگر کسی نے یتیم کے مال کو اپنے مال سے فساد اور نقصان پہنچانے کی غرض سے ملایا تو اسے رب تعالیٰ عذاب دے گا۔ لہٰذا تم رب تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر رہو سوائے بھلائی کرنے کے اور راستہ نہ اختیار کرو۔

"ویعلم ضمائر من اراد الافساد والطمع فی مالهم بالنكاح من المصلح"

اگر کوئی شخص یتیم کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے، یا نفع پہنچانے کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ ان کے ارادوں پر بھی مطلع ہے، کیونکہ وہ دلوں کی باتوں کو اور سینوں کے رازوں کو جانتا ہے۔ تم ارادے کو ظاہر بعد میں کرو گے، وہ پہلے ہی تمہارے ارادے کو جانتا ہے۔ بلکہ تمہارے دل میں خیال آنے

سے بھی پہلے جانتا ہے۔ کہ اس کے دل میں یہ خیال آئے گا۔ "وھذا تھدید عظیم" اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف شدید خوف دلایا گیا ہے کہ یتیم کے مال کے معاملہ میں رب تعالیٰ کو خوف رکھو۔

(از روح البیان و کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر اس پر اعتراض یہ ہے کہ "علم" کے بعد "من" نہیں آتا۔ یہاں "یعلم" کے بعد "من المصلح" کا استعمال کیسے درست ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے۔

"ومن لتضمين العلم معنى التمييز ای يعلم من يفسد فی امورهم عند المخالطة ممن يصلح"

کہ یہاں قاعدۂ تضمین پایا گیا ہے۔ کیونکہ "علم" بمعنی "تمییز" استعمال ہے۔ چونکہ "تمییز" کے بعد "من" کا آنا صحیح ہے۔ اس لئے "یعلم" کے بعد "من" لایا گیا ہے۔

اب مطلب یہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے یتیموں کے مال کو اپنے مال سے ملا کر ان کے امور میں فساد کون برپا کرنا چاہتا ہے اور کون اصلاح چاہتا ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ ان کو ان کے کردار کی وجہ سے جدا جدا کرنا چاہتا ہے۔

یہی قرآن پاک کی عظمت ہے کہ ایک لفظ سے عظیم مطالب سمجھا دیئے جاتے ہیں۔ (از روح البیان)

قرآن پاک کا کمال:

"وفی تقديم المفسد مزيد تهديد"

صرف اندازِ بیان سے ہی قرآن کتنے مسائل حل کر دیتا ہے، یہی قرآن پاک کا کمال ہے، اس مقام پر "مفسد" کو "اصلاح" سے پہلے ذکر کر کے یہ واضح کر دیا کہ فساد کی غرض سے یتیموں کے مال کو اپنے مال سے ملانے کی وجہ سے تم شدید گرفت میں آؤ گے۔ (از روح البیان)

"ولو شاء اللہ لأعنتکم": اور اگر چاہتا اللہ تو مشقت میں ڈالتا تمہیں۔

" الا عنات " کا معنی ہوتا ہے کسی کو ایسی مشقت میں ڈالنا جس کی وہ طاقت نہ رکھے، اور کبھی کہا جاتا ہے " تعنته تعنتا " میں نے فلاں شخص پر سوال خلط ملط کر کے پیش کیا، یعنی پیچیدہ سوال کیا۔

مشقت میں ڈالنے کا کیا مطلب؟

اس کے تین مطالب ہیں۔

(۱) ایک مطلب یہ ہے جو عام مفسرین کرام نے بیان فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی وضاحت یوں بیان فرمائی۔

" لو شاء اللہ لجعل ما اصبتم من اموال الیتامی موبقا"

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا یعنی یتیموں کے مالوں کی وجہ سے تمہیں ہلاکت میں ڈالتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے یتیموں کے مالوں کے متعلق واضح طور پر بیان فرما کر تمہیں ہلاکت سے بچا لیا۔

(۲) " وقال عطاء ولو شاء اللہ لا دخل علیکم المشقة کما ادخلتم علی انفسکم ولضیق الأمر علیکم فی مخالطتهم "

عطاء کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا، یعنی جس طرح تم نے یتیموں کا مال علیحدہ کر دیا تھا، ان کا کھانا پینا جدا کر دیا تھا، تم نے اپنے آپ کو مشقت میں ڈال دیا تھا، اللہ تعالیٰ تمہیں اسی مشقت میں مبتلا رکھتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں اصلاح کی غرض سے ان کے مالوں کو اپنے مالوں سے ملانے کی اجازت فرما کر مشقت سے بچا لیا۔

(۳) " وقال الزجاج ولو شاء اللہ لکلفکم ما یشتد علیکم "

زجاج نے یہ بیان کیا کہ ان الفاظ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم پر مشقت والے احکام نازل کرتا لیکن اس نے تمہاری آسانی کے لئے تم پر مشقت والے احکام نافذ نہیں فرمائے۔ (کبیر)

"ان اللہ عزیز" بے شک اللہ غالب ہے **"حکیم"** حکمت والا ہے۔

" ان اللہ عزیز " غالب یقدر علی الاعنات " بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے مشقت میں ڈالنے کی قدرت رکھتا ہے۔

"حکیم" یحکم ما تقتضیه الحکمة " حکمت والا ہے اس لئے وہ اپنی حکمت کے مطابق حکم فرماتا ہے۔

یعنی وہ اپنی حکمت کے مطابق ہی تمہیں مشقت میں نہیں ڈالتا، ورنہ اس کی طاقت اور غلبہ کو دیکھا جائے تو وہ تمہیں مشقت میں ڈالتا۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

لفظ "لـــو" آتا ہے امتناع کے لئے ،یعنی دوسرے کا امتناع اول کے امتناع کا سبب بنتا ہے۔ یا بقول ابن حاجب اول کا امتناع سبب بنتا ہے ثانی کے امتناع کے لئے۔ مفصل بحث مختصر المعانی میں دیکھئے۔

اس ضابطہ کو مدنظر رکھتے ہوئے آیۃ کریمہ کی طرف توجہ فرمائیں ،تو مطلب واضح ہو جائے گا۔

" ولو شاء اللہ لا عنتکم لکو نه غالبا لکنه لم یشأ لکو نه حکیما"

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا کیونکہ وہ غالب ہے،لیکن وہ نہیں چاہتا کیونکہ وہ حکیم ہے۔ (روح المعانی)

یعنی حکمت کے تقاضا کے مطابق اس کا تمہیں مشقت میں نہ ڈالنے کا ارادہ ومشیت سبب ہے، اس کا تمہیں حقیقت میں مشقت میں نہ ڈالنے کا باوجود اس کے کہ وہ ذات غالب ہے اور وسیع طاقت کا مالک ہے۔

فائدہ:

اس آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی حاصل ہوا کہ تکلیف مالا یطاق ثابت نہیں ،یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کی

طاقت سے زائد تکلیف دے کر مشقت میں نہیں ڈالتا، یہی وجہ ہے کہ مریض کا بیٹھ کر یا لیٹ کر اشارہ سے نماز پڑھنا صحیح ہے۔ اور دورانِ سفر یا حالتِ مرض کے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے کہ بعد میں قضاء کر لے۔ (ماخوذ از کبیر)

یتیم پر رحم کرنا:

"واعلم ان مخالطة الایتام من اخلاق الکرام وفی الترحم علیهم فوائد جمة"

یتیموں کے مال اور ان کی ذاتوں کو اپنے ساتھ ملانا اخلاق کریمانہ کا ایک حصہ ہے اور ان پر رحم کرنے پر عظیم فوائد پائے گئے ہیں۔

☆ "قال رسول الله ﷺ من وضع یده علی رأس یتیم ترحما علیه کانت له بکل شعرة تمر علیها یده حسنة"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اپنا ہاتھ رحم کرتے ہوئے یتیم کے سر پر رکھا اس کے ہاتھ کے نیچے یتیم کے جتنے بال آئیں گے، ہر بال کے بدلے اللہ تعالیٰ اسے نیکی عطا فرمائے گا۔

☆ وفی الحدیث (ثلاثة فی ظل عرش الله یوم القیامة امراة مات عنها زوجها وترک علیها یتامی صغارا فخطبت فلم تتزوج وقالت اقیم علی الیتامی حتی یغنیهم الله او یموت) یعنی الیتیم (اوهی ورجل له مال صنع طعاما فاطاب صنیعه واحسن نفقته فدعا الیه الیتیم والمسکین، وواصل الرحم یوسع له فی رزقه ویمد له فی اجله ویکون تحت ظل عرشه"

حدیث شریف میں آتا ہے کہ تین شخص قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوں گے۔ (ایک ان میں سے) وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو اور اس کے پاس چھوٹے یتیم بچے چھوڑ گیا ہو، اس عورت کو خطبہ کیا گیا (یعنی پیغام نکاح دیا گیا) تو اس نے نکاح نہ کیا، اور کہا میں یتیموں کی دیکھ بھال کروں گی، ان کی پرورش کروں گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو بے پرواہ کر دے یا (یتیم بچے یا بچی کی رضاءِ الٰہی سے) وفات ہو جائے۔

(دوسرا ان میں سے) وہ شخص جو مال دار اچھے طریقہ سے طعام تیار کرے، اچھی طرح نفقہ تیار کرے

اور پھر یتیموں اور مسکینوں کو دعوت دے (ان کو کھانا کھلائے)

(تیسرا ان میں سے) وہ شخص جو صلہ رحمی کرے اس کے رزق میں وسعت دی جاتی ہے اور اس کی عمر میں برکت ہوتی ہے اور وہ اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا۔

"یا موسی کن للیتیم کالاب الرحیم و کن للارامل کا لزوج الشفیق و کن للغریب کالاخ الرفیق اکن لک کذلک"

اے موسیٰ تم یتیموں کے لئے رحم کرنے والے باپ کی طرح ہو جاؤ، اور بیوہ عورتوں کے لئے شفیق زوج کی طرح ہو جاؤ، اور غریب کے لئے مہربان بھائی کی طرح ہو جاؤ، تو میں تمہارے لئے اسی طرح (رحیم و شفیق و رفیق) ہو جاؤں گا۔

☆ "وفی الحدیث انا و کافل الیتیم کھا تین فی الجنة"

(نبی کریم ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) میں اور یتیم کا کفیل جنت میں ان دو (انگلیوں) کی طرح ہوں گے۔

یعنی یتیم کے مال اور جان کی حفاظت کرنے والے شخص کو جنت میں میرا قرب حاصل ہوگا اور وہ میرے سامنے ہوگا۔ حدیث پاک میں یہ مطلب نہیں کہ اس شخص کو وہ درجہ حاصل ہوگا جو نبی کریم ﷺ کو حاصل ہوگا۔

حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

تیمار غریباں سبب ذکر جمیل ست   جانا مگر ایں قاعدہ در شہر شما نیست

غریبوں کی تیمارداری اچھا ذکر ہے، اے پیارے مگر یہ قانون تمہارے شہر میں نہیں پایا جاتا۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

چو بینی یتیمی سر افگندہ پیش   مدہ بوسہ بروئے فرزند خویش

الا تا نگرید کہ عرش عظیم   بلرزد ہمی چوں بگرید یتیم

جب تو دیکھے کہ یتیم نے سر آگے جھکایا ہوا ہے۔ تو تو اپنے بیٹے کی رخساروں پر بوسہ نہ دے۔

ہاں کہیں یتیم رونہ پڑے، کیونکہ عرش عظیم۔ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے یتیم کے رونے سے۔

فائدہ: یتیم کو اس طرح ادب سکھائے جس طرح اپنے بچوں کو ادب سکھایا جاتا ہے، کیونکہ قیامت کے دن انسان سے یتیم کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ لہٰذا وہ اس کی اصلاح کی پوری کوشش کرے۔

" والتا دیب علی انو اع منھاوالوعید ومنھا الضرب ومنھا جس المنافع والعطیۃ والبر"

ادب سکھانے میں مختلف صورتوں پر عمل کرنے کی ضرورت درپیش آتی ہے، کبھی ڈرانے دھمکانے کی ضرورت ہوتی ہے، اور کبھی ہلکی مار اور سرزنش یعنی ایک یا دو تھپڑ مار دینا، اور اس سے منافع اور عطیات اور مہربانیوں کو روک کر ابہ ادب سکھانے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔

" فان بین الناس تفاوتا فنفس تخضع با لغلظۃ والشدۃ ولو ا ستعملت معھا الرفق والبر لا فسد ھا ونفس با لعکس "

لوگ چونکہ مختلف طبیعتوں کے مالک ہوتے ہیں، بعض وہ ہوتے ہیں جو سختی اور شدت کی وجہ سے ہی سدھرتے ہیں اگر ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور بھلائی کی جائے تو وہ بگڑ جاتے ہیں، اور کئی لو گ نرمی سے سنور جاتے ہیں۔

لہٰذا ہر انسان کے حال کو دیکھ کر اس کے مطابق تربیت کی جائے، ایسا نہ ہو کہ یتیم اگر سرزنش کے قابل تھا تو اس کی سرزنش نہ کر کے اسے بگاڑ دیا جائے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حدود کو جرائم کے مطابق رکھا، اور تعزیرات کو لوگوں کے مطابق رکھا، ایک قسم کا ہی جرم ہوتا ہے لیکن کسی شخص کو معمولی تعزیر سے تنبیہ حاصل ہو جاتی ہے اور کسی کو سخت تعزیر کی ضرورت درپیش آتی ہے۔

ادب سکھانے پر اجر حاصل ہوتا ہے۔

" فادب الاحرار الی السلطان وادب المالیک والاولاد الی السادات والآباء وھو ماجور علی التأدیب ومسئول عنہ، قال اللہ تعالیٰ " قوا انفسکم واھلیکم نارا "وفی الحدیث "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "

آزادانسانوں کا(عوام کا)ادب بادشاہ کے ذمہ ہے۔اور غلاموں کوادب سکھانا ان کے مالکوں کی ذمہ داری ہے۔اور اولاد کوادب سکھانا والدین پرلازم ہے۔ہرشخص کوادب سکھانے پراجر حاصل ہوگا۔اور ہر ذمہ دار سے ذمہ داری کے نبھانے کے متعلق سوال ہوگا،اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "قوا انفسکم و اھلیکم نارا" اپنے آپ کواور اپنے اہل وعیال کوآگ سے بچاؤ۔اور حدیث شریف میں ہے "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته"تم میں سے ہرشخص ذمہ دار ہے (ہرشخص رعیت رکھتا ہے)اورتم سے ہرشخص سے اس کی رعیت کے متعلق سوال ہوگا۔

فائدہ: "وان تخالطوھم" سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے میں اورلوگوں یعنی مسکین،غریب،فقیر کوساتھ شریک کرے،کیونکہ اس میں برکت حاصل ہوگی۔

حدیث شریف میں ہے۔" ان من احب الطعام الی اللہ ماکثرت علیه الایدلی "

بے شک اللہ کومحبوب طعام وہ ہے جس پر ہاتھ کثیر ہوں (یعنی جس مین زیادہ کھانے والے شریک ہوں)

وذکر فی المصابیح ان اصحاب النبی ﷺ قالوا یارسول اللہ ان نا کل ولا نشبع،قال (لعلکم تفترقون) قالوا نعم قال(فاجتمعوا علی طعامکم واذکروا اسم اللہ تعالیٰ"

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے عرض کیایارسول اللہ!ہم کھاتے ہیں لیکن سیرنہیں ہوتے، آپ نے فرمایا شائدتم علیحدہ علیحدہ کھانا کھاتے ہوگے۔انہوں نے کہاہاں،آپ نے فرمایامل کر کھانا کھایا کرو،اوراللہ تعالیٰ کانام لے کرکھانا کھاؤ۔

یعنی کھانا کھانے سے بسم اللہ پڑھ لیا کرواوراپنے کھانے میں غرباءومساکین کوشریک کیاکرو۔

(روح البیان)

☆☆☆☆☆☆

وَلَاتَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَاتُنكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۲۱)

﴿۱﴾

اور شرک والی عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک مسلمان نہ ہو جائیں اور بے شک مسلمان لونڈی مشرکہ سے اچھی ہے اگرچہ وہ تمہیں بھاتی ہو، اور مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اور بے شک مسلمان غلام مشرک سے اچھا ہے اگرچہ وہ تمہیں بھاتا ہو، وہ دوذخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اپنے حکم سے اور اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے کہ کہیں وہ نصیحت مانیں۔

﴿۲﴾

اور نہ نکاح کرو تم شرک والی عورتوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور لونڈی ایمان والی بہتر ہے شرک والی عورت سے اگرچہ وہ تمہیں تعجب میں ڈالے۔ اور نہ دو مشرکوں کے نکاح میں یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، اور غلام مومن بہتر ہے مشرک سے اگرچہ وہ تمہیں تعجب میں ڈالے، وہ بلاتے ہیں آگ کی طرف، اور اللہ بلاتا ہے طرف جنت اور بخشش کے اپنے حکم سے، اور بیان کرتا ہے اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پچھلی آیۃ میں یتیموں کو اپنے ساتھ ملانے کی اجازت فرمائی، جس کے مطالب میں ایک یہ بیان ہوا کہ تم ان کو اصلاح کی غرض سے اپنے نکاح میں لا سکتے ہو۔

اس آیۃ کریمہ میں یہ واضح فرمایا کہ مومن مرد شرک والی عورتوں سے نکاح نہ کریں، اگرچہ ان کا مال دولت اور حسن جمال اور حسب نسب تمہیں تعجب میں ڈالیں، ان سے بہتر ایمان والی لونڈی ہے۔ اگرچہ اس کے پاس مال و دولت نہ ہو جو تمہیں فریفتہ کر سکے۔ اسی طرح اپنی ایمان والی عورتوں کو مشرکوں کے نکاح میں نہ دو، اگرچہ وہ مشرک اپنے مال و دولت وغیرہ سے وہ تمہیں تعجب میں ڈالیں، پھر بھی ان سے نکاح نہ کر کے دو، ان سے تو مومن غلام بہتر ہیں۔ کفار و مشرکین تمہیں دوزخ کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو واضح طور پر لوگوں کے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑ لیں۔ (از قرطبی)

شانِ نزول:

(۱) ''روی السدی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان ھذہ نزلت فی عبداللہ بن رواحۃ و کانت لہ امۃ سوداء و انہ غضب فلطمھا ثم انہ فزع فاتی النبی ﷺ فاخبرہ خبرھا فقال لہ النبی ﷺ ماھی یا عبد اللہ ؟ فقال ھی یا رسول اللہ تصوم وتصلی وتحسن الوضوء وتشھد ان لا الہ الا اللہ وانک رسولہ فقال یا عبداللہ ھی مؤمنۃ قال عبداللہ فوالذی بعثک بالحق نبیا لأ عتقنھا ولأ تزوجنھا ففعل فطعن علیہ ناس من المسلمین فقالوا انکح امۃ وکانوا یریدون ان ینکحوا الی المشرکین وینکحوھم رغبۃ فی انسابھم فانزل اللہ تعالیٰ''

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں یہ آیۃ کریمہ عبداللہ بن رواحہ کے حق میں نازل ہوئی، ان کی ایک لونڈی تھی جو سیاہ رنگ کی (حبشیہ) تھی۔ ایک مرتبہ اس لونڈی پر انہیں غصہ آ گیا تو اسے

تھپڑ مار دیا، پھر وہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئے۔ تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اور لونڈی کے متعلق خبر دی۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے ابوعبداللہ وہ کیسے ہے (یعنی ایمان والی ہے یا کافر ہے) عبداللہ نے کہا یا رسول اللہ! وہ روزے رکھتی ہے اور نماز ادا کرتی ہے اور اچھی طرح وضو کرتی ہے اور شہادت دیتی ہے کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں، اور شہادت دیتی ہے کہ بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ وہ مومنہ ہے۔ عبداللہ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر مبعوث فرمایا میں اس کو ضرور آزاد کروں گا، اور اس سے ضرور نکاح کرلوں گا، تو انہوں نے ایسا ہی کیا، مسلمان لوگوں نے طعنہ دیا کہ اس شخص نے اپنی لونڈی سے نکاح کر لیا ہے، کیونکہ وہ لوگ زمانہ جاہلیت کے قریب ہونے کی وجہ سے مشرکوں سے حسب ونسب کی وجہ سے نکاح کرنے میں رغبت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر عبداللہ بن رواحہ کی تائید فرمائی اور باقی لوگوں کا رد کیا۔ (روح المعانی)

(۲) شانِ نزول کی دوسری وجہ۔

" اخرج ابن ابی حاتم وابن المنذر عن مقاتل بن حبان قال نزلت هذه الآية فی ابی مرثد الغنوی استأذن النبی ﷺ فی عناق ان یتزوجها وکانت ذاحظ من جمال وهی مشرکة وابو مرثد یومئذ مسلم فقال یا رسول الله انها تعجبنی فانزل الله ولا تنکحوا المشرکات الخ "

نبی کریم ﷺ نے بنو ہاشم کے حلیف مرثد بن ابی مرثد غنوی کو مکہ میں بھیجا تاکہ وہ مسلمان قیدیوں کو وہاں سے نکال کر لے آئے۔ جب وہ مکہ مکرمہ میں آئے تو ان سے ایک عورت عناق (نام ہے) نے ملاقات کی۔ زمانہ جاہلیت میں ان کا تعلق عناق سے تھا، اس نے ان سے خلوت چاہی، لیکن انہوں نے کہا کہ اب میرے اور تمہارے درمیان اسلام حائل ہو گیا ہے، میں حرام کام کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔

اس نے کہا تم میرے ساتھ نکاح ہی کرلو، انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے نکاح کرلوں گا، لیکن پہلے نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کروں گا، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عناق کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت طلب کی، وہ بہت خوبصورت تھی، لیکن مشرکہ تھی اور مرثد مسلمان تھے، عرض کیا یارسول اللہ وہ مجھے بہت تعجب میں ڈالتی یعنی میرے دل کو بھاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ شرک والی عورتوں سے نکاح نہ کرو، اگرچہ وہ تمہیں بھلی لگتی ہوں، لیکن شرک کی وجہ سے وہ نجس (ناپاک) ہیں۔ (از درمنثور وروح المعانی)

دوسری وجہ پر گرفت:

"وتعقب ذلک السیوطی بان هذا لیس سببا لنزول هذه الآیة وانما هو سبب فی نزول آیة النور (الزانی لا ینکح الازانیة او مشرکة) (روح المعانی)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس دوسری وجہ شان نزول پر گرفت فرمائی کہ یہ واقع اس آیۃ کریمہ کا شانِ نزول نہیں بلکہ سورہ نور کی آیۃ " الزانی لا ینکح الازانی او مشرکة "کا شانِ نزول ہے۔

راقم کا محاکمہ:

جب اکثر مفسرین کرام نے شانِ نزول میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے تو رد کرنے کی بجائے اگر یوں کہہ دیا جائے، کہ دونوں واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا اور سورہ نور کی آیت کا بھی نزول ہوا، تو اس وجہ تطبیق میں کوئی مشکل نہیں، لہٰذا یہ قول راقم کے نزدیک بہتر ہے کہ اقوال کو جمع کیا جائے، کسی کو رد نہ کیا جائے۔

اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کا حکم:

اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے، اس مسئلہ میں اتفاق ہے۔ البتہ اس آیۃ کریمہ کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ......

" حرم الله نكاح المشركات فی سورة البقرة ثم نسخ من هذه الجملة نساء اهل الكتاب فاحلهن فی سورة المائدة"

......اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں تمام مشرکات سے نکاح کرنے سے منع فرمایا، اس ممانعت میں اہلِ کتاب عورتیں بھی شامل تھیں۔لیکن......

" والمحصنات من الذين او تو ا الكتاب من قبلكم "

......سے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی حرمت کومنسوخ قرار دیا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے۔" ولم يتناول العموم قط الكتابيات " کہ اس آیۃ کریمہ کا عموم کتابیات کو شامل ہی نہیں۔اگر چہ ان پر کفر وشرک کا اطلاق ہوسکتا ہے، لیکن عرف عام میں ان پر کفر وشرک کا اطلاق نہیں تھا، بلکہ ان کو اہلِ کتاب ہی کہا جاتا تھا۔اس طرح یہ آیۃ کریمہ کتابیات سے نکاح کرنے کی حرمت کو شامل ہی نہیں۔البتہ دوسری آیۃ " والمحصنات الخ " سے اس کی مزید وضاحت کردی گئی۔ (از قرطبی)

کتابیات سے نکاح کرنا صحابہ کرام نے ناپسند فرمایا:

"وروى عن حذيفة ايضا انه تزوج يهو دية و كتب اليه عمر ان خل سبيلها فكتب اليه حذيفة احرام هي فكتب اليه عمر لا ولكن اخاف ان تو اقعوا المومسات منهن "

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک یہودیہ سے نکاح کرلیا۔ان کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ تم اس عورت کا راستہ چھوڑ دو۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف لکھا کیا وہ حرام ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا وہ حرام تو نہیں لیکن مجھے یہ خوف ہے کہ تم فاحشہ، فاجرہ عورت سے جماع کرو گے۔ (احکام القرآن للجصاص)

سبحان اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد جگمگا رہا ہے۔یہودیہ اور نصرانیہ فاحشہ، فاسقہ اور فاجرہ ہیں، خصوصاً ان کے اثرات اولاد پر پڑتے ہیں، اولاد میں یہودیت ونصرانیت کا رنگ نظر آئے گا۔اولاد بھی ماں کی طرح بے حیاء اور بے شرم نظر آئے گی۔

☆ "ان طلحة نكح نصرانية وحذيفة يهودية فغضب عمر رضی الله عنه عليهما غضبا شديدا فقالا نحن نطلق يا امير المؤمنين فلا تغضب فقال ان حل طلاقهن فقد حل نكاحهن ولكن انتزعهن منكم"

حضرت طلحہ نے ایک نصرانیہ سے نکاح کرلیا اور حذیفہ نے یہودیہ سے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے بہت غصہ کیا، ان دونوں نے کہا اے امیر المومنین! آپ غصہ نہ فرمائیں، ناراض نہ ہوں ہم طلاق دے دیتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا جب ان کو طلاق دینا جائز ہے تو ان سے نکاح کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن میں تم سے ان کو جدا کروں گا۔ (از کبیر بتصرف)

مطلب واضح ہے کہ یہودیہ یا نصرانیہ سے نکاح جائز ہونے کے باوجود مسلمان کی زندگی پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کوئی مسلمان اپنے نکاح میں یہودیہ اور نصرانیہ کو نہ لائے، اگر کسی یہودیہ یا نصرانیہ کو لائے تو اسے جدا کردے تا کہ وہ شخص اور اس کی اولاد بے دینی اور بے حیائی سے محفوظ رہے۔

☆ "عن مجاهد عن ابن عباس قال لا تحل نساء اهل الكتاب اذا كانوا حربا"

(احکام القرآن للجصاص)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں جبکہ وہ دارحرب کی ہوں۔

☆ "وقد روی عن علی انه كره نساء اهل الحرب من اهل الكتاب"

(احکام القرآن للجصاص)

حضرت علی رضی اللہ عنہ دارحرب کی کتابیہ عورتوں سے نکاح کرنا مکروہ سمجھتے تھے۔

ان دونوں حضرات (حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم) کے قول کے مطابق صرف دارِاسلام میں رہنے والی کتابیات (یعنی ذمیہ کتابیات) سے نکاح جائز ہے۔ دارِحرب کی کتابیات سے جائز نہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا سخت موقف:

"عن الليث قال حدثني نافع عن ابن عمر انه كان اذا سئل عن نكاح اليهودية والنصرانية قال ان الله حرم المشركات على المسلمين قال فلا اعلم من الشرك شيأ اكبر اوقال اعظم من ان تقول ربها عيسى او عبد من عباد الله"

(احکام القرآن للجصاص)

نافع کہتے ہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ یہودیہ اور نصرانیہ سے نکاح کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے مشرکات سے نکاح کرنا مسلمانوں کے لئے حرام کر دیا، مجھے معلوم نہیں کہ شرک سے بڑا اور گناہ کیا ہوگا کہ وہ عورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا رب کہہ رہی ہے یا اللہ کے بندوں میں سے کسی بندے کو اپنا رب کہہ رہی ہے۔ یعنی حضرت عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ رہی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا موقف یہ تھا کہ رب تعالیٰ نے جب مشرکوں سے نکاح کرنا حرام قرار دیا تو جبکہ یہود و نصاریٰ میں بھی عقائد شرکیہ پائے گئے ہیں، تو ان سے نکاح کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ حضرت ابن عمر کتابیات سے نکاح کرنے کو جواز مانتے ہوئے بھی سخت موقف رکھتے تھے کہ جب ان کے عقائد شرکیہ ہیں تو ان سے نکاح ہرگز نہ کیا جائے۔

کفر و شرک میں فرق:

شرک خاص ہے اور کفر عام ہے۔ شرک کا مطلب یہ ہے کہ مجوسیوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے غیر کو واجب الوجود سمجھ کر اس میں الوہیت ثابت کرنا، یا بت پرستوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے غیر کو مستحق عبادت سمجھنا اور اسے معبود کہنا۔

کفر ضروریات دین کا انکار کرنا، جیسا کہ قرآن پاک کا انکار کرنا، انبیاء کرام کا انکار کرنا، آسمانی کتابوں کا

انکار کرنا، فرشتوں کا انکار کرنا، قیامت کا انکار کرنا، فرائض کی فرضیت کا انکار کرنا، محرمات کی حرمت کا انکار کرنا، دینی شعار کا مزاح اڑانا، خیال رہے کہ مستحب چیزوں کا مزاح اڑانا بھی کفر ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ ہر شرک کفر ہے، لیکن ہر کفر شرک نہیں، البتہ مجازی طور پر کفر پر شرک کا اطلاق بھی ہوتا رہتا ہے۔

آیہ کریمہ میں محققین کا موقف:

زیر بحث آیہ کریمہ میں زیادہ اہلِ تحقیق کا موقف یہ ہے کہ "ولاتنکحوا المشرکات" میں حکم عام ہے، کسی مشرکہ عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں، اور کسی کافرہ سے بھی نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہاں مشرکات کا اطلاق کافرات پر بھی ہے۔

"والاکثرون من العلماء علی لفظ "المشرک" یندرج فیہ الکفار من اھل الکتاب وھو المختار"

اکثر علماء کرام کا قول یہ ہے کہ "مشرک" کے لفظ میں اہل کتاب کے کفار بھی مندرج ہیں، یہی قول مختار ہے۔

اس قول کے مختار ہونے پر چند وجوہ دلالت کر رہی ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاری المسیح ابن اللہ"

اور یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

پھر اس آیہ کریمہ کے آخر میں ذکر فرمایا "سبحانہ عما یشرکون" (پاک ہے وہ ذات اس سے جو شریک ٹھہراتے ہیں)

"وھذہ الآیۃ صریحۃ فی ان الیھودی والنصرانی مشرک"

یہ آیت واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ یہودی اور نصرانی کو بھی مشرک کہا گیا ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء"

بے شک اللہ تعالیٰ مشرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے بغیر جس کی چاہے مغفرت کر دے۔

اگر یہودیوں اور نصرانیوں کو مشرک کہنا صحیح نہ ہوتو اس آیۃ کریمہ سے یہ سمجھ آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو یہودیوں اور نصرانیوں کی بھی مغفرت فرمادے۔"ولما کان ذلک باطلاعلمناان کفرھماشرک" حالانکہ یہ نظریہ باطل ہے تو اس سے واضح ہوگیا کہ یہود ونصاری کا کفر شرک بھی ہے۔

(۳) رب تعالیٰ نے فرمایا" لقد کفر الذین قالو ا ان اللہ ثالث ثلاثة"
تحقیق وہ لوگ کافر ہیں جنہوں نے کہا اللہ تین میں سے ایک ہے۔
"وقول با ثبات الآلھة فکانوا مشرکین" وہ متعدد خدا ماننے کی وجہ سے مشرک ہوئے۔

(۴) نبی کریم ﷺ نے عام کافروں کو مشرک کہا، ارشاد فرمایا۔
"واذالقیت عدوا من المشرکین فادعھم الی الاسلام"
جب تم مشرکین دشمنوں کی جماعت سے ملو (یعنی جہاد میں ان سے تمہارا آمنا سامنا ہو) تو ان کو پہلے دعوت اسلام دو۔
اس سے مراد تمام کفار ہیں۔

(۵) ابوبکراصم رحمہ اللہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کے انکار کرنے والے کو بھی مشرک کہتے تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ شدید:

"عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنه عن رسول اللہ ﷺ نتزوج نساء اھل الکتاب ولا یتزجون نساء نا" (کبیر)

حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، ہم اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن وہ ہماری عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے۔

اس لئے واضح ہوا کہ کوئی عورت کسی یہودی یا نصرانی سے نکاح نہیں کر سکتی، نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہودیوں اور نصرانیوں کے یاروں نام نہاد مسلمانوں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے، جو مردوں اور عورتوں کی برابری کے قائل ہیں۔ شریعت کے باغی درحقیقت بے حیاء ہیں۔

مشرکین کے ایمان لانے پر ان سے نکاح جائز ہے:

شرک والی عورتیں ایمان لے آئیں تو ان سے نکاح مسلمان مردوں کا جائز ہے۔ اور مشرک مرد ایمان لے آئیں تو ان سے مسلمان عورتوں کا نکاح جائز ہے۔

ایمان جو معتبر ہے " الاقرار بالشهادة و التزام احکام الاسلام " زبان سے کلمہ شہادت پڑھنا اور رب تعالیٰ کی وحدانیت کا قرار کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرنا اور اسلام کے احکام پر عمل کرنا۔ شریعت ظاہر کو دیکھ کر مسلمان کہے گی، دل کا اعتقاد رب تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ (از کبیر)

لونڈی سے نکاح کرنا:

انسان اپنی ہی مملوکہ لونڈی سے نکاح نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر اپنی ہی لونڈی سے جماع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے تمام جسم کا مالک ہے۔ حالانکہ اپنی زوجہ کے فقط فرج کا مالک ہے، جب اپنی زوجہ سے جماع کرنا جائز ہے تو اپنی مملوکہ لونڈی سے جماع کرنا بھی جائز ہے۔

اگر مالک اپنی لونڈی سے جماع کرے، اس کی اولاد پیدا ہو جائے، مالک تسلیم کرے کہ یہ میری ہی اولاد ہے، تو وہ اولاد آزاد ہوگی، اور وہ لونڈی " ام ولد " کہلائے گی۔ مالک کی موت پر وہ بھی آزاد ہو جائے گی۔

کسی اور کی لونڈی سے نکاح جائز ہے، جب مالک نے اسے نکاح کرنے کی اجازت دی ہو، لیکن اگر مالک اجازت نہ دے تو لونڈی خود کسی سے نکاح نہیں کرسکتی، لونڈی کی اولاد غلامیت میں ماں کے تابع ہوگی، یعنی لونڈی جس کا نکاح اس کے مالک نے کسی آزاد شخص سے کیا ہو لیکن اس لونڈی کی اولاد بھی لونڈی کے مالک کی غلام ہوگی۔

غلام سے نکاح کرنا:

مالکہ اپنے ہی غلام سے نہ نکاح کرسکتی ہے اور نہ ہی اس سے جماع کراسکتی ہے۔ البتہ غلام کا مالک غلام کو نکاح کرنے کی اجازت دے تو وہ نکاح کرسکتا ہے۔ (از کتب فقه)

مسئلہ: اس زمانہ میں انگریز عورتیں جو دہریئے ہو کر خدا کی ذات اور انجیل شریف اور عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہو چکے ہیں ان سے نکاح جائز نہیں، کیونکہ یہ عیسائی نہیں بلکہ دہریئے ہیں، مسلمان سخت غلطی کرتے ہیں کہ بے تحقیق ولایت سے میمیں بیاہ لاتے ہیں، مجھ سے ایک عیسائی پادری نے جس کا نام پادری ایم سکاٹ تھا بیان کیا کہ عام انگریز قومی عیسائی رہ گئے ہیں، دینی عیسائی نہیں، یہ حضرت مسیح اور انجیل بلکہ رب کے منکر ہو چکے ہیں۔ (نعیمی)

مسئلہ: جس کی بیوی عیسائن یا یہودن ہو وہ اپنے بچوں کی پرورش ماں سے نہ کرائے، بلکہ ان کے ہوش سنبھالتے ہی انہیں ماں سے الگ کر دے، ورنہ بچوں کے ایمان کا اندیشہ ہے۔ (نعیمی)

جیسا کہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا، یہی موقف خواجہ قمر الاسلام حضرت قمر الدین سیالوی ... کا تھا کہ آج کل کے اہلِ کتاب دہریئے ہیں ان سے نکاح نہ کیا جائے۔

مسئلہ: میاں بیوی کافر تھے، ان کا نکاح کفر میں ہوا تھا، مسلمان ہونے پر ان کو پہلے ہی نکاح پر قائم رہنے دیا جائے گا۔ (هدایہ)

مسئلہ: مجوسی (آگ پرست) شخص نے اپنے مذہب کے مطابق اپنی ماں یا بیٹی سے نکاح کیا ہوا تھا، پھر ان دونوں نے اسلام قبول کر لیا، تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ (هدایہ)

مسئلہ: اگر خاوند مسلمان ہو اور عورت اہلِ کتاب سے ہو تو نابالغ اولاد باپ کے تابع ہوگی۔ البتہ بالغ اولاد جس دین کو اختیار کرے گی وہی اس کا دین ہوگا۔ (از هدایة)

مسئلہ: میاں بیوی دونوں کافر تھے، عورت نے اسلام قبول کر لیا تو مرد پر اسلام پیش کیا جائے، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو اس کی زوجہ اس کے نکاح میں رہے گی، اگر وہ اسلام لانے سے انکار کر دے تو قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کر دے، یہ تفریق طلاق ہوگی۔

اگر خاوند نے پہلے اسلام قبول کر لیا تو زوجہ پر اسلام پیش کیا جائے اگر وہ اسلام لے آئے تو ان کا نکاح برقرار رہے گا، اور اگر وہ اسلام لانے سے انکار کر دے تو قاضی ان کے درمیان تفریق کر دے یہ تفریق طلاق نہیں ہوگی بلکہ نکاح فسخ ہوگا۔ (هدایہ)

مسئلہ: میاں بیوی مسلمان تھے، العیاذ باللہ کوئی ایک ان سے کافر ہو جائے (مرتد ہو جائے) تو ان کا نکاح ختم ہو جائے گا۔ (ھدایۃ)

مسئلہ: اگر دونوں ایک ساتھ ہی مرتد ہو گئے، لیکن پھر دونوں ایک ساتھ ہی اسلام کی طرف لوٹ آئے، تو ان کا نکاح برقرار رہے گا۔ اور اگر کوئی ایک پہلے اسلام کی طرف لوٹ آئے تو نکاح فاسد ہو گا۔ (از ھدایۃ)

کفار اور مشرکین کا تعجب میں ڈالنے کا کیا مطلب؟

''(ولو اعجبتکم) بحسنھا او مالھا او حریتھا او نسبھا''

اگر چہ مشرکات اپنے حسب جمال اور مال دولت اور اپنی حریت (آزادی) اور حسب نسب کی وجہ سے تمہیں تعجب میں ہی کیوں نہ ڈالیں، بے شک وہ تمہارے دل میں بھاتی ہوں، لیکن مشرکات سے تم نکاح نہ کرو، بلکہ ان سے بہتر مومنہ لونڈی ہے، اس لئے کہ ایمان ہو گا تب ہی دین حاصل ہو گا، اور ایمان و دین کے ہوتے ہی مال و نسب بھی معتبر ہو گا ورنہ اس نسب و مال کا کوئی فائدہ نہیں، جو مشرکین و مشرکات کو حاصل ہے۔

''فعند التوافق فی الدین تکمل المحبۃ فتکمل منافع الدین و الدنیا''

جب دونوں میاں بیوی کا دین ایک ہو گا یعنی دونوں مومن ہوں گے تو ان میں کامل محبت ہو گی، جب کامل محبت ہو گی تو وہ دونوں دین داری میں کامل ہوں گے، ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نیکی کے کام کریں گے۔ جب ان دونوں کے درمیان کامل محبت ہو گی کھچا تانی نہیں ہو گی تو ان کو صحت حاصل ہو گی، ان کا مال محفوظ رہے گا اور ان کی اولاد کی تربیت اچھی ہو گی۔

''وعند الاختلاف فی الدین لا تحصل المحبۃ''

جب زوجین دین میں مختلف ہوں تو ان میں محبت نہیں ہو سکتی، جب محبت نہیں ہو گی تو محبت پر مرتب ہونے والے منافع بھی حاصل نہیں ہوں گے، اس لئے مشرکات سے نکاح حرام کر دیا گیا ہے۔ اور کتابیات سے نکاح جائز ہونے کے باوجود بہتر نہ ہونے کا حکم نافذ کر دیا گیا۔

"ولواعجبکم": کا بھی یہی مطلب ہے کہ مشرک اپنے مال و دولت اور حسن و جمال وغیرہ سے اگرچہ تمہیں تعجب میں ہی کیوں نہ ڈالے، اپنی عورتوں (بیٹیوں، بہنوں وغیرہ) کو ان کے نکاح میں نہ دو۔

سب سے بڑا نقصان:

مسلمان غیر مسلم عورت سے نکاح کرے تو اسے اپنا ایمان محفوظ رکھنا بھی ممکن نہیں، اولاد کے ایمان دار ہونے یا نیک ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"ولواعجبتکم" اسی طرح "ولو اعجبکم" میں دو ترکیبیں پائی گئی ہیں۔

ایک یہ ہے کہ "واؤ حالیہ ہو" اور اس کا عطف مقدر عبارت پر ہو۔ حاصل عبارت یہ ہو۔

"والأمة مومنة خیر من مشرکة علی کل حال ولو فی هذه الحالة"

ایمان والی لونڈی مشرکہ عورت سے ہر حال میں بہتر ہے، خواہ وہ مشرکہ تمہیں تعجب میں ہی کیوں نہ ڈالے۔

دوسری ترکیب جو تفسیر کواشی نے بیان کیا ہے، وہ ایک قانون بیان کی ہے (جو راقم کے نزدیک زیادہ بہتر ہے)

لفظ "لو" یہاں "ان" کے معنی میں ہے، اور واؤ وصل کے لئے ہے، یعنی "ان وصلیه" والا معنی ہوگا۔ جس کا معنی ہوتا ہے "اگر چہ"

قانون یہ ہے کہ "لـو" کے بعد جب ماضی ہو تو وہ "ان وصـلیـه" کے معنی میں ہوگا، اور جواب اس کا مقدم ہوگا۔ اب تقدیر عبارت یہ ہے۔

"وان کانت المشرکة تعجبکم وتحبونها فان المومنة خیر لکم"

اگر چہ مشرکہ تمہیں تعجب میں ڈالے، اور تم اسے پسند کرو، بے شک اس سے ایمان والی لونڈی تمہارے لئے بہتر ہے۔ (روح البیان)

تاہم یہ خیال رہے یہ قاعدہ اکثریہ ہے کلیہ نہیں۔ کیونکہ "لو کان فیھما آلھة الا اللہ لفسدتا" میں "لو" کے بعد ماضی ہے لیکن "لو" امتناعیہ ہے۔

زمخشری معتزلی کی خوبصورت عبارت:

"لاترضی لمجالستک الا اھل مجانستک" تم اپنی ہم نشینی کے لئے سوائے اپنی ہم جنس کے کسی اور کو پسند نہ کرو۔ حقیقت یہی ہے۔

جنس با جنس کند پرواز کبوتر با کبوتر باز با باز

جنس جنس کے ساتھ پرواز کرتی ہے۔ کبوتر کبوتر کے ساتھ اور باز باز کے ساتھ۔

آجکل یہی جھگڑا اور فساد ہے، یہود ونصاریٰ کے یار لوگ نام نہاد مسلمان چاہتے ہیں علماء بھی ہماری طرح ہو جائیں۔ لیکن علماء کرام بھی نامساعد حالات میں اسلام کے باغیوں کا ہمت وجرات سے مقابلہ کررہے ہیں کہ اے یہود ونصاریٰ کے یارو! ہم سے یہ توقع چھوڑ دو کہ ہم بھی تمہاری طرح ہو جائیں۔

"اولئک یدعون الی النار":

اس مقام میں "اولئک" کا اشارہ مشرکین اور مشرکات کی طرف ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ مشرکین ایسے اعمال کی طرف بلاتے ہیں جو تمہارے لئے آگ میں جانے کا ذریعہ ہیں۔

"فان صحبتم ومعاشرتھم توجب الانحطاط فی کثیر من ھواھم مع تربیتھم النسل"

اگر تم نے مشرکین سے نکاح کے معاملات طے کئے، ان سے میل جول رکھا، ان سے رہن سہن رکھا تو وہ تمہیں غلط خواہشات میں مبتلا کر کے پستی کی طرف دھکیل دیں گے۔ اور وہ تمہاری نسل کی غلط تربیت کر کے تمہاری دنیا اور تمہارا دین برباد کردیں گے۔

"واللہ یدعوا الی الجنة والمغفرة": "ای الی عمل اھل الجنة"

اور اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے اعمال کی دعوت دیتا ہے جو تمہاری مغفرت کا ذریعہ ہے اور تمہیں جنت میں لے جانے والے ہیں۔

"باذنہ": "ای بامرہ" اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے حکم، اپنی توفیق سے جنت و مغفرت کی دعوت دیتا ہے، اور تمہارے لئے نیک اعمال کے ذریعے جنت میں جانا آسان فرماتا ہے۔ (قرطبی)

مقام توجہ:

" واللہ یدعو" میں حذف مضاف بھی مانا گیا، جس کے مطابق معنی یہ بھی کیا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ولی یعنی اللہ والے تمہیں مغفرت اور جنت کی طرف اللہ کے حکم اور اس کی توفیق سے بلاتے ہیں۔

اس معنی کے مطابق علامہ رازی رحمہ اللہ کی خوبصورت عبارت دیکھی جائے۔ آپ رقمطراز ہیں۔

" اعداء اللہ یدعون الی النار، واولیاء اللہ یدعون الی الجنة والمغفرة، فلاجرم یجب علی العاقل ان لا یدورحول المشرکات اللواتی ھن اعداء اللہ تعالیٰ وان ینکح المومنات فانھن یدعون الی الجنة والمغفرة "

اللہ کے دشمن آگ کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ کے دوست مغفرت اور جنت کی طرف بلاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ عقل مند شخص مشرکات کے اردگرد نہ پھرے، وہ اللہ کی دشمن ہیں، وہ آگ کی طرف لے جائیں گی، بلکہ ایمان والی عورتوں سے نکاح کرے، خواہ وہ لونڈیاں ہی کیوں نہ ہوں، اس لئے کہ وہ جنت و مغفرت کی طرف بلاتی ہیں۔

سب سے بڑی خرابی:

" انھم یدعون الی ترک المحاربة والقتال وفی ترکھما وجوب استحقاق النار والعذاب" (کبیر)

بیشک مشرکین تمہیں جہاد سے روکیں گے۔

ہندو، مسلم، عیسائی

ہیں سب بھائی بھائی

کا تصور تمہیں دیں گے، جب تم نے اس نعرہ کو قبول کرلیا تو تم اس آگ کے مستحق ہو جاؤ گے۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص ایمان والی آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہو، یعنی اس کا مہر اور نفقہ ادا کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو تو وہ ایمان والی لونڈی سے نکاح کرسکتا ہے۔

”ویبین آیاته للناس لعلهم یتذکرون“:

اور وہ بیان کرتا ہے اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو بیان فرماتا ہے جو آیات اعلیٰ احکام پر مشتمل ہیں۔ اور عمدہ حکم ان میں پائے جاتے ہیں، تاکہ لوگ ان سے نصیحت حاصل کریں، اور ایسے اعمال کریں جو ان کی کامیابی کا ذریعہ ہوں اور جنت ومغفرت کی طرف وہ اعمال ان کو لے جائیں۔ (تفسیر ابی السعود)

شادی کرنے کے لئے صرف دین دار عورت کا انتخاب کیا جائے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

”تنکح المراة لأربع لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك“ (بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب النکاح)

عام طور پر عورت سے نکاح چار چیزوں کو دیکھ کر کیا جاتا ہے اس کا مال، اور اس کی خاندانی شہرت، اور اس کی خوبصورتی اور اس کی دینداری کو دیکھا جاتا ہے لیکن تم صرف دیندار عورت کو اپنے پاس لانے میں کامیابی حاصل کرو، تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں۔

وضاحت حدیث:

حدیث پاک میں جو لفظ "تربت یداک" استعمال ہوا ہے، یہ کبھی تو بددعاء کے لئے بھی اہل عرب استعمال کرتے ہیں" کہ تمہارے ہاتھ خاک آلود ہو جائیں، یعنی تم ذلیل ہو جاؤ"

اگر ان الفاظ کا یہاں یہی معنی لیا جائے تو عبارت محذوف ہوگی، اصل عبارت اس طرح بن سکے گی۔

" صرت محروما من الخير ان لم تفعل ما امرتک "

تم بھلائی سے محروم ہو جاؤ گے اگر تم نے میرے حکم کے مطابق عمل نہ کیا۔

یعنی اگر تم نے دیندار عورت کا انتخاب نہ کیا بلکہ صرف خوبصورت کو تلاش کرتے رہے تو تمہیں دین کی بھلائی حاصل نہیں ہو سکے گی۔

اور کبھی اہل عرب اس لفظ کو ایک محاورہ کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں جس طرح ہم بھی اپنے محاورہ میں "خاک چھاننے" کا مطلب "محنت ومشقت کرنا" لیتے ہیں، ایسے ہی اہل عرب "تربت یداک" کا معنی محنت کرنا، مشقت کرنا، تلاش کرنا لیتے ہیں۔ یعنی تم دیندار عورت کو ہی تلاش کرو، اگرچہ تمہیں اس کے لئے کتنی خاک کیوں نہ چھاننی پڑے۔

" ذات الدين " سے مراد وہ عورت ہے جو مسلمان ہو اور نیک پرہیزگار ہو اور دیندار خاندان کی ہو۔

☆ " قال ابن الهمام اذا لم يتزوج المراة الالعزها او مالها او حسبها فهو ممنوع شرعا" قال ﷺ من تزوج امراة لعزها لم يزده الله الاذلا ومن تزوجها لمالها لم يزده الافقرا ومن تزوجها لحسبها لم يزده الادناءة ومن تزوج امراة لم يرد بها الا يغض بصره و يحصن فرجه او يصل رحمه بارک الله له فيها وبارک لها فيه "

(رواه الطبرانی فی الاوسط)

حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ صاحب فتح القدیر نے فرمایا کہ صرف مال، عزت اور دنیاوی شہرت کو دیکھ

کر نکاح کرنا منع ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے (دنیاوی) عزت کے پیش نظر کسی عورت سے نکاح کیا تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوائے ذلت کے اضافہ کے کچھ حاصل نہیں ہوگا، اور اگر کسی شخص نے صرف عورت کا مال دیکھ کر نکاح کیا تو اللہ کی طرف سے سوائے غربت کے اضافہ کے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا، اگر کسی شخص نے صرف خاندانی شہرت کی وجہ کسی عورت سے نکاح کیا تو اسے سوائے کمینگی اور گھٹیاپن کے اضافہ کے اللہ تعالیٰ کچھ عطا نہیں کرے گا، اور جو شخص کسی عورت سے نکاح پاکدامنی اور فرج کی حفاظت اور صلہ رحمی کے لئے کرتا ہے، یعنی اپنی رشتہ دار عورت سے صلہ رحمی کا ثواب بھی ملے گا، تو ایسے نکاح میں اللہ تعالیٰ مرد اور عورت کو برکت عطا فرمائے گا۔

اصل مقصد دینداری ہو، اگر دیندار عورت کو جمال، مال اور خاندانی شہرت بھی حاصل ہو تو ایک عظیم نعمت ہوگی۔

"وقال ﷺ لا تتزوجوا النساء لحسنهن فعسى حسنهن ان يرديهن و لا تتزوجوهن لمالهن فعسى اموالهن ان تطغيهن ولكن تزوجوهن على الدين و لامة خرماء سوداء ذات دين افضل " (رواه ابن ماجه)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورتوں سے صرف ان کے حسن کی وجہ سے نکاح نہ کرو، ہوسکتا ہے حسن ہی ان کی بربادی کا سبب بنے۔ اور صرف ان کے مال کی وجہ سے نکاح نہ کرو، ہوسکتا ہے ان کا مال ان کو سرکش بنادے، لیکن ان کی دینداری دیکھ کر ان سے نکاح کرو۔ اگر کوئی لونڈی سیاہ رنگ والی ہو اور اس کا کان بھی کٹا ہوا ہو لیکن وہ دیندار ہو تو اس سے نکاح کرنا افضل ہے۔

حسب سے مراد کیا ہے؟

حسب (بفتحتین) کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان میں اس کے آباء واجداد میں اچھی عادات کی شہرت ہو۔

لیکن یہ خیال رہے کہ صرف دنیاداری کے لحاظ سے اچھی عادات اور اچھے خاندان کو دیکھنا شریعت میں کوئی پسندیدہ فعل نہیں، بلکہ دینداری کی اچھی شہرت تقوی ہے، جو شریعت میں پسند ہے۔

(وضاحت حدیث ماخوذ از مرقاۃ جلدنمبر ٦ صفحہ نمبر ١٨٨)

ضروری ہدایت:

اپنی بچیوں کے لئے خوش اخلاق، تندرست، کمانے والے، دیندار خاوند تلاش کرو، صرف مال دیکھ کر لڑکی نہ دے دو، ورنہ بعد میں سخت پریشانی اٹھانا پڑے گی، بچہ کا پہلا اسکول ماں، باپ کی گود ہے، آوارہ، بداخلاق ماں، باپ کی اولاد بھی آوارہ ہی ہوتی ہے۔ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا جیسی ماں ہو تو حضرت امام حسن وامام حسین رضی اللہ عنہما جیسے فرزند ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال مرحوم نے بے حجاب پھرنے والی لڑکیوں کو خطاب کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا۔

اگر پندے ز درویشے پذیری، جہاں میرد تو نمیری

بتولے باش پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوش شبیرے بگیری

(١) اگر تو درویش کی نصیحت قبول کرلے، تو جہاں مرجائے گا لیکن تو نہیں مرے گی۔ یعنی نیکیوں کی وجہ سے تیرا نام زندہ رہے گا تجھے حیات جاودانی حاصل ہوگی۔

(٢) بتول بن کر رہ، اس زمانے سے پوشیدہ ہو جا، تاکہ تو اپنی آغوش میں شبیر یعنی امام حسین رضی اللہ عنہ جیسا فرزند لائے۔

یعنی تو بے حجاب ہو کر گلی کوچوں میں گشت نہ کر، بازاروں کی رونق نہ بن، اجنبی مردوں کے لئے شمع محفل نہ بن، بلکہ حضرت بتول یعنی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا جیسی شرم وحیاء کا پیکر بن جا، پھر تیرے فرزند بھی امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرح بہادر، حق وصداقت پر قائم رہنے والے، باطل سے ٹکر لینے والے، ظالموں کے پہاڑوں، چٹانوں جیسے لشکروں سے پنجہ آزمائی کرکے پاش پاش کردیں گے۔

حضورﷺ نے اپنی لخت جگر فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے مسکین کو منتخب فرمایا، جن کے گھر میں بجائے دولت کے اللہ اور اس کے رسول کا نام ہی تھا، مگر ان کا سینہ دولت ایمان سے مالا مال تھا۔

نیز حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی صفورا کے لئے موسی علیہ السلام کو منتخب کیا جن کے پاس اس وقت نہ گھر تھا نہ در۔ پردیسی مسافر تھے، صرف دین اور قوت ایمانی کو دیکھا تھا۔

گھر میں ایسی بہولائیں جو قرآن، مصلی اور تسبیح لائیں تا کہ ان کے آنے سے گھر اللہ کے ذکر سے بھر جائے۔ صرف ٹیلی ویژن لانے والی نہ ہوں جو گھر کو سینما بنادے، سر سے ننگی پھرنے والی، بازو اور گریبان ننگے کر کے گھومنے والی، بے حیائی کو فروغ دینے والی نہ ہوں۔ (از نعیمی بزیادۃ)

☆☆☆☆☆

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ ھُوَاَذًی فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ وَلَاتَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰی یَطْھُرْنَ فَاِذَاتَطَھَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت،۲۲۲)

﴿۱﴾

اورتم سے پوچھتے ہیں حیض کا حکم تم فرماؤ وہ ناپاکی ہے،تو عورتوں سے الگ رہو حیض کے دنوں میں اوران سے نزدیکی نہ کرو جب تک پاک نہ ہوں، پھر جب پاک ہو جائیں توان کے پاس جاؤ جہاں سے تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کواور پسند رکھتا ہے ستھروں کو۔

﴿۲﴾

اورسوال کرتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق،فرمادیجئے وہ اذیت (ایذاء پہنچانے والی) ہے،تو جداء ہو جاؤ عورتوں سے حیض میں ،اور نہ قریب جاؤان کے یہاں تک کے وہ پاک ہو جائیں ،تو جب وہ پاک ہو جائیں تو آؤان کے پاس جہاں سے تمہیں اللہ نے حکم دیا، بیشک اللہ پسند کرتا ہے توبہ کرنے والوں کواور پسند کرتا ہے پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو۔

لفظی مختصر مطلب:

”**ویسئلونک عن المحیض**“: ھومصدریقال حاضت محیضا کقولک جاء مجیأ ”

”محیض“ مصدر ہے،جس طرح مجیٔ،مضیٔ وغیرہ مصدر ہیں،اوروہ سوال کرتے ہیں آپ

سے حیض کے متعلق یعنی آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔

"قل ھواذی": ای المحیض شئ یستقذر ویؤذی من یقربه "

ھو ضمیر ، محیض کی طرف لوٹ رہی ہے، نبی کریم ﷺ کو خطاب فرمایا کہ آپ فرمادیجئے کہ وہ حیض ایک ایسی چیز ہے جو گندگی ہے۔اس حالت میں جو شخص عورت کے قریب آتا ہے وہ حیض کی گندگی اسے ایذاء پہنچاتی ہے۔

خیال رہے وہ گندگی نجاست ہے۔اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "اذی" کا ترجمہ ''ناپاکی'' کیا ہے۔اور کئی مترجمین نے "اذی" کا معنی گندگی کیا ہے۔اور راقم نے لغوی اور بطور نتیجہ صادق آنے والا ترجمہ کیا ہے ''ایذاء پہنچانے والی چیز'' تمام تراجم کا مقصد ایک ہی کہ حیض ناپاک اور گندی چیز ہے، جوایذاء پہنچاتی ہے قریب آنے والے کو۔

"فاعتزلو االنساء فی المحیض": فاجتنبوھن ای فاجتنبو امجامعتھن "

عورتوں کو جدا کرو حیض میں، یعنی حیض کے دنوں میں ان کو جماع سے دور کردو، ان سے جماع کرنے سے اجتناب کرو۔

"ولا تقربوھن" مجامعین او و لاتقربو امجا معتھن **"حتی یطھرن"** ای یغتسلن"

اور حیض والی عورتوں کے قریب جماع کرنے کے لئے نہ جاؤ، یا یہ مطلب ہے کہ حیض والی عورتوں کو جماع کے لئے اپنے قریب نہ آنے دو، یہاں تک کہ وہ پاکیزہ ہو جائیں یعنی غسل کرلیں۔

"فاذاتطھرن" اغتسلن **"فاتو ھن"** فجا معوھن **"من حیث امر کم اللّٰہ"** من المأتی الذی امر کم اللہ به وحله لکم وھو القبل "

جب وہ عورتیں پاکیزہ ہو جائیں یعنی غسل کرلیں تو ان کے پاس آؤ یعنی ان سے تم جماع کر سکتے ہو، البتہ جماع کی اجازت تمہیں قبل (عورت کا اگلا مقام فرج) میں ہے، وہی تمہارے لئے حلال ہے۔

"ان اللّٰہ یحب التوابین": بے شک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے توبہ کرنے والوں کو۔

یعنی جس کام سے منع کیا گیا ہے، اگر اس کا ارتکاب کسی نے کرلیا، لیکن پھر اس پر نادم ہوکر توبہ کرلی تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا اور اسے پسند فرمائے گا۔

"والتواب الذی کلما اذنب جدد توبۃ وقیل الذی لا یعود الی الذنب"

توبہ کرنے والے کو چاہئے کہ اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کرے کہ پھر اس گناہ کی طرف نہ لوٹے، اگر غلطی سے پھر گناہ ہوجائے پھر توبہ کرے، اللہ تعالیٰ پھر معاف فرمائے گا۔

"ویحب المتطہرین": پسند کرتا ہے پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو۔

"یعنی من الاحداث وسائر النجاسات بالماء"

پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ وہ بے وضو ہونے کی صورت میں یا بے غسل ہونے کی صورت میں پانی سے وضو کرتا ہے اور غسل کرتا ہے اور اگر جسم یا کپڑوں وغیرہ پر نجاست (پلیدی) ہو تو اسے پانی سے دھوتا ہے۔

"وقیل المتطہرین من الشرک" اور پاکیزگی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شرک سے اپنے آپ کو پاک کرتے ہیں۔

"اوالمتنزھین من ادبار النساء" اور پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورتوں کے پچھلی جانب (دبری جانب) آنے سے پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔

"اومن الجماع فی الحیض" اور پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ وہ حیض کے دنوں میں عورتوں سے جماع کرنے سے دور رہ کر اپنے آپ کو پاکیزہ رکھتے ہیں۔

"اومن الفواحش" اور پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں کی آلودگی سے پاک رکھتے ہیں۔

"وقیل ھم الذین لم یصیبوا الذنوب" اعلیٰ قسم کی پاکیزگی یہ ہے کہ ان کو گناہ پہنچے ہی نہیں۔

(از مدارک وخازن)

شانِ نزول:

"عن انس بن مالک قال ان الیهود کا نوااذاحا ضت المراۃ فیهم لم یؤاکلوها ولم یجامعوهن فی البیوت فسأل اصحاب النبیﷺ فانزل اللّٰہ تعالٰی ویسئلونک عن المحیض الخ فقال رسول اللّٰہﷺ اصنعوا کل شیٔ الاالنکاح فبلغ ذلک الیهود فقالو ا ما یرید هذا الرجل ان ید ع من امرناشیأ الاخالفنافیه فجاء اسید بن حضیر و عباد بن بشر فقالا یارسول اللّٰہ ان الیهود تقول کذا و کذ اافلا نجامعهن فتغیر وجه رسول اللّٰہﷺ حتی ظننا ان قدوجد علیهما فخرجافاستقبلتهما هدیة من لبن الی النبیﷺ فارسل فی آثار هما فسقما هما فعرفا انه لم یجد علیهما"

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہود کی عورتوں کو جب حیض آتا تو وہ ان کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے تھے اور نہ ہی ان کو اپنے ساتھ گھروں میں جمع رکھتے، تو نبی کریمﷺ سے آپ کے صحابہ کرام نے حیض کے احکام کے متعلق سوال کیا، تو یہ آیۃ کریمہ" **یسئلونک عن المحیض** الخ "نازل ہوئی تو رسول اللہﷺ نے فرمایا ہر چیز تم کر سکتے ہو سوائے جماع کے، یہود کو جب یہ خبر ملی تو وہ کہنے لگے یہ کیسا شخص ہے کہ یہ کسی معاملہ کو نہیں چھوڑتا سوائے ہماری مخالفت کے (یعنی یہ کیسا شخص ہے کہ ہر معاملہ میں ہماری مخالفت کرتا ہے) تو اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما آئے تو ان دونوں نے کہا یا رسول اللہ! یہود اس طرح کہتے ہیں کیا ہم حیض کی حالت میں اپنی ازواج سے جماع بھی نہ کرلیا کریں، تو رسول اللہﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یہاں تک کے ہم نے گمان کیا کہ آپ کو ان پر بہت غصہ آگیا (آپ ان سے راضی نہیں ہونگے) وہ دونوں حضورﷺ کی محفل سے نکلے تو انہوں نے کسی شخص کو نبی کریمﷺ کی خدمت میں دودھ بطور ہدیہ لاتے ہوئے پایا، نبی کریمﷺ نے ان کے پیچھے کسی شخص کو بھیجا کہ وہ ان دونوں کو بلا کر لائے۔ (جب یہ دونوں واپس لوٹے) تو

آپ نے دودھ ان کو پلا دیا۔ تو انہوں نے سمجھا کہ آپ کو ان پر بہت زیادہ غصہ نہیں۔

" فعرفا انہ لم یحد ای لم یغضب او ما استمر الغضب بل زال او ذھب وھذا من مکارم اخلاقہ ﷺ "

نبی کریم ﷺ کو غصہ اس لئے تھا کہ جماع کی خواہش اگر چہ یہود کی مخالفت کی وجہ سے تھی، لیکن رب تعالیٰ کے حکم کی عدولی پر مشتمل تھی۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے اخلاق کریمانہ میں یہ بات شان تھی کہ آپ غصہ پر قائم نہیں رہتے تھے، بلکہ کسی کو متنبہ کرنے کے لئے غصہ کیا، پھر راضی ہو گئے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

اسید بن حضیر اور عباد بن بشیر کے قول میں "افلا نجامعھن" بعض نسخوں میں بغیر ہمزہ استفہام کے استعمال ہے، مرقاۃ میں بغیر ہمزہ کے ہے، لیکن معنی اس صورت میں بھی استفہامیہ ہے۔

اس کا مطلب مسلم شریف کے حاشیہ میں بہتر لکھا گیا ہے، کیونکہ وہ سیاق وسباق کے مطابق ہے۔

"افلا نجامعھن ای افلا نباشرھن بالوطی کما جاء فی سنن ابی داؤد " افلا ننکحھن "

یعنی ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم جماع نہ کر لیا کریں، یہ معنی اس لئے درست ہے کہ اسے ابوداؤد کی روایت میں "افلا ننکحھن" سے تائید حاصل ہے۔

اس لئے اس مقام پر ملا علی قاری رحمہ اللہ کی تشریح محل نظر ہے۔ ان کی تشریح مرقاۃ ج ۲، ص ۹۷ میں یہ ہے (جو درست نہیں)

"(فلا) ای افلا کما فی نسخۃ (نجامعھن) ای نساکنھن والتقدیر الا نعتزلھن فلا نجتمع معھن فی الاکل والشرب والبیوت " (راقم)

فائدہ:

"قال علماؤنا کانت الیھود والمجوس تجتنب الحائض و کانت النصاری یجامعون الحیض (بضم الیاء وتشدید الیاء جمع الحائض) فامر اللہ بالقصد بین ھذین" (قرطبی)

یہود اور مجوس حیض والی عورتوں سے مکمل دور رہتے تھے، ان کو اپنے پاس کمرے میں بھی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ کھانے اور پینے سے بھی دور رہتے تھے، اور نصرانی اپنی عورتوں سے حیض کی حالت میں جماع کرتے تھے، نبی کریم ﷺ کی شریعت میں درمیانی صورت میں عمل کرنے کا حکم دیا گیا۔ یعنی صرف جماع سے منع کیا اور باقی ان سے میل جول کی اجازت دی گئی۔

عورت کو آنے والے خون تین قسم کے ہیں:

(۱) حیض (۲) نفاس (۳) استحاضہ

حیض کیا ہے؟

حیض وہ خون ہے جو بالغ عورت کی رحم (بچہ دانی) سے آتا ہے کسی بیماری وغیرہ کا وہ خون نہ ہو۔ حیض کم از کم تین دن آتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ دس دن۔

"عن واثلة بن الاسقع قال قال رسول الله ﷺ اقل الحیض ثلاثه ایام و اکثره عشرة ایام"

واثلہ بن اسقع نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، حیض کی مدت کم از کم تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ (تبیین الحقائق للزیلعی)

حیض کے خون کے رنگ:

سب سے پہلے آنے والا خون مٹیالا (مٹی کے رنگ والا) ہوتا ہے، حیض کے دنوں میں آنے والا خون سرخ رنگ کا ہو یا زرد رنگ کا ہو، یا سبز رنگ کا ہو، یا مٹیالے رنگ کا ہو، سب حیض ہی کہلائیں گے، سوائے خالص سفید رنگ کے پانی کے، جب خالص سفید رنگ کا پانی آنا شروع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ حیض ختم ہو چکا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس عورتیں اپنے کرسف (فرج میں رکھنے والے کپڑے) بھیجتیں کہ ان کو دیکھ کر

بتائیں حیض ختم ہو چکا ہے یا نہیں، تو آپ دیکھتیں اگر ان میں زرد رنگ ہوتا تو فرماتیں " لا تعجلن حتی ترین القصة البیضاء " جلدی نہ کرو یہاں تک کہ خالص سفید رنگ جب دیکھو تو پھر حیض ختم ہوگا۔

حیض کتنے دنوں کے بعد آتا ہے؟

عورت کے پاکیزہ رہنے کی کم از کم مدت پندرہ دن ہے، اگر عورت پندرہ دن پاکیزہ رہے، پھر اسے تین دنوں سے لیکر دس دنوں تک خون آجائے تو وہ حیض کہلائے گا۔ اگر پندرہ دنوں سے کم پاک رہنے کے بعد خون آنا شروع ہوگیا تو وہ حیض کا خون نہیں ہوگا بلکہ بیماری کا خون ہوگا۔ لیکن عورت کے پاک رہنے کی زیادہ سے زیادہ مدت مقرر نہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی عورت کو بہت لمبی مدت حیض نہ آئے۔

نفاس:

وہ خون جو عورت کو بچے کی پیدائش کے بعد آئے اسے نفاس کہا جاتا ہے، بچہ مکمل پیدا ہو، یا نامکمل پیدا ہو، البتہ نامکمل کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے کچھ اعضاء یعنی ہاتھ پاؤں، انگلی، ناخن وغیرہ بن چکے ہوں۔

نفاس کی مدت کم از کم کوئی مقرر نہیں۔ جب خون آنا ختم ہوگیا تو نفاس ختم ہوگیا۔ البتہ زیادہ سے زیادہ مدت نفاس کی چالیس دن ہے۔ اس پر احادیث مبارکہ شاہد ہیں۔

☆ "عن ام سلمة انها سألت النبی ﷺ کم تجلس المرأة اذا ولدت قال اربعین یوما الا ان تری الطهر قبل ذلک "

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ عورت ولادت کے بعد کتنے دن بیٹھ رہے (یعنی نماز وغیرہ نہ ادا کرے) تو آپ نے فرمایا چالیس دن، سوائے اس کے کہ وہ پہلے ہی پاک ہو جائے۔

☆ " وعن ام سلمة کانت النساء یجلس علی عهد رسول اللہ ﷺ اربعین یوما"

(رواهما احمد وابو داؤد وابن ماجة والترمذی . تبیین الحقائق للزیلعی)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں عورتیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں چالیس روز بیٹھ رہتی تھیں۔

☆ "وقال الترمذی اجمع اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ ومن بعد هم علی ان النفساء تدع الصلوة اربعین یوما الا ان تری الطهر قبل ذلک"

ترمذی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام اور آپ کے بعد اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ نفاس والی عورتیں چالیس دنوں تک نماز ادا نہ کریں، ہاں البتہ اگر وہ پہلے ہی پاک ہو جائیں یعنی خون آنا بند ہو جائے تو اسی وقت نماز شروع کر دیں۔ (تبیین الحقائق للزیلعی)

استحاضہ:

عورت کو جو خون تین دنوں سے کم آئے،، یا دس دنوں سے بڑھ جائے، وہ استحاضہ ہے، اور پیدائش کے بعد آنے والا خون جب چالیس دنوں سے بڑھ جائے، تو چالیس دنوں سے زائد خون استحاضہ ہے۔

حاملہ عورت کو آنے والا خون استحاضہ ہے، کیونکہ دوران حمل رحم (بچہ دانی) کا منہ بند ہو جاتا ہے، اس لئے وہ خون کسی رگ کا ہو سکتا ہے، رحم کا نہیں کہ اسے حیض کہا جائے، اور نفاس بھی نہیں کیونکہ نفاس نے آنا ہی پیدائش کے بعد ہے۔

☆ "عن انس بن مالک رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال الحیض ثلاثة ایام واربعة و خمسة وستة وسبعة وثمانیة وتسعة فاذاجاوزت العشرة فهواستحاضة"

(تبیین الحقائق للزیلعی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حیض تین دن، اور چار دن اور پانچ دن اور چھ دن، اور سات دن، اور آٹھ دن اور نو دن ہوگا، جب دس دن سے تجاوز کر جائے تو وہ استحاضہ ہوگا۔

سبحان اللہ! کیسا فصیح و بلیغ کلام ہے، دس دن کا ذکر بظاہر نہیں، لیکن جب دس دنوں سے تجاوز کرنے کا ذکر فرمادیا، تو خود بخود پتہ چل گیا کہ دس دن آنے والا خون بھی حیض ہی ہے۔

حیض کے احکام:

☆ حیض کے دنوں میں زوجہ سے جماع کرنا حرام ہے، زیر بحث آیۂ کریمہ کے شان نزول سے واضح ہو چکا ہے کہ "قل ھواذی فاعتزلوا النساء فی المحیض" کا یہی مطلب ہے کہ عورتوں کو حیض کے دنوں میں جماع سے دور کر دو، یعنی ان سے جماع نہ کرو۔

☆ حیض کے دنوں میں عورت کو نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا منع ہے، البتہ روزہ کی قضاء لازم ہے، اور نماز کی قضاء لازم نہیں ہوگی، کیونکہ روزے سال میں ایک ماہ میں لازم ہیں، اگر ایک عورت کو مکمل دس دن رمضان میں حیض آئے، تو پھر بھی سال میں دس دن قضاء کوئی مشکل نہیں، لیکن نمازیں ہر دن، رات میں پانچ مرتبہ فرض ہیں، اگر ایک عورت کو پندرہ دن پاکیزہ رہنے کے بعد ہمیشہ دس دن خون آتا ہے تو اسے کثیر نمازیں قضاء کرنا لازم آئیں گی، اس لئے شریعت نے اس مشکل اور حرج کو عورت سے اٹھا کر عورت پر آسانی کر دی۔
سبحان اللہ! اسلام کا عورت پر کتنا احسانِ عظیم ہے کہ عورت کی مشکل کو حل کرنے کے لئے نماز جیسا اہم فریضہ معاف فرما دیا۔

☆ "عن معاذة العدوية قالت سالت عائشة رضی الله عنها فقلت ما بال الحائض تقضی الصوم ولا تقضی الصلوة فقالت احرورية انت قلت لست بحرورية ولكنی اسال قالت كان يصيبنا ذلک فنؤمر بقضاء الصوم ولا نؤمر بقضاء الصلوة"

(بخاری ومسلم ۔ تبيين الحقائق للزيلعی)

معاذہ عدویہ کہتی ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حیض والی عورتوں کا کیا حال ہے کہ روزہ قضاء کرتی ہیں اور نماز قضا نہیں کرتیں، آپ نے فرمایا تم حروریہ ہو (یعنی خارجی فرقہ سے تعلق رکھتی ہو) میں نے کہا میں حروریہ تو نہیں، لیکن میں آپ سے (یہ مسئلہ) پوچھ رہی ہوں، آپ نے فرمایا ہمیں جب حیض آتا تھا تو ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ ہم روزے قضا کریں اور ہمیں نماز قضاء کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔

مسجد میں داخل ہونا اور طواف کرنا منع ہے:

یعنی حیض والی عورت کا مسجد میں داخل ہونا اور بیت اللہ شریف کا طواف کرنا حرام ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"انی لااحل المسجد لحائض و لاجنب" (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ باب مخالطۃ الجنب)

بیشک میں نہیں حلال کرتا مسجد حیض والی عورت اور جنبی کے لئے۔

طواف کرنا منع ہے۔ اس کی ایک وجہ تو بعض حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ بیت اللہ شریف مسجد حرام میں ہے، جب مسجد میں داخل ہونا منع ہے تو طواف کرنا بھی منع ہے، لیکن علامہ چلپی رحمہ اللہ نے بھی اس علت کو ضعیف قرار دیا ہے، اور صاحبِ عنایۃ نے بھی یہ بیان کیا کہ خود بیت اللہ شریف کو یہ شرف حاصل ہے کہ حیض کی حالت میں طواف کرنا منع ہے، اگر بالفرض بیت اللہ شریف مسجد کے باہر ہوتا تو پھر بھی یہی حکم تھا، بلکہ طواف کرنے میں نقص ہو، یعنی بغیر وضو اور بغیر غسل کے طواف کرنے میں صدقہ ودم سے جبیرہ ادا کرنا پڑتا ہے، جبکہ مسجد میں داخل ہونے کا یہ حکم نہیں۔

(تبیین الحقائق للزیلعی، و چلپی)

قرآن پڑھنا منع ہے:

حیض والی عورتوں کو قرآن پڑھنا منع ہے۔

☆ " عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تقرأ الحائض و لا الجنب شیأ من القرآن"
(رواہ الترمذی، مشکوۃ باب مخالطۃ الجنب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حیض والی عورت اور جنبی شخص قرآن پاک نہ پڑھیں۔

حیض والی عورت کا قرآن پاک کو ہاتھ لگانا منع ہے:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" لایمسہ الا المطھرون "اس کو (قرآن پاک کو) نہ چھوئیں سوائے پاکیزہ لوگوں کے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے عامل عمرو بن حزم کی طرف خط لکھا، اس میں یہ لکھا۔

"ان لا یمس القرآن الا طاهر" (رواہ مالک والدار قطنی)

قرآن پاک کو سوائے پاک آدمی کے کوئی نہ چھوئے۔ (مشکوۃ باب مخالطۃ الجنب)

فائدہ: قرآن پاک کو کسی کپڑے سے پکڑے تو جائز ہے۔لیکن قرآن پاک کی جلد اور جلد کے اوپر چسپاں تہہ یا کپڑے کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

تنبیہ: جنبی شخص بھی قرآن پاک کو نہ پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی ہاتھ لگا سکتا ہے۔اور بے وضو شخص قرآن پاک کو ہاتھ تو نہیں لگا سکتا، البتہ زبانی پڑھے تو پڑھ سکتا ہے۔

مقام توجہ:

قرآن پاک پڑھنے کی ممانعت اس وقت ہے جب تلاوت کی غرض سے پڑھا جائے، اگر قرآن پاک کی کوئی آیات بطور دعاء پڑھے تو جائز ہے۔

"هذا اذاقرأه علی قصد التلاوة واما اذاقرأه علی قصد الذکر والثناء نحو بسم الله الرحمن الرحيم او الحمدلله رب العلمين او علم القرآن حرفا حرفا فلا بأس به بالاتفاق"

(تبیین الحقائق للزیلعی)

حیض والی عورت کو قرآن پڑھنا منع ہے جبکہ وہ تلاوت کے ارادہ سے پڑھے، اگر وہ ذکر اور ثناء کے ارادے سے "بسم الله الرحمن الرحيم" یا "الحمد لله رب العلمين" پڑھے تو یہ جائز ہے۔اسی طرح قرآن پاک پڑھانے کی غرض سے ایک ایک حرف کر کے پڑھائے، آگے پڑھنے والے روان خود کریں تو یہ جائز ہے۔

"لوقرأ الجنب الفاتحة علی سبيل الدعاء لا باس به وكذا شيأ من الآيات التی فيها معنی الدعاء"

اگر جنبی نے دعا کے طور پر سورہ فاتحہ کو پڑھا، یا اور وہ آیات پڑھیں جن میں دعا کا معنی نکلتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جنبی اور حیض والی عورتوں کا حکم ایک ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ سوائے قرآن پاک کی تلاوت کے عورت حیض کی حالت میں ہر قسم کا ذکر اور دعاء اور وظائف پڑھ سکتی ہے۔

دینی طلبا کرام کی توجہ کے لئے:

زیر بحث آیۂ کریمہ میں "حتی یطھرن" میں دو قرأتیں ہیں۔ ایک تخفیف سے اور دوسری تشدید سے، تخفیف والی قرأت کے مطابق ترجمہ ہوگا "یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں"۔

اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر عورت کو دس دن مکمل حیض آئے تو اس سے وطی حیض کے ختم ہونے پر بغیر غسل کرنے کے جائز ہے۔

اور تشدید والی قرأت سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے "یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو پاکیزہ کر لیں" کہ اگر عورت کو حیض دس دنوں سے کم آکر ختم ہو گیا ہے تو اس سے وطی اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک وہ غسل نہ کرے۔ یا اس پر نماز کا وقت گزر جائے، جس کو غسل کے قائم مقام سمجھا گیا ہے۔

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے حتی "یطھرن" کا ترجمہ کیا ہے (ان سے نزدیکی نہ کرو) جب تک وہ پاک نہ ہوں۔

اور "فاذا تطھرن فاتو ھن" "پھر جب پاک ہو جائیں ان کے پاس جاؤ"۔

راقم کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کی نقل ہے کیونکہ عورت کا پاک ہونا عام ہے کہ مدت حیض مکمل خون آکر وہ پاک ہو گئی۔ یا مدت حیض اگرچہ خون مکمل نہیں آیا، لیکن اس عورت نے حیض کے ختم ہونے پر غسل کر لیا تو وہ پاک ہو گئی۔ یہ ترجمہ بہت خوب ہے۔

اگرچہ بعض مترجمین نے ''وہ اپنے آپ کو خوب ستھرا کرلیں'' بھی ترجمہ کیا ہے، لیکن اس ترجمہ کی ضرورت نہیں۔

حیض کی حالت میں جو کام جائز ہیں:

عورت اپنی شرم گاہ پر کپڑا باندھ لے، پھر اس سے جماع کے بغیر باقی منافع حاصل کئے جاسکیں گے۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں '' وکان یامرنی فأتزر فیبا شرنی وانا حائض ''
رسول اللہ ﷺ مجھے فرماتے تھے تو میں چادر باندھ لیتی تھی (سلوار پہننے کا بھی یہی حکم ہے) تو حیض کی حالت میں آپ مجھ سے منافع حاصل کر لیتے تھے۔

خیال رہے کہ حدیث شریف میں استعمال لفظ ''فیباشرنی'' کا معنی جماع کرنا نہیں۔ بلکہ اس کا ترجمہ یہ ہے۔
''فیباشرنی ای یضا جعنی فیلا مسنی وتمس بشرته فوق الازار''
کہ آپ میرے ساتھ لیٹ جاتے اور آپ مجھے ہاتھ لگاتے اور چادر سے اوپر آپ کا جسم میرے جسم سے مس کرتا۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ''وکان یخرج رأسه الی وهو معتکف فاغسله وانا حائض''
نبی کریم ﷺ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے، مسجد میں رہتے ہوئے آپ متصل میرے حجرے میں کھڑکی سے سر اندر کرتے تو میں آپ کا سر دھو دیتی، حالانکہ میں حالت حیض میں ہوتی۔

☆ '' وعن عائشة قالت كنت اشرب وانا حائض ثم اناوله النبی ﷺ فیضع فاه موضع فی فیشرب واتعرق العرق وانا حائض ثم اناوله النبی ﷺ فیضع فاه علی موضع فی''
(رواہ مسلم، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں حیض کی حالت میں (پانی وغیرہ) پیتی تو حضور ﷺ میرے منہ کے رکھنے کی جگہ منہ رکھ کر پی لیتے۔ اور میں حیض کی حالت میں اپنے دانتوں سے گوشت کو کاٹتی (بوٹی کو دانتوں سے توڑتی) تو نبی کریم ﷺ میرے منہ رکھنے کی جگہ پر منہ رکھ کر گوشت کھا لیتے۔

☆ '' وعن عائشة قالت كان النبی ﷺ یتکئ فی حجری وانا حائض ثم یقرأ القرآن''
(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ کبھی میرے ساتھ سہارا لگا لیتے ،یعنی اپنا سر مبارک میری گود میں رکھ لیتے تھے اور آپ قرآن پاک پڑھ رہے ہوتے جبکہ میں حیض کی حالت میں ہوتی۔

"وفیہ دلالة علی ان الحائض طاهرة حسا نجسة حکما"

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ حیض والی عورت حسی طور پر یعنی ظاہر جسم کے لحاظ سے پاک ہے اور حکمی طور پر ناپاک ہے۔ (مرقاۃ ج ۲، ص ۹۸)

"عن میمونہ قالت کان رسول اللہ ﷺ یصلی وانا حذاء وانا حائض وربما اصابنی ثوبه اذا سجد"

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں حیض کی حالت میں ہوتی تو رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرما لیتے جبکہ میں آپ کے آگے لیٹی ہوتی ،نماز ادا فرماتے ہوئے آپ کا کپڑا بھی میرے کپڑوں کے ساتھ لگ جاتا تھا۔ (بخاری ، مرقاۃ ج ۲، ص ۹۹)

"عن عائشة قالت قال لی النبی ﷺ ناولینی الخمرة من المسجد فقلت انی حائض فقال ان حیضتک لیست فی یدک" (رواہ مسلم ، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسجد سے مجھے مصلیٰ (جائے نماز) پکڑا دو ،میں نے کہا میں تو حیض میں ہوں ،آپ نے فرمایا کہ بے شک تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں تو نہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ عورت حالت حیض میں کسی کپڑے کو ہاتھ لگائے یا مصلیٰ کو ہاتھ لگ جائے تو جائز ہے ،حیض کی حالت میں اس نے جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں ،وہ کسی اور وجہ سے اگر ناپاک نہیں تو صرف اس وجہ سے ناپاک نہیں ہوں گے یہ حیض والی عورت نے پہن رکھے ہیں۔

خیال رہے کہ عورت حیض کی حالت میں مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی ، نبی کریم ﷺ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ارشاد "کہ مسجد سے مجھے مصلیٰ پکڑا دو" کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے حجرہ میں کھڑی رہو ،دروازہ سے ہاتھ لمبا کر کے دیوار کے ساتھ ہی پڑا ہوا مصلیٰ مجھے دے دو۔

اعتراض:

"عن عائشة قالت کنت اذاحضت نزلت عن المثال علی الحصیر فلم یقرب رسول اللہ ﷺ ولم تدن منه حتی تطهر" (رواہ ابوداود، مشکوۃ باب الحیض)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں جب حیض میں ہوتی تو بستر سے چٹائی پر آجاتی، تو رسول اللہ ﷺ (میرے) قریب نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی میں آپ کے قریب ہوتی۔

اس حدیث سے تو پتہ چلا کہ عورت جب حیض میں ہو تو اس کا خاوند اس سے دور ہو جائے اور وہ خاوند سے دور ہو جائے تو کس طرح کہنا یہ درست ہے کہ سوائے جماع کے باقی منافع حاصل کئے جا سکتے ہیں؟

جواب:

"ولعله منسوخ الاان یحمل الدنو والقربا ن علی الغشیان"

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ حدیث دوسری احادیث کی وجہ سے منسوخ ہے۔ جن سے یہ ثابت ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے سے جماع کے بغیر باقی منافع حاصل کر سکتے ہیں۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ قریب نہ ہونے سے مراد جماع کے قریب نہ ہونا، مراد ہے۔ (مرقاۃ ج ۲، ص ۱۰۲)

تنبیہ:

اگرچہ حائضہ عورت سے جماع کے بغیر اس کے ننگے جسم سے مس کرنا اور ذکر (آلہ تناسل) کو اس کے پیٹ یا ران سے لگانا جائز ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو یہ گمان ہو کہ وہ اجتناب نہیں کر سکے گا، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے دور رہے۔

مسئلہ: حیض والی عورت حج عمرہ میں سوائے طواف کے اور تمام مناسک پر عمل کر سکتی ہے، البتہ طواف اس کا مؤخر ہو جائے گا۔

عورتوں کا ناقصات العقل والدین ہونا:

اگرچہ عورت کو حیض کی حالت میں نماز ادا کرنا منع ہے۔اوران دنوں میں رہ جانے والی نمازوں کی قضاء بھی نہیں،لیکن جو نمازیں رہ جائیں گی ،ان کا ثواب نہیں ملے گا،صرف نہ ادا کرنے کی وجہ سے گناہ نہیں ہوتا۔اسی علت کے پیش نظر نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو ناقصات الدین کہا۔

☆ "عن ابی سعید الخدری قال خرج رسول الله ﷺ فی اضحی اوفطر الی المصلی فمر علی النساء فقال یا معشر النساء تصدقن فانی اریتکن اکثر اهل النار فقلن وبم یارسول الله قال تکثرن اللعن وتکفرن العیشرمارأیت من نا قصات عقل ودین اذهب للب الرجل الحازم من احد کن قلن وما نقصان دیننا وعقلنا یا رسول الله قال الیس شهادة المراة مثل نصف شهادة الرجل قلن بلی قال فذالک من نقصان عقلها قال الیس اذاحا ضت لم تصم قلن بلی ،قال فذلک من نقصان دینها" (بخاری مسلم ،مشکوة کتاب الایمان)

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کو عید گاہ کی طرف تشریف لے گئے آپ کا عورتوں سے گزر ہوا آپ نے فرمایا،اے عورتوں کی جماعت تم صدقہ کیا کرو،تم میں سے اکثر مجھے جہنمی دکھائی گئیں،عورتوں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا تم لعنت زیادہ کرتی ہو۔اوراپنے زوج (خاوند) کی نعمتوں کا کفران کرتی ہو،میں نے تم سے زیادہ کسی ایک کو نہیں دیکھا جو خود تو ناقص العقل اور ناقص الدین ہو لیکن بڑے بڑے ماہر عقلمندوں کی عقل کو ضائع کردے۔عورتوں نے عرض کیا یارسول اللہ ہمارے دین اور عقل میں کیا نقصان ہے؟ آپ نے فرمایا کیا عورتوں کی شہادت مردوں کی شہادت کے نصف برابر نہیں،عورتوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ !ایسا ہی ہے،آپ نے فرمایا یہ ان کی عقل کی کمی ہے۔پھر آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ عورت کو جب حیض آئے تو وہ نماز ادا نہیں کرتی اور روزہ نہیں رکھتی؟ عورتوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ !ایسا ہی ہے۔آپ نے فرمایا یہ ان کے دین کی کمی ہے۔

نفاس کے احکام:

نفاس کے احکام وہی ہیں جو حیض کے ہیں۔ یعنی نفاس کی حالت میں بھی حیض کی طرح جماع کرنا منع ہے۔ عورت کو اس حال میں نماز پڑھنا منع ہے اور روزہ رکھنا منع ہے۔ نماز کی قضا نہیں اور روزہ کی قضا ہے۔ قرآن پاک پڑھنا اور قرآن پاک کو ہاتھ لگانا اس کے لئے جائز نہیں، مسجد میں داخل ہونا اور طواف کرنا منع ہے۔

استحاضہ کے احکام:

جس عورت کو استحاضہ کا خون آتا ہے یعنی تین دنوں سے کم یا حیض کے دنوں میں دس دنوں سے بڑھ گیا یا نفاس میں چالیس دنوں سے بڑھ گیا تو وہ خون استحاضہ ہے۔

استحاضہ کی حالت میں جماع کرنا، نماز ادا کرنا، روزہ رکھنا، مسجد میں داخل ہونا، طواف کرنا، قرآن پاک پڑھنا اور قرآن پاک کو وضو کر کے ہاتھ لگانا جائز ہے۔

مسئلہ:

استحاضہ والی عورت کو اگر لگاتار خون آرہا ہو، اتنا وقت بھی نہ مل سکے کہ وہ ایک وقت کے فرض ادا کر سکے تو ہر وقت کے لئے وضو کر لے، بعد میں بے شک خون جاری رہے۔ جب تک اور کوئی چیز وضو توڑنے والی اسے لاحق نہ ہو تو اسی ایک وضو سے نماز کے وقت کی ابتدا سے لے کر انتہا تک فرض پڑھے نفل پڑھے۔ نماز قضا کرے۔ قرآن پاک پڑھے اور قرآن پاک کو ہاتھ لگائے، مسجد میں داخل ہو یہ سب کام جائز ہیں۔ جونہی وقت نکلے گا وضو خود بخود ٹوٹ جائے گا۔

مسئلہ:

اگر ایک عورت بالغ ہوتے ہی استحاضہ کے خون میں مبتلا ہوگئی تو وہ ہر مہینہ کے پہلے دس دن حیض سمجھے اور بعد

والے دن استحاضہ۔ حیض والے دنوں میں نماز نہ ادا کرے اور استحاضہ والے دنوں میں نماز ادا کرے۔ یہی حکم نفاس کا ہے کہ اگر پہلے بچہ سے ہی استحاضہ شروع گیا تو چالیس دن نفاس ہوگا باقی استحاضہ۔

مسئلہ:

اگر ایک عورت کی پہلے عادت مقرر ہے کہ اسے معین تاریخوں میں خون آتا ہے اور اس کے دن مقرر ہیں۔ مثال کے طور پر پانچ دن یا سات دن وغیرہ اسے خون آتا تھا، لیکن اب اسے استحاضہ کا خون شروع ہو گیا، اسی طرح نفاس کی عادت مقرر تھی اب استحاضہ شروع ہو گیا، تو عادت کے دنوں میں اس پر حیض اور نفاس کا حکم لاحق ہوگا، باقی دنوں میں استحاضہ ہوگا۔

عورت کے لئے ایک مشکل مسئلہ:

اگر ایک عورت کی عادت مقرر نہیں تھی، بلکہ اسے کبھی اور تاریخوں میں حیض کا خون آتا اور کبھی اور تاریخوں میں آتا اور کبھی کم دن آتا ہے اور کبھی زیادہ۔ اب اسے استحاضہ کی بیماری لاحق ہوئی تو اس کے لئے حیض کے دن مقرر کرنے مشکل ہیں کہ حیض مہینے کی فلاں تاریخ کو ہوگا۔ اس مشکل کا صرف یہی حل ہے کہ وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخوں میں دس دن حیض سمجھ کر نماز ادا نہ کرے، باقی دنوں میں نماز ادا کرے، لیکن ہر نماز کے وقت غسل کرنا پڑے گا، ہوسکتا ہے یہ حیض کے دن ہوں۔

استحاضہ میں نماز ادا کرے پر ارشاد مصطفوی:

"عن عائشة رضی الله عنها قالت جاء ت فاطمه بنت ابی حبیش الی النبی ﷺ فقالت یا رسول الله انی امرأة استحاض فلا اطهر افادع الصلوة قال لا انماذلک عرق ولیس بحیض فاذااقبلت حیضتک فدعی الصلوة واذاادبرت فاغسلی عنک الدم ثم صلی"

(بخاری ومسلم، مشکوة باب المستحاضه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں فاطمہ بنت ابی حبیش آئی، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں استحاضہ والی عورت ہوں، میں پاک نہیں ہوتی (یعنی میرا خون بند نہیں ہوتا) کیا میں نماز کو چھوڑ دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں، یہ تو رگ کا خون ہے، حیض نہیں، جب حیض کے دن ہوں تو نماز چھوڑ دو اور جب حیض ختم ہو جائے تو خون دھولو اور نماز ادا کرو۔

خون دھونے سے مراد غسل کر کے خون کے اثرات کو زائل کرنا ہے، یعنی غسل کرلو، پھر استحاضہ کے دنوں میں نماز ادا کرتی رہو۔

طہر متخلل:

اگر ایک عورت کو خون آئے، پھر پندرہ دنوں سے کم پاک رہے، پھر خون آئے تو اسے لگاتار خون سمجھ کر دس دن حیض کا حکم ہوگا اور باقی استحاضہ، جیسا کہ ایک دن خون آئے چودہ دن پاکیزہ رہے اور ایک دن پھر خون آئے، تو پہلے دس دن حیض اور باقی استحاضہ ہوگا۔ اور اگر ایک دن خون آئے، آٹھ دن پاکیزہ رہے اور پھر ایک دن خون آئے تو تمام دس دن حیض ہوگا۔

طلباء کرام تفصیلی اقوال کتب فقہ میں تلاش کریں۔

☆☆☆☆☆

نِسَآءُ كُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ☆

(سورة البقرة آیت نمبر ۲۲۳)

﴿۱﴾

تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتیاں ہیں تو آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو اور اپنے بھلے کا کام پہلے کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جان رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے اور اے محبوب بشارت دو ایمان والوں کو۔

﴿۲﴾

بیبیاں تمہاری کھیتی ہیں تمہارے لئے ، تو آؤ کھیتی اپنی میں جیسے چاہو تم ، اور پہلے کرو اپنے نفسوں کے لئے (بھلائی کے کام) اور ڈرو اللہ سے ، اور جان رکھو بے شک تم نے ملنا ہے اس سے ، اور (اے محبوب) بشارت دو ایمان والوں کو۔

شانِ نزول:

اگر چہ تفسیر کبیر میں شان نزول کی تین وجوہ ذکر کی گئی ہیں، البتہ مقصد تینوں کا ایک ہی ہے۔

﴿۱﴾ ایک وجہ نزول کی یہ ہے کہ یہود کہتے تھے جو شخص اپنی عورت کی فرج (اگلے حصہ) میں جماع کرے۔ لیکن الٹا کر پچھلی جانب سے اپنے ذکر (آلہ تناسل) کو عورت کے (اگلے حصہ) میں داخل کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہوگا، تو رب تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرما کر ان کی تکذیب کی کہ وہ جھوٹے ہیں تم جس طرح چاہو جماع کرو۔

﴿۲﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے "یارسول اللہ ھلکت" یارسول اللہ میں ہلاک ہوگیا، کیونکہ میں نے اپنی عورت

سے جماع اگلے حصہ میں کیا ہے، لیکن پچھلی جانب سے کیا ہے، ان کے کہنے کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا کہ تم اپنی بیبیوں سے جس طرح چاہو جماع کرو۔

﴿۳﴾ انصار صحابہ کرام اپنی بیبیوں سے پچھلی جانب سے اگلے حصہ میں جماع کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ انہوں نے یہود سے سن رکھا تھا کہ اس طرح بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ اور قریش (مہاجرین صحابہ کرام) اس صورت کو جائز سمجھتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے قریش کی تائید میں اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

تمام وجوہ کا اجتماع:

یعنی یہ تمام وجوہ پہلے درپیش آئیں تو آیۃ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا۔ اس لئے یہ آیۃ کریمہ کے شان نزول کی یہ تمام وجوہ پائیں گئی ہیں ۔

مختصر مطلب:

تمہاری بیبیاں تمارے لئے کھیتی ہیں۔ یعنی جس طرح کھیتی سے پیداوار ہوتی ہے، اسی طرح ان سے بھی اولاد پیدا ہوتی ہے، تم اپنی بیبیوں کے پاس آؤ جس طرح چاہو، یعنی ان سے جماع تو اگلے حصہ میں کرو، لیکن جماع کرنے کی کیفیت معین نہیں، بلکہ بیٹھ کر یا لیٹ کر، اگلی جانب سے یا پچھلی جانب سے، جس طرح چاہو اسی طرح جماع کرنے کی تمہیں اجازت ہے، اور جماع سے پہلے اپنے لئے بھلائی کے کام کرلو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور یہ بھی جان رکھو کہ تم نے ایک دن اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے، چونکہ وہ دن جزاء (ثواب وعذاب) کا دن ہوگا۔ اس میں کامیابی مومنوں کو ہی حاصل ہونی ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ اے محبوب آپ ایمان والوں کو جنت کی اور کامیابی کی اور رب تعالیٰ کی رضاء حاصل ہونے کی بشارت دے دو۔

"نساء کم حرث لکم": تمہاری بیبیاں تمہارے لئے کھیتی ہیں۔

عورتوں (زوجات) کو زمین سے تشبیہ دی گئی، جس طرح زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے، اسی طرح عورت کی رحم (بچہ دانی) میں نطفہ جو بیج کی طرح ہے ڈالا جاتا ہے، اور اولاد کو زمین کی پیداوار سے تشبیہ دی گئی۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہ آیۃ پہلے آیۃ کریمہ میں مذکور الفاظ گرامی "فأتوھن من حیث امر کم اللہ" (تو آؤان کے پاس جہاں سے تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے) کا بیان ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جہاں سے آنے کا حکم دیا ہے وہ عورت کی قبل (اگلا حصہ) ہے۔ کیونکہ وہی کھیتی کا ذریعہ ہے، اس لئے کہ پیدائش اگلے حصہ سے ہوتی ہے نہ کہ پچھلے حصہ سے۔

قرآن پاک کی عظمت:

چھوٹا سا جملہ "نساء کم حرث لکم" کتنے عظیم معانی اور مسائل پر مشتمل ہے۔

ایک مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ عورتوں سے لواطت حرام ہے، کیونکہ دبر (پچھلا مقام) نتائج کا مقام نہیں۔

اور یہ سمجھ آیا کہ نکاح کرنے میں اصل مقصود وہی ہو جو نکاح کی حکمت ہے، نکاح کی حکمت ہی یہ ہے کہ اولاد پیدا ہو، اور نسل برقرار رہے۔ یہ خیال رہے کہ شہوت کو اولاد کی پیدائش کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔

"وجعلت شھوة النساء اعظم لأن مشقة النسل علیھن اعظم من الرجال فتتسلی النساء عن المشقة بعظم الشھوة"

اور عورتوں میں زیادہ شہوت رکھی گئی ہے جبکہ عورتوں پر بچے کی پیدائش اور پرورش باعث مشقت ہے جو مشقت مردوں کو حاصل نہیں، لیکن عورتوں کو عظیم شہوت عطاء کر کے، تکمیل خواہشات کے پیش نظر ان پر اس مشقت کو برداشت کرنا آسان کر دیا گیا ہے۔ (صاوی)

بعض روایات سے بعض حضرات غلطی کا شکار ہو گئے:

چونکہ بعض روایات میں "ادبار" کا لفظ استعمال ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اگلے حصہ میں پچھلی جانب سے جماع کر سکتے ہو۔ لیکن کچھ حضرات نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ پچھلے حصہ میں جماع کرنا جائز ہے، کیونکہ "ادبار" کا

ایک معنی یہ بھی ہے۔

اس پر ایک حدیث پاک کا مشاہدہ کریں، مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

"عن ابی النضر انه اخبره انه قال لنافع مولی ابن عمر انه قد اکثر علیک القول انک تقول عن ابن عمر انه افتی ان تؤتی النساء فی ادبارهن قال کذبوا علی ولکن سأحدثک کیف کان الأمر، ان ابن عمر عرض المصحف یوما وانا عنده حتی بلغ (نساء کم حرث لکم فاتو حرثکم انی شئتم) فقال یا نافع هل تعلم من امر هذه الآیة؟ قلت لا، قال انا کنا معشر قریش نجبی النساء، فلما دخلنا المدینة ونکحنا نساء الانصار اردنا منهن مثل ما کنا نرید فآذاهن فکرهن ذلک واعظمنه وکانت نساء الانصار قد اخذن بحال الیهود انما یؤتین علی جنوبهن، فانزل الله تعالی (نسائکم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم)" (رواه النسائی)

ابونضر کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے غلام حضرت نافع سے پوچھا کہ لوگ تمہاری طرف یہ بات کثرت سے منسوب کرتے ہیں کہ تم کہتے ہو حضرت ابن عمر عورتوں سے پچھلی جانب سے فتوی دینے کو جائز سمجھتے تھے، تو انہوں نے کہا لوگ میری طرف جھوٹ منسوب کرتے ہیں، ہاں البتہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اصل میں حضرت ابن عمر کی حدیث کیا ہے۔

وہ یہ ہے کہ ایک دن حضرت ابن عمر کے پاس قرآن پاک تھا (آپ پڑھ رہے تھے) جب آپ اس آیۃ (نساء کم حرث لکم فأتو حرثکم انی شئتم) پر پہنچے، تو آپ نے فرمایا اے نافع! کیا تم اس آیۃ کے متعلق کچھ جانتے ہو؟ تو میں نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا ہم قریش کے لوگ عورتوں سے جماع پچھلی جانب سے (اگلے حصہ میں) کرتے تھے، جب ہم مدینہ طیبہ میں آئے اور ہم نے انصار کی عورتوں سے نکاح کئے، ہم نے ان سے اسی طرح جماع کرنا چاہا جس طرح ہم قریش کی عورتوں سے جماع کرتے تھے، تو انہوں نے اسے اپنے لئے باعث اذیت سمجھا،

اور ناپسند کیا اور اسے عظیم (جرم) سمجھا۔ چونکہ انصار کی عورتوں نے یہود کی عورتوں سے یہ (مسئلہ) حاصل کیا تھا کہ جماع ایک کروٹ کی جانب سے کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی، جس میں انصار کے قول کو رد کیا گیا اور عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی گئی اور اپنی کھیتی میں ہر طرح آنے کی اجازت فرمائی گئی۔ (صابونی)

حضرت ابن عمر کے اس قول سے واضح ہوگیا کہ آپ نے "نحبی" کا لفظ جو استعمال فرمایا، جو "حبو" سے مشتق ہے، جس کا مطلب پچھلی جانب سے جماع کرنا لیا گیا ہے، لیکن اسی لفظ کا معنی پچھلے حصہ میں جماع کرنا بھی لیا گیا ہے، تو بعض لوگ اسی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے، خیال رہے کہ بعض روایت میں یہ لفظ جیم سے بھی استعمال ہے جو مجباۃ سے لیا ہوا ہے، معنیٰ ایک ہی ہے۔

☆ " وعن خزیمة بن ثابت ان رسول اللهﷺ نهی ان یأتی الرجل امرأته فی دبرها "

(مسند احمد)

حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہﷺ نے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنی عورت سے پچھلے حصے میں جماع کرے۔ (از صابونی)

☆ "قال رسول اللهﷺ استحیوا ان الله لایستحی من الحق لایحل ان تاتوا النساء فی حشوشهن "

اور ایک روایت میں "فی حشوشهن" کی جگہ "فی اعجازهن " کے الفاظ کا ذکر ہے۔ مطلب دونوں لفظوں کا ایک ہی ہے، یعنی آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے۔

حیاء کرو، بیشک اللہ تعالیٰ حق بیان کرنا نہیں چھوڑتا، تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ کہ تم اپنی عورتوں کے پچھلے حصے میں جماع کرو۔

☆ "وقال رسول اللهﷺ لاینظر الله الی رجل اتی رجلا او امرأة فی الدبر"

(رواہ الترمذی والنسائی)

رسول اللہﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرماتا جو کسی مرد یا کسی عورت کے پچھلے حصہ میں جماع کرتا ہے۔

☆ " وعن عكرمة قال جاء رجل الى ابن عباس وقال كنت آتي اهلي في دبرها، وسمعت قول الله (نساء كم حرث لكم فاتوا حرثكم انى شئتم) فقال يالكع انما قوله (فاتوا حرثكم انى شئتم) قائمة وقاعدة ومقبلة ومدبرة في اقبالهن لا تعدواذلك الى غيره "

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں ایک شخص حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس آیا تو کہنے لگا میں اپنی عورت سے پچھلے حصہ میں جماع کرتا ہوں، کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد (نساء کم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم) سنا ہے، جس سے میں نے جائز سمجھا ہے۔ آپ نے فرمایا اے بیوقوف اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی (فأتوا حرثکم انی شئتم) کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی عورتوں سے کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر اور اگلی جانب سے اگلے حصہ میں یا پچھلی جانب سے اگلے حصہ میں جماع کرو، اس حکم کے بغیر اور کہیں تجاوز نہ کرو، یعنی پچھلے حصہ میں جماع کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز ہے۔

نکاح کرنے میں اصل مقصد اولاد کی پیدائش ہو:

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے میں نے ایک عورت کو پایا ہے، جو اچھے نسب اور قدر و منزلت والی ہے، لیکن اس کی اولاد نہیں ہوتی، کیا میں اس سے شادی کر لوں؟ آپ ﷺ نے منع فرمایا، وہ دوبارہ حاضر ہوئے اور اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ تیسری مرتبہ پھر حاضر ہوئے (پھر اجازت طلب کی) آپ ﷺ نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا۔

" تزوجواالولود الودود فاني مكاثربكم "

زیادہ بچے جننے والی اور زیادہ محبت کرنے والی سے نکاح کرو بیشک تمہاری کثرت کی وجہ سے ہی مجھے فخر ہوگا۔

یعنی جس خاندان کی عورتوں کی زیادہ اولاد ہوتی ہے اس خاندان سے شادی کی جائے، اور جس خاندان کی عورتیں اپنے خاوندوں سے محبت کرتی ہوں اس سے شادی کی جائے، ممکن ہے کہ یہ مطلب بھی ہو سکے کہ بانجھ عورت

سے شادی کی جائے وہ زیادہ محبت کرتی ہے۔

اور آپ کا فرمان کہ مجھے تمہاری کثرت پر ناز ہوگا، یعنی میری امت باقی انبیاء کرام پر کثیر ہوگی، جو میرے لئے خوشی کا مقام ہوگا۔

عزل کے متعلق احادیث:

عزل کا مطلب یہ ہے کہ جماع کرتے وقت جب انزال کے قریب ہوتو اپنا ذکر (آلہ تناسل) عورت کی فرج سے باہر نکال لے تاکہ اولاد پیدا نہ ہو۔

☆ " اخرج وکیع و ابن ابی شیبة عن ابی ذراع قال سألت ابن عمر عن قول اللہ " فاتوا حرثکم انی شئتم " قال ان شاء عزل و ان شاء غیر العزل"

ابوذراع کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "فأتو حرثکم انی شئتم " کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا (اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے) کہ تم اپنی کھیتی میں آؤ جس طرح چاہو، اسے سیراب کرو یا نہ کرو، یعنی چاہو تو عزل کرلو اور چاہو تو عزل نہ کرو۔

☆ " واخرج عبدالرزاق وابن ابی شیبة والبخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابن ماجه والبیهقی عن جابر قال کنا نعزل والقرآن ینزل فبلغ ذلک رسول اللہ ﷺ فلم ینهانا عنه "

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ہم عزل کرتے تھے جب کہ قرآن پاک نازل ہورہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع نہیں فرمایا۔

☆ "واخرج عبدالرزاق والبیهقی عن ابن عباس انه سئل عن العزل فقال ما کان ابن آدم لیقتل نفسا قضی اللہ خلقها هو حرثک ان شئت عطشته و ان شئت سقیته "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جسے رب تعالیٰ نے پیدا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اسے کوئی انسان ختم تو نہیں کرسکتا، تاہم تمہاری زوجہ تمہاری کھیتی ہے، چاہو تو اسے سیراب نہ کرو اور چاہو تو اسے سیراب کرلو۔

☆ "واخرج البزار والبیهقی عن ابی هریرة قال سئل رسول اللہ ﷺ عن العزل قال ان الیهود تزعم ان العزل هی المؤدة الصغری قال کذبت یهود"

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا یہ سوال کرنے والے نے یہ کہا یہود گمان کرتے ہیں کہ عزل مودۃ صغری (زندہ دفن کرنے کی ایک چھوٹی قسم) ہے۔ آپ نے فرمایا یہود جھوٹ کہتے ہیں۔

☆ "واخرج عبدالرزاق وابن ابی شیبة ومسلم وابو داؤد والبیهقی عن جابر ان رجلا اتی النبی ﷺ فقال ان لی جاریة وانا اطوف علیها وانا کره ان تحمل فقال اعزل عنها ان شئت فانها سیاتیها ما قدر لها، فذهب الرجل فلم یلبث الایسیرا ثم جاء فقال یا رسول اللہ ان الجاریة قد حملت فقال قد اخبرتک انه سیاتیها ما قدر لها"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، آپ کی خدمت میں عرض کیا، میری ایک لونڈی ہے، میں اس سے وطی کرتا ہوں، لیکن میں اس کے حاملہ ہونے کو پسند نہیں کرتا، (کیا میں اس سے عزل کرلیا کروں) تو آپ نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو اس سے عزل کرلیا کرو، لیکن جو اس کی تقدیر میں اولاد ہے وہ پیدا ہوکر رہے گی، تو وہ شخص چلا گیا تھوڑا ہی عرصہ گزرا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا، یارسول اللہ! میری لونڈی حاملہ ہوگئی، تو آپ نے فرمایا میں نے تو تمہیں خبر دے دی تھی کہ اس کے مقدر میں جو اولاد ہے وہ پیدا ہوکر رہے گی۔

☆ "واخرج مالک وعبدالرزاق وابن ابی شیبة والبخاری ومسلم وابو داؤد والنسائی وابن ماجة والبیهقی عن ابی سعید قال سئل النبی ﷺ عن العزل فقال او تفعلون لا علیکم ان تفعلوا فانما هو القدر مامن نسمة کائنة الی یوم القیامة الا وهی کائنة"

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کیا تم کرتے ہو؟ تم پر حرج نہیں کہ تم نہ کرو، تقدیر میں جس روح نے قیامت تک آنا ہے وہ آکر ہی رہے گی۔

''واخرج ابن ماجة والبیهقی عن ابن عمرقال نهی رسول اللہ ﷺ ان یعزل عن الحرة الاباذنها''

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا حضور ﷺ نے آزادعورت سے اس کی اجازت کے بغیر عزل کرنے سے منع فرمایا۔

'' واخرج البیهقی عن ابن عمر قال تعزل عن الامة وتستأ مر الحرة ''

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے کہ لونڈی سے اس کی اجازت کے بغیر عزل کر سکتے ہو اور آزادعورت کی اجازت سے عزل کیا جا سکتا ہے۔

نتیجہ واضح ہے کہ بچوں کی پیدائش پر پابندی عائد نہ کرنا بہتر ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کی کثرت کو پسند فرمایا ہے۔ تاہم اگر عقیدہ یہ ہو کہ جس بچے نے پیدا ہونا ہے اس کو رزق اللہ تعالیٰ نے ہی دینا ہے اور جس بچے نے پیدا ہونا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے مقابلہ نہیں۔

اس عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے اگر بچوں کی پیدائش میں عزل وغیرہ سے احتیاط سے کام لے کہ بچوں کی تعداد کم ہوگی تو عورت پر مشقت کم ہوگی، اور اس کی صحت بہتر رہے گی، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (ماخوذ از درمنثور)

حرث اور زرع میں فرق:

حرث کا معنی ہے زمین تیار کرنا اور بیج ڈالنا، اور زرع کا مطلب ہے بیج کی حفاظت کرنا اور اس سے نباتات کو اگانا۔ یہ فرق رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہو رہا ہے۔

'' افرأیتم ما تحرثون ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون ''

تو بھلا بتاؤ جو بوتے ہو، کیا تم اس کی کھیتی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں۔

اس مقام پر حرث کی نسبت بندوں کی طرف کی، لیکن زرع کی نسبت ان کی طرف نہیں کی، بلکہ اپنی طرف کی۔

(روح البیان)

"فأتوا حرثکم انی شئتم": تو آؤ اپنی کھیتی میں جیسے چاہو تم۔

یہاں تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے راقم نے تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان میں تحریر کیا۔

" فأتوا حرثکم انی شئتم " جاؤ اپنی کھیتی میں جس طرح سے چاہو۔ (محمود الحسن صاحب)

سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

تو آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح سے چاہو۔ (مولانا احمد رضا خان بریلوی)

اس مقام پر ایک فرق تو یہ ہے کے "فأتوا" ایتان سے بنا ہے، جس کا معنی ہے آنا نہ کہ جانا۔

البتہ اس کے دوسرے معانی میں سے ایک معنی ہے کسی سے گزرنا۔ اس توجیہ سے جانا معنی کیا جائے تو کچھ بات بنتی ہے۔ تاہم یہ وجہ کوئی اتنی نہیں۔

زیادہ جو باعثِ گرفت بات ہے وہ یہ ہے کہ "انی شئتم" کا معنی "جہاں سے چاہو" یہ سراسر غلط ہے اور تمام تفاسیر اور اصولِ فقہ کی جمیع کتب کے مخالف ہے، اس لئے کہ کوئی شخص اردو پر مکمل دسترس رکھنے والا کبھی تائید نہیں کر سکے گا کہ لفظ "جہاں" کیفیت کا معنی دیتا ہے۔

اگر کسی آدمی کو یہ کہنا ہو کہ تو لاہور، کراچی، پشاور، اور اسلام آباد میں سے جس شہر میں جانا چاہے جا سکتا ہے، اسے یہ تو کہا جائے گا "تو جہاں چاہے جا سکتا ہے" لیکن اس کے برخلاف اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ تو سبق یاد کر، چاہے بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر یا لیٹ کر۔ یعنی جس حال میں تو چاہے سبق یاد کر سکتا ہے۔

اب اس جملے کو اس طرح بیان کیا جائے "تو سبق یاد کر جس طرح چاہتا ہے" تو یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر یوں بیان کیا جائے، جہاں چاہے سبق یاد کر تو یہ غلط ہے۔

اردو زبان کی مشہور لغت کی کتاب "فیروز اللغات" نے بھی لفظ "جہاں" کا استعمال اس طرح کیا ہے۔

جہاں، جس جگہ، جس وقت، جس گھڑی۔

اب اس مسئلہ کو سمجھنے کے بعد اصل آیۃ کے مقصود کی طرف آئیں، آیۃ کریمۃ میں اپنی عورتوں سے جماع کا ذکر ہے، عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی۔

عربی زبان میں لفظ "انی" بمعنی "این" (جگہ) کے بھی آتا ہے، اور "کیف" (حالت، کیفیت) کے معنی میں بھی آتا ہے۔

صرف لفظ "انی" کو دیکھنے سے تو دونوں معنی صحیح ہیں۔ لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ اس آیۃ کریمہ میں "این" کے معنی لینے میں خرابی ہے، تو یقینا یہ ایسی غلطی ہے جس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

اب اصل مسئلہ دیکھیں "نور الانوار" میں بیان کیا گیا ہے۔

"(مثال المشکل) قوله تعالیٰ "فأتوا حرثكم انی شئتم" فان كلمة انی مشكل تجی تارة بمعنی من این كما في قوله تعالیٰ "انی لک هذا" ای من این لک هذا الرزق الآتی كل يوم، وتارة بمعنی كيف كمافي قوله تعالیٰ "انی يكون لی غلام" ای كيف يكون لی غلام، فاشبه ههنا انه بای معنی هو فان كان بمعنی این يكون المعنی من ای مكان شئتم قبلا او دبرا فتحل اللواطة من امرأته وان كان بمعنی كيف فيكون المعنی بأية كيفية شئتم قائماً او قاعداً او مضطجعاً فيدل علی تعميم الاحوال دون المحال فاذا تأملنا في لفظ الحرث علمنا انه بمعنی كيف لان الدبر ليس بموضع الحرث بل موضع الفرث"

اصول فقہ میں اسی آیۃ مبارکہ کے ان الفاظ کو مشکل کی مثال بنایا گیا ہے، رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "فأتوا حرثكم انی شئتم" میں کلمہ "انی" مشکل ہے، کیونکہ یہ کبھی "این" کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہی استعمال ہے "انی لک هذا" حضرت زکریا نے حضرت مریم سے یہ سوال کیا کہ ہر دن آنے والا رزق تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے؟

اور کبھی یہی لفظ "انی" کیف کے معنی میں آتا ہے، جس طرح قرآن پاک میں آیا ہے "انی

يكون لي غلام " حضرت زکریا علیہ السلام کو جب بیٹے کی بشارت دی گئی تو آپ نے کہا' میرا بیٹا کیسے ہوگا۔

اب مثال مذکور(**انى شئتم**) میں جب غور کیا کہ کس معنی میں لیا جائے، کیونکہ یہ اشتباہ ہوا۔ دیکھا کہ اگر "این" کے معنی میں لیا جائے تو معنی یہ ہوگا ''جس مکان سے چاہو وطی کر سکتے ہو' اس طرح قبل اور دبر دونوں مکانوں کا ثبوت ہوگا، جس سے لواطت ثابت ہوگی، حالانکہ لواطت حرام ہے۔ اگر بمعنی" **كيف** " کے لیں تو معنی یہ ہوگا ''جس طرح چاہو، کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا لیٹ کر' یہ معنی عموم احوال پر دال ہوگا، لیکن عموم محلیت پر دال نہیں ہوگا۔

اب غور وفکر کیا کہ لفظ حرث کا استعمال بمعنی کھیتی کے ہے تو خود واضح ہوا کہ "**كيف** '(جس طرح) کے معنی میں لینا ہی درست ہے، اس لئے مقام پیداوار ہی قبل ہے نہ کہ دبر بلکہ دبر تو فقط ایک گندگی کا مقام ہے۔

اسی طرح تفسیر مدارک التنزیل میں ہے۔

"**فأتوا حرثكم انى شئتم "جامعوهن متى شئتم او كيف شئتم باركة اومستلقية او مضطجعة** "

ان سے جب چاہو جس طرح چاہو جماع کرو، خواہ وہ حالت بروک ہو یا حالت استلقاء یا اضطجاع ہو۔ یعنی گھٹنوں کے بل یا سیدھا لیٹ کر یا کروٹ کے بل لیٹ کر ہو۔

جلالین میں ہے۔

"**(فأتوا حرثكم)اى محلة وهو القبل (انى) كيف (شئتم) من قيام وقعود واضطجاع واقبال وادبارنزل ردالقول اليهودمن اتى امرأته فى قبلها من جهة دبرهاجاء الولداحو ل**"

جماع فرج میں ہی ہو جس طرح چاہو حالت قیام ہو یا قعود و اضطجاع ہو، خواہ آگے کی جانب سے یا پیچھے کی جانب سے ہو، یہود کا رد کیا گیا ہے کہ ان کا گمان تھا کہ اگر پچھلی جانب سے جماع ہو تو بچہ بھینگا ہوگا۔

اب یہاں سے بھی واضح ہوا کہ صحیح معنی "کیف" کا (جس طرح) ہے۔ اگر معنی "ایـــن" کا (جہاں) کیا جائے تو ساری توجیہات باطل ہوں گی۔ حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو ضرور ماننا پڑے گا کہ یہ معنی "جہاں" والا کرنا غلط ہے۔

(تسکین الجنان، ص ٦٦ تا ٦٨)

"وقدموا لانفسکم": اور پہلے کرو اپنے نفسوں کے لئے (بھلائی کے کام)

" مایحب تقدیمه من الاعمال الصالحة " یعنی اپنے نفسوں کے لئے نیک عمل آگے بھیجو۔

یا مطلب یہ ہے، کہ نیک کام پہلے کرو۔

نیک اعمال آگے کرنے سے کیا مراد ہے؟

(۱) نیک اعمال سے مراد جماع سے پہلے "بسم اللہ" پڑھنا۔

" عن ابن عباس قال قال النبی ﷺ لو ان احدکم اذاارادان یا تی اهله قال بسم الله اللهم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان مارزقتنافانه ان یقدر بینهما ولد فی ذلک لم یضره الشیطان ابدا " (بخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی شخص اپنی زوجہ کے پاس (جماع کے لئے) آنے کا ارادہ کرے تو بسم اللہ شریف پڑھے، (پھر یہ دعا کرے) اللهم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان مارزقتنا " تو اللہ تعالیٰ ان کو جو بچہ عطا فرمائے گا شیطان اسے کبھی تکلیف نہیں پہنچا سکے گا۔ (از خازن)

(۲) نیک عمل اپنے لئے آگے بھیجنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنی عورتوں سے جماع کر کے اپنے آپ کو گناہوں سے بچاؤ۔

" لان الامور المباحة با قتران النیة الصحیحة الصالحة تصیر عبادة "

اس لئے کہ مباح کاموں کے ساتھ جب نیک اور صحیح نیت مل جائے تو وہ مباح کام عبادت بن جاتے ہیں۔

☆ " عن ابی ذرقال قال رسول اللہ ﷺ وفی بضع احد کم صدقة قالوایارسول الله ایأتی احد ناشهوته ویکون له فیها اجر قال أرایتم لو وضعها فی حرام اکان علیه فیه وزر فکذلک اذا وضعها فی حلال کان له اجر" (رواه مسلم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم سے ہر ایک کی (زوجہ کی) فرج میں صدقہ ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! جب ہم میں سے کوئی ایک اپنی شہوت پوری کرنے کے لئے زوجہ کے پاس آتا ہے تو اسے اس کا بھی اجر حاصل ہوگا؟ آپ نے فرمایا کیا تم دیکھتے نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی شہوت کو حرام جگہ پورا کرے تو اسے گناہ حاصل ہوگا؟ اسی طرح جب حلال طریقہ سے اپنی شہوت کو پورا کرے گا تو اسے ثواب حاصل ہوگا۔ (مظهری)

(۳) نیکی کے کام پہلے کرنے سے مراد نیک اولاد کی طلب ہے۔

☆ " عن ابی هریرةان رسول الله ﷺ قال اذامات الانسان انقطع عمله الامن ثلاثة صدقة جارية اوعلم ينتفع به اوولد صالح يدعوله" (رواه مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں سوائے تین کے، یعنی صدقہ جاریہ، یا وہ علم جس سے نفع حاصل کیا گیا ہو، یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔

(۴) بھلائی کے کام آگے بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نابالغ بچے فوت ہو جائیں جو آگے جا کر اس کے لئے منتظم بنیں اور شفاعت کریں۔

"عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال لايموت لاحد من المسلمين ثلاثة من الولد فتمسه النار الا تحلة القسم" (باب ما جاء فی من قدم ولدا ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمانوں میں سے کسی ایک کے تین بچے فوت ہو جائیں تو اسے آگ نہیں چھوئے گی سوائے قسم کے پورا کرنے کے۔

قسم کے پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ومامنکم الاواردھا" تم میں سے کوئی ایک نہیں مگر اسے آگ سے گذرنا ہوگا، یعنی پل صراط سے ہر ایک کو گذرنا ہوگا، جو جہنم پر ہوگا۔

☆ "عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ من قدم ثلاثۃ لم یبلغوا الحنث کانوا لہ حصنا حصینا قال ابوذر قدمت اثنین قال واثنین فقال ابی بن کعب سید القراء قدمت واحدا قال واحد ولکن انما ذلک عند الصدمۃ الاولی"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے نابالغ تین بچے آگے بھیجے (یعنی جس کے نابالغ تین بچے فوت ہو گئے) تو وہ اس کے لئے مضبوط قلعہ بنیں گے۔ (یعنی اس کی شفاعت کریں گے) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے دو بچے فوت ہوئے ہیں، آپ نے فرمایا دو ہی (شفاعت کریں گے) سید القراء حضرت ابی بن کعب نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا ایک بچہ فوت ہوا ہے، آپ نے فرمایا ایک ہی شفاعت کرے گا۔ لیکن انسان کو اولاد کی وفات پر یہ مرتبہ اس وقت حاصل ہوگا جبکہ اس نے صدمہ پہنچتے ہی صبر سے کام لیا۔

(حوالہ مذکور)

☆ "عن ابن عباس یحدث انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول من کان لہ فرطان من امتی ادخلہ اللہ بھما الجنۃ فقالت لہ عائشہ فمن لہ فرط من امتک قال ومن کان لہ فرط یاموفقۃ قالت فمن لم یکن لہ فرط من امتک قال فانا فرط لن یصابوا بمثلی"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ میری امت میں سے جس شخص کے دو چھوٹے بچے فوت ہو گئے جو اس کے لئے منتظم بنیں تو اللہ تعالیٰ اسے ان دو کے ذریعے جنت میں داخل فرمائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ کی امت سے اگر کسی کا ایک بچہ فوت ہوا تو آپ نے فرمایا وہ ایک کے ذریعے ہی جنت میں داخل ہوگا، وہی اس کا منتظم ہوگا۔ اسے نیکیوں کی توفیق دی گئی۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا آپ کی امت میں سے کسی کا ایک بچہ بھی نہ فوت ہوا تو؟ آپ نے فرمایا اس کا میں منتظم ہوں گا، میرے جیسی کسی اور کو مصیبتیں حاصل نہیں ہوئیں۔

(حوالہ مذکور)

" الفرط هنا الولدالذی مات قبله فانه یتقدم ویهی لوا لدیه منزلا فی الجنة "

حدیث شریف میں جولفظ فرط استعمال ہوا ہے اس کا معنی یہاں ''بچہ جو آگے گیا ہے اور والدین کے لئے جنت میں والدین کے لئے مقام تیار کرنے میں مشغول ہو۔

"یا موفقة ای با لخیرات و الاسولة الواقعة مو قعها شفقة علی الامة" (مرقاة)

اے بھلائی کی توفیق دی گئی، اور موقعہ محل کے مطابق سوال کرنے کی توفیق دی گئی، تمہارے یہ سوال امت کی بھلائی کے لئے ہیں اور ان پر شفقت ہے۔

"فانا فرط لن یصابو امثلی: ای بمثل مصیبتی لهم فان مصیبتی اشد علیهم من سائر المصائب و اکو ن انا فرطهم" (مرقاة)

جس کا کوئی بچہ فوت نہ ہوا اس کے آگے میں منتظم ہوں گا، کیونکہ میری جیسی مصیبتیں کسی اور نے نہیں جھیلیں۔ میری مصیبتوں کوسن کر صبر کرنے والوں کا میں آگے جا کر منتظم بنوں گا۔

آسان مفہوم راقم کو یوں سمجھ آتا ہے کہ آپ نے فرمایا جس کا کوئی نہیں ہوگا اس کا میں ہوں گا، میرے جیسا شفاعت کرنے والا اور میرے جیسا آگے جا کر انتظام کرنے والا اور کون ہوگا۔

(۵) ہر قسم کی نیکیاں مراد ہیں، کہ تم اپنے لئے آگے نیکیاں بھیج دو، کیونکہ آگے آنے والے الفاظ "واتقوا الله" سے یہ مفہوم سمجھنا آسان ہے۔ (ماخوذ از خازن و مظهری)

"واتقوا الله": اور اللہ سے ڈرو۔

ان الفاظ مبارکہ میں تحذیر پائی گئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ڈرایا ہے، اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جس چیز کا حکم دیا ہے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ (روح المعانی و قرطبی)

اللہ تعالیٰ کے اوامر (احکام) میں سے یہ بھی ہے کہ عورتوں سے قبل (اگلے حصہ) میں جماع کرو، اور جماع سے پہلے بسم الله پڑھنے کا حکم نبی کریم ﷺ نے دیا، آپ کے ارشادات بھی درحقیقت رب تعالیٰ کے ارشادات ہی ہیں، کیونکہ آپ کے ارشادات رب تعالیٰ کی منشاء کے مطابق ہوتے ہیں۔

اور رب تعالیٰ نے نواہی (جن کاموں سے منع کیا گیا ہے) کے معاملہ میں رب تعالیٰ سے ڈرو، ان نواہی میں سے دبر (پچھلے حصہ) میں وطی کرنا ہے، جو کہ حرام ہے۔ (از صاوی)

"(وتقوا الله) ان تضیعوا بذره بوضعه فیمالا یحل"

اور اللہ سے ڈرو اس معاملہ میں کہ اپنا بیج حرام جگہ پر رکھ کر ضائع کرنے سے۔

یعنی تمہاری ازواج تمہاری کھیتیاں ہیں، اپنا نطفہ مقام پیدائش میں رکھو، جو بیج کی حیثیت رکھتا ہے۔ دبر میں نطفہ ڈال کر اپنا بیج ضائع نہ کرو۔ (تبصیر الرضی)

"وعلموا انکم ملاقوه": اور جان رکھو بے شک تم نے ملنا ہے اس سے۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے " واعلموا " کا ترجمہ کیا ہے "اور جان رکھو"

راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے، کیونکہ خطاب مومنین کو ہے جو پہلے سے جانتے اور ایمان رکھتے ہیں کہ انہوں نے رب تعالیٰ سے ملنا ہے۔ اس لئے مطلب یہ ہے کہ جو تم جانتے ہو اس پر قائم بھی رہو۔

ان الفاظ مبارکہ سے ڈرانے میں اور مبالغہ کیا گیا ہے کہ تم نے رب تعالیٰ سے ملنا ہے، اس نے تمہیں نیکیوں کا ثواب اور گناہوں کو عذاب دینا ہے۔ لہٰذا تم اس سے اچھی ملاقات کی تیاری کرلو کہ نیکی کے کام کرلو، برائیاں کر کے اپنے آپ کو رسوا نہ کرو۔

☆ "عن ابن عباس قال سمعت رسول الله ﷺ وهو یخطب یقول انکم ملا قوا الله حفاة عراة مشاة غرلا" ثم تلا رسول الله ﷺ واتقو الله واعلموا انکم ملا قوه "

(اخرجه مسلم بمعناه)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے دوران خطبہ سنا کہ آپ فرما رہے تھے، بے شک تم نے اللہ تعالیٰ سے ایسے حال میں ملنا ہے کہ تمہارے پاؤں میں جوتا نہیں ہو گا، تمہارے جسم پر لباس نہیں ہوگا، تم پیدل چل رہے ہو گے، تم غیر ختنہ شدہ ہو گے۔

(از روح المعانی وقرطبی)

"وبشر المؤمنین": اور (اے محبوب) بشارت دو مومنوں کو۔

یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اوامر کے مطابق عمل کیا اور نواہی سے اجتناب کیا، ان کو بشارت دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی عطاء سے ان کے ایمان نے انہیں گناہوں سے دور رکھا اور نیکیوں میں مشغول رکھا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عطاء اور ایمان سے خالی ہوتے ہیں وہ گناہوں سے اجتناب نہیں کر سکتے اور نہ ہی نیکیوں میں مشغول رہ سکتے ہیں۔ (از روح البیان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

ابھی تک چھ مرتبہ "یسئلونک" ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے تین مرتبہ کے ساتھ واؤ نہیں اور بعد میں تین مرتبہ واؤ بھی مذکور ہے یعنی "ویسئلونک" مذکور ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تین سوال مختلف مواقع پر کیے گئے، اس لئے ان کے ساتھ واؤ ذکر نہیں، کیونکہ واؤ جمعیت پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن بعد والے سوال ایک ہی موقع پر کیے گئے ہیں اس لئے ان کے درمیان واؤ کو ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ ان سوالات کی جمعیت کا پتہ چلتا رہے۔ (از مدارک التنزیل)

☆☆☆☆☆

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَیْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۲۴)

☆ ۱ ☆

اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بنالو کہ احسان اور پرہیز گاری اور لوگوں میں صلح کرنے کی قسم کرلو اور اللہ سنتا جانتا۔

☆ ۲ ☆

اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو نشانہ اپنی قسموں کے لئے کہ نیکی نہیں کرو گے اور پرہیز گاری نہیں کرو گے اور صلح نہیں کرو گے لوگوں کے درمیان۔ اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

شانِ نزول:

اس آیۂ کریمہ کے شانِ نزول میں مختلف اقوال ہیں۔ یعنی کئی وجوہ درپیش آنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی، جبکہ مسطح نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف بہتان میں کلام کیا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی کفالت نہ کرنے سے اس پر خرچ نہ کرنے کی قسم اٹھالی۔

(۲) عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کے خاوند بشیر بن نعمان سے کلام نہ کرنے کی جب قسم اٹھائی تو اس وقت یہ آیۃ نازل ہوئی۔ (قرطبی، خازن)

آیۃ کریمہ کے معنی میں دو احتمال:

"الاول وھو الذی ذکرہ ابو مسلم الاصفھانی وھو الاحسن"

پہلا احتمال وہ ہے جو ابو مسلم اصفہانی نے پیش کیا ہے، اور وہ احسن احتمال ہے۔ وہ احتمال یہ ہے۔

"(ولا تجعلوا الله عرضة لایمانکم) نهی عن الجراة علی الله بکثرة الحلف"

کہ زیادہ قسمیں اٹھا کر اللہ تعالیٰ پر جرأت کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ قسمیں اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے نام کو نشانہ نہ بناؤ۔

"لان من اکثر ذکر شئ فی معنی من المعانی فقد جعله عرضة له"

اس لئے کہ جب کسی چیز کے معنی اور صفت کو زیادہ ذکر کیا جائے تو اسے نشانہ بنانا لازم آتا ہے۔

جیسا کہ کوئی شخص کسی کو کہے "قد جعلتنی عرضة للومک" تحقیق تو نے مجھے اپنی ملامت کا نشانہ بنایا۔

اسی طرح کسی شاعر نے کہا "ولا تجعلنی عرضة للوائم" اپنی ملامتوں کا مجھے نشانہ بناؤ۔

اللہ تعالیٰ نے زیادہ قسمیں اٹھانے کی مذمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "ولا تطع کل حلاف مهین" "اور نہ اطاعت کرو ہر زیادہ قسمیں اٹھانے والے ذلیل کی۔

اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "واحفظوا ایمانکم" "اور حفاظت کرو اپنی قسموں کی۔

یعنی کم قسمیں اٹھاؤ، اگر کہیں قسم اٹھانے کی ضرورت در پیش آجائے تو اس پر قائم رہ کر اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔

عرب حضرات کم قسمیں اٹھانے والے کی تعریف کرتے ہیں، کم قسمیں اٹھانے کی بہتری میں حکمت یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے نام کی قلیل و کثیر قسمیں اٹھانے کی عادات بنالیتا ہے۔

"ولا یبقی للیمین فی قلبه وقع فلا یؤمن اقدامه علی الیمین الکاذبة فیختل ماهو الغرض الاصلی فی الیمین"

تو اس کے دل میں قسم کی کوئی قدر و منزلت نہیں رہتی، اور وہ جھوٹی قسمیں اٹھانے سے بھی باز نہیں رہتا، اس طرح تو اس کے دل میں قسم کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے یا اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔

کیونکہ اصل میں قسم اٹھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قدر کرتے ہوئے اپنی قسم پر قائم رہے۔

''وایضا کلما کان الانسان اکثر تعظیما للہ تعالٰی کان اکمل العبودیة''

اور یہ ہے جب انسان اللہ تعالٰی کی زیادہ تعظیم کرے گا، اسے عبادت میں کمال حاصل ہوگا۔

''ومن کمال التعظیم ان یکون ذکر اللہ تعالٰی اجل واعلی عندہ من ان یستشھد بہ فی غرض من الاغراض الدنیویة''

رب تعالٰی کی کامل تعظیم یہ ہے کہ انسان اس کے ذکر کو اعلٰی اور معظم سمجھے، اس کے نام دنیاوی غرضوں میں بطور قسم اور بطور دلیل نہ پیش کرے۔

اس تمہید کے بعد اصل مقصد کی طرف آئیں وہ یہ ہے۔

''واما قولہ تعالٰی بعد ذلک (ان تبروا) فھو علة لھذا المعنی''

اللہ تعالٰی کا ارشاد گرامی ''ان تبروا'' قسم اٹھانے کی ممانعت کی علت ہے۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالٰی کی طرف سے یہ کہا گیا کہ میں نے تمہیں زیادہ قسمیں اٹھانے سے اس لئے منع کیا ہے تاکہ تم سے نیکی، تقوی اور اصلاح فوت نہ ہو جائے۔ اب ان الفاظ گرامی......

''ولا تجعلوا اللہ عرضة لایمانکم ان تبروا وتتقوا وتصلحوا بین الناس'' کا معنی یہ ہوگا۔

''فتکونون یا معشر المؤمنین بررة اتقیاء مصلحین فی الارض غیر مفسدین''

اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ تاکہ تم نیک اور متقی لوگوں میں صلح کرانے والے بن جاؤ۔

سوال: قسم نہ اٹھانا عبادت کیسے ہے؟

جواب: جب انسان یہ خیال کرتے ہوئے قسم نہیں اٹھائے گا کہ اللہ تعالٰی کا نام بہت ہی معظم و مکرم ہے، میں اسے دنیاوی گھٹیا مقاصد حاصل کرنے میں کیوں استعمال کروں '' فلاشک ان ھذا من اعظم ابواب البر'' تو یقیناً یہ بہت بڑی نیکی کا کام ہوگا۔

قسم کا چھوڑنا تقوی کیسے؟ یہ تو واضح ہے، کیونکہ تقوی کا معنی ہے بچنا، جب انسان قسم اٹھانے سے اس لئے

بچے گا کہ دنیاوی گھٹیا مقاصد کے لئے اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت میں خلل نہ آئے، تو یہی تقوی ہے۔

قسم کو چھوڑنے سے اصلاح بین الناس کیسے حاصل ہوگی؟ وہ اس طرح کہ جب لوگ اس کے تقوی اور نیکی پر اعتبار کریں گے تو وہ اس کے متعلق یہ اعتقاد بھی رکھیں گے کہ یہ فساد سے دور ہے اور کسی قسم کی غلط طرفداری نہیں کرتا تو وہ اس سے اپنے جھگڑوں کے فیصلے کرائیں گے، یہ ان کے درمیان اصلاح کرائے گا۔

اس بحث کے بعد:

ابھی تک جو احتمال بیان کیا گیا اس کے مطابق حضرت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھیں۔

''اور نہ بناؤ تم اللہ کو نشانہ واسطے قسموں اپنی کے یہ کہ بھلائی کرو اور پرہیزگاری کرو اور درستی کرو درمیان لوگوں کے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے'' (مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ)

دوسرا احتمال:

"العرضة عبارة عن المانع" یعنی اس آیۂ کریمہ کی دوسری تفسیر یہ ہے "عرضة" کا معنی ہو "مانع رکاوٹ" یہ معنی بھی عرب حضرات لیتے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے "اردت افعل کذا فعرض لی امر کذا" میں نے فلاں کام کرنے کا ارادہ کیا، لیکن اس میں اس طرح رکاوٹ درپیش آگئی۔

اسی طرح کہا جاتا ہے "اعترض علی" فلاں شخص نے اعتراض کر کے مجھے کام سے روک دیا۔

اسی طرح راستہ میں کوئی چیز رکھ کر اگر راستہ کو روک دیا جائے تو اسے بھی " عرضة " کہتے ہیں۔

اب اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوا۔

"ولا تجعلوا ذکر اللہ مانعا بسبب ایمانکم من ان تبروا او فی ان تبروا "

اور تم اللہ کے ذکر کو رکاوٹ نہ بناؤ، بسبب اپنی قسموں کے نیکی کے کام کرنے سے اور تقوی کرنے سے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے سے۔

اس کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ لوگ نیکی کے کام چھوڑنے کی قسم کی اٹھا لیتے تھے کہ صلہ رحمی نہیں کروں گا، یا لوگوں میں صلح نہ کرانے کی قسم اٹھا لیتے تھے، اس طرح کسی پر احسان نہ کرنے کی قسم اٹھا لیتے تھے، پھر کہتے تھے کہ میں یہ کام کر لیتا لیکن میں نے قسم اٹھا رکھی ہے، اس لئے قسم سے حانث ہو جانے کی وجہ سے یہ کام نہیں کرتا۔

اب اس احتمال کے مطابق معنی یہ ہوگا۔

''ولا تجعلوا ذكر الله ما نعابسبب هذه الايمان عن فعل البر والتقوى''

قسموں میں اللہ تعالیٰ کے نام کو رکاوٹ نہ بناؤ نیکی کے کام کرنے سے اور تقوی کرنے سے اور لوگوں میں اصلاح کرنے سے۔

اسی احتمال کو آسان کرنے کے لئے جلالین میں تفسیر یوں کی گئی۔

''(ولا تجعلوا الله)اى الحلف به (عرضة)علة مانعة(لايمانكم)(ان)لا(تبروا وتتقوا) (وتصلحوا بين الناس)''

اور اللہ تعالیٰ کے نام کو رکاوٹ نہ بناؤ کہ قسمیں اٹھاؤ کہ تم نیکی کے کام نہیں کرو گے اور تقوی نہیں کرو گے اور لوگوں کے درمیان اصلاح نہیں کرو گے۔ (ماخوذ از کبیر)

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کا ترجمہ ضیاء القرآن میں جلالین کی تفسیر کے مطابق ہے۔آپ فرتے ہیں۔

''اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو رکاوٹ اس کی قسم کھا کر نیکی نہ کرو گے اور پرہیز گاری نہ کرو گے اور صلح نہ کراؤ گے لوگوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا، جاننے والا ہے'' (ضیاء القرآن)

ابو بکر جصاص رحمہ اللہ نے یہ دونوں معنی ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

''واذا كانت الآية محتملة للمعنيين وليسامتضادين فالواجب حملها عليهاجميعا''

آیۃ کریمہ میں جب دو معنوں کا احتمال ہے اور دونوں معنی میں کوئی تضاد (مخالفت) بھی نہیں تو ضروری ہے کہ دونوں معانی جمع کر لئے جائیں۔ (احکام القرآن للجصاص)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ دونوں احتمالوں کا جامع ہے:

پہلے آپ کا ترجمہ پھر سے دیکھئے۔

''اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بنالو کہ احسان اور پرہیز گاری اور لوگوں میں صلح کرنے کی قسم کرلو، اور اللہ سنتا جانتا ہے''۔ (کنز الایمان)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اور مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ کا ترجمہ بظاہر ایک ہی طرح نظر آتا ہے، جبکہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ میں ''کہ'' بیان کے لئے بنایا جائے۔

لیکن اگر راقم کی اس توجیہ کے مطابق دیکھیں تو دونوں احتمالات کا جامع نظر آئے گا۔

یعنی آپ نے فرمایا کہ اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ، زیادہ قسمیں نہ اٹھاؤ کہ ان قسموں کی آڑ میں نیکی کے کام بھی چھوڑ دو، ہاں اگر تمہیں نیکی کا کام کرنے کے لئے قسم اٹھانی پڑے، اور تقوی کے لئے قسم اٹھانے کی ضرورت در پیش آئے اور لوگوں میں صلح کرانے کی ضرورت کے لئے قسم اٹھانا چاہو تو قسم اٹھالو۔

جصاص کی عبارت دیکھو اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی توضیح راقم کی دیکھو تو امید غالب ہے کے آپ کو بہت خوب نظر آئے گا۔

ہاں یہ بھی خیال کیا جائے کہ راقم نے "عرضة" کا معنی نشانہ کر کے، اور بعد میں " لا "مقدر مان کر جو ترجمہ پیش کیا ہے، اس میں بھی جصاص کے قول کے مطابق دونوں احتمالوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"واللہ سمیع علیم": اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال اور تمہاری قسموں کو سننے والا ہے، اور تمہاری نیتوں کو اور تمہارے احوال کو جاننے والا ہے، لہٰذا تمہیں چاہئے کے اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرو، اور عمل پر محافظت کرو۔

قسم کے متعلق چند احادیث:

"عن ابن هريرة قال كان رسول اللهﷺ من حلف على يمين فرأى خيرا منها فليكفر عن يمينه وليفعل" وفي رواية فليات الذى هو خير وليكفر عن يمينه" (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہﷺ نے فرمایا جو شخص کسی کام کی قسم اٹھالے اور اس کا غیر کام بہتر دیکھے تو وہ بہتر کام کرے (جو بہتر نہیں اسے چھوڑ دے) اور قسم کا کفارہ ادا کر دے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"من حلف على فعل شئ او تركه وكان الحنث خيرا من التمادى على اليمين استحب له الحنث وتلزمه الكفارة وهذا متفق عليه واجمعوا على ان لا تجب عليه الكفارة قبل الحنث وعلى انه يجوزتا خيرها عن الحنث"

جو شخص قسم اٹھائے کہ میں یہ کام کروں گا، حالانکہ اسے چھوڑنا بہتر ہے تو وہ کام نہ کرے، یعنی قسم کو توڑ دے اور کفارہ ادا کرے، اسی طرح اگر قسم اٹھائی تھی کہ میں یہ کام نہیں کروں گا لیکن وہ کام کرنا بہتر ہے تو وہ کام کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے، یعنی ان صورتوں میں قسم کا توڑنا بہتر ہے اور قسم کے توڑنے کی وجہ سے کفارہ ادا کرے۔

اگر کوئی شخص فرض کام کے چھوڑنے یا حرام کام کرنے کی قسم اٹھادے تو اس قسم کو توڑنا فرض ہو جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا قسم کو توڑنا:

"عن ابى قلابة قال كنا عند ابى موسى فدعابمائد ته وعليها لحم دجاج فدخل رجل من بنى تيم الله احمر شبيه بالموالى فقال له هلم فتلكأ فقال هلم فانى قدرأيت رسول اللهﷺ يا كل منه فقال الرجل انى رأيته يا كل شيئا فقذرته فحلفت ان لا اطعمه فقال هلم احدثك عن ذلك انى اتيت رسول اللهﷺ فى رهط من الاشعريين نستحمله

فقال والله لا احملكم وماعندى احملكم عليه فلبثناماشاء الله فاتى رسول الله ﷺ بنهب ابل فدعابنا فامرلنا بخمس ذودغر الذرى قال فلماانطلقناقال بعضنا لبعض اغفلنا رسول الله ﷺ يمينه لا يبارک لنا فرجعنا اليه فقلنا يا رسول الله ﷺ انااتيناک نستحملک وانک حلفت ان لا تحملنا ثم حملتنا افنسيت يا رسول الله ﷺ قال انى والله ان شاء الله لا احلف على يمين فارى غيرهاخيرامنها الا اتيت الذى هو خير وتحللتهافانطلقوافانما حملكم الله عزوجل" (مسلم كتاب الايمان)

ابوقلابہ کہتے ہیں ہم ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھے آپ نے دستر خوان منگوایا اس پر مرغ کا گوشت تھا، ایک شخص بنی تیم اللہ سے وہاں آئے، ان کا رنگ سرخ تھا، غلاموں کے مشابہ تھے، حضرت ابوموسیٰ نے انہیں کہا آؤ (یعنی کھانا کھاؤ) انہوں نے کچھ تاخیر کی، حضرت ابوموسیٰ نے کہا آؤ، بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو مرغ کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا، وہ شخص کہنے لگے میں نے ایک مرتبہ مرغ کو کوئی چیز کھاتے ہوئے دیکھا تو قسم اٹھادی کے اسے نہیں کھاؤں گا۔ انہوں نے کہا آؤ میں تمہیں اس (قسم اٹھانے) کے متعلق حدیث بیان کروں، بیشک میں اشعری قبیلہ کے چند آدمیوں سے مل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ سے بوجھ اٹھانے والے جانور طلب کرنے لگے، آپ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہیں کوئی بوجھ اٹھانے والا جانور نہیں عطا کروں گا اور نہ ہی میرے پاس اس قسم کے جانور ہیں۔ ہم وہاں ٹھہرے جتنی دیر رب تعالیٰ کو منظور تھا، تو بیشک رسول اللہ ﷺ کے پاس غنیمت کے اونٹ آگئے، آپ نے ہمیں بلایا اور ہمیں حکم دیا کہ ان کو پانچ اونٹ سفید بلند کوہانوں والے دے دو، ابوموسیٰ کہتے ہیں جب ہم اونٹ لے کر چلے تو ہم میں سے بعض نے بعض کو کہا، ہم نے رسول اللہ ﷺ کو قسم سے غافل رکھا (کہ آپ کو یاد نہ رہا اور ہم نے یاد نہ دلایا) اللہ تعالیٰ ہمیں برکت عطا نہیں کرے گا، تو ہم آپ کے پاس لوٹ کر آئے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ کے پاس آئے اور ہم نے آپ سے بوجھ اٹھانے والے جانور

طلب کئے، تو آپ نے قسم اٹھائی تھی کہ میں تمہیں نہیں عطا کروں گا، پھر آپ نے ہمیں عطا کر دیئے۔ کیا آپ بھول گئے یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا بے شک قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو میں کسی کام کی قسم نہیں اٹھاتا مگر میں جب اس سے بہتر کام کو دیکھتا ہوں تو وہ بہتر کام کر لیتا ہوں اور قسم کو توڑ دیتا ہوں، تم چلو اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ عطا کئے ہیں۔

فوائد:

(۱) حدیث پاک سے اصل مسئلہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ نے جو قسم اٹھائی تھی کہ ان لوگوں کو سواریاں نہیں عطا کی جائیں گی، پھر جب آپ نے دیکھا کہ ان کو سواریاں دینا بہتر ہے تو آپ نے قسم توڑ دی اور ان لوگوں کو سواریاں عطا کر دیں۔

(۲) اگر چہ نبی کریم ﷺ نے تلذذ والے کھانے زیادہ طور پر استعمال نہیں فرمائے، لیکن کبھی کبھی استعمال کر لئے جیسا کہ مرغ کا گوشت بھی بعض اوقات کھالیا۔

(۳) ان لوگوں کو سواریاں نہ عطا کرنے کے متعلق قسم اٹھانے کی اصل وجہ آپ کا کسی وجہ سے غم و غصہ تھا جس کا ذکر دوسری حدیث شریف میں موجود ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قسم توڑنا:

"عن عبدالرحمن بن ابی بکر قال نزل علینا اضیاف لنا و کان ابی یتحدث الی رسول اللہ ﷺ من اللیل قال فانطلق وقال یا عبدالرحمن افرغ من اضیافک قال فلما امسیت جئنا بقراھم قال فابوافقالوا حتی یجئ ابومنزلنافیطعم معناقال لھم انہ رجل حدید وانکم ان لم تفعلوا خفت ان یصیبنی منہ اذی قال فابوافلماجاء لم یبدأ بشئ اول منھم فقال افرغتم من اضیافکم قال قالوالاواللہ مافرغنا،قال الم آمرعبدالرحمن قال وتنحیت عنہ فقال یاعبدالرحمن قال فتنحیت عنہ قال فقال

یاغنثر اقسمت علیک ان کنت تسمع صوتی الا جئت قال فجئت قال فقلت واللہ مالی ذنب ھؤلاء اضیافک فسلھم قد اتیتھم بقراھم فابوان یطعموا حتی تجیٔ قال فقال مالکم ان لاتقبلوا عنا قراکم قال فقال ابوبکر فواللہ لااطعمه اللیلة قال فقالوا فواللہ لانطعمه حتی تطعمه قال فقال مارأیت کالشر کاللیلة قط ویلکم مالکم الا تقبلوا عنا قراکم قال ثم قال اماالاولی فمن الشیطان ھلموا قراکم قال فجیٔ بالطعام فسمی فاکل واکلوا قال فلما اصبح غدا علی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ بروا وحنثت قال فاخبرہ قال بل انت ابرھم واخیرھم قال ولم تبلغنی کفارۃ"

(مسلم، ج۲، ص۱۹۴، باب اکرام الضیف الخ)

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر فرماتے ہیں ہمارے پاس کچھ مہمان آئے، چونکہ میرے باپ رات کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باتیں کرتے رہتے تھے، اسی معمول کے مطابق چلے گئے۔ اور کہہ گئے اے عبدالرحمٰن مہمانوں سے (کھانا کھلاکر) فارغ ہوجانا، عبدالرحمٰن کہتے ہیں جب شام ہوئی تو ہم نے ان کے پاس مہمان نوازی کے لئے کھانا پیش کیا، تو انہوں نے انکار کر دیا، اور کہنے لگے گھر کے صاحب جب آجائیں گے اور ہمارے ساتھ مل کر کھائیں گے تو ہم بھی کھالیں گے میں نے ان کو کہا وہ بہت سخت آدمی ہیں اگر تم نے کھانا نہ کھایا تو مجھے ڈر ہے کہ مصیبت مجھے ہی پہنچے گی آپ کہتے ہیں، انہوں نے پھر بھی انکار کر دیا، حضرت ابوبکر جب واپس آئے تو آتے ہی سب سے پہلے سوال یہی کیا، کیا تم مہمانوں کو (کھانا کھلانے) سے فارغ ہو چکے ہو۔ گھر کے حضرات نے بتایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم فارغ تو نہیں ہوئے، تو آپ فرمانے لگے کیا میں نے عبدالرحمٰن کو حکم نہیں دیا تھا؟ عبدالرحمٰن کہتے ہیں میں وہاں سے ہٹ گیا، آپ نے فرمایا اے عبدالرحمٰن، وہ کہتے ہیں میں ہٹ کر ہی رہا۔ (یعنی آپ سے ڈرنے کی وجہ خاموش رہا) پھر آپ نے فرمایا اے سست وجاہل! میں تمہیں قسم دلاکر کہتا ہوں اگر تم میری آواز سن رہے ہو تو سامنے آجاؤ۔ عبدالرحمٰن کہتے ہیں میں سامنے ہوگیا، میں نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میرا اس میں کوئی گناہ نہیں، یہ ہیں

آپ کے مہمان، آپ ان سے پوچھ لیں، میں ان کے پاس کھانا لایا، انہوں نے کھانے سے انکار کردیا کہ آپ آجائیں پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مہمانوں کو کہا تمہیں کیا ہوا تھا کہ تم نے ہماری مہمان نوازی کو قبول نہیں کیا۔ (بس یہ کہتے ہی غصہ میں) آپ نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں اس رات کو کھانا نہیں کھاؤں گا، مہمانوں نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم بھی اس وقت تک کھانا نہیں کھائیں گے جب تک آپ نہیں کھائیں گے۔ آپ نے کہا میں نے اس رات کے شر کی طرح کوئی شر نہیں دیکھا۔ تم پر افسوس تم نے ہماری مہمان نوازی کو کیوں نہیں قبول کیا تھا، پھر آپ نے کہا میرا قسم اٹھانا شیطان کی طرف سے وسوسہ تھا، آؤ اب میں تمہیں کھانا کھلاؤں۔ آپ نے طعام طلب کیا، پہلے خود بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا، پھر مہمانوں نے بھی کھایا۔ صبح نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! وہ لوگ تو اپنی قسموں پر پورے اترے، لیکن میں نے قسم کو توڑ دیا۔ حضور ﷺ کو جب واقع کی خبر دی تو آپ نے فرمایا کہ قسم کو تو تم ان سے زیادہ پورے کرنے والے ہوئے اور تم ان سے زیادہ بہتر ہو۔ حضرت ابوبکر کہتے ہیں قسم توڑنے سے پہلے مجھے کفارہ نے نہیں پایا، یعنی میں نے قسم توڑنے سے پہلے کفارہ ادا نہیں کیا۔

وضاحت حدیث:

حدیث پاک سے مقصود تو آخری حصہ بیان کرنا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غصہ سے جب قسم اٹھادی کہ میں اس رات کھانا نہیں کھاؤں گا تو مہمانوں نے بھی قسم اٹھادی کہ ہم بھی اس وقت کھانا نہیں کھائیں گے۔ اب اس صورت حال کے پیش نظر اگر آپ اپنی قسم پر قائم رہتے تو مہمان بھوکے رہتے، جب اس کی غیر صورت زیادہ بہتر تھی کہ آپ قسم کو توڑ کر کھانا کھالیں تاکہ آپ کے مہمان بھی کھانا کھالیں، اسی وجہ سے آپ نے قسم کو توڑ دیا اور نبی کریم ﷺ نے بھی اس کی تعریف فرمائی، جس کا مقصد یہ تھا کہ تمہارا قسم کو توڑنا بنسبت ان کے قسم پر قائم رہنے سے بہتر تھا، تو گویا کہ ان سے زیادہ قسم کو پورا کرنے والے تم ہی ہو، اور تمہیں ہی زیادہ ثواب حاصل ہوا۔ لہٰذا تم ان سے بہتر ہو۔

وہ مہمان کون تھے؟

دوسری روایت میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ وہ اصحاب صفہ تھے جو فقیر لوگ تھے۔ایک دن نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کے گھر دو آدمیوں کا طعام ہے وہ تیسرا شخص ان سے لے جائے،اس کھانے میں تین آدمی مکمل ہو جائیں گے۔جس کے پاس چار آدمی کا طعام ہے وہ پانچویں اور چھٹے کو لے جائے۔

" وان ابابکر جاء بثلاثه وانطلق نبی اللہ ﷺ بعشرۃ "

بے شک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تین مہمانوں کو لے کر گئے،اور خود نبی کریم ﷺ دس آدمیوں کو ساتھ لے کر گئے۔

اس واقعہ میں عجیب کرامت کا ظہور:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب قسم توڑ کر طعام سے لقمہ کھایا،تو حضرت عبدالرحمن کہتے ہیں۔

" وایم اللہ ما کنا نا خذ من لقمة الا ربا من اسفلها اکثر منها قال حتی شبعنا وصارت اکثر مما کانت قبل ذلک فنظر الیها ابو بکر فاذاهی کما هی او اکثر قال لأمراته یا اخت بنی فراس ماهذا قالت لا وقرة عینی لهی الآن اکثر منها قبل ذلک بثلاث مرار قال فاکل منها ابوبکر وقال انما کان ذلک من الشیطان یعنی یمینه ثم اکل منهالقمة ثم حملهاالی رسول اللہ ﷺ فاصبحت عنده قال وکان بیننا وبین قوم عقد فمضی الاجل ففرقنا اثناعشر رجلا مع کل رجل منهم اناس اللہ اعلم کم مع کل رجل قال الاانه بعث معهم فاکلوا منها اجمعون او کما قال " (مسلم حوالہ مذکور)

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم کوئی لقمہ نہیں اٹھاتے تھے مگر یہ کہ نیچے سے وہ بڑھ جاتا اور پہلے سے زیادہ ہو جاتا یہاں تک کہ ہم سیر ہو گئے،وہ کھانا پہلے سے زیادہ ہو گیا،حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب کھانے کو دیکھا تو وہ پہلے کی طرح تھا،بلکہ بڑھ چکا تھا،آپ نے اپنی زوجہ کو کہا اے بنی فراس قبیلہ

کی یہ کیا ہے؟انہوں نے کہا اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک میں تو یہی کہتی ہوں کہ یہ پہلے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ تین مرتبہ انہوں نے یہ الفاظ دہرائے ، یہ واقعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قسم کو شیطان کی طرف منسوب کرنے اور قسم کو توڑ کر خود کھانا کھانے کے بعد درپیش آیا۔ صبح وہ کھانا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا، اور ہمارا معاہدہ ایک قوم سے چل رہا تھا ان کے بارہ سرداروں کی طرف ہم نے وہ کھانا بھیجا اور ان کے تحت کتنے ہی اور لوگ تھے وہ کھانا سب لوگوں نے کھایا۔

نبی کریم ﷺ سب سے زیادہ سخی تھے:

آپ نے باقی لوگوں کو حکم دیا کہ جس گھر میں دو شخصوں کا کھانا ہو وہ ایک مہمان لے جائے اور اسے کھانا کھلائے ، اور اگر چار آدمیوں کا کھانا ہے تو ایک یا دو مہمان لے جاے ، یعنی نسبت دو ایک کی ہی تھی۔ لیکن آپ خود ایک فرد کے کھانے پر ایک مہمان کو لے گئے ، کیونکہ آپ کے گھر دس افراد تھے ، نو ازواج مطہرات اور آپ خود۔ اس لئے آپ دس افراد کو ساتھ لے گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے کامل متبع تھے:

اس دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی گھر کے تین افراد تھے، آپ خود اور آپ کی زوجہ اور آپ کا بیٹا عبدالرحمٰن۔ آپ بھی گھر کے ایک فرد کے مقابل ایک شخص کو لے کر گئے ، یعنی تین مہمان آپ لے کر گئے تھے۔

قسم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات سے اٹھائی جائے:

"عن ابن عمر قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من حلف بغير الله فقد اشرک"

(رواه الترمذی ، مشکوة ، باب الایمان والنذور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے غیر کی قسم اٹھائی ، تحقیق اس نے اس کے ساتھ غیر کو شریک کر دیا۔

" فقد اشرک ای اشرک غیر الله به فی التعظیم البلیغ فکانه مشرک اشرا کا جلیا فیکون زجرا بما لغة " (مرقاۃ)

نبی کریم ﷺ کے ارشاد "فقد اشرک" کا مطلب یہ ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے غیر کو رب تعالیٰ کے ساتھ کامل تعظیم میں شریک کر دیا، کیونکہ قسم تو اس کی اٹھائی جاتی ہے جو بہت ہی زیادہ تعظیم کے لائق ہو۔ گویا کہ آپ کے اس کلام سے واضح ہوا کہ وہ شخص شرک جلی (واضح شرک) کا مرتکب ہوا، اور اس میں بہت زیادہ زجر و توبیخ پائی گئی۔

"قال ابن الهمام من حلف بغیر الله کالنبی و الکعبة لم یکن حالفا" (مرقاۃ، فتح القدیر)

جس شخص نے اللہ کے غیر کی قسم اٹھائی جیسا کہ کہا "نبی کی قسم" یا یہ کہا "کعبہ کی قسم" تو اس کی قسم درست نہ ہوئی اور نہ ہی اس پر قسم کے احکام مرتب ہوں گے۔

تنبیہ: قدوری میں ذکر ہے۔

" و من حلف بغیر الله عز و جل لم یکن حالفا کالنبی علیه السلام و القرآن و الکعبة "

جس شخص نے اللہ کے غیر کی قسم اٹھائی تو وہ قسم اٹھانے والا نہیں ہوا، جیسا نبی علیہ السلام کی قسم اٹھائی۔ یا قرآن کی قسم اٹھائی یا کعبہ کی قسم اٹھائی۔

"و القرآن" پر راقم نے اپنے عربی حاشیہ "المظهر النوری" میں یوں وضاحت کی۔

"قوله و القرآن" قال فی الفتح ثم لا یخفی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینا کما هو قول الائمة الثلاثة و نقل فی الهندیة عن المضمرات و قد قیل هذا فی زمانهم اما فی زماننا فیمین و به ناخذ و نامر و نعتقد و قال محمد بن المقاتل الرازی انه یمین و به اخذ جمهور مشائخنا فهذا مزید لکونه صفة تعورف الحلف بها کعزة الله و جلاله" (شامی، فتح القدیر، عالمگیری)

فتح القدیر اور شامی اور عالمگیری میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ پہلے زمانہ میں قرآن بول کر اس سے مراد قرآن پاک کا نسخہ یعنی کتاب لیتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں قرآن بول کر مراد اللہ

کا کلام لیتے ہیں، اللہ کا کلام اللہ کی صفت ہے، اس لئے اب ہمارے زمانہ میں قرآن پاک کی قسم اٹھانا متعارف ہے، اس لئے ہمارے جمہور مشائخ نے اسی پر عمل کیا ہے، لہٰذا ہم اس پر عمل کرتے ہیں، اسی کا حکم دیتے ہیں اور اسی کا عقیدہ رکھتے ہیں، یہ قسم ایسی ہی متعارف ہوگئی جیسے اللہ کی عزت کی قسم اور اللہ کے جلال کی قسم متعارف ہے۔ اور قرآن کی قسم واضح ہونے پر امام مالک امام شافعی امام احمد رحمہم اللہ کا اتفاق ہے۔ (المظہر النوری شرح القدوری)

''والیمین با اللہ تعالیٰ اوبا سم من اسمائہ کالرحمن والرحیم اوبصفۃ من صفات ذاتہ کعزۃ اللہ وجلالہ وکبریائہ الاقولہ وعلم اللہ فانہ لا یکون یمینا وان حلف بصفۃ من صفات الفعل کغضب اللہ وسخط اللہ لم یکن حا لفا'' (قدوری)

قسم اٹھائے اللہ کی یا اللہ تعالیٰ کے ناموں سے کسی نام کی جیسے کہے رحمٰن کی قسم یا کہے رحیم کی قسم یا اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات ذات کی قسم اٹھائے، جیسے کہے اللہ کی عزت کی قسم، اللہ کے جلال کی قسم، اللہ کی کبریائی کی قسم، تو یہ قسم ہوگی، اس پر تمام احکام قسم والے ہی جاری ہوں گے۔ البتہ اللہ کے علم کی قسم اٹھائے تو یہ قسم نہیں ہوگی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی صفات فعل میں سے کسی صفت کی قسم اٹھائے تو قسم نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اللہ کے غضب اور اللہ کی ناراضگی کی قسم اٹھائے۔

''وعلم اللہ'' پر راقم نے ''المظہر النوری'' میں یوں وضاحت کی۔

''قولہ وعلم اللہ ''ان المعتبر العرف وعدمہ فی الیمن فالتعلیل لیسن الابنفی المتعارف واما لو فرع علی القول المفصل بین صفۃ الذات وغیر ھا وجب ان یکون یمینا لان العلم من صفات الذات'' (فتح القدیر)

قسموں میں اعتبار عرف کا ہے، اللہ کے علم کی قسم نہ ہونے کا دارومدار عرف پر ہے۔ چونکہ اس وقت اللہ کے علم کی قسم اٹھانا متعارف نہیں تھا تو یہ کہہ دیا کہ یہ قسم نہیں۔ مطلب صرف یہ تھا کہ یہ قسم متعارف نہیں، یہ مطلب نہیں کہ ان الفاظ سے قسم بنتی ہی نہیں۔ کیونکہ علم صفات ذات سے ہے اور صفات ذات کی قسم اٹھائی جائے تو قسم لازم آتی ہے۔ (المظہر النوری)

صفات ذات اور صفات افعال میں فرق:

وہ صفات جن کی اضداد (ضدیں) اللہ تعالیٰ کی صفات نہ بن سکیں، وہ صفات ذات ہیں۔ جیسا کہ عزت رب تعالیٰ کی صفت ذات ہے، کیونکہ عزت کی ضد ذلت ہے، اللہ تعالیٰ ذلت سے متصف نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح علم رب تعالیٰ کی صفت ذات ہے، کیونکہ علم کی ضد جہالت ہے رب تعالیٰ جہالت سے پاک ہے۔

لیکن وہ صفات جن کی ضدوں سے بھی رب تعالیٰ متصف ہے وہ صفات فعل ہیں۔ رضاء رب تعالیٰ کی صفت فعل ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے۔

"ان اللہ یر ضی بعباد ہ الایمان و لا یر ضی با لکفر"

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ایمان کو پسند فرماتا ہے اور کفر کو پسند نہیں فرماتا۔

تو واضح ہوا کہ وہ رضاء اور عدم رضاء دونوں سے متصف ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کفار پر غضب فرماتا ہے اور کفار پر ناراض ہوتا ہے لیکن مومنوں پر رحم فرماتا ہے اور ناراض نہیں ہوتا۔ لہٰذا غضب اور سخط (ناراضگی) صفات فعل ہیں۔

واضح رہے:

کہ یہ ضابطہ بھی اکثر یہ ہے کہ صفات ذات سے قسم لازم آتی ہے اور صفات فعل سے نہیں، کیونکہ قسم کا دارومدار عرف پر ہے۔ اگر عرف میں صفات فعل سے قسم اٹھائی جاتی ہو تو وہ بھی قسم ہی ہوگی۔

(ماخوذ از مظہری النوری)

مسئلہ:

اگر کوئی شخص کہے اگر میں یہ کام کروں، یا یہ کام نہ کروں تو میں یہودی ہو جاؤں یا نصرانی ہو جاؤں یا کافر ہو جاؤں تو یہ بھی قسم ہے۔ قسم والے تمام احکام جاری ہوں گے۔

☆ "عن ابن عمر قال اکثر ما کان النبی ﷺ یحلف لا ومقلب القلوب"

(رواہ البخاری، مشکوۃ باب الایمان والنذور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اکثر طور پر نبی کریم ﷺ قسم اٹھاتے وقت فرماتے مقلب القلوب (دلوں کو پھیرنے والے) کی قسم۔

☆ "عن ابن عمر ان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ ینھا کم ان تحلفوا بابا ئکم من کان حالفا فلیحلف باللہ اولیصمت" (رواہ البخاری ومسلم، مشکوۃ باب الایمان والنذرو)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا، بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں منع فرماتا ہے کہ تم اپنے آباء کی قسم اٹھاؤ، جو شخص قسم اٹھانا چاہتا ہے وہ اللہ کی قسم اٹھائے یا خاموش ہو جائے۔

وضاحت:

حدیث شریف میں آباء کی قسم اٹھانے سے ممانعت کی اصل وجہ یہ ہے کہ غیر خدا کی قسم نہ اٹھائے، آباء کا ذکر اس لئے کر دیا گیا ہے کہ وہ اکثر طور پر آباء کی قسم اٹھاتے تھے۔

اعتراض:

رب تعالیٰ نے دن، رات، سورج، چاند وغیرہ کی قسمیں اٹھائی ہیں، تو کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی قسم اٹھانا صحیح نہیں؟

جواب:

یہ قانون بندوں کے لئے ہے۔

" واما اللہ سبحانہ فلہ ان یحلف بما شاء من مخلوقاتہ تنبیھا علی شرفہ "

کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں جس کی چاہے قسم اٹھائے، رب تعالیٰ کا مخلوق کی قسم اٹھانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی شرافت پر متنبہ کرتا ہے۔ (از مرقاۃ)

سوال:

نبی کریم ﷺ نے "افلح وابیه" ارشاد فرمایا جس میں آپ کی قسم کا ذکر ہے۔

جواب:

"ان هذه الکلمة تجری علی اللسان لا یقصدبهاالیمن"

بیشک یہ کلمہ زبان پر جاری ہوجاتا تھا جس میں قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا تھا۔ (ازمرقاة)

☆ "عن بریدة قال قال رسول الله ﷺ من قال انی بریٔ من الاسلام فان کا ن کا ذبا فهو کما قال وان کان صادقا فلن یرجع الی الاسلام سا لما"

(رواه ابو داود والنسائی وابن ماجه . مشکوة باب الایمان والنذور)

حضرت بریدہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کہا، بے شک میں اسلام سے بری ہوں (یعنی اگر میں نے یہ کام نہ کیا، یا یہ کام کیا تو اسلام سے بری ہوں) اگر وہ جھوٹا ہوا تو ایسا ہی ہوگا جیسا اس نے کہا، یعنی وہ اسلام سے بری ہوگا۔ اگر سچا ہوا۔ یعنی اس نے قسم پر عمل کر دیا تو پھر بھی اسلام کی طرف کامل نہیں لوٹے گا (کیونکہ اس نے اسلام سے بری ہونے کے الفاظ ذکر کرنے میں جسارت سے کام لیا)

☆☆☆☆☆☆

لَايُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِفِيْ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۲۵)

☆۱☆

اللہ تمہیں نہیں پکڑتا ان قسموں میں جو بے ارادہ زبان سے نکل جائے، ہاں اس پر گرفت فرماتا ہے جو کام تمہارے دلوں نے کئے اور اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔

☆۲☆

نہیں پکڑتا تمہیں اللہ تمہاری لغو قسموں سے، اور لیکن پکڑتا ہے تمہیں ان قسموں سے جو کسب کیا تمہارے دلوں نے، اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

"لایؤاخذکم اللّٰہ": نہیں پکڑتا تمہیں اللہ۔

"یؤاخذ" لیا ہوا ہے "اخذ" سے، جس کا معنی پکڑنا۔ طلباء کرام یہ خیال رکھیں کہ یہ باب مفاعلہ ہے، اگرچہ اس میں شرکت جانبین ہوتی ہے، یعنی "مؤاخذہ" کا معنی ایک دوسرے کو پکڑنا۔ لیکن یہاں ہر جانب سے فاعلیت اور مفعولیت کا معنی مراد لینا ممکن نہیں، فاعلیت کا معنی صرف اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، اور مفعولیت کا معنی صرف مخاطبین کی طرف منسوب ہے۔

"باللغوفی ایمانکم": تمہاری لغو قسموں سے۔

یعنی تمہاری قسموں میں سے جو لغو قسمیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان قسموں کی وجہ سے تمہاری پکڑ نہیں فرماتا۔

"اللغو" السا قط الذی لایعتدبه سواء کان کلا ما او غیرہ"

لغو کا مطلب ہے بے فائدہ چیز، جس کا کوئی اعتبار نہ ہو اور کسی شمار میں نہ ہو خواہ کلام ہو یا غیر کلام ہو۔

" لغو" کا لفظ قول باطل اور فعل باطل دونوں پر بولا جاتا ہے۔

لغو بمعنی فعلِ باطل:

"واذامروا باللغو مروا کراما" جب وہ گزرتے ہیں بیہودہ اور باطل فعل سے تو گذر جاتے ہیں شریفانہ انداز سے۔

لغو بمعنی قولِ باطل:

باطل قول کے لئے لغو کا استعمال قرآن پاک اور حدیث پاک سے ثابت ہے۔ پھر مختلف مقامات میں مختلف حالات کی وجہ سے مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لغو بمعنی کلمہ فاحشہ:

"لا یسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما" اس مقام میں لغو کا معنی فحش کلمات ہے۔

اسی طرح "لاتسمع فیھا لاغیہ" میں بھی یہی معنی معتبر ہے۔ "لاغیۃ" بھی لغو سے ماخوذ ہے۔

لغو بمعنی باطل کلام:

حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

" من قال یوم الجمعة مصاحبه صه والامام یخطب فقد لغا "

جس شخص نے جمعہ کے دن امام کے خطبہ دینے کی حالت میں (دوسرے ساتھ والے) اپنے صاحب کو کہا خاموش ہو جا (اس کا یہ کہنا) لغو اور باطل ہے۔

لغو بمعنی کفر و کلام قبیح:

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔ "واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه"

جب وہ کفریہ کلام اور قبیح کلام سنتے ہیں تو اس سے اعراض کر لیتے۔

اس آیت میں لغو بمعنی کفر اور کلام قبیح کے استعمال ہوا ہے۔

لغو بمعنی آواز بلا مقصد:

جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ "لغا الطائر یلغو لغو اذا صوت"

پرندہ جب آواز نکالتا ہے تو عام انسان اس کی آواز کو بلا مقصد سمجھتے ہوئے کہتا ہے "**لغا الطائر**"

پرندے نے اپنی بولی بولی جس کا بظاہر کوئی مقصد نہیں۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص و کبیر)

یمین کو یمین کہنے کی وجہ:

یمین کا معنی اگر چہ یہاں قسم ہے، تاہم قسم کو یمین کہنے کی دو وجہ ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ یمین کا معنی دایاں ہاتھ ہے، چونکہ عرب حضرات قسم اٹھاتے وقت ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر وعدہ کرتے ہیں یعنی مصافحہ کرتے اور زیادہ طور پر وہ صرف دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرتے، اس لئے قسم کو یمین کہہ دیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یمین کا معنی ہے قوت، جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا "**لاخذنا منه باليمين**" ہم اسے مضبوطی (قوت) سے پکڑیں گے۔ چونکہ قسم اٹھانے والا بھی اپنی بات کو قسم کے ذریعے مضبوط کرتا ہے، اس لئے قسم کو یمین کہہ دیا جاتا ہے۔ (روح البیان)

یمین کی تین صورتیں:

یعنی قسم کی تین اقسام ہیں۔ (۱) منعقدہ (۲) غموس (۳) لغو

یمین منعقدہ:

مستقبل کے متعلق قسم اٹھائی تھی کہ میں یہ کام کروں گا، یا یہ کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، تو وہ اپنی قسم کے خلاف کام کردے تو وہ حانث ہو جائے گا، یعنی اپنی قسم کو توڑنے والا بن گیا، اس پر کفارلازم آئے گا۔

یمین منعقدہ کو توڑنے سے گناہ لازم آئے گا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر معصیت کی قسم اٹھائی تھی یعنی فرض یا واجب کو چھوڑنے یا گناہ کرنے کی قسم اٹھائی تھی، جو معصیت کی قسم تھی تو اسے توڑنے پر ثواب حاصل ہوگا۔ اگر معصیت نہ کرنے کی قسم اٹھائی تو قسم کے توڑنے پر گناہ ہوگا، قسم کا توڑنا علیحدہ گناہ اور معصیت کا کام کرنا علیحدہ گناہ۔ اگر مباح کام کے کرنے یا چھوڑنے کی قسم اٹھائی تھی تو اس کا توڑنا بھی گناہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی اس نے تعظیم نہیں کی۔

یمین غموس:

ماضی کے متعلق جان بوجھ کر جھوٹی قسم اٹھائی کہ میں نے یہ کام نہیں کیا تھا، حالانکہ واقع میں اس نے کام کیا تھا، یا قسم اٹھائی کہ میں نے یہ کام کیا تھا، حالانکہ واقع میں اس نے کام نہیں کیا تھا، اس قسم پر گناہ کبیرہ لازم آتا ہے۔

" ولا کفارة عندابی حنیفة فی الکبائر وعند الشافعی تجب الکفارة فیه "

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یمین غموس میں کفارہ لازم نہیں، کیونکہ کبائر پر کفارہ لازم نہیں بلکہ توبہ ضروری ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یمین غموس میں کفارہ لازم ہے۔

(از روح البیان بزیادہ)

یمین لغو اور اہلِ علم کو دعوتِ فکر:

عام طور پر بیان یہ کیا جاتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ماضی کی قسم اپنے گمان کے مطابق سچی اٹھائی واقع میں جھوٹی تھی، یعنی قسم اٹھائی میں نے یہ کام نہیں کیا تھا، وہ اپنے آپ کو سچا سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ اس نے کام

کیا تھا، لیکن وہ بھولا ہوا ہے، یہ لغو قسم ہے، اس میں وہ شخص گنہگار نہیں، کیونکہ بھولنے پر کوئی مواخذہ (پکڑ) نہیں، اور اس پر کفارہ بھی لازم نہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ اس قسم کو یمین غموس کہتے ہیں، اور وہ فرماتے ہیں اس پر کفارہ لازم ہے۔

یہاں تک تو راقم کو کوئی کلام نہیں۔ البتہ یہ جو بیان کیا جاتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یمین لغو یہ ہے کہ بے ارادہ قسم اٹھادے کہے "لا واللہ" "ایسا نہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، اور کہے "بلی واللہ" کیوں نہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، اس قسم کے الفاظ عام طور پر زبان جاری ہوتے ہیں، یہ لغو قسمیں ہیں، ان پر نہ کفارہ ہے اور نہ ہی گناہ ہے۔

اس بحث سے جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کو امام اعظم رحمہ اللہ یمین لغو نہیں کہتے، راقم کے نزدیک یہ غلط ہے، کسی فقیہ اور کسی مفسر نے یہ واضح بیان نہیں کیا۔

راقم کا موقف:

اس میں یہ ہے کہ پہلی جو صورت بیان کی، اسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ یمین لغو کہتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ اسے یمین غموس کہتے ہیں۔ یہ اختلاف تو صراحۃ ثابت ہے۔

لیکن یمین لغو کی تعریف جو امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا کوئی اختلاف نہیں، بلکہ عام طور پر بغیر ارادہ کے زبان پر جاری ہونے والے الفاظ بالاتفاق یمین لغو ہیں۔

نہ ہی اس کی تعریف میں کوئی اختلاف ہے اور نہ ہی حکم میں کوئی اختلاف ہے، بلکہ لغو کی اس قسم میں نہ گناہ ہے اور نہ ہی کفارہ لازم ہے۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

ذرا کتب کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کا ذہن قبول کرے گا کہ اس صورت کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ یمین لغو نہ مانیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جبکہ پہلے احادیث میں تعارض کو مٹانے کے لئے ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ کا قول پیش کیا جاچکا ہے کہ "قد افلح و ابیہ" حدیث شریف میں باپ کی قسم بغیر ارادہ کے اٹھائی گئی اس میں کوئی مواخذہ نہیں۔ اس سے واضح

ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی اسے یمین لغوہی قرار دیتے ہیں۔ واضح احادیث کا انکار امام صاحب سے ممکن نہیں۔

☆ "عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال من حلف فقال فی حلفه باللات و العزی فلیقل لا اله الاالله"

حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قسم اٹھائے اور اپنی قسم میں یہ کہے "لات کی قسم اور عزی کی قسم" تو اسے چاہئے کہ وہ " لااله الا الله " کہے۔

(بخاری و مسلم)

نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد جس موقع ومحل کے مطابق ہے اس کو سمجھئے۔

" فهذاقاله لقوم حدیثی عهد بجاهلیة قد اسلموا والسنتهم قد الفت ما کانت علیه من الحلف بالات من غیر قصد فامروا ان یتلفظوا بکلمة الاخلاص کماتلفظوا بتلک الکلمة من غیر قصدلتکون هذه بهذه" (ابن کثیر۔ صابونی)

نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد اس قوم کو فرمایا جن کا زمانہ اسلام زمانہ جاہلیت کے قریب تھا۔ یعنی نومسلم حضرات تھے، چونکہ وہ زمانہ جاہلیت میں لات اور عزی کی قسمیں اٹھاتے تھے، اسلام میں آکر بغیر ارادہ کے لات اور عزی کی قسم اٹھادی، تو نبی کریم ﷺ نے ان پر کوئی کفارہ مقرر نہیں کیا اور نہ ہی ان کو گنہگار کہا، بلکہ حکم یہ دیا کہ اخلاص سے "لا الــــه الاالله" کہو، تاکہ خلوص سے کہے ہوئے یہ الفاظ ان کا بدل بن جائیں جو بغیر ارادہ کے کہے گئے۔ یعنی اگر چہ ان میں کوئی مواخذہ تو نہیں، البتہ خلوص سے کلمہ توحید زبان پر جاری کر دیا جائے تاکہ ثواب حاصل ہو جائے۔

☆ "عن عروة عن عائشة فی قوله "لایؤ اخذ کم الله باللغو فی ایمانکم" قالت هم القوم یتدراؤن فی الامر فیقول هذا لا والله، وبلی والله و کلاوالله "

حضرت عروہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا رب تعالی کے ارشاد گرامی "لایؤاخذکم الله باللغو فی ایمانکم" کی وضاحت میں ارشاد فرمایا کہ لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو بغیر ارادہ لوگ اٹھاتے ہیں، اور "لا والله، بلی والله، کلا والله" کہہ دیتے ہیں۔

" یتدراؤن فی الامر لا تعقدعلیه قلوبهم" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد میں "یتدارؤن فی الامر" کا مطلب ہی یہ ہے کہ کہ وہ بغیر ارادہ اور بغیر عقیدہ کے یوں قسمیں زبان پر لے آتے ہیں۔ (صابونی)

☆ "عن عروة قال كانت عائشة تقول انما اللغو فی المزاحة والهزل وهو قول الرجل لا والله وبلى والله، فذاك لا كفارة عليه، انما الكفارة فيما عقدعليه قلبه ان يفعله ثم لا يفعله" (صابونی)

حضرت عروۃ کہتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جو قسم مزاح اور ہنسی کھیل سے بلا ارادہ اٹھائی جائے وہ بھی لغو ہے، اس پر کفارہ نہیں۔ کفارہ اس قسم پر ہے جو ارادہ سے اٹھائے کہ یہ کام میں کروں گا پھر وہ کام نہ کرے۔ (صابونی)

راقم کہتا ہے کہ اس ہنسی و مزاح والی قسم میں گناہ لازم آئے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت کا لحاظ اس میں نہیں پایا گیا۔

☆ "عن عروة عن عائشه انها كانت تتاؤل هذه الآية يعنى قوله تعالىٰ" لا يؤاخذكم الله باللغو فی ایمانكم" وتقول هوا لشئ يحلف عليه احدكم لا يريد منه الا الصدق فيكون على غير ماحلف عليه "

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس آیۃ کریمہ "لا يؤاخذ كم الله باللغو فی ایمانكم" کے متعلق بیان فرماتی تھیں کہ ایک شخص اپنے خیال میں سچی قسم اٹھائے، لیکن واقعہ میں وہ سچی نہ ہو تو یہ لغو قسم ہے۔ یعنی اس پر گناہ اور کفارہ نہیں۔ (صابونی)

☆ "وعن عطاء عن عائشة قالت هو قوله لا والله وبلى والله وهو يرى انه صادق ولا يكون كذلك "

حضرت عطاء کہتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک شخص اپنے آپ کو سچا سمجھ کر قسم اٹھاتا ہے واقعہ میں ایسا نہیں تو یہ لغو قسم ہے اس پر گناہ کفارہ نہیں۔ (صابونی)

واضح ہوا کہ لغو کی یہ دونوں صورتیں احادیث سے ثابت ہیں، ایک میں امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کا اختلاف ہے اور ایک میں اختلاف نہیں۔

تفسیر روح المعانی اور تفسیر روح البیان کو گہری نظر سے مطالعہ کرنے سے انشاء اللہ راقم کا موقف طلباء کرام آسانی سے سمجھ لیں گے اور قوی امید کہ انشاء اللہ تائید کریں گے۔

تنبیہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث ابوداؤد نے مرفوع ذکر کی ہے، بخاری نے موقوف۔

"عن عائشه قالت قال رسول الله ﷺ هو قول الرجل في يمينه كلا والله وبلى والله

(ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لغو قسم ہے جبکہ ایک شخص بغیر ارادہ کے قسم اٹھائے۔ (خازن)

اعتراض: کبیر اور خازن میں تو یہ ذکر ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ " **لا والله، بلى والله**" میں کفارہ لازم کرتے ہیں، یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ یہ لغو قسم ہے اور اس میں کفارہ نہیں۔

جواب: اس قسم کی قسموں پر اسی وقت کفارہ لازم آئے گا جب وہ ارادہ سے قسم اٹھائے۔ ہاں البتہ قاضی ظاہر الفاظ کو دیکھ کر مستقبل کے متعلق اٹھائی ہوئی قسم پر کفارہ لازم ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ البتہ مفتی کہے گا اگر یہ سچا ہے تو عند اللہ کفارہ لازم نہیں۔ **والله اعلم بالصواب** (راقم)

تین چیزیں ہنسی مزاح سے بھی ثابت ہو جائیں گی:

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ثلاث جد هن جد وهزلهن جد النكاح والطلاق والرجعة" (اخرجه احمد وابو داؤد والترمذی وابن ماجه والحاكم والدار قطنی)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ فرماتے ہیں تین چیزوں میں حقیقت بھی حقیقت ہے اور مزاح بھی حقیقت ہے، وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ نکاح اور طلاق اور رجوع کرنا۔ (مظھری)

اور ایک روایت میں غلام آزاد کرنے کا بھی یہی حکم بیان کیا گیا، اس لئے گویا کہ چار چیزوں میں مزاح بھی

حقیقت ہے، ہنسی ومزاح سے طلاق دینے سے طلاق واقع ہوجائے گی، پھر یہ نہ کہے کہ میرا ارادہ نہیں تھا۔

"ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم":

اور لیکن پکڑتا ہے تمہیں ان قسموں سے جو کسب کیا تمارے دلوں نے۔

شیخ احمد المدعو بملا جیون رحمہ اللہ کی علمی تحقیق:

اللہ تعالیٰ نے قسم کا ذکر دو مقامات پر کیا، ایک اسی آیۃ کریمہ میں جو سورۃ بقرہ کی زیر بحث ہے، اور دوسرا مقام سورۃ مائدہ میں ہے۔ دونوں جگہ ذکر کیا۔

"لایؤاخذ کم اللہ باللغو فی ایمانکم" تمہیں نہیں پکڑتا اللہ تمہاری لغو قسموں میں۔

لیکن یہاں لغو کے مقابل ذکر کیا "ولکن یؤاخذکم اللہ بما کسبت قلوبکم"

لیکن مواخذہ کرتا ہے تمہارا جو تمہارے دلوں نے کسب کیا۔

اس کے بعد اور کوئی حکم ذکر نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد مغفرت کا ذکر کیا "و اللہ غفور حلیم" اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

اور سورۃ مائدہ میں لغو قسم کے بعد ذکر فرمایا "ولکن یؤاخذ کم بما عقد تم الایمان" کا معنی ہے "بما قصدت بہ قلوبکم و کسبتہ" (جس کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا اور کسب کیا) یہ حکم عام ہے یمین غموس اور منعقدہ کو، کیونکہ دونوں میں ارادہ پایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ غموس ماضی کے متعلق قسم ہے اور مستقبل کے متعلق قسم کو منعقدہ کہا جاتا ہے۔

اس آیۃ کریمہ میں "بما کسبت قلوبکم" میں مؤاخذہ کا ذکر ہے اور مائدہ میں بھی "بماعقدتم الایمان" میں مؤاخذہ کا ذکر ہے جو کہ کفارہ سے مقید ہے، اس لئے سورۃ بقرۃ میں مؤاخذہ اگرچہ مطلق ذکر ہے، لیکن مطلق کو مقید پر محمول کریں گے۔ لہٰذا (بما کسبت قلوبکم) سے بھی کفارہ ثابت جو یمین غموس اور منعقدہ دونوں میں لازم ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے متبعین کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "بما کسبت قلوبکم" سے مراد یہ ہے کہ وہ یمین جس کا تمہارے دلوں نے کسب کیا ہے اس پر تمہارا مؤاخذہ ہوگا، کیونکہ یہ دونوں قسمیں لغو کے مقابل ہیں، لغو میں مؤاخذہ نہیں اور ان دونوں میں مؤاخذہ ہے۔

لیکن مؤاخذہ مطلق ذکر ہے، مطلق سے مراد فرد کامل ہے۔ وہ کامل مؤاخذ اخروی ہے، یعنی گناہ ہوگا۔ اور اس کی اخروی گرفت ہوگی۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "واللہ غفور حلیم" (اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے) اس پر دلالت کر رہا ہے، کیونکہ مغفرت آخر میں ہی ہوتی ہے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ "بما کسبت قلوبکم" میں غموس اور منعقدہ دونوں آجاتی ہیں، جن پر مؤاخذہ اخروی ہوگا، لیکن کفارہ کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔

لیکن سورۃ مائدہ میں "بما عقدتم الایمان" مذکور ہے، جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب تم قسم کو پورے کرنے کا ارادہ کرلو، پھر حانث ہو جاؤ، یعنی قسم توڑ دو، تو اس پر تمہیں مؤاخذہ ہوگا وہ مؤاخذ یہ ہے کہ تم قسم کا کفارہ ادا کردو۔

منعقدہ کا حقیقی معنی یہ ہے کہ قسم کو پورا کرنے کا عقد باندھ لے۔ اور مجازی معنی ہے ارادہ کرنا۔ قانون یہ ہے کہ جب حقیقی معنی مراد لیا جاسکے تو مجازی معنی مراد نہیں لیا جائے گا۔

جب سورۃ مائدہ میں مؤاخذہ کا مطلب کفارہ ہے، اور مؤاخذہ نہ ہونے کا مطلب کفارہ لازم نہ آنا ہے، اس لئے سورۃ مائدہ میں یمین غموس "لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم" میں داخل ہے۔

مطلب یہ ہوگیا کہ منعقدہ میں کفارہ لازم ہے اور لغو اور غموس میں کفارہ لازم نہیں۔ اور غیر لغو میں گناہ ہوگا۔

اس سے یہ واضح ہوگا کہ غموس میں اور منعقدہ کو بلاوجہ توڑنے میں گناہ لازم آئے گا۔ (تفسیرات احمدیہ)

قسم کا کفارہ:

دس مسکینوں کو دو وقت کا طعام کھلانا (یا اس طعام کی قیمت مساکین کو دینا) یا دس مسکینوں کو کپڑوں کا جوڑا جوڑا دینا

یاغلام آزادکرنا۔اگران چیزوں کےاداکرنے کی استطاعت نہ ہوتو تین روزلگا تارروزہ رکھنا کہ ان میں کوئی ناغہ نہ ہو۔

(زیادہ تفصیل سورۃ مائدۃ میں ان شاءاللہ آئے گی)

"واللہ غفور حلیم": اوراللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

"غفور" گناہوں کوڈھانپنے ،معاف کرنے اوران پرعذاب کوساقط کرنے میں مبالغہ پایا گیا ہے،یعنی بہت ہی زیادہ معاف کرنے والا "الغفور مبالغة في ستر الذنوب وفي اسقاط عقوبتها" (کبیر)

"حلیم" کلام عرب میں "حلم" کامعنی سکون وآرام،جب اللہ تعالیٰ کی صفت "حلیم" ہوتو اس کا معنی یہ ہے۔

"الذی لا یعجل بالعقوبة بل یؤخرعقوبة الکفار والفجار" (کبیر)

کہ وہ سزاجلدی نہیں دیتا،بلکہ کافروں اورفاجروں کوسزادینے میں دیرکرتا ہے۔یعنی مہلت دیتا ہے تاکہ یہ لوگ توبہ کرلیں۔

☆☆☆☆☆

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَاۗءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۲۶)

﴿۱﴾

اور وہ جو قسمیں کھا بیٹھتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے کی چار مہینے کی مہلت ہے، پس اگر اس مدت میں پھر آئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿۲﴾

ان لوگوں کے لئے جو ایلاء کرلیں اپنی عورتوں سے انتظار ہے چار مہینوں کی۔ تو اگر رجوع کرلیں تو بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۲۷)

﴿۱﴾

اور اگر چھوڑ دینے کا ارادہ پکا کرلیں تو اللہ سنتا جانتا ہے۔

﴿۲﴾

اور اگر وہ پختہ ارادہ کرلیں طلاق کا تو بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

مختصر مطلب:

ان دونوں آیتوں میں مسئلہ ایلاء بیان کیا گیا ہے۔ ایلاء کا معنی ہے قسم اٹھانا۔ جب کوئی شخص قسم اٹھائے اور اپنی زوجہ کو کہے ''قسم ہے اللہ تعالی کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا، یعنی تمہارے ساتھ جماع نہیں کروں گا'' یا یہ کہے قسم ہے اللہ تعالی کی میں چار مہینے تم سے جماع نہیں کروں گا تمہارے قریب نہیں آؤں گا، اسے ایلاء کہتے ہیں۔

ایلاء کا حکم یہ ہے کہ اگر چار مہینے کے اندر زوجہ کے قریب چلا گیا تو قسم ٹوٹ گئی، قسم کا کفارہ ادا کرے، نکاح

اس کا برقرار رہے گا۔ اور اگر چار مہینے زوجہ کے قریب نہ گیا، مجامعت نہ کی، تو اس کی عورت کو طلاق بائن ہو جائے گی۔

اب دونوں آیتوں کا مفہوم واضح ہو گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی عورتوں سے ایلاء کر لے تو چار مہینے کی انتظار ہے، اگر اپنی عورتوں کی طرف رجوع کر لیا تو قسم ٹوٹ گئی، اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اور اگر چار مہینے کے اندر عورت کی طرف رجوع نہ کیا، بلکہ طلاق کا پکا ارادہ کر لیا، تو طلاق واقع ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ سننے، جاننے والا ہے۔

تنبیہ : اگر مطلقاً قسم اٹھائی کہ میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا، تو ہر چار مہینے کے اندر اندر جماع کرنا ہوگا۔ اور قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا، اگر چار مہینے کسی وقت بھی بغیر جماع کے گزر گئے تو طلاق بائن ہو جائے گی۔

شانِ نزول:

زمانہ جاہلیت میں لوگ زوجہ کی طرف جب میلان نہیں کرتے تھے، اور انہیں اپنی ازواج کی طرف شوق نہیں رہتا تھا اور وہ یہ بھی غیرت کرتے تھے کہ ہماری ازواج کسی اور شخص کے نکاح میں نہ جائیں تو وہ اپنی ازواج کو معلق رکھتے تھے کہ نہ وہ آزاد ہوں کہ اور ازواج سے نکاح کر لیں اور نہ ہی یہ خود اس کی طرف رغبت کرتے تھے۔ تو رب تعالیٰ نے طلاق اور عدت کے مسائل کو قرآن پاک میں اتنی تفصیل سے بیان کیا، جتنی تفصیل سے کسی اور مسئلہ کو نہیں بیان کیا۔ زیادہ مسائل یہاں ہی سورۃ بقرۃ میں ہیں اور کچھ مسائل سورۃ طلاق میں ہیں۔ (تفسیر ات احمدیہ)

”للذین یؤلون من نساء ھم تربص اربعة اشھر“:

ان لوگوں کے لئے جو اپنی عورتوں سے ایلاء کرتے ہیں چار مہینے انتظار کرنا ہے۔

"یؤلون" ایلاء سے لیا ہوا ہے۔ "آلی یولی ایلاء، تالی یتالی تألیا، ائتلی یأتلی ائتلاء" قسم اٹھانا۔ اگرچہ لغوی معنی کے لحاظ سے مطلقاً قسم اٹھانا ہے۔ تاہم اس کا استعمال ایسی قسموں کے لئے زیادہ ہے کہ جن چیزوں کے متعلق قسم اٹھائی گئی ان میں نقص پایا جائے۔

مفردات راغب میں قرآن پاک کی دوسری آیت سے اسی استعمال کو واضح کیا گیا ہے۔

"لا یألونکم خبالا، ای باطل" وہ تمہارے سامنے باطل قسمیں نہ اٹھائیں۔

"ولا یأتل اولوا الفضل منکم والسعة ان یؤتوا اولی القربیٰ والمساکین والمھاجرین فی سبیل اللہ"

تم میں سے فضل اور وسعت والے لوگ قسمیں نہ اٹھائیں کہ وہ قریبی رشتہ داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو مال نہیں دیں گے۔

یہاں بھی "یؤلون" عورتوں سے جماع نہ کرنے کے معنی میں قسم اٹھانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جو عورتوں پر ظلم کی وجہ سے اس میں قباحت اور نقص پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

دینی طلباء کرام کے ذوق کے لئے:

یہاں بظاہر یہ وہم پایا گیا ہے کہ "ایلاء"، تو "علی" سے متعدی ہوتا ہے یہاں "من" آیا ہوا ہے۔ اس کا استعمال کیسے صحیح ہے؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں قاعدۂ تضمین جاری ہوا ہے کہ یہ "بعد" کے معنی کو متضمن ہے، جس کے بعد "علی" آتا ہے، جس کا معنی یہ ہے "للذین یبعدون من نساء ھم مولین" ان لوگوں کے لئے جو اپنی عورتوں کو قسم اٹھا کر دور ہوتے ہیں چار مہینے انتظار کرنا ہے۔

البتہ ایک اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ ابوالبقاء نے یہ بیان کیا ہے کہ "ایلاء، علی" اور "من" دونوں سے ہی متعدی ہوتا رہتا ہے۔ (از روح المعانی)

"من نساء ھم" (اپنی عورتوں سے) یعنی ایلاء اپنی ازواج سے ہوتا ہے۔ جب زوجیت کا تعلق ختم ہو جائے تو ایلاء نہیں ہوگا۔ یعنی اگر کسی شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق بائن دے دی، پھر اسے کہا "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں چار مہینے تمہارے قریب نہیں آؤں گا" پھر اس دوبارہ نکاح کر لیا تو وطی کرنے سے کفارہ تو لازم آئے گا، کیونکہ قسم ٹوٹ گئی، لیکن چار مہینے اگر وطی نہ کی تو پھر طلاق بائن لازم نہیں آئے گی، اس لئے کہ وہ زوجہ جس کو طلاق بائن دے کر زوجیت کا تعلق اس سے ختم کر لیا، اس سے ایلاء نہیں ہوتا۔ (تفسیرات احمدیہ)

اگر اپنی عورت کو رجعی طلاق دے دی، پھر قسم اٹھائی کہ قسم اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا تو یہ ایلاء ہوگا، کیونکہ اس کی زوجیت قائم ہے۔ اگر چار مہینے کے اندر وطی کر لی تو رجوع ہو گیا اور قسم کا کفارہ ادا کر دے، اور اگر چار مہینے تک وطی نہ کی تو طلاق بائن ہو جائے گی، جو پہلی صریح طلاق سے ملحق ہو جائے گی۔ (تفسیرات احمدیہ)

جس عورت سے ظہار کر لیا کہ اسے اپنی محرمات میں سے کسی سے تشبیہ دے دی، پھر اس سے ایلاء کر لیا تو ایلاء ہو جائے گا، چار مہینے تک وطی نہ کی تو طلاق بائن ہو جائے گی۔ طلاق سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ظہار کا کفارہ ادا کرے، پھر وطی کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے۔ (تفسیرات احمدیہ)

اگر اجنبیہ عورت کو کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا، پھر اسی سے نکاح کر لیا، تو یہ ایلاء نہیں ہوگا کیونکہ وہ محل طلاق نہیں۔ لہٰذا نکاح کے بعد چار ماہ یا اس سے زائد عرصہ تک وطی نہ کرے، تو اسے طلاق بائن نہیں ہوگی۔ ہاں البتہ وطی کرنے پر قسم کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا، کیونکہ اس نے اپنی قسم کو توڑ دیا۔ (تفسیرات احمدیہ)

اگر اجنبیہ عورت کو کہا تو مجھ پر ایسے ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ ہے، تو یہ ظہار نہیں ہوگا باوجود اس کے کہ اس سے نکاح بھی کر لے، کیونکہ یہ الفاظ بولتے وقت وہ منکوحہ نہیں تھی۔ (تفسیرات احمدیہ)

"تربص اربعة اشهر": چار مہینوں تک انتظار کرنا ہے۔

تربص کا معنی ہے انتظار کرنا، تربص کی اضافت ظرف یعنی "اربعة اشهر" کی طرف کر کے واضح کر دیا کہ اس میں وسعت پائی گئی ہے کہ چار مہینے تک وطی نہ کرنے کی مہلت دی گئی ہے، لیکن اگر قسم اٹھا کر چار مہینے یوں ہی گذار دیئے تو عورت کو طلاق بائن ہو گی۔ (تفسیرات احمدیہ)

ایلاء کے الفاظ:

"واللہ لا اقربک" قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔

"واللہ لا اقربک اربعة اشهر" قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب چار مہینے نہیں آؤں گا۔

"وان اقربک فعلی حج او صدقة او صوم او فانت طالق او عبده حر"

اگر میں تمہارے قریب آؤں تو مجھ پر حج لازم ہو جائے اگر میں تمہارے قریب آؤں تو میرے اوپر صدقہ لازم ہو جائے۔ اگر میں تمہارے قریب آؤں تو مجھ پر اتنے روزے رکھنے لازم ہو جائیں، ان سب صورتوں میں ایلاء لازم ہو جائے گا۔

اور اگر یہ کہے میں تمہارے قریب آؤں تو تمہیں طلاق ہو، یہ بھی ایلاء ہے۔ لیکن اس میں عجیب صورت لازم آئے گی، اگر چار مہینے کے اندر جماع کر لیا تو طلاق رجعی واقع ہو جائے گی اور اگر چار مہینے تک وطی نہ کی، تو طلاق بائن ہو جائے گی۔ (تفسیرات احمدیہ)

تنبیہ: ایلاء کے لئے صریح لفظ قریب ذکر کیا جائے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔ یا میں تمہارے ساتھ جماع نہیں کروں گا، وطی نہیں کروں گا۔

اگر اس نے قسم اٹھا دی، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں فلاں شہر میں نہیں جاؤں گا، اس شہر میں اس کی زوجہ بھی ہے تو یہ ایلاء نہیں، کیونکہ اس کی زوجہ وہاں سے نکل کر دوسرے شہر میں بھی منتقل ہو سکتی ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

لفظ حرام کا حکم:

"وکذا قوله انت علی حرام ان نوی به الطلاق فبائنة وان نوی به الظهار او الثلاث او الکذب فمانوی وان نوی به التحریم اولم ینو شیا فایلاء" (تفسیرات احمدیہ)

اگر اپنی زوجہ سے کہے تو مجھ پر حرام ہے تو ان الفاظ سے اگر اس نے نیت طلاق کی تو طلاق بائن واقع ہوگی، اگر ظہار کی نیت کی تو ظہار ہوگا۔ اگر تین طلاقوں کی نیت کی تو تین طلاقیں واقع ہوں گی، اگر نیت جھوٹ کی ہو یعنی ویسے ہی ڈرانے کے لئے یہ لفظ استعمال کئے تو کوئی طلاق وغیرہ واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر ان الفاظ سے نیت بھی حرام ہونے کی کی یا کوئی نیت نہیں تو یہ ایلاء ہوگا۔

(تفسیرات احمدیہ)

مسئلہ: جس شخص کی طلاق واقع ہو جاتی ہو، اس کا ایلاء بھی ثابت ہو جائے گا۔ لہٰذا حر ہو یا عبد ہو (آزاد ہو یا غلام) یا نشے میں ان کی طلاق واقع ہو جاتی ہے، ان سے ایلاء بھی واقع ہو جائے گا۔ (قرطبی)

نوٹ: تمام فقہاء کرام نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ سکران (نشے والے) کی طلاق نشے کے حال میں دی ہوئی واقع ہو جائے گی۔

مسئلہ: غصہ کی حالت میں طلاق دے یا خوشی کی حالت میں، ہر حال میں طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہر حال میں ایلاء بھی لازم آ جائے گا۔ (ماخوذ از قرطبی)

"فان فاء وافان اللّٰہ غفور رحیم":

تو اگر وہ رجوع کر لیں تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یعنی اگر وہ اپنی قسم سے پھر جائیں، عورت سے وطی کر لیں تو ان کی عورت کو طلاق نہیں ہوگی، قسم اٹھا کر جو عورت کو پریشان کیا تھا اور قسم توڑ کر اللہ تعالیٰ کے نام کی عزت کا پاس نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

"وان عزمواالطلاق فان اللّٰہ سمیع علیم":

اور اگر تم نے پختہ ارادہ طلاق کا کر لیا تو بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔

یعنی اگر قسم اٹھانے والے شخص نے پختہ ارادہ کر لیا کہ قسم پر قائم رہنا ہے، مجامعت نہیں کرنی تو اللہ تعالیٰ اس کے اس قول کو سننے والا ہے "صار منهم طلاقا بائنا بمضی المدة" مدت گزرنے پر یعنی چار مہینے گزرنے پر طلاق بائن واقع ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، یعنی ان کے ایلاء کی جو غرض بھی ہوگی، رب تعالیٰ اسے جانتا ہے، اس کی جزاء ان کو نیت کے مطابق ہوگی۔ (از روح المعانی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

ایلاء سے رجوع پر مغفرت اور رحمت کو معلق کیا اور عزم طلاق پر سمع اور علم کو تا کہ اہلِ علم کا امتحان لیا جا سکے کہ وہ کتنا سمجھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مفسرین کرام کو خیر کثیر عطا فرمائے کہ انہوں نے وضاحت فرمائی ہے، خصوصا احناف نے کہ ایلاء کرنے والے جب دوران مدت وطی کرلیں اور قسم کے توڑنے کا کفارہ ادا کردیں (کیونکہ کفارہ کا تعلق تو قسم توڑنے اور اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم میں فرق آنے سے ہے) تو ان پر کوئی گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمانے والا مہربان ہے کہ اس نیکی پر ان کو ثواب عطا فرمائے گا۔

اور اگر انہوں نے قسم کو نہ توڑنے اور رجوع نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا جو حقیقت میں طلاق کا ہی عزم ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے اقوال کو سننے والا ہے، جو وہ اپنے آپ سے بات کررہے ہیں یا اپنے اقرباء وغیرہ سے کہ میں رجوع نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ ان کی نیات کو جاننے والا ہے کہ وہ کیا ارادہ رکھتے ہیں، ضمناً ان کو دھمکی بھی دے دی گئی کہ اگر وہ رجوع نہیں کرتے اور عورت پر ظلم کا ارادہ ہی کرتے ہیں تو جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ارادوں کو بھی جانتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی حاصل کررہے ہیں۔ (تفسیرات احمدیہ)

اگر وطی کرنا ممکن نہ ہو تو پھر کیا کرے؟

اگر ایک شخص نے قسم اٹھا دی کہ وہ اپنی زوجہ کے قریب نہیں جائے گا، اس سے جماع نہیں کرے گا، اب وہ رجوع کرنا چاہتا ہے لیکن کسی مجبوری سے وہ ابھی وطی نہیں کرسکتا کہ وہ خود ایسا مریض ہے کہ وطی پر قادر نہیں، اس کی زوجہ اس حال میں ہے کہ اس سے وطی نہیں کی جاسکتی، تو وہ رجوع کرنے کے لئے صرف زبان سے کہہ دے کہ میں اپنی قسم کو توڑ کر رجوع کررہا ہوں، تو اب طلاق بائن واقع نہیں ہوگی۔ البتہ جب وطی پر قادر ہوگا تو وطی کرنا لازم ہوگا۔

(ماخوز از تفسیرات احمدیہ)

ایلاء سے متعلق چند احادیث:

"اخرج عبد الرزاق فی مصنفه والبیهقی فی سننه من طرق عن ابن عباس قال الفئی جماع" (درمنثور)

مصنف عبد الرزاق اور بیہقی میں متعدد طرق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایلاء سے رجوع جماع ہے، یعنی چار مہینے کے اندر جماع کرے۔

☆ "واخرج عبدالرزاق فی المصنف وعبد بن حمید عن الحسن قال الفئی الجماع فان کان له عذر من مرض اوسجن اجزأ ه ان یفئی بلسانه " (درمنثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایلاء سے رجوع جماع سے ہوگا، ہاں البتہ اگر اسے کوئی عذر لاحق ہو یعنی مرض یا قید میں ہونے کی وجہ سے جماع نہ کیا جاسکے تو زبان سے رجوع کر لینا کافی ہے۔

☆ " واخرج ابن ابی حاتم عن ابن مسعود قال اذا حال بینه وبینها مرض اوسفر اوحبس اوشئی یعذربه فاشهاده فئی" (درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب مرد یا عورت سے کوئی مریض ہو جائے، یا مرد اور عورت کے درمیان کوئی سفر حائل ہو، یا کوئی ایک قید میں ہو، کسی قسم کا کوئی عذر ہو جو وطی سے مانع ہو تو زبان سے رجوع کر لے لیکن رجوع پر گواہ بنا لے تا کہ کسی قسم کا نزاع نہ ہو۔

چار ماہ میں زوجہ سے ایک مرتبہ وطی کرنا:

" اخرج مالک عن عبد الله بن دینار قال خرج عمر بن الخطاب من اللیل یسمع امرأة تقول

تطاول هذا اللیل واسود جانبه	وارقنی ان لا خلیل الاعبه
فو الله لولا الله انی اراقبه	لحرک من هذا السریر جوانبه

فسأل عمر ابنته حفصة کم اکثر ما تصیر المرأة عن زوجها فقالت ستة اشهر او اربعة اشهر فقال عمر لااحبس احدامن الجیوش اکثر من ذلک " (درمنثور)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک رات کو گشت کر رہے تھے، ایک عورت کی آواز سنی، جو یہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

یہ رات لمبی ہوگئی اور اس کی طرفیں تاریک ہوگئیں، میرے دوست (زوج) کا نہ ہونا مجھے بیدار کئے

ہوئے ہے کہ میں اس سے خواہشات کو پورا کرتی، اس سے کھیلتی۔

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر مجھے اللہ کا خوف نہ ہوتا تو میری چارپائی اپنی اطراف سے حرکت کر رہی ہوتی۔ (یعنی میں کسی شخص کو اپنے آپ پر قادر کر لیتی جس کے جماع سے چارپائی حرکت کر رہی ہوتی)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیٹی (ام المؤمنین) حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ ایک عورت اپنے خاوند کے بغیر کتنا عرصہ صبر کر سکتی ہے؟ انہوں نے کہا چار ماہ یا چھ ماہ۔ آپ نے فرمایا کہ میں آئندہ کسی شخص کو چار ماہ سے زائد کسی لشکر میں روکنے کا حکم نہیں دوں گا۔

اسی واقعہ کی تفصیل میں سائب بن جبیر کی روایت میں یہ مذکور ہے کے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عورت سے پتہ کرایا کہ اس کی بے قراری کی وجہ کیا تھی؟

"وقالت لهاني عمربن الخطاب وحشتي في بيتي وغيبة زوجه علي وقله نفقتي"

تو اس عورت نے بتایا کہ میری بے قراری کی وجہ یہ ہے کہ مجھے گھر میں اکیلے رہتے ہوئے وحشت ہو رہی ہے، میرا خاوند مجھ سے غائب ہے، یعنی ایک لشکر میں ہے جو بہت دیر سے واپس نہیں آیا، اور میرے پاس خرچ بھی کم ہے۔

"فلما اصبح بعث اليها بنققة وكسوة وكتب الى عامله يسرح اليها زوجها"

صبح ہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عورت کے پاس خرچ کے لئے مال اور کپڑے بھیج دیئے اور اپنے عامل کی طرف خط لکھا کہ اس عورت کے خاوند فلاں شخص کو واپس بھیج دے۔ (در منثور)

☆ زبیر بن بکار نے محمد بن معن سے روایت کی کہ ایک عورت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آکر عرض کرنے لگی،

"یاامیر المؤمنين ان زوجي يصوم النهار ويقوم الليل وانا اكره ان اشكوه اليک وهو يقوم بطاعة الله"

اے امیر المؤمنین بیشک میرا خاوند دن کو روزہ اور رات کو قیام کرتا ہے، یعنی نوافل پڑھتا ہے، اور میں ناپسند سمجھتی ہوں کہ اس کی شکایت آپ تک پہنچاؤں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔

" فقال لها جزاک الله خیرا من مثنیة علی زوجها "

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے خاوند کی تعریف کرنے پر جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس عورت نے اپنے خاوند کے متعلق کہے ہوئے الفاظ کئی مرتبہ کہے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک ہی جواب کئی مرتبہ دیا۔(ممکن ہے کہ آپ نے توجہ نہ کی ہو کہ عورت کیا کہنا چاہتی ہے۔ممکن ہے کہ آپ یہ چاہتے ہوں کے یہ صراحۃ خاوند کے متعلق کچھ ذکر کرے تو اس کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جائے، کنایہ کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ممکن ہے آپ دیکھنا چاہتے ہوں کہ حاضرین میں سے بھی کوئی اس کی بات کو سمجھتا ہے یا نہیں)

وہاں حضرت کعب بن سوار اسدی بھی موجود تھے، آپ نے عرض کیا اے امیر المؤمنین اس عورت اور اس کے خاوند کے معاملہ میں کوئی فیصلہ فرما دیں۔آپ نے فرمایا یہ عورت جو بیان کر رہی ہے کیا اس میں کسی فیصلہ کی بھی ضرورت ہے؟

" فقال انها تشکو مباعدة زوجها لها عن فراشها و تطلب حقها "

انہوں نے کہا یہ اپنے خاوند کے جماع نہ کرنے اس کے بستر سے دور رہنے کی شکایت کر رہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو کہا جب تم نے اس عورت کے کلام کا مطلب سمجھ ہی لیا تو تم ہی ان دونوں کے درمیان فیصلہ کر دو، کعب نے اس عورت کے خاوند کو طلب کیا اور کہا کہ تمہاری زوجہ تمہاری شکایت کر رہی ہے، اس شخص نے کیا میں اسے خرچ کم دیتا ہوں؟ کعب نے کہا نہیں۔اس عورت نے کہا۔

یاایهاالقاضی الحکیم یر شده	الهی خلیل عن فراشی مسجده
نهاره و لیله ما یر قده	فلست فی حکم النساء احمده
زهده فی مضجعی تعبده	فاقض القضاء یا کعب لا تر دده

اے دانا قاضی اس کی راہنمائی کرنے والے۔میرے خاوند کے تجدے میرے بستر سے اسے دور رکھتے ہیں۔

دن رات اس کا علیحدہ ہو کر سونا کام ہے۔ میں بحیثیت زوجہ کے اس کی تعریف نہیں کر سکتی۔
اس کا عبادت کرنا میرے بستر سے اسے دور رکھتا ہے۔ اے کعب فیصلہ فرمادیں کوئی تردد نہ کریں۔
اس کے خاوند نے کہا۔

زهدنی فی فرشها وفی الحجل	انی امرؤ ازهد فیما قدنزل
فی سورة النحل وفی السبع الطوال	وفی کتاب الله تخویف جلل

میں اس کے بستر اور اس کے پاس لیٹنے والی پالکی سے دور رہتا ہوں۔ کیونکہ میں نیک انسان ہوں اور رب کا حکم نازل ہے سورۃ نحل میں اور سبع طوال میں۔ اور اللہ کی کتاب میں اللہ کا خوف دلایا گیا ہے۔
حضرت کعب نے کہا۔

ان خیر القاضین من عدل	و قضی بالحق جهراو فصل
ان لهاحقاعلیک یا رجل	تصیبها فی اربع لمن عقل
قضیة من ربها عزوجل	فاعطهاذاک ودع عنک العلل

قاضیوں میں بہتر قاضی کا انصاف کا فیصلہ یہ ہے۔ جو فیصلہ حق ہے اور ظاہر اور تفصیلی طور پر کر دیا گیا ہے۔
کہ بے شک اس زوجہ کا تم پر حق ہے اے مرد۔ تم چار مہینے میں اس کے پاس پہنچو (جماع کرو) اگر تمہیں عقل ہے۔
یہ فیصلہ رب تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اس عورت کا حق پورا کرو اس میں کوئی حجت بازی نہ کرو۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ وَّلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ☆ (سورة البقرة آیت نمبر ۲۲۸)

﴿۱﴾

اور طلاق والیاں اپنی جانوں کو روکے رہیں تین حیض تک، اور انہیں حلال نہیں کہ چھپائیں وہ جو اللہ نے ان کے پیٹ میں پیدا کیا اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتی ہیں، اور ان کے شوہروں کو اس مدت کے اندر ان کے پھیر لینے کا حق پہنچتا ہے اگر ملاپ چاہیں۔ اور عورتوں کا بھی حق ایسا ہی ہے جیسا ان پر ہے شرع کے موافق، اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

﴿۲﴾

اور جن کو طلاق دی گئی وہ روک کر رکھیں اپنے آپ کو تین حیض (تک) اور نہیں حلال ان کے لئے کہ وہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کی بچہ دانیوں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور دن آخرت پر، اور خاوند ان کے زیادہ حق رکھتے ہیں ان کے لوٹانے کا اس میں اگر وہ ارادہ رکھیں اصلاح کا، اور ان (عورتوں) کا حق ہے مثل اس کے جو ان پر حق ہے شرع کے موافق، اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

جب اس سے پہلے ایلاء کا ذکر کیا گیا اور ایلا چار مہینے کے اندر وطی نہ کرنے کی وجہ سے طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے تو اب اس آیۃ کریمہ میں طلاق کے بعد کا حکم بیان کیا جا رہا ہے۔یعنی عدت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ (قرطبی)

مختصر مطلب:

جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی وہ اپنے آپ کو تین حیض تک روک کر رکھیں،یعنی ان کی عدت تین حیض ہے، اور اگر ان کا اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان ہو تو وہ اپنی رحموں (بچہ دانیوں) میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو نہ چھپائیں۔ یعنی اگر وہ حاملہ ہوں تو اللہ تعالیٰ اور آخرت کا خوف کرتے ہوئے بتادیں کہ وہ حاملہ ہیں، کیونکہ حمل کی صورت میں ان کی عدت بچے کی پیدائش ہے،ایسا نہ ہو کہ عدت ختم ہونے سے پہلے ہی اور کسی سے نکاح کر لیں، وہ نکاح نہیں ہوگا۔ اور اگر ان کو رجعی طلاق دی گئی ہو تو ان کے خاوندان سے رجوع کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں،ہاں اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو۔یعنی اچھی طرح شرع کے مطابق ان کو بسانا چاہیں،ان کی عدت لمبی کرنے کا اردہ نہ ہو ان پر پھر سے مظالم ڈھانے کا ارادہ نہ ہو تو وہ رجوع کرنے کو زیادہ حق رکھتے ہیں۔

عورتوں کے حقوق مردوں پر شریعت کے موافق ایسے ہی ہیں جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں۔اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔اور اللہ غالب ہے اور اللہ حکمت والا ہے۔

قدرے تفصیل:

"والمطلقات" جمع ہے "المطلقة" کی۔مطلقہ اس عورت کو کہا جاتا ہے جسے طلاق دی گئی،طلاق کے لئے ملک یا نسبت ملک ضروری ہے۔اگر اجنبیہ عورت کو یہ کہے تجھے طلاق ہے تو یہ الفاظ اس کے ضائع چلے جائیں گے، کیونکہ وہ اس کی منکوحہ بھی نہیں اور ملک کی طرف طلاق کی نسبت بھی نہیں۔

اگر اجنبیہ کو طلاق دیتے وقت یہ کہے کہ جب میں تمہارے ساتھ نکاح کروں تو تجھے طلاق، اس صورت میں جب نکاح کرے گا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

اگر منکوحہ کو طلاق دے تو پھر دیکھا جائے کہ اس سے نکاح کے بعد وطی کی تھی یا خلوت صحیحہ پائی گئی یا نہیں، اگر وہ عورت غیر مدخول بہا (یعنی اس سے وطی نہیں کی گئی) ہے اور اس سے خلوت صحیحہ بھی نہیں پائی گئی تو اس کی کوئی عدت نہیں، طلاق کے بعد بغیر عدت کے اس کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا۔

'' یا ایھالذین امنوا اذا نکحتم المومنات ثم طلقتموھن من قبل ان تمسو ھن فمالکم علیھن من عدۃ تعتدو نھا '' (سورۃ الاحزاب)

اے ایمان والو! جب تم ایمان والی عورتوں سے نکاح کرلو پھر ان کو مس کرنے (وطی، خلوت صحیحہ) سے پہلے طلاق دے دو تو ان پر تمہارے لئے عدت گزارنا لازم نہیں۔

اگر منکوحہ سے وطی کر لی تھی، یا خلوتِ صحیحہ پائی گئی تھی، تو اب دیکھا جائے گا وہ حاملہ ہے یا نہیں۔ اگر حاملہ ہو تو اس کی عدت وضعِ حمل یعنی بچے کی پیدائش ہے، اس مسئلہ کو اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔

''واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن'' اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔ (الطلاق)

اگر حاملہ نہیں تو پھر دیکھا جائے کہ ان کو حیض آتا ہے یا نہیں۔ اگر حیض نہیں آتا بچپن کی وجہ سے یا بڑھاپے کی وجہ سے یا کسی بیماری کی وجہ سے حیض مکمل بند ہو گیا، تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اس مسئلہ کو اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

''واللا ئی ینئسن من المحیض من نساء کم ان ارتبتم فعدتھن ثلاثہ اشھر'' (الطلاق)

اور تمہاری عورتیں جو حیض سے ناامید ہو جائیں اگر تمہیں کچھ شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔

اگر ان کو حیض آنا ممکن ہو تو پھر دیکھا جائے وہ لونڈی ہے یا حرہ (آزاد عورت) ہے۔ اگر لونڈی ہو تو اس کی عدت دو حیض ہے، جو اجماع امت سے ثابت ہے، اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے ثابت ہے۔

"طلاق الامۃتطلتقیان وعدتھاحیضتان"لونڈی کی (مغلظہ) طلاقیں دو ہیں اوراس کی عدت دوحیض ہے۔

جس عورت کوحیض آتا ہےاور وہ منکوحہ ہےاس سے وطی یا خلوت صحیحہ ہوچکی ہے،اس کی عدت کا ذکراس زیر بحث آیۃ کریمہ میں موجود ہے کہ اس کی عدت طلاق کے بعد تین حیض ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباءکرام کے لئے:

جس عورت کاخاوندفوت ہوجائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے،جس کا ذکران شاءاللہ قریب ہی آرہا ہے۔

سوال: لفظ"مطلقات"جمع ہے جوعموم پردلالت کررہا ہے۔قانون یہ ہے کہ عام سے کم چیزوں کی تخصیص کی جاتی ہے،یہاں تو"مطلقات"میں ایک قسم داخل ہے،اور مطلقات کی پانچ قسموں کواس لفظ عام سے خارج کردیا گیا ہے،یہ کیسے صحیح ہے؟

جواب: اجنبیہ تولفظ"مطلقات" میں داخل ہی نہیں کیونکہ اسے "مطلقۃ"نہیں کہا جاتا،لہٰذا نہ لفظ"مطلقات"اسے شامل ہے،اورنہ ہی اسے عام سے نکالا گیا ہے۔

غیر مدخول بہا(جس سے وطی اورخلوت صحیحہ نہیں پائی گئی)قرینہ سے خارج ہے،کیونکہ عدت کا اصل مقصد رحم کا بری ہونے کا پتہ چلانا ہے،اس کے لئے شریعت نے حدودعدت مقرر کردی ہیں۔رحم کی برأت کی ضرورت اس وقت درپیش آتی ہے جب پہلے مجامعت پائی جائے یا خلوت صحیحہ پائی جائے جومجامعت کے شرعاً قائم مقام ہے،جب یہ صورت نہیں تو وہ خودبخود اس حکم سے خارج ہے۔

حاملہ عورت اورحیض سے ناامید لفظ"قروء" سے خارج ہیں،کیونکہ حیض سے عدت وہاں ہوتی جہاں حیض ہواور جہاں حیض ہی نہ ہو وہاں حیض سے عدت گذارنا متصور ہی نہیں۔

لونڈی سے چونکہ بہت کم ہی نکاح کیا جاتا ہے،کیونکہ وہ مالک کی خدمت گذاری میں رہتی ہے،اس لئے نوادرات وشواذ ویسے ہی خارج ہوتے ہیں۔

" فثبت ان الاعم الاغلب با ق تحت هذا العموم "

تو ثابت ہوا کہ لفظ "مطلقات" کا عموم غالب طور پر باقی ہے۔ (کبیر)

راقم کہتا ہے "والمطلقات" الف لام عہد خارجی ہے، جو معہود یعنی حیض والی مطلقات کے غیر کو شامل ہی نہیں۔ البتہ لفظ جمع کی وجہ سے جن پر اطلاق ہے ان کے تمام افراد کو شامل ہے۔

تنبیہ:

اعلیٰ حضرت نے "یتربصن" کا ترجمہ کیا ہے "روک کر رکھیں" راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے، یہ ترجمہ تو امر کا ہے، مضارع کا ترجمہ امر والا کرنا کیسے صحیح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔

"قوله" یتر بصن" لا شک انه خبر والمراد منه الامر"

کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں اگر چہ "یتصربصن" مضارع کا صیغہ ہے جو خبر پر دلالت کرتا ہے لیکن معنی امر کا ہے جو انشاء ہے۔ (از کبیر)

سوال: جب معنی امر کا ہے تو امر کے معنی کو خبر سے تعبیر کرنے کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: امر میں کسی کام کو اپنے اختیار اور قصد سے کیا جاتا ہے۔ لیکن خبر میں قصد واختیار کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یہاں امر والا معنی لینے کے لئے مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے کہ ایک مسئلہ واضح کر دیا جائے وہ یہ کہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے یا اس نے طلاق دے دی، عورت کو پتہ نہیں چل سکا، پتہ اس وقت چلا جب عدت گذر چکی ہے تو وہ دوسری جگہ اس وقت نکاح کر سکتی ہے، اسے قصد واختیار سے عدت گذارنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا جواب: زمخشری نے کشاف میں یہ جواب ذکر کیا ہے کہ امر کو خبر کے صیغہ سے ذکر کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ظاہر کرنا یہ مقصود ہوتا ہے کہ اس امر پر جلدی سے عمل کر دیا گیا۔ یہاں بھی یہ بتانا مقصود ہے۔

"فکأنھن امتثلن الأمر بالتربص فھو یخبر عنه موجودا "

گویا کہ ان عورتوں نے رب تعالیٰ کے حکم کو جلدی ہی قبول کر لیا ہے اور ان کا انتظار کرنا موجود ہو چکا ہے۔

اس کی اور مثال دعائیہ کلمات میں دیکھی جائے جیسا کہ کہا جاتا ہے "رحمنا اللہ" معنی اس کا یہ ہے "اے اللہ ہم پر رحم کر" لیکن صیغہ ماضی کا ذکر کیا گیا، کیونکہ دعا کی قبولیت پر کامل وثوق کیا گیا ہے۔

"کانھا وجدت الرحمة فھو یخبر عنھا" گویا کہ رحمت پائی گئی ہے اور اس کی خبر دی جارہی ہے۔ (کبیر)

سوال: "یتربصن" کے بعد "بانفسھن" کے ذکر کا کیا فائدہ ہے، صرف "یتربصن" پر اکتفاء کیوں نہیں کیا۔

جواب: عورتوں کو عدت گذارنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے کہ وہ یہ تصور کرتے ہوئے کہ نبی کریم ﷺ کے واسطہ سے ہمیں یہ حکم براہ راست دیا گیا ہے، ہم پر کسی اور کو یہ حکم چلانے کے لئے مسلط نہیں کیا گیا تو اس طرح وہ خوشی سے حکم تسلیم کریں گی۔

دینی طلباء کرام کے ذوق کے لئے:

سوال: لفظ انفس جمع قلت ہے حالانکہ نفوس کثیر ہیں، یہاں جمع کثرت کا صیغہ ہونا چاہیے تھا۔ اور "قروء" جمع کثرت ہے، حالانکہ حیض تین مراد ہیں، یہاں جمع قلت کا صیغہ استعمال ہونا چاہیے تھا، عقل کے خلاف دونوں صیغوں کا استعمال کس حکمت کی وجہ سے ہے؟

جواب: نحوی ضابطہ یہ بھی ہے کہ جمع قلت اور کثرت ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتی رہتی ہیں۔

سوال: قروء کا معنی جب حیض ہے تو حیض مؤنث سماعی ہے، اس کے لئے تو "ثلاث" استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "ثلاث حیض" تو "ثلاثہ قروء" کیوں کہا گیا۔

جواب: "لانہ اتبع تذکیر اللفظ ولفظ القروء مذکر" یہ اس لئے کہ لفظ "قروء" مذکر ہے اگرچہ اس کا معنی حیض ہے جو مونث سماعی ہے لیکن یہاں لفظ کا اعتبار کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

ثلاثہ قروء : تین حیض۔

"قروء" لغوی معنی کے لحاظ پر مشترک ہے۔ حیض پر بولا جاتا ہے اور طہر (پاکیزگی) پر بھی۔

لیکن شرع میں غالب طور پر استعمال اس کا حیض پر ہی ہے، یہاں بھی مراد حیض ہے، یعنی عدت تین حیض ہے، " قروء" کا معنی حیض لیا جائے، کیونکہ اس پر چند وجوہ سے دلائل پائے جاتے ہیں۔

(۱) "روی عن النبی ﷺ انه قال" دعی الصلوة ایام اقراء ک "

نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کے مسئلہ پوچھنے پر ارشاد فرمایا تم نماز چھوڑ دو اپنے حیض کے دنوں میں۔

اتنا مسئلہ واضح ہے کہ نماز حیض کے دنوں میں چھوڑی جاتی ہے، پاکیزگی کے دنوں میں نہیں، جب حدیث شریف میں "اقراء" (جو جمع ہے قرء کی) کا معنی حیض ہے۔تو اس آیۃ کریمہ میں بھی "قروء" کا معنی حیض ہی لیا جائے گا۔

(۲) "ثلاثة" لفظ خاص ہے۔جس کا معنی ہے "تین" قرآن پاک میں استعمال ہونے والا لفظ خاص خبر واحد یا قیاس سے تبدیل نہیں ہوسکتا۔ثلاثہ کی تخصیص اسی وقت تک برقرار رہے گی جب معنی حیض لیا جائے، کیونکہ طلاق طہر میں دینی چاہئے، اس کے بعد عدت تین حیض مکمل ہو جائے گی۔ اگر عدت تین طہر ہو تو تین مکمل نہیں ہوتے، بلکہ یا تو بڑھ جائیں گے یا کم رہیں گے، کیونکہ جس طہر میں طلاق دی گئی اگر وہ بھی شمار کیا جائے تو تین طہر مکمل نہیں ہو سکتے، اگر اس کے بغیر تین اور مراد لئے جائیں تو تین سے بڑھ جائیں گے۔

(۳) تین مہینے ان عورتوں کی عدت ہے جن کو حیض نہیں آتا، جب حیض نہ آنے کی صورت میں اس کا بدل تین مہینے مقرر کیا گیا، تو یقیناً اصل عدت حیض ہی ہوں گے۔

(۴) نبی کریم ﷺ نے فرمایا "طلاق الامة تطليقان وعدتها حيضتان" لونڈی کی طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے۔ جب لونڈی کی عدت دو حیض ہے تو یقیناً حرہ کی عدت تین حیض ہیں۔

(۵) عدت میں اصلی غرض رحم کی براءت (بچہ دانی کا حمل سے پاک ہونا) معلوم کرنا ہے، وہ حیض سے ہی معلوم ہوسکتی ہے، طہر سے نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

"ولا يحل لهن ان يكتمن ما خلق الله فى ارحامهن":

اور نہیں حلال ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کی بچہ دانیوں میں۔

عدت کا ختم ہونا تین حیض کے ختم ہونے پر موقوف ہے، اور حاملہ عورت کی عدت وضعِ حمل سے مکمل ہوتی ہے، اس پر مرد کا مطلع ہونا آسان نہیں، اس لئے عورت کو اس پر امینہ بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے حمل کو نہ چھپائے، ایسا نہ ہو کہ عدت ختم ہونے کا دعوی کرے اور واقع میں اس کی عدت ختم نہ ہوئی ہو تو حرام کی مرتکب ہو۔

"ان کن یؤمن باللہ والیوم الآخر":

اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔

حمل کو چھپانے سے نہی ایمان پر موقوف نہیں۔ بلکہ جس طرح کسی کو کہا جائے "ان کنت مؤمنا فلا تظلم" اگر تو مومن ہے تو ظلم نہ کر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تو ایمان والا ہے تو ایمان تجھے ظلم سے روکے۔ اسی طرح اس آیۃ کریمہ میں عورتوں کے لئے وعید شدید ہے کہ اے عورتو! جب تم ایمان والی ہو تو تمہارا ایمان تمہیں اس سے روکے کہ تم اپنی رحموں (بچہ دانیوں) میں اللہ تعالی کی مخلوق کو چھپاؤ۔

"وبعولتھن احق بردھن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا":

اور خاوند ان کے زیادہ حق رکھتے ہیں ان کی طرف رجوع کرنے کا اس میں اگر وہ ارادہ کریں اصلاح کا۔

طلاق کا پہلا حکم بیان کیا عدت گذارنے کا، یہ دوسرا حکم بیان کیا جا رہا ہے رجوع کرنے کا۔

"وبعولتھن": "بعولۃ" میں دو قول ہیں۔

ایک یہ ہے کہ یہ لفظ جمع ہے "بعل" کی، جیسے فحولۃ، ذکورۃ، جدودۃ، عمومۃ وغیرہ جمع ہیں۔ اور تاء، جو وقفی حالت میں ھاء بن جاتی ہے، یہ زائد ہے اور جمع کی تاکید کے لئے ہے۔ یہ تاء، ہر جمع میں نہیں لائی جاسکتی، بلکہ وہاں ہی آئے گی جہاں عرب حضرات نے اسے استعمال کیا ہوگا۔ اسی لئے "کعب" کی جمع "کعوبۃ" اور "کلب" کی "کلابۃ" نہیں آئے گی۔

"بعل" کا لفظ مشترک ہے جس طرح "زوج" کا لفظ مشترک ہے۔ مذکر اور مونث دونوں پر یہ دونوں لفظ

بولے جاتے ہیں۔ "بعل" کا معنی سرداراور مالک بھی آتا ہے۔ جس طرح کہا جاتا "من بعل هذه الناقة" اونٹنی کا مالک کون ہے۔ اور "بعل" کا اطلاق بتوں پر بھی کیا گیا، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد گرامی ہے؟ "اتدعون بعلا" کیا تم بت کی پوجا کرتے ہو۔

دوسرا قول "بعولة" مصدر ہے، کہا جاتا ہے "بعل الرجل بعولة" جس کا معنی ہے جماع کرنا۔

جیسا کہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ایام تشریق (گیارہ بارہ، تیرہ ذی الحج) کے متعلق یہ ہے۔ "انها ایام اکل وشرب وبعال" بے شک یہ دن کھانے اور پینے اور جماع کرنے کے ہیں (یعنی ان دنوں میں روزہ نہ رکھا جائے)

"وامرأة حسنة البعل اذا كانت تحسن عشرة زوجها" جب عورت اپنے خاوند سے اچھی معاشرت رکھے تو اس سے جماع کرنا بھی اچھا لگتا ہے، یعنی وہ اپنے آپ کو اچھی طرح جماع کے لئے پیش کرتی ہے۔

اور حدیث شریف میں ہے "اذااحسنتن يبعل ازواجكن" (اے عورتو) جب تم اپنے آپ کو حسین بنا کر رکھو گی تو تمہارے خاوند تم سے جماع کریں گے۔

اس قول کے مطابق آیۃ کریمہ کا ترجمہ ہوگا۔ "وبعولتهن احق بردهن" ان سے جماع کرنے والے (ان کے خاوند) ان کی طرف رجوع کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔

"فی ذلک": میں "ذلک" کا اشارہ "تربص" کی طرف ہے۔ اب معنی یہ ہوگیا۔ "احق برجعتهن فی مدة ذلک التربص" ان کے خاوند ان سے رجوع کرنے کا حق رکھتے ہیں، اس مدت انتظار میں، یعنی عدت کے دنوں میں۔

"ردیرد، ردا" کا معنی پھیرنا، لوٹانا، رجوع کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے "رددتها ای رجعتها" میں نے اس کی طرف رجوع کیا۔

"ان حق الرد انما يثبت في الوقت الذى هو وقت التربص فاذا انقضى ذلك الوقت فقد بطل حق الرد والرجعة"

رجوع کرنے کا حق اسی وقت تک رہے گا جب عدت قائم رہے گی، جب عدت ختم ہو جائے گی تو خود بخود رجوع کا حق بھی ختم ہو جائے گا۔

"ان ارادوا اصلاحا": اگر وہ ارادہ رکھتے ہوں اصلاح کا۔

یعنی ان عورتوں کے خاوند رجعی طلاق کے بعد رجوع کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں، اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں، ان کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ رکھیں۔ جس طرح عنقریب "ولاتمسکوھن ضرارا لتعتدوا" میں واضح طور پر ذکر آ جائے گا۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ طلاق کے بعد رجوع کر لیتے تھے، پھر طلاق دے دیتے تھے، اس طرح عورت کی عدت لمبی ہو جاتی تھی، اس ظالمانہ طریقہ سے منع کیا گیا اور کہا گیا کہ اصلاح کی غرض سے رجوع کرنا چاہیں تو کریں۔

اعتراض: "ان ارادوا" میں "ان" حرف شرط ہے۔ قانون یہ ہے کہ شرط کے نہ پائے جانے سے حکم نہیں پایا جاتا، اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ اصلاح کا ارادہ نہ ہو تو رجوع ہی ثابت نہ ہو، حالانکہ رجوع تو ہر حالت میں ثابت ہو جاتا ہے۔

جواب: ارادہ دل کا فعل ہے، دوسرا کوئی اس پر مطلع نہیں ہو سکتا، اس لئے رجوع کی داد و مدار ظاہری الفاظ یا فعل پر ہے۔ البتہ اگر کسی شخص نے نقصان پہنچانے کے لئے رجوع کیا تو وہ گنہگار ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

"ولھن مثل الذی علیھن": اور ان عورتوں کے لئے مثل اسی کے ہے جو ان پر ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

اس مقام میں "صنعۃ احتباک" پائی گئی ہے، وہ یہ کہ اول کو حذف کر دیں، دوسرے کے قرینہ سے، یا دوسرے کو حذف کر دیں اول کے قرینہ سے۔

"ولا یخفی لطفه فیما بین الزوج والزوجة" زوج اور زوجہ کے درمیان حقوق کو بیان کرنے میں

"صنعت احتباک" کا طریقہ استعمال عجیب لطف پر مشتمل ہے۔ گویا کہ معنوی طور پر عبارت یوں ہے۔

" ولهن عليهم مثل الذی لهم عليهن " عورتوں کے لئے مردوں پر ایسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں پر ان کے حقوق ہیں۔

" والمراد بالمماثلة المماثلة فی الوجوب لافی جنس الفعل "

مماثلت سے مراد وجوب میں مماثلت ہے یعنی عورتوں پر بھی مردوں کے حقوق واجب ہیں اور مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق واجب ہیں۔

یہ مطلب نہیں کہ جو کام عورت کرے وہی مرد بھی کرے کہ عورت کپڑے دھوئے اور روٹی پکائے تو مرد بھی یہی فعل کرے۔ البتہ مرد ان کے مقابل اس قسم کے راحت پہنچانے والے کام کرے۔ (روح المعانی)

"بالمعروف": شرع کے موافق

"(بالمعروف) بالوجه الذی لا ينكر فی الشرع وعادات الناس فلا يكلف احد الزوجين صاحبه ما ليس له " (مدارک التنزیل)

یعنی عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، معروف طریقہ سے، معروف طریقہ سے مراد یہ ہے کہ وہ شرع کے موافق ہوں۔ وہ حقوق نہیں جن کا شریعت انکار کرے، حقوق تو ہیں ہی وہ جن کا شریعت انکار نہ کرے اور مسلمان لوگوں کی عادات کے خلاف نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جن کاموں پر زوج قدرت نہیں رکھتا ان پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا، اور جن کاموں پر زوجہ طاقت نہیں رکھتی، ان پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ (مدارک)

" وذلک ان حق الزوجية لا يتم الااذا كان كل واحد منهما يراعی حق الآخر فيماله وعليه "

یعنی اس وقت تک زوجیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی جب تک ہر ایک زوجین میں سے ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ نہ کریں۔ اگر خاوند چاہتا ہے کہ زوجہ میرے حقوق ادا کرے تو خاوند کو بھی چاہئے

کہ وہ زوجہ کے حقوق ادا کرے، اور اگر زوجہ چاہتی ہے کہ زوج میرے حقوق ادا کرے تو وہ خود بھی زوج کے حقوق ادا کرے۔ (حازن)

خاونداور بیوی کے حقوق:

حقوق کی دوقسمیں ہیں بعض شرعی اور بعض اخلاقی۔

حقوقِ شرعیہ وہ ہیں جن کے ادا نہ کرنے پر عدالت سے رجوع کیا جا سکتا ہے، حاکم جبراً وہ حقوق دلائے گا یا بعض حقوق کے ادا نہ کرنے پر نکاح فسخ کر دے گا۔

اور حقوقِ اخلاقیہ وہ ہیں جن کے ادا کرنے سے رجوع نہیں کیا جا سکے گا، البتہ خاوند حقوق اخلاقیہ میں کمی کرے گا تو زوجہ کو بھی حق حاصل ہوگا کہ وہ بھی حقوقِ اخلاقیہ میں کمی کر دے تاکہ خاوند کو بھی احساس ہو جائے۔

عورت کے حقوق خاوند پر:

خاوند پر عورت کے حقوق شرعیہ واجبہ چار قسم کے ہیں۔

(۱) کھانا جیسے خود کھائے ایسے زوجہ کو بھی کھلائے۔

(۲) اپنی وسعت اور طاقت کے مطابق لباس مہیا کرنا اور جہاں تک ممکن ہو اسے آرام پہنچانا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے " لینفق ذو سعة من سعة "ہر شخص اپنی وسعت کے مطابق نفقہ دے۔

یعنی مال دار اپنی وسعت کے مطابق خرچ دے اور غریب شخص اپنی وسعت کے مطابق۔ اور ارشاد فرمایا۔

"وعلى المولودله رزقهن وكسوتهن بالمعروف " بچے کے باپ پر ان کی ماؤں کا رزق اور کپڑے لازم ہیں اچھے طریقے سے۔

یعنی اپنی طاقت کے مطابق دے، غنی پر اس کی طاقت کے مطابق رزق اور کپڑے دینے لازم ہیں، اور غریب پر اس کی طاقت کے مطابق لازم ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔

"ولھن علیکم رزقھن وکسو تھن بالمعروف" تم پر لازم ہے کہ اپنی بیویوں کو اپنی طاقت کے مطابق کپڑے اور رزق دو۔

خیال رہے کہ اگر عورت کو طلاق بھی دے دی جائے تو پھر بھی خرچہ عدت کے دوران خاوند پر ہی لازم ہے۔ عدت گذرنے کے بعد خاوند کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

تنبیہ: خاوند اگر خرچ بہت کم دے جو زوجہ اور بچوں کے جائز حقوق کو کافی نہیں ہوسکتا تو عورت خاوند کی اجازت کے بغیر اس کا مال اتنی مقدار میں لے سکتی ہے جس سے اس کی جائز ضروریات پوری ہوسکیں، حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے حضورﷺ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! میرے خاوند ابوسفیان کنجوس شخص ہیں، مجھے اتنا خرچ نہیں دیتے جو مجھے اور میرے بچوں کو کفایت کر سکے، کیا میں ان کے علم کے بغیر ان کا مال لے لیا کروں؟ تو نبی کریمﷺ نے فرمایا" خذی من ماله با لمعروف ما یکفیک ویکفی بنیک" ہاں اتنا مال تم لے لیا کرو جو تمہیں اور تمہارے بچوں کو اچھے طریقے سے کافی ہو جائے۔

(۳) عورت کو رہنے کے لئے مکان دینا خاوند پر لازم ہے۔

"وعلی الزوج ان یسکنها فی دار مفردة لیس فیها احد من اهله الا ان تختار ذلک" خاوند پر لازم ہے کہ زوجہ کو علیحدہ کمرہ دے جس میں اس کے گھر کا اور کوئی فرد نہ ہو، ہاں اگر زوجہ دوسرے حضرات (ساس، سسر، نند) کو اپنے کمرہ میں رہنے کی اجازت دے تو جائز ہے، کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا"اسکنو ھن من حیث سکنتم من وجدکم"عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہتے ہو وسعت کے مطابق۔

"والسکنی با لملک او الاجارة او العاریة واجبة اجماعا" ٹھہرنے کے لئے مکان دینا خاوند پر واجب ہے بالاتفاق، البتہ مکان عام ہے کرایہ پر لیا جائے، کسی سے مانگ کر لیا جائے یا ملکیت ہو۔

(۴) مرد پر لازم ہے کہ ایک مرتبہ کم از کم مجامعت کرے، اگر ایک مرتبہ بھی مجامعت نہ کر سکے تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے۔

"واذا کان الزوج عنینا اجله الحاکم سنة فان وصل الینا فبها والا فرق بینهما اذا طلب المراة ذلک"

جب خاوند نامرد ہو یعنی وطی نہ کر سکے تو حاکم ایک سال کے لئے اسے مہلت دے، اگر وہ جماع کرنے کے قابل ہو گیا اور عورت سے مجامعت کر لی تو بہتر ورنہ قاضی ان کے درمیان تفریق کر دے لیکن شرط یہ ہے کہ اگر عورت تفریق کا مطالبہ کرے تو تفریق کی جائے گی۔ اور اگر تفریق کا مطالبہ نہ کرے بلکہ اسی حالت میں خاوند کے پاس رہنا چاہے تو قاضی تفریق نہیں کر سکتا کیونکہ یہ عورت کا حق ہے۔

مسئلہ: مرد کو چاہئے کہ کم از کم چار ماہ میں ایک بار اپنی بیوی سے ضرور صحبت کرے، بلا وجہ عورت کو چھوڑ کر بہت دن سفر میں نہ رہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل ایلاء کی بحث میں گذر چکی ہے۔

(از ابتداء حقوق تا انتهاء، بخاری، مسلم هدایه، فتح القدیر، شامی، درمنثور، نعیمی)

خاوند پر زوجہ کے اخلاقی حقوق:

عورت کے خاوند پر اخلاقی حقوق کثیر ہیں، ہر وہ حق جو حسن اخلاق میں آتا ہو وہ خاوند پر اخلاقاً لازم ہے، اور ہر وہ قول و فعل جو بدمزاجی میں آتا ہے اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان زوجہ کو اپنے گھر کا ایک فرد سمجھے تو یقیناً تمام گھریلو جھگڑے، فساد ختم ہو جائیں گے، لیکن بشرطیکہ وہ زوجہ بھی اپنے آپ کو یہی سمجھے کہ میں یہاں اجنبی نہیں بلکہ اس گھر کا ایک فرد ہوں۔ شریعت نے اسی وجہ سے زوجہ کے ماں باپ کو خاوند کے ماں باپ ہونے کا درجہ دیا ہے اور خاوند کے ماں باپ کو زوجہ کے ماں باپ ہونے کا درجہ دیا ہے۔

جب یہ بات دونوں کو سمجھ آ جائے تو ساس اور بہو کے جھگڑے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، بہو کو ساس کی اتنی بات برداشت کرنی چاہئے جتنی ماں کی برداشت کرتی ہے۔ اور ساس کو بہو کی اتنی بات برداشت کرنی چاہئے جتنی وہ اپنی بیٹی کی برداشت کرتی ہے۔

مقام تعجب اور مقام افسوس یہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں ساس کو ماں نہیں سمجھا جاتا اور بہو کو بیٹی نہیں سمجھا جاتا، بات بات پر دنگا وفساد برپا کر دیا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر ساس اور بہو کی لڑائی سے ہی گھر برباد ہوتے نظر آتے ہیں، کاش آج کی ساس کو اتنا ہوش آئے کہ کل میں بھی کسی کی بہو تھی، اور آج کی بہو کو یہ سمجھ آئے کے کل میں نے بھی کسی کی ساس بننا ہے۔

شریعت مطہرہ نے تو ساس کو ماں بنا کر شفقت کرنے کا حکم دیا ہے اور بہو کو بیٹی بنا کر عزت واحترام کرنے کا حکم دیا ہے، آج دونوں شریعت کے احکام سے دور ہو کر پریشانیوں کا شکار ہیں۔

خاوند پر اخلاقاً لازم ہے کہ وہ اپنی زوجہ کی ہر قسم کی تکلیف کو دور کرنے کی اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرتا رہے، بیمار ہونے پر جتنا ہو سکے علاج کرائے۔ اس کے والدین کو اس کی ملاقات سے نہ روکے، کیونکہ اس میں قطع رحمی ہے۔ جو گناہ ہے، اس کے محرم آدمیوں یعنی چچا، ماموں، بھائی، بھانجوں، بھتیجوں کو اس کے پاس آنے سے نہ روکے۔ البتہ اس کے ماں باپ ہر ہفتے میں ایک دن آ سکتے ہیں، دوسرے رشتہ دار سال میں ایک مرتبہ آئیں تو بہتر لیکن اخلاقی طور پر وقت کا تعین نہیں۔ عام عادت کے مطابق اور ضرورت کے مطابق جب بھی یہ لوگ ملاقات کرنا چاہیں اسی وقت ملیں۔ خاوند کو چاہئے کہ وہ انہیں کشادہ روئی یعنی ہنس مکھ چہرے سے ملے۔

" وینبغی ان یا ذن لھافی زیارتھمافی الحین بعدالحین علی قدر متعارف" (فتح القدیر)

خاوند کو چاہئے کہ وہ اپنی زوجہ کو اتنی دیر بعد اجازت دے کہ وہ اپنے والدین کو ملے، جتنی دیر میں عام طور پر ملاقات کرنے کا رواج ہو یا عورت کی تمنا ہو۔

یقیناً شروع شروع میں عورت جلدی جلدی ملاقات کی تمنا کرتی ہے، عیال میں مشغول ہونے کے بعد خود ہی اس میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

زوجہ پر خاوند کے حقوق:

زوجہ پر بھی دو قسم کے حقوق ہی ہیں، ایک شرعیہ اور دوسرے اخلاقاً لازم ہیں۔ جن کے نہ ادا کرنے میں عدالت کی طرف رجوع نہیں ہو سکے گا۔

عورت پرحقوق واجبہ تین ہیں۔

(۱) عورت پر واجب ہے کہ مرد کو اپنے آپ پر قدرت دے، یعنی اسے جماع سے نہ روکے، جب تک کوئی شرعی عذر نہ ہو، یعنی حیض ونفاس سے پاک ہو۔ اور ایسی کوئی بیماری بھی نہ ہو جس سے تکلیف ہو یا مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہو۔ ہاں اگر کوئی عذر ہو تو اسے روکنے کا حق حاصل ہے، بلا عذر روکنا منع ہے۔

☆ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"اذا دعا الرجل امراته الى فراشه فابت فبات غضبان لعنتها الملائكة حتى تصبح"

(بخاری ومسلم، مشكوة باب عشرة النساء)

جب مرد عورت کو اپنے بستر پر بلائے اور عورت (بغیر عذر کے) انکار کرے اور خاوند رات کو ناراضگی میں گذارے، تو اس زوجہ پر فرشتے صبح تک لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

☆ دوسری روایت میں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، کوئی مرد ایسا نہیں کہ وہ اپنی زوجہ کو اپنے بستر پر بلائے تو وہ انکار کردے، مگر یہ کہ اس عورت پر اللہ تعالیٰ اس وقت تک ناراض رہتا ہے، جب تک وہ اپنے خاوند کو راضی نہ کرے۔

☆ حضرت طلق بن علی سے مروی ہے، آپ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"اذاالرجل دعازوجته فلتأ ته وان كانت على التنور" (ترمذی، مشكوة باب عشرة النساء)

جب خاوند اپنی زوجہ کو اپنی حاجت کے لئے بلائے فوراً اس کے پاس آجائے خواہ تنور پر ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی اگر وہ روٹیاں پکا رہی ہے اور روٹیوں کے جل جانے کا بھی خطرہ ہو تو کوئی حرج نہیں، روٹیوں کو جلنے دے اس لئے کہ مال بھی خاوند کا ہی ہے اور وہی اپنی حاجت کے لئے بلا رہا ہے گویا کہ وہ اپنے مال کے ضائع ہونے پر رضامند ہے۔ (مرقاة)

☆ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کوئی عورت اپنے خاوند کو دنیا میں تکلیف نہیں پہنچاتی مگر یہ کہ جنتی حوریں کہتی ہیں۔

"لا تؤذیه،قاتلک الله فانماھو عندک دخیل یو شک ان یفارقک الینا "

(ترمذی ، ابن ماجه ، مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

اللہ تمہیں برباد کرے تم اسے نہ ستاؤ، یہ تمہارے پاس مہمان کی حیثیت سے ہے، عنقریب ہی تمہیں چھوڑ کر ہمارے پاس آنے والا ہے۔

وضاحت حدیث: " قاتلک اللہ" کا معنی ہے "اللہ تم پر لعنت کرے، اللہ تمہیں جنت سے دور رکھے" جو معنی راقم نے تحریر کیا ہے "اللہ تمہیں برباد کرے" یہ معنی دونوں کو شامل ہے۔

جنتی حوروں کا یہ کہنا کہ یہ تمہیں چھوڑ کر ہمارے پاس آ کر ہمارا مہمان بننے والا ہے، اسی طرح پہلی حدیث فرشتوں کے لعنت کرنے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آسمانی مخلوق دنیا والوں کے اعمال پر مطلع ہوتی ہے۔
(مرقاۃ)

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"المرأة اذاصلت خمسها وصامت شهرها واحصنت فرجها واطاعت بعلها فلتدخل من ای ابواب الجنة شاءت" (ابو نعیم ، مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

عورت جب پانچ نمازیں ادا کرے اور ایک ماہ (رمضان شریف) کے روزے رکھے اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی فرمانبرداری کرے، اسے اجازت ہوگی جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ مذکورہ بالا صفات رکھنے والی عورت کو جنت میں داخل ہونے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی، اور جنت میں پہنچنا اور جنت حاصل کرنا اس کے لئے آسان ہوگا۔ (مرقاۃ)

☆ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

"لو كنت آمر احدا ان يسجد لاحد لامرت المرأة ان تسجد لزوجها"
(ترمذی ، مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ کسی ایک کو (اللہ تعالیٰ کے بغیر) وہ سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

سجدہ بہت زیادہ عاجز ہونے اور مطیع ہونے پر دلالت کرتا ہے، اسی لئے سجدہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کو جائز نہیں۔ حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ عورت پر خاوند کے بہت حقوق ہیں، جن کا شکر یہ ادا کرنے سے وہ قاصر ہے۔ اور یہ واضح ہوا کہ عورت کو خاوند کی بہت زیادہ فرمانبرداری کا حکم دیا گیا ہے۔

فائدہ: اگر غیر خدا کو معبود سمجھ کر سجدہ کیا گیا تو یہ شرک اور کفر ہے۔ اور اگر معبود سمجھ کر سجدہ نہیں کیا گیا بلکہ تعظیم کے لئے سجدہ کیا گیا تو یہ حرام ہوگا لیکن کفر نہیں ہوگا۔ ایسا سجدہ کرنے والے کو فاسق تو کہا جا سکے گا لیکن مشرک نہیں کہا جا سکے گا۔

" قال قاضیخان ان سجد السلطان ان کان قصده التعظیم والتحیة دون العبادة لا یکون ذلک کفرا" (قاضیخان، مرقاۃ)

قاضی خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اگر کوئی شخص بادشاہ کو تعظیم کے ارادے سے سجدہ کرے، وہ سجدہ عبادت کے ارادہ سے نہ ہو تو یہ کفر نہیں، اگرچہ حرام ہوگا، بہت بڑا گناہ ہوگا، ایسا سجدہ کرنے والا فاسق وفاجر ہوگا، البتہ مشرک نہیں ہوگا۔

تنبیہ: عورت کا مہر اگر خاوند نے ادا نہیں کیا تو اس وجہ سے عورت نے خاوند کو اپنے قریب آنے (مجامعت کرنے سے) منع کر دیا تو یہ اس کا حق ہے وہ منع کر سکتی ہے۔

" وللمراءة ان تمنع نفسها حتی تاخذ المهر وتمنعة ان یخرجها " (هدایة)

عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نفس پر خاوند کو قادر ہونے سے منع کر دے یہاں تک کہ وہ اپنا مہر لے لے اور عورت کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ خاوند کے ساتھ کہیں سفر میں جانے سے انکار کر دے کہ پہلے میرا مہر ادا کرو پھر میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔

ہاں اگر مہر ادا کرنے کے لئے ایک خاص وقت تک مہلت طلب کر رکھی ہے، تو اس وقت سے پہلے عورت مطالبہ نہیں کر سکتی۔

(۲) زوجہ پر خاوند کا دوسرا حق یہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے کہیں باہر نہ جائے۔ ہاں اگر زوجہ نے خاوند کی اجازت سے دایہ بننے کے لئے کسی سے معاہدہ کر لیا، یا کسی کے کپڑے وغیرہ دھونے کے لئے

معاہدہ کرلیا، تو اب وہ عورت خاوند کی اجازت کے بغیر وہ کام بجالا سکتی ہے، کیونکہ خاوند پہلے اجازت دے چکا ہے۔ اگر عورت پر حج فرض ہو تو خاوند کی اجازت کے بغیر کسی محرم کے ساتھ حج کے لئے جا سکتی ہے۔ اجنبی لوگوں کی بیمار پرسی کے لئے یا ان کی زیارت کے لئے، ایسے ولیمہ میں جہاں مرد، عورت ایک جگہ جمع ہوں۔ پردے کا کوئی انتظام نہ ہو، ایسی جگہ عورت کا خاوند کی اجازت کے بغیر جانا بھی ناجائز ہے، اور خاوند کا اجازت دینا بھی ناجائز ہے۔

"ولو اذن وخرجت کانا عاصیین" اگر خاوند نے اجازت دے دی اور عورت اجنبی لوگوں کی محفل میں چلی گئی تو خاوند اور بیوی دونوں گنہگار ہوں گے۔ خاوند غیر شرعی چیز کی اجازت دے کر گنہگار ہوا اور عورت غیر شرعی محافل میں شریک ہو کر اجنبی لوگوں سے گپ شپ لگا کر، ہاتھ ملا کر گناہوں کا پتلا بن گئی۔

(۳) تیسرا حق زوجہ پر خاوند کا یہ ہے کہ کسی اجنبی کو گھر نہ آنے دے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"لا یخلون رجل با مرأة الا کان ثالثها شیطان" (ترمذی، مشکوۃ باب النظر الی المخطوبۃ)

کوئی مرد کسی اجنبی عورت سے ہرگز علیحدہ ہو کر نہیں بیٹھے گا مگر وہاں تیسرا شیطان ہوگا۔

یعنی شیطان ان دونوں کے ساتھ ہوگا اور خواہشات پر دونوں کو ابھارے گا، جس کی وجہ سے وہ دونوں بدکاری جیسے عظیم جرم میں مبتلاء ہوں گے۔

آج کے دور میں دل کے صاف ہونے کے دعویدار دفاتر میں اجنبی مرد اور عورت بند کمرے میں ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر براجمان ہیں، ذرا دل کی گہرائیوں سے سچ تو بتائیں کہ ان کا کیا حال ہوتا ہے، کیا فرمان مصطفیٰ ﷺ جھوٹا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یقیناً دفاتر جہاں مردوں، عورتوں کا اختلاط ہے اور ہسپتال، شیطان کی آماجگاہیں ہیں، جہاں ہمہ وقت شیطان کا بسیرا ہو، وہاں خیر کی توقع کیا ہو سکتی ہے۔

عورت پر خاوند کے اخلاقی حقوق:

عورت پر اخلاقی حقوق بھی خاوند کے اخلاقی حقوق کی طرح ہیں، ہر وہ کام جو عورت کی خوش مزاجی اور خاوند کی تابعداری اور سلیقہ شعار ہونے پر دلالت کرے وہ اخلاقاً اس کے ذمہ لازم ہے۔

کھانا پکانا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی وغیرہ، یہ ایسے کام ہیں جن سے عورت کے سلیقہ شعار ہونے یا ست اور گندہ ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکے گا جب عورت خاوند کے گھر کو اپنا گھر سمجھے، زندگی بھر وہاں رہنے کا پکا ارادہ رکھے۔

☆ "وقال ابن عباس انی لا حب ان اتزین للمرأة کما احب ان تتزین لی المرأة لان الله یقول(ولهن مثل الذی علیهن با لمعروف)"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، میں عورت کے لئے اپنے آپ کو مزین کرنا پسند کرتا ہوں، جس طرح عورت میرے لئے زینت کرتی ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔"ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف" (ابن ابی حاتم وابن جریر، صابونی)

☆ "عن جابر بن عبدالله قال خطب النبی ﷺ بعرفات فقال اتقوا الله فی النساء فانکم اخذتموهن بامانة الله واستحللتم فروجهن بکلمة الله وان لکم علیهن ان لا یوطئن فرشکم احدا تکرهونه فان فعلن فاضربوهن ضربا غیر مبرح ولهن علیکم رزقهن وکسوتهن بالمعروف" (مسلم، صابونی)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مقام عرفات میں خطبہ دیا تو ارشاد فرمایا عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، بیشک تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت کے بدلے حاصل کیا، اور ان کی فرجوں کو تم نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کے بدلے اپنے لئے حلال کیا، اور وہ تمہارے فراش پر آنے کی کسی ایک کو اجازت نہ دیں جن کو تم ناپسند سمجھتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو ان کو مارو غیر واضح مار (ہلکی مار)، ان کے لئے تم پر لازم ہے کہ تم ان کو خرچ دو اور ان کو کپڑے دو شرع کے مطابق۔

☆ "عن ابن عمر قال جاء ت امرأة الی النبی ﷺ فقالت یا رسول اللہ ما حق الزوج علی الزوجۃ فذکر فیھا اشیاء لا تصدق بشئ من بیتہ الا باذنہ فان فعلت کان لہ الاجر و علیھا الوزر فقالت یا رسول اللہ ماحق الزوج علی زوجتہ فقال لا تخرج من بیتہ الا باذنہ و لا تقوم یوما الا باذنہ" (احکام القرآن للجصاص)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، عرض کیا یا رسول اللہ! خاوند کا حق زوجہ پر کیا ہے؟ تو آپ نے چند چیزوں کا ذکر کیا، (ان میں یہ بھی کہا) عورت اپنے خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرے، اگر اس نے صدقہ کر دیا تو وہ گنہگار ہوگی، البتہ خاوند کو ثواب حاصل ہوگا۔

(لیکن خیال رہے کہ عام عادت کے مطابق معمولی صدقہ کرنا جائز ہے، زیادہ مقدار میں صدقہ کرنے کے لئے اجازت طلب کرنی پڑے گی)

عورت نے پھر کہا یا رسول اللہ ﷺ خاوند کا زوجہ پر کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نہ نکلے اور دن کو (نفلی) روزے خاوند کی اجازت کے بغیر نہ رکھے۔

☆ "عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ خیر النساء امرأۃ اذا نظرت الیھا سرتک و اذا امرتھا اطاعتک و اذا غبت عنھا حفظتک فی مالک و نفسھا ثم قرأ (الرجال قوامون علی النساء) الآیۃ" (احکام القرآن للجصاص)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں میں سے بہتر عورت وہ ہے جسے تم دیکھو تو وہ تمہیں خوش کرے اور جب تم اسے حکم دو تو وہ تمہاری فرمانبرداری کرے، اور جب تم غائب ہو تو وہ تمہارے مال کی حفاظت کرے، اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی " الرجال قوامون علی النساء "(مرد عورتوں پر حاکم ہیں)

"وللرجال عليهن درجة": اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے۔

یعنی یہ نظام قدرت ہے اور رب تعالی کا جب فیصلہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے تو عورتوں یا ان کے ہمنوا اسلام سے دور مردوں کے شور وغل کا کیا مطلب کہ مرد اور عورتیں برابر ہیں۔

"رجال" جمع ہے "رجل" کی، جو ماخوذ ہے "رجلة" سے جس کا معنی قوت و بہادری، جیسا کہ کہا جاتا ہے "رجل بین الرجلة" فلاں شخص کی قوت واضح ہے۔ "وھو ارجل الرجلین" وہ دو شخصوں سے بہادر ہے، "فرس رجل" گھوڑا چلنے میں تیز ہے یعنی طاقتور ہے۔ "الرجل" (بکسر الراء) پاؤں کو کہا جاتا ہے کیونکہ یہ چلنے میں طاقت دیتا ہے۔ "ارتجل الکلام" فی البدیہ کلام کہنا یعنی وہ شخص اس پر قوت رکھتا ہے کہ بغیر سوچنے اور سمجھنے کلام کرنے پر قادر ہے کہ وہ فصیح کلام کرتا ہے یا شعر کہہ لیتا ہے۔ "ترجل النھار" دن میں روشنی زیادہ ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ "رجل" کا معنی مرد کر کے پھر مرد کی بہادری کا اعتراف نہ کرنا عربی زبان سے جاہل ہونے کی علامت ہے۔

"درجة": مرتبہ، اصل میں کسی چیز کو لپیٹنا اس کا معنی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "ادرجته" میں نے اسے لپیٹا۔ "درج القوم قرنا بعد قرن" قوم نے آہستہ آہستہ اپنی عمر کو طے کر لیا لپیٹ لیا، یعنی وہ فنا ہو گئے۔ "المدرجة" راستہ پر چلنا، کیونکہ راستہ بھی منزل کو آہستہ آہستہ طے کر لیتا ہے "الدرجة" راستہ کی منزلوں میں سے ایک منزل کو بھی کہا جاتا ہے۔ "ومنه الدرجة التی یرتقی فیھا" اسی سے ہے کسی منزل پر چڑھنا۔ (کبیر)

علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

"الدرجة نحو المنزل لکن تقال اذا اعتبرت بالصعود دون الامتداد علی البسیط"

درجہ کا اگرچہ لغوی معنی منزل ہے لیکن اس کا استعمال خاص ہے یعنی یہ چڑھنے کے معنی میں استعمال ہے اترنے یا پھیلانے کے معنی میں استعمال نہیں۔

"ویعبر بھا عن المنزلة الرفیعة" بلند مرتبہ درجہ کہا جاتا ہے۔

دونوں لفظوں کے معانی سے ہی واضح ہو گیا کہ مردوں کو عورتوں پر قوت و بہادری اور بلندی مرتبہ حاصل ہے۔

(ا ر روح المعانی)

مرد کو عورت پر فضیلت:

مرد کو عورت پر فضیلت کا حاصل ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔البتہ اسے بیان کرنے کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں دو احتمال پائیں گے ہیں۔

پہلا احتمال: یہ ہے کہ مرد کو عورت پر چند وجہ سے فضیلت رکھنے میں واضح امور حاصل ہیں۔

(۱) عقل میں مرد کو فضیلت حاصل ہے جو عقل مرد کو حاصل ہے وہ عورت کو نہیں۔

(۲) دیت مرد کی عورت سے دوگنا ہے۔

(۳) عورت کا وراثت میں حصہ کم ہے مرد سے، یعنی بیٹی کا حصہ کم ہے بیٹے سے، بہن کا کم ہے بھائی سے، ماں کا کم ہے باپ سے، وراثت کے مسائل میں ان شاء اللہ تفصیل آئے گی۔

(۴) منصب امامت، قضاء اور شہادت میں بھی مرد کو فضیلت حاصل ہے۔

(۵) مرد ایک عورت کے بعد دوسری سے شادی کر سکتا ہے جبکہ عورت ایک خاوند کے بعد اس کی زوجیت میں ہوتے ہوئے دوسرے شخص سے شادی نہیں کر سکتی۔

(۶) زوج کا حصہ وراثت میں زوجہ سے زیادہ ہے۔

(۷) زوج طلاق دینے پر قادر ہے اور طلاق رجعی کے بعد رجوع کرنے پر قادر ہے، عورت چاہے یا نہ چاہے۔ جبکہ عورت طلاق دینے پر قادر نہیں اور رجوع کرنے پر قادر نہیں۔اور نہ ہی عورت کو یہ قدرت حاصل ہے کہ مرد کو رجوع کرنے سے روک دے۔

(۸) مرد کا حصہ مال غنیمت میں عورت سے زیادہ ہے۔

واذا ثبت فضل الرجل علی المرأة فی هذه الامور ظهران المراءة کالاسیر العاجز فی ید الرجل "

جب ان تمام امور میں مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے تو واضح ہوا کہ عورت عاجز قیدی کی طرح مرد کے ہاتھ میں ہے۔

حقیقت میں وہی عورت کامیاب ہے جو مرد کو اپنا سربراہ سمجھے، اگر عورت اپنے آپ کو مرد سے برتر سمجھنا شروع کردے، تو جلدی ہی ذلت سے خاوند کے گھر سے نکل کر کسی اور کی تلاش میں سرگرداں ہوگی۔

حدیث شریف میں ہے۔

"اتقوا الله في الضعيفين اليتيم والمرأة"

دوضعیف صنفوں میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، یعنی یتیم اور عورت (کے معاملہ میں)۔

مطلب یہ ہے کہ ان پر رحم کرو، ان کے حقوق کا لحاظ کرو۔ تاہم ان کو ضعیف کہہ کر مرد کی برتری واضح کردی۔

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "استوصوا بالنساء خيرا فانهن عندكم عوان" عورتوں کو بھلائی پہنچانے کی نصیحت قبول کرو بے شک وہ تمہارے پاس قید کی حیثیت میں ہیں۔

تنبیہ:

آیۃ کریمہ میں گویا کہ اس مضمون کو واضح کیا گیا جب اللہ تعالیٰ نے مردوں کو فضیلت دی ہے اور عورتوں پر ان کو اقتدار دیا ہے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق پورے کریں، ان میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ اور ضمناً اس آیۃ کریمہ میں عورتوں کو ضرر پہنچانے اور ستانے اور تکلیف دینے پر تہدید کی گئی، یعنی ڈرایا اور دھمکایا گیا

"وذلك لان كل من كانت نعم الله عليه اكثر كان صدور الذنب اقبح واستحقاقه للزجر اشد"

یہ اس لئے کہ ہر وہ شخص جس پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کثیر ہوں اس سے گناہ سرزد ہونا زیادہ برا ہے اور زیادہ زجر وتوبیخ کا سبب ہے۔

دوسرا احتمال:

نکاح کرنے کی وجہ سے منافع کا حاصل کرنا، لذت حاصل کرنا مشترک ہے، کیونکہ یہ مقاصد زوجہ کو بھی حا

صل ہیں اور خاوند کو بھی، شادی کرنے کے مقاصد یہ ہیں کہ دل کو تسکین حاصل ہو، اور الفت ومحبت حاصل ہو اور نسب میں اشتراک ہو، اور زیادہ احباب ومددگار حاصل ہو جائیں۔ اور لذت حاصل ہو، یہ تمام مقاصد دونوں کو حاصل ہیں، بلکہ ممکن ہے یہ کہا جائے "ان نصیب المرأۃ فیھا اوفر" بے شک عورت کا حصہ ان میں زیادہ پایا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ عورت کو زیادہ شہوت حاصل ہے۔

پھر خاوند پر لازم کیا گیا کہ وہ مہر ادا کرے اور خرچ ادا کرے اور عورت سے آنے والی مشکلات کی مدافعت کرے اور اس کی بھلائی کو قائم کرے۔

یہ تمام وجوہ مرد کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں، خصوصا عورتوں کو مردوں کی تابعداری کا حکم بھی مرد کی برتری پر دلالت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "لو امرت احد ابالسجود لغیر اللہ لأ مرت المرأۃ بالسجود لزوجھا" اگر میں کسی کو اللہ کے غیر کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

"واللہ عزیز حکیم": اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔

یعنی غالب ہے، کیونکہ اسے کسی کام سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا اور حکمت والا ہے، کیونکہ اس کا ہر کام درست ہوتا ہے اور اس کا ہر حکم درست ہوتا ہے، اس کا کوئی کام اور کوئی حکم بے مقصد اور بے فائدہ نہیں اور غلط یا باطل نہیں۔ (کبیر)
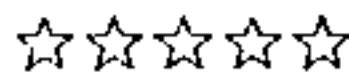
☆☆☆☆☆

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ بَاِحْسَانٍ وَ لَایَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّااٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا اِلَّا اَنْ یَّخَافَا اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَاللّٰہِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّایُقِیْمَا حُدُوْدَاللّٰہِ فَلَاجُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ تِلْکَ حُدُوْدُاللّٰہِ فَلَاتَعْتَدُوْھَا وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۲۹)

یہ طلاق دو بار تک ہے پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا یا نکوئی کے ساتھ چھوڑ دینا اور تمہیں روا نہیں کہ جو کچھ عورتوں کو دیا اس میں سے کچھ واپس لو مگر جب دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی حدیں قائم نہ کریں گے پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں ٹھیک انہی حدوں پر نہ رہیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں اس میں جو بدلہ دے کر عورت چھٹی لے، یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

یہ طلاق دو بار تک ہے پھر روکنا ہے بھلائی کے طریقہ سے یا چھوڑ دینا ہے مستحسن (اچھے) طریقہ سے۔ اور نہیں جائز تمہارے لئے کہ تم لو اس سے جو دیا ہے تم نے ان کو مگر یہ کہ خوف کریں دونوں کہ وہ قائم نہیں کر سکیں گے اللہ کی حدیں۔ پھر اگر تم خوف رکھو کہ وہ دونوں نہیں قائم کریں گے اللہ کی حدیں تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر اس میں جو بدلہ دے عورت اس کا، یہ اللہ کی حدیں ہیں تو نہ تجاوز کرو ان میں، اور جو شخص تجاوز کرے گا اللہ کی حدوں میں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

مختصر مطلب:

طلاق کے بعد رجوع کا حق دو بار تک ہے یعنی ایک طلاق صریح یا دو طلاقیں صریح کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔ یہ حد ہے رجوع کرنے کی، اس کے بعد رجوع نہیں ہو سکتا۔

صریح طلاق کا مطلب یہ ہے کہ لفظ طلاق ہی استعمال کرے کوئی اور لفظ بائن وغیرہ استعمال نہ کرے، ان کا حکم علیحدہ ہے، ایک طلاق یا دو طلاقوں کے بعد اگر بھلائی کے طریقہ سے رجوع کرنا چاہے تو رجوع کرلے۔ یعنی طلاق کے بعد نادم ہو گیا، رجوع کر کے پھر سے تعلقات ازدواجی قائم کرنا چاہے اور شرع کے مطابق اس کے حقوق کو پورا کرنا چاہے تو رجوع کرنے کا خاوند کا حق ہے۔

لیکن یہ حق عدت ختم ہونے سے پہلے تک ہے اور اگر وہ رجوع نہیں کرنا چاہتا تو اچھے طریقے سے عورت کو آزاد کر دے، یعنی رجوع نہ کرے، عدت گذرنے پر وہی عورت بائنہ ہو جائے گی، جہاں چاہے نکاح کرلے، اگر پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو اس سے بھی نکاح کر سکے گی۔

مرد کے لئے جائز نہیں کہ وہ عورت سے مہر کے طور پر دیا ہوا مال واپس لے لے۔ ہاں اگر وہ دونوں سمجھتے ہیں کہ ہم شرعی حقوق قائم نہیں کر سکتے اور حکام بھی یہ سمجھتے ہوں کہ یہ دونوں آپس میں حقوق کو پورا نہیں کر سکتے تو اس صورت میں عورت مہر کے طور پر لیا ہوا مال خاوند کو دے کر خلع کرلے، یہ جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے احکام واضح طور پر بیان فرما دیئے، وہی اس کی حدیں ہیں، ان احکام کو نہ مان کر اللہ تعالیٰ کی حدو سے تجاوز نہ کرو، جو لوگ اللہ کی حدو سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ میں بیان فرمایا "وبعولتهن احق بردهن" اور ان کے خاوند ان کی طرف رجوع کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ تو اس آیۃ میں رجوع کرنے کی حد کو بیان کیا کہ وہ دوبارہ طلاق دینے تک ہے، اس کے بعد طلاق دینے پر رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

شانِ نزول:

"واخرج الترمذی وابن مردویه والحاکم وصححه والبیهقی فی سننه من طریق هشام بن عروة عن ابیه ان عائشة قالت کان الناس والرجل یطلق امرأته ما شاء الله ان یطلقها وهی امرأته اذا ارتجعها وهی فی العدة وان طلقها مائة مرة او اکثر حتی قال رجل لأمرأته والله لا اطلقک فتبینی ولا آویک ابدا قالت وکیف ذلک قال اطلقک فکلما همت عدتک ان تنقضی راجعتک فذهبت المرأة حتی دخلت علی عائشة فاخبرتها فسکتت عائشة حتی جاء النبی ﷺ فاخبرته فسکت النبی نزل القرآن (الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان)"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص ماشاء اللہ اپنی عورت کو جتنی طلاقیں دینا چاہتا اتنی ہی طلاقیں دے دیتا، وہ اس کی عورت ہی رہتی جبکہ عدت کے اندر رجوع کر لیتا۔ خواہ وہ ایک سو یا اس سے زیادہ بھی طلاقیں دے دیتا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے اپنی زوجہ کو کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں تمہیں طلاق دے کر اپنے آپ سے جدا نہیں کروں گا اور تمہیں اپنے پاس بھی کبھی نہیں رکھوں گا، عورت نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے کہا جب تمہاری عدت ختم ہونے کے قریب ہوگی تو میں رجوع کروں گا، (یعنی طلاقیں دیتا رہوں گا اور رجوع کرتا رہوں گا) وہ عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئی اور ان کو واقعہ کی خبر دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خاموش رہیں یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو اس عورت کے ساتھ پیش آنے والے معاملہ کی خبر دی، آپ خاموش رہے یہاں تک کہ قرآن پاک کی یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی "الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان" طلاق (میں رجوع کا حق) دو بار تک ہے، پھر بھلائی کے طریقہ سے ان کو روک کر رکھو یا اچھے طریقہ سے آزاد کردو۔ (درمنثور)

"فامساک بمعروف او تسریح باحسان":

پھر روک لو بھلائی کے طریقہ سے یا چھوڑ دو اچھے طریقہ سے۔

"امساک" اطلاق کا خلاف ہے، یعنی "اطلاق" کا معنی ہے "چھوڑنا" اور "امساک" کا معنی ہے "روکنا" "مساک" اور "مسکة" دو اسم ہیں۔ "ذو مسکة" اور "ذو مساک" اسے کہا جاتا ہے جو بخیل ہو، یعنی مال کو روک کر رکھنے والا۔ اور کہا جاتا ہے "مساکة من جبر" قوت وطاقت سے روک دینا۔

"تسریح" کا معنی ہے چھوڑنا، کہا جاتا ہے "تسریح الشعر" بالوں کو کھلا چھوڑنا، لٹکانا، اور کہا جاتا ہے "سرح الماشیة" مویشی چرانے والوں نے اپنے مویشیوں کو چرنے کے لئے چھوڑا۔

یعنی دو طلاقوں یا ایک طلاق کے بعد حق یہ ہے کہ اچھی طرح روک لے یعنی رجوع کرے، رجوع کرنے میں غرض اصلاح اور نفع پہنچانا ہے نہ کہ نقصان پہنچانے کا ارادہ ہو، یعنی عدت کو لمبا کرنے کی غرض سے رجوع کرنا گناہ ہے، اسی طرح اس لئے رجوع کرنا کہ میں رجوع کے بعد عورت کو ستاؤں گا، اس پر مظالم ڈھاؤں گا، اس غرض سے بھی رجوع کرنا گناہ ہوگا۔

یا اچھی طرح آزاد کر دے، خیال رہے "تسریح باحسان" کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ ہے۔

"ان معناه ان یترک المراجعة حتی تبین بانقضاء العدة"

کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوران عدت رجوع کرنا چھوڑ دو، رجوع کرنے کے بغیر ہی عدت کو ختم ہونے دو، جب عدت ختم ہو جائے گی تو وہ خود بخود بائن ہو جائے گی۔

اور بائن طلاق کے بعد عورت خود مختار ہو جائے گی، چاہے تو اسی خاوند سے پھر نکاح کر لے یا کسی اور سے نکاح کر لے۔ ضحاک اور سدی رحمہما اللہ سے یہ معنی روایت کیا گیا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق دے کر رجوع کا راستہ بند کر لے اور اچھے طریقہ سے چھوڑ دے، اس معنی پر بھی روایت موجود ہے۔

☆ "واخرج ابن مردویه والبیهقی عن انس قال جاء رجل الی النبی ﷺ فقال یا رسول الله انی اسمع الله یقول "الطلاق مرتان" فاین الثالثة ؟ قال (امساک بمعروف اوتسریح باحسان) هی الثالثة (درمنثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ! دوطلاقوں کا ذکر تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "الطلاق مرتان" میں ہے، تیسری طلاق کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا، وہ "امساک بمعروف او تسریح باحسان" میں ہے یعنی (تسریح باحسان) تیسری طلاق ہے۔

☆ " واخرج البیھقی من طریق السدی عن ابی مالک وابی صالح عن ابن عباس وعن مرة عن ابن مسعود وناس من الصحابة فی قوله (الطلاق مرتان) قال هو المیقات الذی یکون علیهافیه الرجعة فاذاطلق واحدة اوثنتین فامایمسک ویراجع بمعروف واما یسکت عنها حتی تنقضی عد تها احق بنفسها " (درمنثور)

حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود اور کئی صحابہ کرام نے فرمایا کہ رب تعالیٰ نے (الطلاق مرتان) میں رجوع کی حد بیان کردی کہ جب ایک طلاق دے یا دو طلاقیں دے تو اسے اچھی طرح روک کر رکھنا اور رجوع کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر خاموش رہے یعنی رجوع نہ کرے یہاں تک کہ اس کی عدت ختم ہو جائے تو وہ اپنے نفس پر خود مختار ہوگی، یعنی عدت کے بعد رجوع کا حق ختم ہوگیا۔

واضح ہوا کہ دونوں روایتوں میں تعارض نہیں بلکہ " تسریح باحسان "کی دوصورتیں ہیں، جس پر چاہے عمل کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

صراحۃً تیسری طلاق کا ذکر آنے والی آیۃ کریمہ "فان طلقها" الخ میں آئے گا۔

خلع کے مسائل:

(۱) اگر مرد عورت کے حقوق پورے نہ کر رہا ہو " فلا یحل له الاخذ " تو اسے مال لینا حلال نہیں، ہاں اگر خلع کر لے اور مال لے لے تو باوجود اس کے کہ اس نے مال حرام طور پر لیا ہے، لیکن خلع واقع ہو جائے گا۔

اگرچہ صاحب ہدایہ نے تو مرد کی طرف سے زیادتی اور حقوق کی پاسداری پر مال لینے کو مکروہ (تحریمی) کہا ہے، لیکن "والحق انه یحرم لماتلونا" حق یہ ہے کہ مال لینا اس کے لئے حرام ہے، اس لئے کہ رب تعالیٰ نے واضح طور پر بیان کر دیا "ولا یحل لکم ان تاخذوا مما آتیتموهن شیأ " تمہارے لئے حلال نہیں کہ لو تم اس سے جو تم نے دیا ہے ان کو مال (مہر)۔

(۲) ہاں البتہ رب تعالیٰ نے اس نہی سے یہ حکم مستثنیٰ فرمایا ہے " الاان یخافا الایقیما حدود الله " مگر جب وہ دونوں خوف کریں کہ اللہ کی حدیں قائم نہیں کر سکیں گے۔

ساتھ ہی حکام کو بھی واضح طور پر بتا دیا۔

"فان خفتم الا یقیما حدود الله فلاجناح علیهما فیما افتدت به "

پھر (اے حاکمو!) اگر تم خوف کرو کہ یہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں کر سکیں گے تو ان دونوں پر گناہ نہیں اس چیز میں جو عورت فدیہ دے اس کے بدلے۔

یعنی جب زوجہ اور خاوند دونوں ہی ایک دوسرے کے حقوق پائمال کر رہے ہوں تو عورت بدلہ (فدیہ) دے کر خاوند سے اپنی جان چھڑا لے وہ خلع کر لے تو یہ دونوں کے لئے جائز ہے۔

ساتھ ہی حکام کو بھی بتا دیا کہ وہ اس معاملہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کریں کیونکہ رب تعالیٰ کی طرف سے جب اجازت ہے تو عورت کو بدلہ دے کر خلع کا مطالبہ کرنا اور مرد کا خلع کر کے مال لینا جائز ہے، ان پر کوئی گناہ نہیں خلع کرنے میں۔ یعنی......

"تخاف المرأة ان تعص الله فی امرزو جهاویخاف الزوج اضاعة حقوقها "

عورت یہ خوف رکھے کہ خاوند کے حقوق کو میں پائمال کر کے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمان نہ بن

جاؤں اور خاوند کو یہ خوف ہو کہ میں عورت کے حقوق ادا نہیں کر سکتا تو یہ خلع کر لیں۔

(۳) "وان لم یکن النشوز من جانب ولایخافان ان لا یقیما حدود الله فلا یحل اخذ المال للزوج ولا طلب الطلاق وبذل المال للزوجة لکن یقع الخلع ویجب المال للزوج علی الزوجة"

اگر خاوند اور زوجہ کسی ایک کو بھی حقوق پائمال کرنے کا کوئی خوف نہ ہو تو خاوند کو مال لینا حلال نہیں، اور زوجہ کے لئے طلاق طلب کرنا اور مال خرچ کرنا حلال نہیں۔ ہاں اگر خلع کر لیا جائے تو عورت کو مال دینا لازم آجائے گا، اور خلع ہو جائے گا، اس پر خلع کے احکام مرتب ہوں گے۔

(۴) "وان کان النشوز من جانبها یحرم علیها وعصت هی لا هو، ولکن یقع الخلع و یجب المال للزوج علی الزوجة"

اگر صرف عورت حقوق کو پائمال کر رہی ہے مرد حقوق کی پاسداری کر رہا ہے پھر عورت خلع کا مطالبہ کرے تو اس صورت میں عورت گنہگار ہوگی، اس کا خلع کا مطالبہ کرنا حرام ہوگا، مرد کو مال لینا حرام نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی خلع کرنا اس کے لئے ناجائز ہوگا۔ یعنی اس صورت میں بھی خلع ہو جائے گا، عورت کو مال دینا لازم ہوگا۔ (ماخوذ از مظهری)

شانِ نزول:

زیر بحث آیۃ کریمہ کے دوسرے حصہ (جس میں خلع کا ذکر ہے) کا شانِ نزول یہ ہے۔

☆ "روی البخاری فی صحیحة عن ابن عباس ان مرأة ثابت بن قیس اتت رسول الله ﷺ فقالت یا رسول الله ثابت بن قیس ما اعیب علیه فی خلق ولادین ولکنی اکره الکفر فی الاسلام قال رسول الله ﷺ تردین حدیقته قالت نعم قال رسول الله ﷺ اقبل الحدیقة وطلقها تطلیقة"

بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ہے کہ بے شک ثابت بن

قیس رضی اللہ عنہ کی عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی، اور اس نے کہا یا رسول اللہ! (میرا خاوند) ثابت بن قیس کے اخلاق میں اور دین داری میں کسی قسم کا میں کوئی عیب نہیں لگاتی، البتہ میں کفر کو اسلام میں ناپسند کرتی ہوں (یعنی ہوسکتا ہے کہ مجھ سے زوج کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی نافرمانی ہو جائے جو مجھے کفر کی طرف لے جائے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس کا باغ (جو تم نے مہر کے عوض لیا ہے) واپس کردو گی؟ اس نے کہا ہاں (واپس کردوں گی) رسول اللہ ﷺ نے (ثابت بن قیس کو) فرمایا تم باغ قبول کرلو اور اسے طلاق دے دو۔

" واخرج ابن جرير عن ابن عباس قال اول خلع كان في الاسلام امرأة ثابت بن قيس اتت النبي ﷺ فقالت يا رسول الله لا يجتمع رأسي ورأس ثابت اني رفعت الخباء فرأيته اقبل في عدة فاذاهو اشد هم سوادا واقصرهم قامة واقبحهم وجها فقال اتردين حديقته قالت نعم وان شاء زدته ففرق بينهما "

ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی کہ اسلام میں سب سے پہلا خلع ثابت بن قیس کی عورت سے ہوا، وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی یارسول اللہ! میرا سر اور ثابت کا سر ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے، کیونکہ میں نے خیمہ کو اٹھایا تو اسے چند آدمیوں میں متوجہ ہوتے ہوئے دیکھا، وہ سب سے زیادہ سیاہ تھا اور سب سے زیادہ چھوٹا اور سب سے زیادہ بدصورت تھا۔ آپ نے فرمایا کیا تو اس کا باغ واپس لوٹا دے گی؟ تو اس عورت نے کہا ہاں، وہ اگر چاہے تو زیادہ مال بھی دے دوں گی۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کے درمیان جدائی کردی۔ (از مظہری)

مسئلہ : خلع طلاق بائن ہے، اس لئے کہ عورت کی طرف سے مطالبہ کے بغیر اور مال کی پیش کش کے بغیر ہی اگر خاوند نے زوجہ کو کہا "خلعتک اوخا لعتک ونوی الطلاق یقع به الطلاق" میں نے تمہارے ساتھ خلع کیا اور اس پر طلاق کی نیت کی تو طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ یہ الفاظ کنایات طلاق سے ہیں، اس لئے کہ خلع کا معنی ہے

اتارنا، ہٹانا، جدا کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ "خلع ثوبه ونعله" اس نے کپڑے اور جوتے اتارے، جب جدا کرنے والا معنی اس میں موجود ہے تو طلاق کی نیت سے بائن طلاق ہوگی، اس لئے کہ کنایات سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔ (از کفایة وفتح القدیر)

تنبیہ: لیکن یہ بھی خیال رہے کہ جب عورت کی طرف سے مال پر خلع کا مطالبہ ہو یا مرد ہی عورت کو کہے تم مجھے مال دو تو میں تمہارے ساتھ خلع کرتا ہوں، اس صورت میں خلع کرنے سے بغیر کسی نیت کے طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ مال کا ذکر کسی نئی نیت سے بے پرواکر دیتا ہے، یہی مسئلہ ہدایہ کی اس عبارت میں دیکھئے۔

"فاذافعلاذلک وقع با لخلع تطليقة بائنة ولز مهالقوله ﷺ الخلع تطليقة بائنة، ولانه يحتمل الطلاق حتى صارمن الكنايات والواقع بالكناية بائن الان ذكر المال اغنى عن النية هنا"

مقام توجہ: اگر کسی شخص نے پہلے اپنی زوجہ کو ایک طلاق دی، پھر خلع کرلیا، تو اب اسے دو طلاقیں ہوگئیں۔ لیکن خلع طلاق بائن ہونے کی وجہ سے نکاح نیا کرنا پڑے گا۔

اگر پہلے دو طلاقیں دی تھیں اور بعد میں خلع بھی کرلیا تو اب تین طلاقیں ہوگئیں، اور تین طلاقوں کے بعد نہ رجوع ہوسکتا ہے اور نہ ہی تجدید نکاح کافی ہے۔ تفصیل ان شاءاللہ آنے والی آیۃ کریمہ میں آئے گی۔

اصل میں قانون یہ ہے کہ رجعی طلاق رجعی سے اور بائن رجعی سے ملحق ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: ایک طلاق کے بعد رجوع کرلیا تھا، پھر کسی وقت ایک طلاق اور دے دی تو اب دو طلاقیں ہوگئیں، پھر رجوع کرلیا، پھر کسی وقت اور طلاق دے دی، تو اب تین طلاقیں ہوگئیں، کیونکہ پہلی طلاق موقوف تھی، ختم نہیں ہوئی تھی۔

مسئلہ: اگر ایک یا دو طلاقوں کے بعد رجوع نہیں کیا تھا، عدت گذر گئی، اب وہ عورت بائنہ ہوگئی، اس سے تجدید نکاح کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے خاوند نے نیا نکاح کرلیا، پھر طلاق دے دی، تو یہ طلاق پہلے ایک سے مل کر دو ہو جائیں گی اور دو سے مل کر تین ہو جائیں گی، یعنی تجدید نکاح سے بھی پہلی طلاقیں ختم نہیں ہوئیں، بلکہ موقوف رہتی ہیں۔

مسئلہ: خلع کے بعد پھر خاوند نے زوجہ سے نیا نکاح کرلیا، پھر دوطلاقیں دے دیں، تواب تین طلاقیں ہو جائیں گی، کیونکہ خلع بھی طلاق بائن ہے۔

مسئلہ: کسی قسم کی بائن طلاق کے بعد تجدید نکاح کرلیا، پھر دوطلاقیں دے دیں تو تین ہو جائیں گی۔

فائدہ: اگر رجعی طلاق کے بعد رجوع نہیں کیا تھا اور عدت گزرگئی وہ بائن طلاق ہوگی، یا بائن طلاق دی یا خلع کیا اس عورت نے عدت گزرنے پر کسی اور شخص سے نکاح کرلیا، دوسرا خاوند مجامعت کرنے کے بعد فوت ہوگیا یا طلاق دے دی پھر عدت گزار کر عورت نے پہلے خاوند سے نکاح کرلیا تو اب پہلے خاوند کو تین طلاقوں کا حق از سرنو مل گیا، کیونکہ دوسرا خاوند جب تین طلاقوں کو ختم کر کے نیا تین طلاقوں کا حق زوج اول کو دلا دیتا ہے تو یقیناً تین طلاقوں سے کم کو بھی ختم کرا کے نیا تین طلاقوں کا حق شرع سے دلا دے گا۔ (نورالانوار)

رجوع کیسے ہوتا ہے:

عورت کو یہ کہے کہ میں نے تمہاری طرف رجوع کرلیا۔ یا یہ کہے میں نے اپنی زوجہ کی طرف رجوع کرلیا۔ یا عورت سے جماع کرلیا، یا شہوت سے چھولیا یا شہوت سے بوسہ لیا، تو رجوع ہوگیا۔

رجوع کے لئے عورت کا رضا مند ہونا ضروری نہیں۔ اسلام نے کیسا خوب نظام عدل قائم کیا کہ دوران عدت مرد کو رجوع کا حق دیا، عورت کو اختیار نہیں دیا۔ اور عدت کے ختم ہونے پر عورت کو خود مختار بنایا، چاہے تو پہلے خاوند سے نکاح کرے چاہے تو انکار کر کے اسے چلتا بنا دے۔

فائدہ: مستحب یہ ہے کہ رجوع پر دو گواہ بنا لے تا کہ جھگڑے کی صورت میں قاضی سے فیصلہ کرانا آسان ہو جائے۔ اگر گواہ نہ بنائے رجوع پھر بھی ثابت ہو جائے گا، مرد نے جب بتا دیا کہ میں نے رجوع کرلیا ہے تو عورت کو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے کسی اور سے نکاح نہیں کرنا چاہئے خواہ گواہ موجود نہ ہوں۔

اعتراض: تم نے خلع کو طلاق کہا ہے، اس طرح تو طلاقیں چار ہو جائیں گی، کیونکہ خلع کے بغیر ہی تین طلاقوں کا ذکر موجود ہے۔

جواب: طلاق کی دوقسمیں بیان کی گئی ہیں، ایک قسم طلاق مال کے بدلے اور دوسری قسم بغیر مال کے طلاق۔ پھر بغیر مال کے دو طلاقوں تک رجوع کرنے کا حق دیا گیا ہے اور تیسری پر رجوع کا حق نہیں دیا گیا مال کے بدلے طلاق بائن ہوگی، یہ علیحدہ قسم ہے، چوتھی طلاق نہیں۔ (تفسیرات احمدیہ و نور الانوار)

مسئلہ: خلع میں صرف وہی مال لینا چاہئے جو مہر کے عوض دیا تھا، زیادہ مال لینا بہتر نہیں۔ لیکن اگر زیادہ مال لے لیا تو خلع ہو جائے گا اور مرد اس مال کا مالک بن جائے گا۔

خلع اور طلاق بالمال میں فرق:

خلع میں وہی الفاظ استعمال ہوں گے جن میں خلع کا ذکر ہوگا، جیسے مرد کہے "خالعتک بالمال، خلعتک بالمال" میں نے اتنے مال کے بدلے تمہارے ساتھ خلع کر لیا ہے۔

خلع میں ائمہ کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے کہ خلع طلاق ہے یا فسخ ہے۔

طلاق بالمال میں لفظ طلاق استعمال ہوگا کہ میں نے تمہیں اتنے مال کے بدلے طلاق دے دی، طلاق بالمال میں ائمہ کا کوئی اختلاف نہیں، بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ مال کے بدلے دی ہوئی طلاق بائن ہوتی ہے۔

یہ علمی نکتہ ہے ورنہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خلع اور مال کے بدلے دی ہوئی طلاق کا حکم ایک ہی ہے کہ دونوں صورتوں میں طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔

تنبیہ: خلع میں عورت کی جانب سے مرد کو مال دینے کی پیش کش ہوتی ہے اور مرد سے مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ خلع کر لے، قبول کرنا یا نہ کرنا مرد کا اختیار ہے، مرد خوشی سے خلع کر لے یا جبراً، اس کی زبان سے خلع کے الفاظ کہلوائے جائیں تو یہ خلع ہے۔ اگر وہ خوشی سے لکھ دے یا کسی سے لکھوادے تو یہ بھی خلع ہے، جبراً اس سے لکھوایا جائے یا جبراً دستخط کرائے جائیں تو یہ خلع نہیں۔

جج خود ہی خلع کا فیصلہ سنادے، خاوند کی زبان سے خلع کے الفاظ نہیں کہلوائے گے اور نہ ہی خاوند نے خوشی

سے خلع کے الفاظ لکھ کر یا لکھوا کر دیئے تو یہ خلع کس شریعت کا قانون ہے؟ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ غلط فیصلے کر کے لوگوں کو حرام کاری پر لگانا کون سا انصاف ہے۔

جب صلح کسی طرح ممکن نہ ہو تو جدائی کر لی جائے:

خاوند اور بیوی میں اختلافات پیدا ہو جائیں تو خاوند اپنی زوجہ کو نصیحت کر کے خوش اخلاقی اور خوش طبعی سے راضی کر لے اور اگر اس طرح راضی نہ ہو تو اسے اپنے گھر میں ہی رکھ کر اپنے بستر سے جدا کر دے، ممکن ہے وہ اس طرح راضی ہو جائے، اگر اس سے بھی بات نہ بنے تو معمولی سرزش کر کے راضی کر لے اور اگر معاملہ اس حد سے بھی آگے بڑھ جائے، تو دونوں جانب سے اجنبی نیک پرہیزگار صلح کرانے والے حضرات کو منصف بنالیا جائے یعنی جرگہ سے کام لیا جائے، وہ صلح کرانے والے اپنے نیک ارادہ سے پوری کوشش کریں تا کہ ان کے درمیان صلح ہو جائے، صلح کرانے کا یہ آخری حربہ تھا، اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو پھر اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں کہ عورت کو طلاق دے کر اپنے آپ سے جدا کر دے۔

طلاق دینے پر شیطان خوش ہوتا ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک شیطان اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکروں کو بھیجتا ہے، کہ وہ لوگوں کو فتنہ میں ڈالیں (یعنی گناہوں کی طرف راغب کریں) ان میں شیطان کے قریب وہ ہوتے ہیں جو لوگوں کو بڑے فتنے میں مبتلاء کریں، ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے میں نے یہ کام کیا ہے، شیطان اسے کہتا ہے تو نے کیا کیا ہے؟ کچھ نہیں کیا، آپ نے فرمایا پھر ایک اور آتا ہے اور کہتا ہے۔

"ماتر كته حتى فرقت بينه و بين امرأته قال فيد نيه منه ويقول نعم انت"

(مسلم، مشكوة باب الوسوسة)

میں نے اس شخص کو اس وقت تک نہیں چھوڑا یہاں تک کے اس کے اور اس کی عورت کے درمیان جدائی کرادی۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں، شیطان اسے اپنے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے بہت اچھا کام کیا ہے۔

راوی حضرت اعمش کہتے ہیں کے میرا خیال ہے ابو سفیان طلحہ بن نافع مکی نے یہ بھی کہا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی روایت میں یہ بھی کہا ہے " فیلیلتزمه "وہ اسے گلے لگا لیتا ہے۔

شیطان زوجین کی تفریق پر اس لئے خوش ہوتا ہے کے یہ کئی اور فتنوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے، بدکاری کثیر ہوگی، اولاد حرام کی ہوگی، اولاد کو تربیت دینے والا کوئی نہیں ہوگا، جس کی وجہ سے وہ زمین میں فساد پھیلائیں گے، رذیل کلام کریں گے، اچھے کام وہ کم ہی کریں گے، ایسے نیکیوں سے دور، برائیوں کا ارتکاب کرنے والے، چوری، ڈاکہ، فحش حرکات کا ارتکاب کرنے والے حرامی بچوں کے لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا " لا یدخل الجنة ولد زانية " زانیہ کی اولاد جنت میں داخل نہ ہوگی۔

طلاق دینا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے:

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کے بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" ابغض الحلال الی الله الطلاق " (ابو داؤد، مشکوۃ باب الخلع والطلاق)

حلال چیزوں سے اللہ تعالیٰ کو طلاق بہت ناپسند ہے۔

بعض چیزیں رب کو ناپسند ہونے کے باوجود واقع ہو جاتی ہیں، ان میں سے ہی طلاق بھی ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، لیکن اگر کسی نے طلاق دی تو وہ واقع ہو جائے گی، ایسے ہی بغیر عذر کے گھر میں نماز بغیر جماعت کے ادا کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، لیکن نماز ادا ہو جائے گی، مغصوبہ (زبردستی چھینی ہوئی، ناحق قبضہ کیا ہوا) زمین میں نماز ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے، لیکن نماز ادا ہو جائے گی۔ جمعہ کی اذان کے بعد خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب ہے لیکن بیع ہو جائے گی۔

خیال رہے کے عذر کی وجہ سے گھر میں نماز ادا کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اسی طرح کبھی طلاق بھی دینا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آرہا ہے۔

عورت کا بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کرنا عظیم جرم ہے:

حضرت ثوبان کہتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا۔

"ایماامرأۃسألت زوجھاطلاقاغیرمابأس فحرام علیھارائحۃ الجنۃ"

(مسند احمد،ترمذی،ابو داؤد،ابن ماجۃ،دارمی،مشکوۃ،باب الخلع والطلاق)

جوعورت بھی اپنے خاوند سے بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی بو حرام ہوگی۔

☆ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"ایما امرأۃ اختلعت من زوجھا بغیر نشوز فعلیھالعنۃ اللہ والملائکۃو الناس اجمعین"

(مرقاۃ)

جوعورت اپنے خاوند سے خلع کا مطالبہ کرے بغیر کسی اختلاف کے، اس پر اللہ تعالیٰ اور فرشتے اور سب لوگ لعنت بھیجتے ہیں۔

☆ "قال رسول اللہ ﷺ المختلعات ھن المنافقات"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خلع کا (بلاوجہ) مطالبہ کرنے والی عورتیں منافقات ہیں، (یعنی ان میں منافقوں والی علامت ہیں) (رواہ الترمذی، مظھری)

طلاق بحیثیت ثواب وعذاب چار قسم ہے:

طلاق کی چار قسمیں ہیں حرام، مکروہ، واجب، مستحب۔

(۱) **حرام:** حیض کی حالت میں طلاق دینا حرام ہے اگر چہ طلاق واقع ہو جائے گی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی زوجہ کو حالت حیض میں طلاق دی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا "مرہ فلیراجعھاثم لیطلقھاطاھرا او حاملا" اس کو حکم دو کہ وہ رجوع کرلے پھر پاکیزگی یا حالت حمل میں طلاق دے۔

☆ جس طہر میں جماع ہو چکا ہے اس میں طلاق دینا بھی ناجائز ہے، ہاں اگر حمل ظاہر ہو جائے تو پھر طلاق دینا جائز ہے۔

☆ اگر ایک شخص کی کئی زوجہ ہیں، ان میں سے ایک کو تقسیم کے حساب سے اس کی باری پر اسے اس کے حصہ سے محروم کر کے طلاق دینا ناجائز ہے۔

تنبیہ: ناجائز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان صورتوں میں طلاق دینا منع ہے، اگر طلاق دے گا تو گناہ ہوگا لیکن طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہ مطلب نہ سمجھ لیا جائے کہ ان صورتوں میں طلاق واقع ہی نہیں ہوگی۔

(۲) **مکروہ:** جب زوجین (میاں بیوی) کے درمیان کوئی شدید اختلاف نہ ہوں تو بلاوجہ طلاق دینا مکروہ ہے۔ اسی صورت کے متعلق پہلے حدیث پاک ذکر ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مباح چیزوں میں طلاق ناپسند ہے۔

(۳) **واجب:** جب مرد اور عورت کے درمیان شدید اختلافات ہوں۔ رضامندی کی کوئی صورت نہ نکل سکے تو ایسی صورت میں قاضی خاوند کو طلاق دینے پر مجبور کرے، کیونکہ اب طلاق دینا واجب ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں طلاق کا حق استعمال کرنا عورت کے لئے بھلائی کا کام ہے تا کہ وہ آزاد ہو کر کہیں اور نکاح کر کے اپنی زندگی آرام سکون سے بسر کر سکے، اگر اسے طلاق بھی نہ دی جائے اور بسایا بھی نہ جائے تو یہ عورت پر ظلم اور اس کے لئے نقصان اور ضرر کا سبب ہے۔

(۴) **مستحب:** جب عورت نیک اور پاک دامن نہ ہو تو طلاق دینا مستحب ہے۔ اسی طرح خاوند اور بیوی دونوں یا ان میں سے ایک خوف رکھتے ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے حقوق پورے نہیں کر سکیں گے اور شرعی حقوق کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے ہم گنہگار ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"تلک حدود الله ومن يتعد حدود الله فاولئک هم الظالمون"

یہ اللہ کی حدیں ہیں (اس کے نافذ کردہ احکام اس کی حدود ہیں) جو شخص اللہ تعالیٰ کی حدوں سے تجاوز کریں گے وہی ظالم ہوں گے۔

جب یہ خوف ہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل ہم دونوں سے نہیں ہو سکے گی تو ایسی صورت میں طلاق دینا مستحب ہے۔

نبی کریم ﷺ کا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا اسی قسم کا تھا اور پھر ان کے عرض کرنے پر آپ نے رجوع فرما لیا تھا، کیونکہ ایک طلاق دی تھی جو رجعی تھی (ماخوذ از نووی ومدارج النبوہ)

تنبیہ:

"واما ما روی عن الحسن وکان قیل له فی کثرة تزوجه وطلاقه فقال احب اغنی قال الله تعالیٰ (وان یتفرقا یغن الله کلا من سعته) (مرقاة)

یعنی حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما بہت شادیاں کرتے تھے اور طلاق دیتے رہتے تھے، جب آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا میں غنی ہونا پسند کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ (اگر وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے انہیں غنی کر دے گا)

آپ کی یہ دلیل ظاہری اجتہاد پر تھی اس پر فتویٰ نہیں۔ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" فهو رأی منه ان کان علی ظاهره " آپ کی یہ رائے ظاہر پر مبنی ہے جو قابل قبول نہیں۔

یعنی قرآن پاک میں غنی کر دینے سے مراد "ایک دوسرے سے بے پروا کر دینا ہے"

بعض علماء کرام سے یہ بھی سنا ہے کہ آپ کی زوجیت میں آنے کو عورتیں باعث شرف و برکت سمجھتی تھیں۔ عورتوں کو یہ معلوم بھی ہوتا تھا کہ آپ طلاق دے دیتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ تمنا رکھتی تھیں کہ ہمیں آپ کی زوجیت میں آنے کا شرف حاصل ہو جائے۔ آپ عورتوں کی تمنا اور خواہش پر نکاح کرتے تھے۔ (والله اعلم بالصواب)

لیکن اتنی بات واضح ہوئی کہ طلاق کے ارادہ سے نکاح کرنا منع ہے۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ آپ کے قول کو اجتہادی خطاء ہی کہا جائے۔

☆☆☆☆☆

فَاِنْ طَلَّقَهَافَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًاغَیْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاجُنَاحَ عَلَیْهِمَااَنْ یَّتَرَاجَعَااِنْ ظَنَّااَنْ یُّقِیْمَاحُدُوْدَاللّٰهِ وَتِلْکَ حُدُوْدُاللّٰهِ یُبَیِّنُهَالِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۳۰)

﴿۱﴾

پھر اگر تیسری طلاق دے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔ پھر وہ دوسرا اگر اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر گناہ نہیں کہ پھر آپس میں مل جائیں اگر سمجھتے ہوں کہ اللہ کی حد نباہیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں بیان کرتا ہے دانش مندوں کے لئے۔

﴿۲﴾

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو وہ عورت حلال نہیں اس مرد کے لئے اس (تیسری طلاق) کے بعد یہاں تک کہ وہ عورت رہے کسی دوسرے خاوند کے پاس، پھر اگر وہ (دوسرا) اسے طلاق دے دے تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر کہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں اگر سمجھتے ہوں کہ قائم کرسکیں گے اللہ کی حدوں کو اور یہ اللہ کی حدیں ہیں وہ بیان کرتا ہے انہیں اس قوم کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔

مختصر مطلب:

تقریباً ترجمہ سے کافی حد تک واضح ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو تیسری طلاق بھی دے دے تو اب وہ عورت اس شخص کے لئے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ عورت کسی اور شخص سے نکاح کرے اور وہ اس سے مجامعت بھی کرے، اس کے بعد دوسرا خاوند اس عورت کو طلاق دے دے یا فوت ہو جائے تو پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو

جائز ہے۔اور ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھا جائے کہ پہلے خاوند کی طلاق کے بعد عدت گزار کر دوسرے سے نکاح ہو سکے گا،اور دوسرے کی طلاق کے بعد طلاق کی عدت (اور فوت ہونے کے بعد وفات کی عدت) گزار کر پہلے خاوند سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔عدت میں نکاح حرام ہوگا۔

طلاق کی تین اقسام:

(۱)احسن (۲)حسن (۳)بدعی

طلاق احسن:

طلاق حسن یہ ہے کہ طہر میں صرف ایک طلاق دی جائے اوراس میں جماع بھی نہیں کیا گیا تھااور اسے اسی طرح چھوڑ دے تا کہ اس کے عدت گزر جائے جہاں چاہے نکاح کرے۔

☆ **"لما اسند ابن ابی شیبة عن ابراهیم النخعی ان الصحابة رضی الله عنهم کانوا یستحبون ان یطلقها واحدة ثم یترکها حتی تحیض ثلاث حیض"**

مصنف ابن ابی شیبہ میں اسناد صحیح سے حضرت ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ صحابہ کرام مستحب یہ سمجھتے تھے کہ عورت کو صرف ایک ہی طلاق دی جائے،پھر اسے اسی طرح چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ تین حیض گزار لے۔

☆ **"وقال محمد بلغنا عن ابراهیم النخعی ان اصحاب رسول الله ﷺ کانوا یستحبون ان لایزیدوا فی الطلاق علی واحدة حتی تنقضی العدة"**

حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ کے اصحاب مستحب یہی سمجھتے تھے کہ عورت کو ایک طلاق سے زیادہ طلاقیں نہ دی جائیں،یہاں تک کہ عدت ختم ہو جائے۔

ایک طلاق دینے کا فائدہ:

"ولانه ابعد عن الندامة حيث ابقى لنفسه مكنة للتدارك"

ایک طلاق دینے کا یہ فائدہ ہے کہ ندامت سے دور رہے گا کیونکہ غلطی کا تدارک ممکن ہوگا۔

عدت کے اندر رجوع کر سکے گا اور عدت گزرنے پر نکاح کر سکے گا جبکہ دوسرے خاوند سے نکاح کرنا ضروری نہیں ہوگا۔

عورت کو ضرر کم ہوگا، کیونکہ حلت نعمت ہے۔ دورانِ عدت حلت برقرار رہے گی، اسے امید ہوگی کہ ہوسکتا ہے خاوند رجوع کر لے، اس طرح اسے دہشت حاصل نہیں ہوگی، آہستہ آہستہ عدت گزرنے پر برداشت کی طاقت حاصل ہوگی۔ (از فتح القدیر)

حیض کی حالت میں طلاق ناپسندیدہ لیکن واقع ہو جاتی ہے:

"عن عبدالله ابن عمر انه طلق امرأة له وهي حائض فذكر عمر لرسول الله ﷺ فتغيظ فيه رسول الله ﷺ ثم قال يراجعها ثم يمسكها حتى تطهر ثم تحيض فتطهر فان بداله ان يطلقها فليطلقها طاهرا او حاملا" (بخاری و مسلم، مشکوۃ باب الخلع و الطلاق)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجہ کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کی نبی کریم ﷺ کو اطلاع دی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا، پھر کہا اسے کہو وہ رجوع کر لے، پھر اپنی زوجہ کو اپنے پاس روک رکھے، یہاں تک کہ طہر گزر جائے، پھر حیض گزر جائے، پھر اگر طلاق دینا چاہے تو پاکیزگی کی حالت میں یا حمل کی حالت میں طلاق دے دے۔

حدیث پاک سے بہت واضح ہے کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے پر نبی کریم ﷺ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا، لہٰذا حیض کی حالت میں طلاق دینا شریعت میں ناپسندیدہ عمل ہے۔

اور واضح ہوا کہ حیض کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے رجوع کرنے کا حکم دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو طلاق حیض میں دی جائے وہ واقع ہی نہیں ہوتی۔

طہر (پاکیزگی) میں طلاق دی جائے، وہ بھی اگر ضرورت درپیش آئے، لیکن بلاضرورت طلاق دینا رب تعالیٰ کو ناپسند ہے۔

حدیث پاک سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ حاملہ عورت کو طلاق دی جائے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے، کیونکہ ضرورت پڑنے پر حمل کی حالت میں طلاق دینے کی اجازت رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔

طلاق حسن:

طلاق حسن یہ ہے کہ جس عورت سے مجامعت کر چکا ہو یا خلوت صحیحہ پائی گئی، اسے تین طہروں (پاکیزگیوں) میں تین طلاقیں دے، یعنی ہر طہر میں ایک طلاق دے اور اس کے بعد رجوع نہ کرے۔

مجامعت یا خلوت صحیحہ کی قید کا یہ فائدہ ہے کہ اگر کسی اور عورت سے نکاح ہوا ہے، ابھی رخصتی نہیں ہوئی، اس مدت میں جماع نہیں کیا گیا اور علیحدگی میں ان کی کوئی ملاقات ایسے وقت اور ایسے حال میں نہیں ہوئی، جو وطی سے مانع تھے، تو اسے ایک طلاق دینے سے وہ بائن ہو جائے گی۔

اس پر بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہی شاہد ہے، کیونکہ بعض روایات میں یہ الفاظ گرامی پائے گئے ہیں۔

"ماھکذاامرک اللہ قد اخطأت السنة،السنة ان تستقبل الطهر فتطلق لكل قرء"

اے ابن عمر حیض میں طلاق دینے کا حکم تمہیں اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔ تم نے سنت کی خلاف ورزی کی، سنت یہ ہے کہ طہر کی انتظار کرو، اور پھر طہر میں طلاق دو۔ (فتح القدیر)

تدریجاً طلاق دینے کا حکم رب تعالیٰ کی رحمت ہے:

اس آیۃ کریمہ سے پہلی آیۃ میں ایک اور دو طلاقوں کے بعد رجوع کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس سے بھی یہ سمجھ آیا کہ طلاقیں ایک ایک کر کے دینا بہتر ہے۔

انسان جب تک اپنی زوجہ کے ساتھ ہوتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ جدائی بہت مشقت آمیز کام ہے۔

" **فاذافارقه فعند ذلک یظهر** " جب زوجہ کو جدا کر دیتا ہے تو پھر اسے پتہ چلتا ہے کہ ہاں جدائی کتنی مشقت آمیز ہے۔ اسی وجہ سے ایک طلاق دینے کا حکم دیا گیا ہے اور ایک طلاق کے بعد رجوع کا حق دیا گیا، اگر رجوع کا حق نہ دیا جاتا۔ "لعظمت المشقة علی الانسان بتقدیر ان تظهر المحبة بعد المفارقة "

تو انسان کو بہت مشقت میں مبتلا ہونا پڑتا، کیونکہ زوجہ کو جدا کرنے کے بعد محبت واپس لوٹ آتی ہے۔

لیکن ایک مرتبہ کامل تجربہ کامل نہیں ہوتا، انسان پھر طلاق دینے کا بھی ارادہ کر لیتا ہے، پھر بھی ایک طلاق دینے پر رجوع کا حق دیا گیا ہے، کیونکہ انسان کو دو مرتبہ جدائی سے کافی حد تک تجربہ حاصل ہو جاتا ہے۔

" وعرف حال قلبه فی ذلک الباب " وہ اپنے دل کے حال کو پہچان لیتا ہے، اگر رجوع کرنا بہتر سمجھے تو رجوع کر لے، اگر اس کا دل نفرت کرتا ہو تو رجوع نہ کرے، یا تیسری طلاق دے کر اسے مکمل طور پر آزاد کر دے

" وهذا التدریج والترتیب یدل علی کمال رحمته ورافته بعبده "

یہ تدریج اور ترتیب اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر کامل رحمت اور مہربانی پر دلالت کرتی ہے۔ (ار کبیر بتصرف)

طلاق بدعی:

تین طلاقیں ایک ہی کلمہ سے دے یا ایک طہر میں تین طلاقیں دے، اسے " **طلاق البدعة**" کہا جاتا ہے۔

" فاذا فعل ذلک وقع الطلاق وکان عاصیا "

جب کوئی شخص طلاق بدعی دے تو طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، البتہ طلاق دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔ (هدایه)

ایک مرتبہ تین طلاقیں دینے پر احناف کا مذہب:

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہی ہے کہ ایک مرتبہ تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اگرچہ ایک مرتبہ تین طلاقیں دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔

احناف کے دلائل:

ایک مرتبہ تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں ہی واقع ہوتی ہیں، اس کا ثبوت حدیث پاک سے بھی ہے اور اجماع امت سے بھی۔

احادیث مبارکہ سے ثبوت:

"عن ابن عمر انه طلق امرأته وهي حائض ثم اراد ان يتبعها بطلقتين اخريين عند القرأين فبلغ ذلك رسول الله ﷺ فقال يا ابن عمر ما هكذاامرك الله قد اخطأت السنة ، السنة ان تستقبل الطهر فتطلق لكل قرء فامرني فراجعتها فقال اذهي طهرت فطلق عند ذلك او امسك فقلت يا رسول الله ارائيت لو طلقتها ثلاثاكان يحل لي ان راجعها قال لا كانت تبين منك و كانت معصية" (رواه الدار قطني)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی زوجہ کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی، پھر ارادہ کیا کہ اس کے پیچھے دو طلاقیں اور دو طہروں میں دے دوں گا، یہ خبر نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا، اے ابن! عمر اللہ تعالیٰ نے اس طرح تو حکم نہیں فرمایا، تحقیق تم نے سنت سے خطاء کر دی، یعنی سنت کے خلاف کام کیا۔ سنت یہ ہے کہ تم طہر کی انتظار کرو، پھر ہر طہر میں ایک طلاق دو، ابن عمر فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ میں رجوع کرلوں، پھر آپ نے فرمایا جب وہ (حیض سے) پاک ہو جائے پھر طلاق دو یا روک کر رکھو۔

میں نے عرض کیا آپ کی اس میں کیا رائے ہے کہ اگر میں اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیتا تو کیا وہ میرے لئے حلال رہتی، آپ نے فرمایا نہیں وہ تم سے جدا ہو جاتی ہے تمہیں اس سے معصیت لازم آئی۔

"ورواه ابن ابي شيبة في مصنفه عن الحسن قال حدثناابن عمر قدصرح بسماعه عنه"

یہی مذکور بالا حدیث ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے اپنی مصنف میں حضرت حسن کی روایت حضرت ابن عمر سے نقل فرمائی ہے۔ جس میں صراحۃً ذکر ہے کہ حضرت حسن نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے خود یہ حدیث سنی۔

اعتراض:

"واعلہ البیھقی بعطاء الخراسانی قال انی بزیا دات لم یتابع علیھا وھو ضعیف لا یقبل ما تفردبہ"

بیہقی نے اس حدیث کا ضعیف ہونا ثابت کیا ہے کہ اس کے راویوں میں عطاء خراسانی ہے، جو ضعیف ہے کیونکہ وہ زیادہ چیزوں کو پیش کر دیتا ہے جس میں اس کے متابع (موافق) کوئی اور روایت نہیں پائی جاتی، لہٰذا اس روایت میں عطاء خراسانی متفرد (اکیلا) ہے۔ لہٰذا یہ روایت قابل قبول نہیں۔

جواب:

"قال ابن الھمام تعلیل البیھقی مردود حیث تابعہ شعیب بن رزیق سنداو متنا"

(رواہ الطبرانی)

حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بیہقی کا اس حدیث کو ضعیف کہنا ہی مردود ہے اور غلط ہے کیونکہ بیہقی نے اس کی علت علت (وجہ ضعف) یہ بیان کی ہے کہ اس کا راوی عطاء خراسانی متفرد ہے اس روایت کے موافق اور کوئی روایت نہیں، بیہقی کا یہ کہنا غلط ہے، کیونکہ اسی سند اور اسی متن سے طبرانی نے شعیب بن رزیق سے روایت بیان کی ہے، لہٰذا اس حدیث کی متابع حدیث پائی گئی ہے، اس حدیث کو ضعیف کہنا قول ہی ضعیف ہے۔ (از مظہری)

عطاء الخراسانی کے متعلق اصحاب الجرح والتعدیل کی آراء:

(۱) " عطاء ابن ابی مسلم الخراسانی ارسل عن معاذ وطائفة من الصحابة وروی عن عکرمة و یحیی بن یعمر والطبقة وعنه ابنه عثمان والاوزاعی ومالک وشعبة قال ابن جابر کنا نغزو معه فیحی اللیل صلوٰۃ الانومه السحرمات سنة ۱۳۸ھ (از الکاشب للذهبی) قال ابن سعد کان ثقة روی عنه مالک و کان ابن حبان کان ردی الحفظ (الحاشیة علی الکاشف للذهبی)

عطاء ابن ابی مسلم خراسانی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور کچھ صحابہ کرام سے مرسل روایات بیان کرتے ہیں، عکرمہ اور یحییٰ بن یعمر اور کچھ حضرات سے بھی روایات بیان کرتے ہیں، عطاء سے روایت کرنے والوں میں آپ کا بیٹا عثمان، اوزاعی، حضرت امام مالک اور شعبہ ہیں۔ ابن جابر کہتے ہیں ہم ایک غزوہ میں آپ کے ساتھ تھے، آپ تمام رات نوافل ادا کرتے تھے، تھوڑی دیر پچھلی رات آرام کرتے، آپ کی وفات ۱۳۸ھ میں ہوئی۔ (الکاشف للذهبی)

اس کتاب کے حاشیہ میں ہے کہ ابن سعد نے کہا عطاء خراسانی ثقہ راوی تھے کیونکہ امام مالک آپ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حبان نے کہا آپ کا حافظہ درست نہیں تھا۔

یہاں سے واضح ہوا کہ ابن سعد کے نزدیک عطا ثقہ راوی تھے، یہ ضروری نہیں کہ ابن حبان پر ہی اعتماد کیا جائے۔

(۲) عطاء ابن ابی مسلم الخراسانی روی عن ابی الدرداء ومعاذ وابن عباس مرسلا وروی عن یحی ابن یعمر و نافع و عکرمة وعنه ابن جریج والاوزاعی ومالک وشعبة وحماد بن سلمة قال عبد الرحمن بن یزید کان یحیی اللیل وثقه ابن معین وابو حاتم"

(از خلاصه تذهیب التهذیب الکمال، ج ۲، ص ۲۳۱)

عطاء بن ابی مسلم خراسانی حضرت ابو الدرداء، حضرت معاذ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مرسل روایات بیان کرتے ہیں اور یحییٰ ابن یعمر اور نافع اور عکرمہ سے بھی روایات بیان کرتے

ہیں اور عطاء سے ابن جریج ، اوزاعی ، امام مالک، شعبہ اور حماد بن مسلمہ روایت کرتے ہیں عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں وہ رات کو بیدار رہنے (جاگنے) والے شخص تھے، ابن معین اور حاتم نے آپ کو ثقہ راوی کہا ہے۔

(۳) " وقال احمد یحییٰ والعجلی وغیر هم ثقة وقال یعقوب بن شیبة ثقة معروف بالفتوی والجهاد قال ابو حاتم ثقة محتج به (میزان الاعتدال، ج۳،ص ۷۴)

احمد اور یحییٰ اور عجلی وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے، اور یعقوب بن شیبہ نے کہا یہ ثقہ راوی ہیں۔فتوی اور جہاد میں مشہور ہیں، ابو حاتم نے کہا ثقہ راوی ہیں، ان کی روایت سے دلیل پکڑی جائے۔

واضح ہوا کہ عطاء خراسانی کو زیادہ حضرات نے ثقہ راوی کہا ہے، ایسی کوئی قوی وجہ نظر نہیں آتی کہ عطاء بن ابی مسلم خراسانی کے متعلق صرف ابن حبان کے قول کو ترجیح دی جائے اور ابن سعد، اور ابن معین، ابو حاتم، احمد، عجلی اور یعقوب بن شیبہ کے ثقہ کہنے کا اعتبار نہ کیا جائے۔

مسئلہ نکھر کر واضح ہو گیا کہ دار قطنی کی روایت کو بیہقی کا ضعیف کہنا " عطاء خرسانی کہ وجہ سے جن کو صرف ابن حبان نے ضعیف کہا باقی اہلِ علم نے قوی کہا" درست نہیں، پھر ان کی روایات متفرد نہیں، بلکہ اس کے متابع موجود ہے۔ (راقم)

☆ " واخر ج عبدالرزاق والبیهقی عن زید بن وهب ان بطالا کان بالمدینة فطلق امرأته الفافرفع ذلک الی عمر بن الخطاب فقال انما کنت العب فعلا ہ عمر بالدرة وقال ان کان لیکفیک ثلاث " (درمنثور)

حضرت زید بن وہب فرماتے ہیں ایک مسخرہ شخص مدینہ طیبہ میں تھا، اس نے اپنی عورت کو ہزار طلاقیں دے دیں، پھر وہ اپنا معاملہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس لایا، تو اس نے کہا میں تو ہنسی کھیل کر رہا تھا۔تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا درہ اس پر بلند کرتے ہوئے فرمایا، تجھے تین طلاقیں ہی کافی تھیں۔

حدیث پاک سے حاصل ہونے والے فوائد:

جب طلاق کا لفظ استعمال کیا جائے تو طلاق واقع ہو جائے گی، خواہ وہ طلاق مزاح کے طور پر ہی دے رہا ہو۔ لہٰذا طلاق دے کر پھر یہ کہنا کہ میری نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، اس حیلے اور بہانے سے شریعت اس کی طلاق واقع ہونے سے اسے بچنے نہیں دیتی۔

اور ایک دفعہ ہی تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ہی ہزار طلاق دینے پر تین کو نافذ کر دیا۔

☆ " واخرج عبدالرزاق والبیھقی عن علقمة بن قیس قال اتی رجل ابن مسعود فقال ان رجلا طلق امراته البارحة مائةقال قلتها مرة واحدة قال نعم قال اترید ان تبین منک امرأتک قال نعمقال هو کما قلت" (درمنثور)

حضرت علقمہ بن قیس کہتے ہیں ایک شخص حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے وہ کہنے لگے بے شک ایک شخص نے (یعنی میں نے) گذشتہ رات اپنی زوجہ کو ایک سو طلاقیں دے دیں، آپ نے فرمایا سب ایک مرتبہ ہی دے دیں؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا تم نے اسی لئے تو یہ طلاقیں دی ہیں کہ وہ تم سے جدا ہو جائے، اس نے کہا ہاں یہی مطلب تھا، تو آپ نے فرمایا، بس وہی ہو گیا جو تمہارا مطلب تھا۔

یعنی تین طلاقیں تو واقع ہو گئیں اور باقی لغو چلی گئیں۔ واضح ہوا کہ ایک دفعہ ہی تین طلاقیں دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔

☆ " واخرج البیھقی عن قیس بن حزم قال سأل رجل المغیرة شعبة وانا شاهد عن رجله طلق امرأته مائة قال ثلاث تحرم وسبع وتسعون فضل" (درمنثور)

حضرت قیس بن حزم کہتے ہیں کہ ایک شخص نے میری موجودگی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ

سے سوال کیا کہ ایک شخص اپنی زوجہ کو ایک سو طلاقیں دے دے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ وہ تین سے حرام ہو جائے گی اور ستانوے زائد ہوں گی (یعنی ضائع چلی جائیں گی)

☆ واخرج ابن عدی والبیهقی عن الاعمش قال بان بالکوفة شیخ یقول سمعت علی ابن ابی طالب یقول اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا فی مجلس واحد فانه یرد الی واحدة والناس عنقاداحدا اذاک یاتونه ویسمعون منه قال فاتیته فقرعت علیه الباب فخرج الی شیخ فقلت له کیف سمعت علی بن ابی طالب یقول فیمن طلق امرأته ثلاثا فی مجلس واحد قال سمعت علی بن ابی طالب یقول اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا فی مجلس واحد فانه یرد الی واحدة قال فقلت له انی سمعت هذا من علی قال اخرج الیک کتابافاخرج فاذافیه بسم الله الرحمن الرحیم قال سمعت علی بن ابی طالب یقول اذاطلق الرجل امرأته ثلاثافی مجلس واحد فقد بانت منه ولا تحل له حتی تنکح زوجاغیره قلت ویحک هذا غیر الذی تقول قال الصحیح هو هذا ولکن هؤلاء ارادونی علی ذلک" (درمنثور)

اعمش کہتے ہیں کہ کوفہ میں ایک بوڑھا شخص ظاہر ہوا جو یہ کہتا تھا کہ میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ جب کوئی شخص اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دے تو وہ ایک ہی طلاق ہوگی، لوگ اس کے پاس آ رہے ہیں گردن اٹھا کر دیکھ رہے ہیں اور اس کی بات کو سن رہے ہیں، اعمش کہتے ہیں میں اس کے پاس آیا، اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ شیخ میری طرف نکلا، تو میں نے اسے کہا تم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیسے سنا، اس شخص کے متعلق جو اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دے ایک ہی مجلس میں؟ اس نے کہا حضرت علی بن طالب رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرمارہے تھے جب کوئی شخص اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دے تو وہ ایک طلاق شمار ہوگی۔ اعمش کہتے ہیں میں نے اسے کہا یہ تم نے کہاں ان سے سنا ہے؟ اس نے کہا میں تمہیں ایک خط (دستاویز جس پر حدیث لکھی ہوئی ہے) نکال کر دیتا ہوں، تو جب اس نے وہ

خط نکال کر دیا تو اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد یہ لکھا ہوا تھا میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا جب کوئی شخص اپنی زوجہ کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دے تو وہ اس سے بائن (جدا) ہو جائے گی اور وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو گی، یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند کے پاس رہے۔ میں نے کہا تمہارے لئے بربادی اس میں تو تمہارے کہنے کے خلاف لکھا ہوا ہے۔ اس نے کہا صحیح حدیث یہی ہے، لیکن لوگوں نے مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ میں یوں بیان کروں تو میں نے بھی ان کے کہنے کے مطابق بیان کر دیا۔

واضح ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف یہ منسوب کرنا ہی باطل ہے کہ وہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک شمار کرتے تھے، بلکہ آپ فرماتے تھے ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں، وہ عورت بائن ہو جاتی ہے۔

☆ **"واخرج البیهقی عن مسلمة بن جعفر الاحمس قال قلت لجعفر بن محمد یزعمون ان من طلق ثلا ثا بجها لة ردالی السنة یجعلو نه واحد ة یر دونها عنکم قال معاذ الله ما هذامن قولنا من طلق ثلا ثا فهو کما قال"** (در منثور)

مسلمہ بن جعفر الاحمس کہتے ہیں میں نے جعفر بن محمد کو کہا کہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ کوئی شخص جہالت سے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دے تو ان کو سنت کی طرف لوٹا کر ایک شمار کیا جائے۔ اس روایت کو لوگ تمہاری طرف منسوب کرتے ہیں کہ یہ تم نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا معاذ اللہ (اللہ کی پناہ) ہمارا یہ قول نہیں۔ بلکہ جو تین طلاقیں ایک مجلس میں دے گا وہ تین ہی واقع ہوں گی۔

☆ **"واخرج ابن ماجه عن الشعبی قال قلت لفاطمه بنت قیس حدثینی عن طلاقک قالت طلقنی زوجی ثلاثا وهو خارج الی الیمن فاجاز ذلک رسول الله ﷺ"** (درمنثور)

شعبی کہتے ہیں میں نے فاطمہ بنت قیس کو کہا کہ مجھے تم اپنی طلاق کے متعلق بتاؤ، وہ کہنے لگیں مجھے میرے خاوند نے تین طلاقیں دے دیں جب وہ یمن کی طرف جانے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے جائز رکھا۔

یعنی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کیا گیا، رسول اللہ ﷺ نے اسے رد نہیں فرمایا۔

مسئلہ : جس عورت کو وطی اور خلوت صحیحہ سے پہلے تین طلاقیں ایک مرتبہ دے دی جائیں، اسے تین طلاقیں ہی واقع ہوں گی، اس سے اس وقت تک دوبارہ نکاح نہیں ہو سکے گا جب تک وہ کسی اور خاوند کے پاس نہ رہے۔

اور اگر عورت کو وطی اور خلوت صحیحہ سے پہلے ایک طلاق دے تو وہ ایک ہی طلاق سے بائن ہو جائے گی، اس سے رجوع جائز نہیں ہوگا، بلکہ دوبارہ نکاح کی ضرورت ہوگی اگر ایک طلاق کے بعد اسے ہی دوسری اور تیسری طلاق دی گئی تو وہ واقع نہیں ہوگی، کیونکہ محل ختم ہو چکا ہے۔

مسئلہ مذکورہ پر احادیث:

"واخرج البیھقی عن ابن مسعود قال المطلقة ثلاثا قبل ان ید خل بھا بمنزلة التی قد دخل بھا" (درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس عورت سے وطی نہ کی گئی ہو (اور خلوت صحیحہ بھی نہ پائی گئی ہو) اسے تین طلاقیں دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ اسے تین طلاقیں دی جائیں جس میں وطی کر لی گئی ہو۔

اس حدیث پاک سے بھی یہ ثابت ہوا کہ تین طلاقیں ایک مرتبہ دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔

☆ "واخرج مالک والشافعی وابو داؤد والبیھقی عن محمد بن ایاس بن البکیر قال طلق رجل امرأته ثلاثا قبل ان ید خل بھا ثم بداله ان ینکحھا فجاء یستفتی فذھبت معه اسأل له فسأل اباھریرة وعبداللہ بن عباس عن ذلک فقالا لا نری ان تنکحھا حتی تنکح زوجا غیرک قال انما کان طلاقی ایاھا واحدة قال ابن عباس انک ارسلت من یدک ما کان لک من فضل" (درمنثور)

محمد بن ایاس بن بکیر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو وطی (اور خلوت صحیحہ) سے پہلے تین طلاقیں دے دیں، پھر ارادہ ہوا کہ میں اس سے نکاح کر لوں، وہ شخص مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا

میں اس کے ساتھ چلا تا کہ اس کے متعلق پوچھوں، تو اس نے حضرت ابوھریرہ اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) سے اس کے متعلق سوال کیا تو ان دونوں نے کہا ہم تو جائز نہیں سمجھتے کہ تم اس سے نکاح کرلو، یہاں تک کہ وہ عورت تمہارے بغیر کسی اور خاوند کے پاس رہے۔ اس شخص نے کہا میری طلاق اس کے لئے ایک ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تم نے اپنے ہاتھ سے باقی کو بھی چھوڑ دیا۔ یعنی تم نے تینوں طلاقوں کا استعمال جب ایک مرتبہ کرلیا تو اب تین طلاقیں واقع ہوگئیں، جو تمہارا خیال ہے کہ ایک ہی طلاق سے وہ بائن ہوگئی اور باقی نہیں واقع ہوئیں یہ اس وقت ہوتا جب تم ایک ایک کرکے دیتے۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ تین طلاقیں ایک مرتبہ دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔

☆ "واخرج مالک والشافعی عن عطاء بن یسار قال جاء رجل یسأل عبداللہ بن عمرو بن العاص عن رجل طلق امرأته ثلاثا قبل ان یمسها فقلت انما طلاق البکر واحدة فقال لی عبداللہ بن عمرو انما انت قاضی الواحدۃ بینها والثلاث تحرمها حتی تنکح زوجا غیره" (درمنثور)

عطاء بن یسار کہتے ہیں ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے پاس سوال کرنے کے لئے آیا کہ ایک شخص اپنی زوجہ کو چھونے سے پہلے تین طلاقیں دے دے تو اس کا حکم کیا ہے۔ عطاء کہتے ہیں میں نے کہا باکرہ (جسے چھوا نہ جائے) اسے ایک ہی طلاق ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے کہا قاضی تم ہی ہو؟ (ایسا نہیں جیسا تم نے کہا) ایک طلاق سے وہ بائنہ ہوجاتی ہے اور تین طلاقیں ایک دفعہ ہی دی جائیں تو وہ عورت اپنے پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں رہتی، یہاں تک کہ وہ دوسرے خاوند کے پاس رہے۔

یہاں تک بیان کی گئی احادیث سے مسئلہ روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آگیا کہ تین طلاقین ایک مرتبہ دینے سے تین طلاقیں ہی واقع ہوتی ہیں۔

شیعہ اور غیر مقلدین کا مسلک:

یہ دونوں فرقے یعنی شیعہ اور غیر مقلدین کہتے ہیں کہ تین طلاقیں ایک مرتبہ دے دی جائیں تو ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔

یہ دونوں فرقے دراصل کم تعداد میں ہیں کہ کسی طرح ہمارا کوئی نہ کوئی ہمنوا بن جائے۔ کئی لوگ تین طلاقیں دے کر غیر مقلدین سے فتویٰ لکھا کر لے آتے ہیں کہ ایک ہی طلاق واقع ہوئی، وہ ہمیشہ کے لئے حرام کے مرتکب ہو جاتے ہیں، لیکن حرام کا مرتکب بنا کر وہ غیر مقلد بنا لیتے ہیں۔

حضرت علامہ الشاہ تراب الحق صاحب مدظلہ العالی نے ایک مرتبہ خطاب میں ارشاد فرمایا کہ تین طلاقوں کے بعد حرام کو حلال سمجھنے والوں نے اور حرام کی اولاد نے گستاخ رسول ہی بننا ہے اور ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

غیر مقلدین کے دلائل اور ان کے جوابات:

اس مسئلہ کو راقم حضرت علامہ محمود احمد رضوی شارح بخاری کے ایک مضمون سے بمع اضافات اور وضاحت سے ذکر کر رہا ہے۔

اس مسئلہ پر صاحب فیض الباری فرماتے ہیں، ابن تیمیہ اور ان کے اصحاب (غیر مقلدین) کا جمہور صحابہ و تابعین اور وائمہ دین کے موقف کے خلاف رائے رکھنا تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، ہر دور میں دو چار افراد ایسے ہوتے ہیں جو جمہور مسلمین کے خلاف رائے رکھتے ہیں، ابن تمیہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ (جو غیر مقلدین کا امام ہے اسی کے نظریات غیر مقلدین کے نظریات ہیں)

ابن تیمیہ (اور اس کے متبعین غیر مقلدین بلکہ مقلدین ابن تیمیہ) کا موقف یہ ہے کہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقیں تین نہیں ایک قرار پاتی ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ جمہور ائمہ دین کے موقف کو غلط قرار دینا اور ابن تیمیہ کے قول کو حق قرار دینے کا کسی کو کوئی حق

نہیں۔اس لئے کہ ابن تیمیہ کے پاس یکدم دی گئی تین طلاقوں کوایک قرار دینے کے لئے صرف تین روایتیں ہیں۔ اول صحیح مسلم کی روایت جو طاؤس کا وہم اور شاذ روایت ہے۔دوم مسند احمد کی روایت جومضطرب،منکر اورضعیف روایت ہے۔اورسوم ابوداؤد کی روایت جومجہول،منکر اورمتروک روایت ہے۔

یہ ہے ابن تیمیہ کے پاس دلائل کا قابل ذکر سرمایہ،جس کی بنیاد پروہ تین طلاقوں کوایک قرار دیتے ہیں۔اس اجمال کی نہایت مختصر توضیح یہ ہے۔

روایت ابوداؤد:

" حدثنااحمدبن صالح اخبر ناعبدالرزاق اخبرناابن جریج اخبر نی بعض بنی ابی رافع مولی النبی ﷺ عن عکرمة مولی ابن عباس عن ابن عباس قال قال طلق عبد یزید ابورکانة (الی)قال(النبی ﷺ)راجع امرأتک ام رکانة واخوته فقال انی طلقتها ثلاثا یارسول اللہ قال قد علمت راجعها وتلا (یاایهاالنبی اذاطلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں،یزید کے غلام ابورکانہ نے اپنی زوجہ ام رکانہ کوطلاق دے دی تونبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایاتم رجوع کرلو۔تووہ عرض کرنے لگایارسول اللہ!میں نے اسے تین طلاقیں دے دی ہیں،آپ نے فرمایا مجھے معلوم ہے،تم اس کی طرف رجوع کرلو۔اور آپ نے یہ آیۃ (بطور دلیل) تلاوت کی یاایهاالنبی اذاطلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن

(ابو داؤد باب نسخ المراجعة بعد تطلیقات الثلاث)

اس حدیث سے ابن تیمیہ اوراس کے متبعین نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ تین طلاقیں دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے اوراس کے بعدرجوع ہوسکتا ہے۔

دلیل کارد:

یہ دلیل مختلف وجوہ سے بہت ہی ناقص اورکمزور ہے،جس سے حرام کوحلال ثابت کرنا درحقیقت اپنی عاقبت ہی خراب کرنا ہے۔

رد کی پہلی وجہ:

حدیث کی سند تمام راقم نے ذکر کر دی ہے جس میں راوی ''بعض بن ابی رافع'' ہے، یعنی ابو رافع کے کسی بیٹے نے یہ حدیث بیان کی ہے۔ یہ راوی مجہول ہے۔ راوی کا جب تک نام نہ ذکر کیا جائے وہ مجہول ہوتا ہے، اس کی حدیث بطور دلیل نہیں پیش کی جا سکتی۔

مجہول راوی کا حکم:

"واما جهالة الراوی فانه ایضا سبب للطعن فی الحدیث لانه لما لم یعرف اسمه وذاته لم یعرف حاله وانه ثقة اوغیر ثقه کما یقول حدثنی رجل اواخبرنی شیخ ویسمی هذامبهماوحدیث المبهم غیرمقبول الاان یکون صحابیا لانهم عدول وان جاء المبهم بلفظ التعدیل کما یقول اخبرنی عدل اوحدثنی ثقة ففیه اختلاف والاصح انه لا یقبل" (مقدمہ مشکوۃ)

راوی کا مجہول ہونا حدیث میں طعن کا سبب ہے، کیونکہ جب تک راوی کا نام اور ذات اور حال نہ پتہ چلے کہ وہ راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ، جیسے کوئی کہے کہ ایک شخص نے مجھے حدیث بیان کی، یا یہ کہے کے مجھے شیخ نے حدیث بیان کی، وہ حدیث مبہم کہلاتی ہے۔ مبہم حدیث مقبول نہیں۔ سوائے اس کے صحابی کا نام وغیرہ ذکر نہ ہو صرف اتنا مذکور رہو کے ایک صحابی نے مجھے حدیث بیان کی ہے، تو وہ مقبول ہو گی کیونکہ تمام صحابہ کرام عادل اور ثقہ ہیں۔ صحابی کے بغیر کسی اور کے متعلق یہ بھی کہہ دیا جائے مجھے عادل شخص نے حدیث بتائی ہے یا یہ کہے مجھے ثقہ راوی نے حدیث بیان کی ہے تو صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث بھی مقبول نہیں۔

رد کی دوسری وجہ:

اس حدیث پر خود محدث ابوداؤد نے اعتبار نہیں کیا۔ بلکہ اس کے خلاف دوسری روایت کو ترجیح دی ہے جس میں ابورکانہ کی طلاق کا ہی ذکر ہے۔

" قال ابو داؤد وحديث نافع بن عجير وعبدالله بن علي بن يزيد بن ركانة عن ابيه عن جده ان ركانة طلق امرأته البتة فردها اليه النبي ﷺ اصح لانهم ولد الرجل واهله اعلم به ان ركانة انما طلق امرأته البتة فجعلها النبي ﷺ واحدة "

(ابو داؤد حوالہ مذکور)

ابوداؤد کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے زیادہ صحیح روایت نافع بن عجیر اور عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانۃ کی اپنے باپ دادا سے ہے کہ بے شک رکانہ نے اپنی زوجہ کو طلاق البتہ دی تھی، تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی زوجہ کو ان پر لوٹا دیا تھا۔ یہ حدیث اس لئے زیادہ صحیح ہے کہ ایک شخص کی اولاد اور اس کے گھر والے حضرات زیادہ اس کے واقعہ کو جانتے ہیں، وہ یہی ہے کہ رکانہ نے اپنی زوجہ کو طلاق البتہ دی، تو نبی کریم ﷺ نے اسے ایک شمار کیا۔

طلاق البتہ یہ ہے کہ زوجہ کو کہا جائے۔ " انت بتة " اس میں نیت طلاق کی ہو تو طلاق واقع ہوتی ہے اور نیت نہ ہو تو طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اگر نیت ہو تو ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے، جس میں تجدید نکاح کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمرو بن شعیب نافع بن عجیر کی روایت میں یہ الفاظ بھی واضح طور پر موجود ہیں۔

"ان النبی ﷺ ردها عليه بنكاح جديد" بے شک نبی کریم ﷺ نے ان پر ان کی زوجہ کو نکاح جدید سے لوٹا دیا۔

رد کی تیسری وجہ:

ابوداؤد نے عنوان ہی یہ قائم کیا "باب نسخ المراجعة بعد تطليقات الثلاث" (تین طلاقوں کے بعد رجوع کرنے کے منسوخ ہونے کے بیان میں)

اس عنوان کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ضعف بیان کیا جائے جیسا کہ رد کی دوسری صورت میں واضح کر دیا گیا ہے۔

مقام افسوس یہ ہے کہ ابوداؤد حدیث کو ضعیف کہیں اور اس کو رد کریں، اور عنوان ہی قائم کریں کہ تین طلاق کے بعد رجوع کرنا منسوخ ہے، لیکن غیر مقلدین اسی حدیث کو اپنی دلیل بنائیں کہ ابوداؤد میں یہ حدیث ہے۔ ابوداؤد کی بات مانیں یا کہ غیر مقلدین کی؟

"ان رکانة طلق زوجته البتة فجعله رسول الله ﷺ انه ما اراد الا واحدة فردها اليه فطلقها الثانية في زمن عمر و الثالثة في زمن عثمان"

(درمنثور، مظہری، مشکوۃ باب المطلقة ثلاثا)

بے شک رکانہ نے اپنی زوجہ کو طلاق البتہ دی، اس نے ایک کا ہی ارادہ کیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر ایک کا ہی حکم نافذ کیا اور اس پر اس کی زوجہ کو لوٹا دیا۔ پھر دوسری طلاق اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اور تیسری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دی۔

واضح ہوا کہ تین کے بعد لوٹانے والی حدیث ضعیف، مبہم، منکر اور شاذ ہے، اس درجہ کی حدیث سے احکام ثابت نہیں۔ حرام کو حلال کرنا کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟

حدیث مسند احمد:

ابن تیمیہ اور ان کے ہمنوا حدیث مسند احمد سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

"وقال الامام احمد حدثنا سعيد بن ابراهيم قال انبانا ابي عن محمد بن اسحق قال حدثني داؤد بن الحصين عن عكرمة عن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال طلق ركانة بن عبد يزيد زوجة ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا فسأله النبي ﷺ كيف طلقتها قال طلقتها ثلاثه في مجلس واحد قال انما تلك طلقة واحدة فارتجعها" ۔

مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ (ابو) رکانہ نے اپنی زوجہ کو ایک ہی

مجلس میں تین طلاقیں دے دیں تو اس پر بہت زیادہ غمزدہ ہوئے (تو نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق سوال کیا) نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے کیسے طلاق دی؟ تو انہوں نے کہا میں نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دی ہیں، آپ نے فرمایا یہ ایک ہی طلاق ہے تم اس کی طرف رجوع کرلو۔

اس دلیل کا رد:

مسند احمد میں صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام نہیں کیا گیا، اس میں ضعیف، حسن اور صحیح ہر قسم کی احادیث موجود ہیں اس لئے مسند احمد کو صحاح ستہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔

یہ حدیث صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ ضعیف حدیث سے حرام کو حلال نہیں کہا جا سکتا، یہ حدیث ضعیف کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کے راویوں میں ایک راوی ابن سحاق ہے جو مجروح ہے اور دوسرا راوی داؤد اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے، جیسا کہ ابن جوزی نے اس بات کی تصریح کی ہے۔ (العلل المتناهیه ج ۲، ص ۱۵۱)

امام جصاص نے اس حدیث کا منکر ہونا بیان کیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

نیز کتب اسماء الرجال میں محمد بن اسحاق کو کذاب قرار دیا گیا ہے۔

حدیث مسلم:

"اسحاق بن ابراهیم ومحمد بن رافع واللفظ لابن رافع قال اسحق انا وقال ابن رافع نا عبد الرزاق قال انا معمر عن ابن طاؤس عن ابیه عن عباس قال کان الطلاق علی عهد رسول الله ﷺ وابی بکر وسنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لهم فیه اناة فلو امضیناه علیهم فامضاه علیهم" (مسلم باب طلاق الثلاث)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کی خلافت کے دو سال تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا، پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، بیشک لوگوں نے اس معاملہ میں جلدی شروع کر دی جس کی ان کو مہلت تھی، اگر ہم اسے جاری کر دیں تو بہتر رہے گا، پھر آپ نے اسے جاری کر دیا۔

☆ "حدثنااسحق بن ابراهيم قال اناروح بن عبادة قال اناابن جريج ح قال وحدثنا ابن رافع فاللفظ له ناعبد الرزاق قال انا ابن جريج قال اخبرنى ابن طاؤس عن ابيه ان ابا الصهباء قال لابن عباس اتعلم انماكانت الثلاث تجعل واحدة على عهد النبى ﷺ وابى بكر وثلاثا من امارة عمر فقال ابن عباس نعم"

ابوالصہباء نے حضرت ابن عباس سے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقیں ایک شمار ہوتیں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں تین کو تین ہی سمجھا گیا؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔

☆ "وحدثنا اسحاق بن ابراهم قال انا سلمان بن حرب عن حماد ابن زيد عن ايوب السختيانى عن ابراهيم بن ميسرة عن طاؤس ان اباالصهباء قال لابن عباس هات من هناتك الم يكن الطلاق الثلاث على عهد رسول الله ﷺ وابى بكر واحدة فقال قد كان ذلك فلما كان فى عهد عمر تتا بع الناس فى الطلاق فا جاز عليهم"

ابوالصہباء نے حضرت ابن عباس کو کہا تم اپنی عجیب خبر پیش کرو، کیا رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقیں ایک نہیں ہوتی تھیں؟ تو انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔ البتہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا زمانہ آیا تو لوگوں نے جلد بازی کر دی تو آپ نے تین کو تین کی ہی اجازت فرما دی۔

یہ تینوں روایات مسلم جلد اول باب طلاق الثلاث سے نقل کی گئی ہیں، ان پر ہی غیر مقلدین زور دے رہے

ہیں اور ضعیف حدیثوں سے حرام کو حلال بنا رہے ہیں، جو سراسر غلط ہے، اور تعجب یہ ہے کے ضعیف حدیث فضائل میں معتبر ہونے کے باوجود نبی کریم ﷺ کے فضائل میں ضعیف بلکہ متعدد طرق سے بیان کردہ ضعیف حدیث جو حسن لغیرہ بن جاتی ہے اسے قبول نہیں کرتے۔

نبی کریم ﷺ کے فضائل کو نہ ماننے کا نتیجہ یہی ہے کہ حرام کو حلال بنا کر ضال اور مضل ہونے کا شرف حاصل کر لیں۔

اس دلیل کا رد:

ابن تیمیہ اور ان کے موافقین نے مسلم کی اس حدیث (جو تین سندوں سے ثابت ہے) سے جو استدلال کیا ہے اس سے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر الزام عائد ہوتا ہے کہ آپ نے واضح طور پر حضور اقدس ﷺ کی شریعت کی مخالفت کی اور تمام صحابہ نے بھی رسول ﷺ کی مخالفت کو قبول کر لیا، معاذ اللہ، اگر یہ بات مان لی جائے تو حضرت ابوبکر کے دور میں وفات پانے والے صحابہ کے علاوہ کوئی صحابی اس قابل نہیں رہے گا کہ اس کے دین اور اس کی روایت کو قبول کیا جائے، ہمارے دور کے غیر مقلد وھابی مولوی بھی تین طلاقوں کو شرعا ایک طلاق ثابت کرنے کے لئے بڑے فخر سے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ان کے اس استدلال باطل سے تو صحابہ کرام کی دیانت وامانت وعدالت سب ختم ہو جاتی ہے، کیا کوئی مسلمان یہ تصور بھی کر سکتا ہے کے حضور اقدس ﷺ کے دور اور حضرت ابوبکر اور خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا اور حضرت عمر نے حضور اقدس ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خود اپنے دور خلافت کے دو سالہ دور کی شریعت کو بدل دیا۔ یہ ممکن نہیں۔

اگرچہ اس کا ایک جواب علامہ نووی رحمہ اللہ نے یہ ذکر فرمایا کہ تین طلاقوں کو ایک شمار کرنے کا حکم منسوخ ہونے کا وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا جسے تمام صحابہ کرام نے قبول کر لیا۔

اگر علامہ نووی رحمہ اللہ کا یہ جواب تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی غیر مقلدین اس حدیث کو اپنی دلیل نہیں بنا سکتے

کیونکہ منسوخ سے دلیل حاصل کرنا سوائے جہالت کے اور کچھ بھی نہیں۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مؤلفۃ قلوب کا زکوۃ کا مصرف نہ رہنے کا وقت بیان کیا جسے تمام صحابہ کرام نے قبول کرلیا۔

شاذ اور معلل حدیث قابل عمل نہیں:

یہ حدیث قرآن پاک کی اس آیت کے خلاف ہے، جس کی وضاحت جاری ہے، کیونکہ اس میں صراحۃ تیسری طلاق کے بعد عورت کا خاوند کے لئے حلال نہ ہونا ذکر کردیا ہے، پھر بخاری اور مسلم کی صحیح اور متفق علیہ حدیث جن کو صحاح کے دیگر مؤلفین نے بھی روایت کیا ہے کہ حضرت عمیر نے بیک وقت تین طلاقیں دیں تو نبی کریم ﷺ نے ان کو نافذ کردیا۔

وہ طویل حدیث ہے جس کا کچھ حصہ یہ ہے۔ "فطلقها ثلاثه قبل ان یامره رسول الله ﷺ عمیر نے نبی کریم ﷺ کے لعان کا حکم نافذ کرنے سے پہلے ہی بیک مرتبہ تین طلاقیں دے دیں، ان تینوں کو جاری کردیا گیا"۔

نیز متعدد صحیح احادیث اور اور بکثرت آثار صحابہ واقوال تابعین سے ثابت ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں، چونکہ مسلم کی یہ روایت قرآن وسنت اور آثار صحابہ وتابعین کے صریح طور پر خلاف ہے اس لئے یہ روایت شاذ اور معلل ہے اور استدلال کے قابل نہیں ہے۔

شاذ اور معلل ہونے کی ایک اور وجہ:

اس روایت کے شاذ اور معلل اور مردود ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ فتوی دیتے تھے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں اور حضرت ابن عباس سے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کہ وہ نبی کریم ﷺ سے ایک بات روایت کریں اور فتوی اس کے خلاف دیں۔ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) کا ایک فتوی گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے، اور ایک روایت دیکھیں۔

''عن مجاهد قال كنت عند ابن عباس فجاءه رجل فقال انه طلق امرأته ثلاثا قال فسكت حتى ظننت انه رادها اليه، ثم قال ينطلق احدكم فيركب الحموقة ثم يقول يا ابن عباس يا ابن عباس وان الله قال (ومن يتق الله يجعل له مخرجا) وانک لم تتق الله فلا اجد لک مخرجا،عصيت ربک وبانت منک امرأتک وان الله قال (يا ايهاالنبی اذاطلقتم النساء فطلقوهن فی قبل عدتهن) '' (ابو داؤد)

حضرت مجاھد کہتے ہیں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس تھا تو ایک شخص ان کے پاس آیا، اس نے کہا کہ اس نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں۔ میں نے گمان کیا کہ شائد آپ اس کی زوجہ کو اس کی طرف لوٹا دیں گے، پھر آپ نے فرمایا تم میں سے ایک آدمی چلتا ہے تو حماقت پر سوار ہو جاتا ہے، پھر وہ شخص کہنے لگا اے ابن عباس! اے ابن عباس! بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے نکلنے کی راہ بنا دیتا ہے) آپ نے فرمایا بیشک تم اللہ سے نہیں ڈرے، میں تمہارے نکلنے کی راہ نہیں پاتا، تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور عورت تم سے جدا ہوگئی، اور بیشک اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو طلاق دو ان کی عدت کے لئے)

مسئلہ واضح ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا فتوی تھا کہ آپ تین طلاقوں کو تین ہی سمجھتے تھے۔

خیال رہے لفظ (قبل) حضرت ابن عباس کی قرأت میں ہے۔ اس لفظ کے ہونے یا نہ ہونے سے اصل مسئلہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اور یہ بھی خیال رہے کے یہ روایت اس سند کے بغیر سات اور اسناد سے ثابت ہے، ابوداؤد کو دیکھئے۔

واضح ہوا کہ یہ روایت شاذ ہے اور طاؤس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت کو منسوب کرنے میں وہم ہوا ہے، یہی وجہ ہے ابن عربی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ''هذا حديث مختلف فی صحته فكيف يقدم على الاجماع '' اس کی صحت میں ہی اختلاف ہے یہ اجماع امت پر کیسے مقدم ہو سکتی ہے؟

"قال ويعارضه حديث محمود بن بسيد يعني الذي اخرجه النسائي فان فيه التصريح بان الرجل طلق ثلاثا مجموعة ولم يرده النبي ﷺ بل امضاه"

اور ابن عربی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کے یہ حدیث اس وجہ سے بھی قابل قبول نہیں کہ اس کے معارض نسائی کی روایت محمود بن بسید سے مروی ہے کہ ایک شخص نے بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو نبی کریم ﷺ نے ان کو رد نہیں فرمایا بلکہ تینوں کو جاری فرمادیا۔

(فتح الباری ج ۹، ص ۲۷۶ کتاب الطلاق)

شاذ اور معلل ہونے کی اور وجہ:

طاؤس کی بیان کردہ اس روایت میں حضور اقدس ﷺ کے کسی فرمان کا ذکر نہیں، وہ تو ایک واقعہ بیان کررہے ہیں جو طاؤس کا وہم ہے، اس لئے یہ روایت صحیح نہیں ہے، چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم علامہ شوکانی نیل الاوطار ج ۸، ص ۲۲ میں تصریح کی ہے کہ حضرت ابن عباس کے تمام شاگردوں نے آپ سے طاؤس کی بیان کردہ روایت کے خلاف روایت کی ہے۔

اور ایمان و دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ حضرت عمر پر عہد رسالت اور عہد صدیقی کے معمول کی مخالفت اور تمام صحابہ پر مخالفت کی تہمت لگانے سے یہ بہتر ہے کے مسلم کی اس روایت کو غیر صحیح اور مردود قرار دیا جائے، جس کی معقول وجہ اور بنیاد طاؤس کا وہم ہے۔

شاذ اور معلل ہونے کی اور وجہ:

جب راوی کا عمل اپنی بیان کردہ حدیث کے خلاف ہو تو یہ بات حدیث کی صحت میں طعن کا سبب ہوتی ہے، یا اس حدیث کے منسوخ ہونے یا اس حدیث میں تاویل ہونے اور اس کے ظاہری معنی مراد نہ ہونے پر دلیل ہوتا ہے، جیسا کے علامہ عبدالعزیز پرہاروی نے نبراس، ص ۲۳ پر لکھا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر جمہور فقہاء اسلام اول تو طاؤس کی روایت کو فنی سقم کی وجہ سے قبول ہی نہیں کرتے، دوم برسبیل تنزل وہ اس کی تاویل کرتے ہیں اور وہ یہ کے دور نبوی وعہد صدیقی میں لوگ تاکید کی نیت سے تین بار طلاق دیتے تھے، بعد میں حضرت عمر کے دور میں تین طلاق کی نیت سے دینے لگے، حضرت عمر نے ان کی نیات کے مطابق تین طلاق کو تین قرار دیا، یعنی حضرت عمر نے عہد نبوت کے کسی معمول کو بدلا نہیں، بلکہ اسی کو نافذ کیا جو حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔

راقم کا مؤقف:

اگر چہ یہ دوسری توجیہ بعض حضرات نے بیان کی ہے جو صاحب فیوض الباری رحمہ اللہ نے بھی نقل فرمادی ہے، لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ یہ حدیث ہی شاذ، معلل، منکر اور ضعیف ہونے کی وجہ سے قبول نہیں، گذشتہ بیان کردہ احادیث سے واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بھی تین طلاقوں کو تین شمار کیا جاتا تھا ان پر رجوع کا حق نہیں دیا جاتا تھا۔

اس توجیہ کو بالفرض قبول کر لیا جائے تو پھر بھی ہمارے زمانے میں اس کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ ہمارے زمانے میں سوائے علماء کے تاکید ومؤکد کے ضوابط سے ہی لوگ بے خبر ہیں، ان کو غلط فتوی سے بدکاری کے ارتکاب پر لگانا ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔

مغالطہ یا غلط استدلال:

ابن تیمیہ اور ان کے ہمنوا قرآن پاک کی اس آیۃ جو زیر بحث ہے اور اس سے پہلی آیۃ سے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قرآن میں ایسے طریقہ سے طلاق دینے کی ہدایت کی ہے کہ عدت گذرنے سے پہلے رجوع کا حق باقی رہے اور بیک وقت تین طلاق دینا قرآن کے خلاف ہے، اس لئے تین طلاق کو ایک قرار دیا جائے۔

مختصر جواب یہ ہے کہ قرآن نے طلاق دینے کا احسن طریقہ بیان کیا ہے اور قرآن کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقیں واقع نافذ نہ ہوں گی۔

نیز قرآن مجید نے بہت سے کاموں سے منع فرمایا ہے، جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس فعل کو کرلیا جائے تو فعل ہی باطل ہوجائے گا، یا اس کا وجود وعدم برابر ہوجائیں گے، قرآن نے زناء اور چوری کرنے سے منع کیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص زنا یا چوری کرلے تو اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ فعل وقوع پذیر ہی نہیں ہوا، دیکھئے اذان جمعہ کے وقت خرید وفروخت کی، یا مغصوبہ زمین پر نماز پڑھی تو شرعا نفس بیع منعقد ہوجائے گی اور نماز فرض بھی ادا ہوجائے گی، تو ایسی ہی بیک وقت دی گئی تین طلاقیں باوجود ممنوع ہونے کے واقع ہوجائیں گی۔

طلاق بدعت اور ثلاثہ کا حکم:

(۱) سیدنا امام اعظم اور امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک بیک وقت تین طلاق دینا بدعت و گناہ ہے اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ یہ حرام ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ حرام و گناہ نہیں، سیدنا امام حسن بن علی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، امام شعبی اور سیدنا امام شافعی رحمھم اللہ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ ہر چند کہ ایک دم طلاق دینا مستحب نہیں مگر حرام گناہ بھی نہیں، کیونکہ عویمر عجلانی نے اپنی بیوی کو لعان کیا اور حضور ﷺ کے حکم دینے سے پہلے بحضور نبوت عرض کی، یا رسول اللہ! اب اگر میں اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھوں تو میرا زنا کی تہمت لگانا جھوٹ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ اور عویمر عجلانی کے ایک دم تین طلاق دینے پر حضور اقدس ﷺ کا انکار منقول نہیں۔

(۲) اور حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا بدعت وحرام ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، سیدنا امام مالک اور سراج الامۃ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی نظریہ ہے (المغنی، ج ۷، ص ۲۸۱)

(۳) ایک دم تین طلاقیں دینے کو حضرت عمر، حضرت علی اور دیگر صحابہ کرام و جمہور اہل سنت اور ان کے لاکھوں مقلدین علماء، صلحاء، اولیاء اور عام مسلمان حرام و بدعت اور گناہ سمجھتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر پر متفق ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو واقع ونافذ ہوجائیں گی، کیونکہ کسی فعل وعمل کا ناجائز ہونا اور گناہ ہونا اس فعل کی تاثیر کو نہیں روکتا۔

طلاق کے لفظ میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کے توڑنے کی تاثیر رکھی ہے، از روئے لغت بھی اس لفظ کے معانی ''نکاح کی گرہ کھولنے'' ترک کرنے، اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ طلاق کا تعلق مردوں سے ہے، اور عدت کا تعلق عورتوں سے ہے۔ (تاج العروس)

(۴) قرآن مجید میں غیر مدخولہ کو طلاق دینے کا ''سورہ احزاب آیۃ ۴۹'' میں ذکر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''یا ایھاالذین امنو اذانکحتم المومنات ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فما لکم من عدۃ تعتدو تھا''

اے مومنو! جب تم نکاح کرو ایمان والی عورتوں سے پھر ان کو چھونے سے پہلے طلاق دے دو تو ان پر تمہارے لئے کوئی عدت نہیں۔

اس آیۃ میں اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کو عام رکھا ہے، خواہ بیک وقت تین طلاق دی جائیں یا الگ الگ طلاق دی جائے، تو جس فعل کو اللہ تعالیٰ نے مطلق و عام رکھا ہے اسے تو صحیح احادیث (اخبار آحاد) سے بھی مقید اور خاص نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ کچھ لوگوں کی غیر معصوم آراء اور غیر مستند اقوال سے اسے مقید کیا جائے۔

(۵) اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایک عاقل و بالغ انسان اپنے اختیار سے ''تین'' کا عدد استعمال کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں ''ایک''

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کاغذات رجسٹری میں قیمت مکان تین لاکھ لکھی اور رجسٹرار کے ہاں رجسٹری کے موقع پر خریدار کہے کہ بے شک لکھا تو تین لاکھ ہے مگر میں ایک لاکھ دوں گا کیونکہ یک دم ''تین کا اقرار'' ایک ہوتا ہے، کیا رجسٹرار خریدار کی یہ بات تسلیم کرے گا؟ ہرگز نہیں۔

(۶) محمود بن لبید کی روایت کا مضمون یہ ہے کہ بحضور نبویﷺ یہ اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو حضورﷺ غصہ سے کھڑے ہو گئے اور فرمایا میرے ہوتے ہوئے اللہ کی کتاب کو کھیل بنایا جا رہا ہے۔ (نسائی، ج ۲، ص ۱۸۱)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ عہد رسالت میں بیک وقت دی گئی تین طلاقیں ایک نہیں قرار پاتی تھیں۔ اگر تین طلاقوں سے ایک طلاق مراد لینے کا عہد رسالت میں معمول ہوتا تو حضور اقدس ﷺ اس قدر ناراض کیوں ہوتے؟ کیونکہ اگر بیک وقت دی گئی تین طلاقیں بھی ایک طلاق کے مترادف ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ طلاق دینے والے نے سنت طریقہ اختیار نہ کر کے گناہ کا ارتکاب کیا، اور یہی جمہور اہل سنت کا مسلک ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو وہ تین طلاق ہی واقع ہوگی۔

(۷) حضرت سہل بن سعید رضی اللہ عنہ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عویمر نے حضور ﷺ کے سامنے تین طلاقیں دے دیں" فانفذه "تو رسول اللہ ﷺ نے ان تین طلاقوں کو نافذ کر دیا۔ (ابو داؤد، ج ا، ص ۳۰۶)

اس حدیث میں اس امر کی بالکل واضح طور پر تصریح ہے کہ حضرت عویمر نے حضور ﷺ کے سامنے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں اور آپ نے ان تین طلاقوں کو نافذ کر دیا، اور یہ بھی واضح ہوا کہ عہد رسالت میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کا ایک ہونا معمول نہ تھا۔ حضور ﷺ تین طلاقوں کو تین ہی قرار دے کر نافذ کر دیتے تھے۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ تاکید والی تاویل درست نہیں، صحیح یہی ہے کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دینے والی روایات غیر معتبر ہیں۔

نتیجہ واضح ہوا:

یہ تمام بحث دلالت کرتی ہے اس پر کہ ایک ہی کلمہ سے تین طلاق کے وقوع کی صحت پر علماء اور صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ نیز یکدم تین طلاق دینے سے تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں، یہ مسئلہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

تنبیہ:

اس مسئلہ کو کنز العمال، ج ۵، ص ۱۶۱۔ ابوداؤد، ج ا، ص ۳۷۳۔ موطا امام مالک، ج ۲، ص ۱۶۔ دار قطنی، ج ۴، ص ۱۲۔ بیہقی، ج ۷، ص ۳۳۵۔ تفسیر مظہری، ج ا، ص ۳۰۲۔ دار قطنی ص ۳۰۔ تفسیر در منثور، ج ۲، ص ۲۳۰۔ عینی شرح بخاری، فتح القدیر میں موجود ہے۔ (رضوان، جنوری، فروری ۱۹۹۶ء مع اضافات وتصرفات کثیرہ)

حرام کو کوئی حلال سمجھے تو ہم کیا کریں:

مسئلہ کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا، اب آگے کسی کی مرضی کہ وہ حرام کو حرام سمجھ کر گناہ سے بچ جائے، اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھے یا کہ حرام کو حلال سمجھ کر ساری زندگی گناہوں میں مبتلا رہے اور رب تعالیٰ کے عذاب سے نڈر اور بے خوف ہو کر رہے۔

اے مسلمانو! خدارا گمراہ کن ٹولے سے بچ کر رہو، اپنی عاقبت کو برباد نہ کرو۔ حرام کاری اور حرام اولاد سے بچو۔

"فان طلقها فلا تحل من بعد حتی تنکح زوجا غیره":

پھر اگر (تیسری) طلاق اسے دی تو وہ عورت حلال نہیں اس مرد کے لئے اس (تیسری طلاق) کے بعد یہاں تک کہ وہ عورت رہے کسی دوسرے خاوند کے پاس۔

دو طلاقوں کا پہلے ذکر ہے، اور تیسری طلاق کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں ہے، اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ "تیسری" طلاق کیا ہے تا کہ مسئلہ واضح ہو جائے، راقم نے بھی وہی ترجمہ نقل کیا ہے بریکٹ میں "تیسری" ذکر کر دیا ہے۔

تیسری طلاق کے بعد وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں رہتی، جب تک کسی اور خاوند سے نکاح نہ کرے، پھر وہ وطی بھی کرے۔

اعتراض: آیت کریمہ میں صرف نکاح کا ذکر ہے وطی کی قید کیوں لگائی گئی؟

جواب: اس آیۃ کریمہ کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ وطی کی قید حدیث مشہور سے لگائی گئی ہے، جس کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ نکاح کبھی بمعنی عقد کے آتا ہے اور کبھی بمعنی وطی کے آتا ہے۔ آیۃ کریمہ سے ہی وطی کرنا ثابت ہے۔

راقم کا موقف یہ ہے کہ وطی کرنا تو خود اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہے، البتہ حدیث مشہور سے اسے تائید حاصل ہے۔ "انا حملنا النکاح علی الوطی وحملنا قوله زوجا علی العقد" (الماخوذ من الکبیر)

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں " حتی تنکح " سے ہم وطی ثابت کرتے ہیں اور " زوجا " سے مراد عقد نکاح۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ یہاں تک کہ وہ عورت وطی کرائے دوسرے شخص سے جس سے اس کا نکاح ہوا ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ان دونوں قولوں کا جامع ترجمہ کیا ہے " جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے " راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔

حدیث مشہور جس سے وطی کا واضح ثبوت موجود ہے، وہ یہ ہے۔

☆ " عن عائشة قالت جاء ت امرأة رفاعة القرظي الى رسول الله ﷺ فقالت انی کنت عند رفاعة فطلقنی فبت طلاقی فتزوجت بعده عبدالرحمن بن الزبیر وما معه الامثل هدبة الثوب فقال اتریدین ان ترجعی الی رفاعة قالت نعم قال لاحتی تذوقی عسیلته ویذوق عسیلتک " (بخاری ومسلم، مشکوٰة باب المطلقة ثلاثا)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رفاعہ قرظی کی عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کرنے لگی، بیشک میں رفاعہ کے پاس تھی، اس نے مجھے تین طلاقیں دے دیں، پھر میں نے عبدالرحمٰن بن زبیر (بفتح الزاء کالامیر) سے نکاح کرلیا، لیکن اس کے پاس سوائے کپڑے کے دھاگہ (ہمل) کے کچھ نہیں، تو آپ نے فرمایا تو رفاعہ کے پاس لوٹنے کا ارادہ رکھتی ہے؟ اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا تو اس کے پاس لوٹ نہیں سکتی، یہاں تک کہ تو اس کی مٹھاس چکھ لے اور وہ تمہاری مٹھاس چکھ لے۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ دوسرے خاوند کا جماع ضروری ہے، پھر وہ پہلے خاوند کے لئے حلال ہوتی ہے۔ اس لئے کہ عبدالرحمٰن بن زبیر نامرد تھے، ان کے آلہ میں انتشار نہیں تھا (کپڑے کے دھاگہ کا یہی مطلب ہے) تو نبی کریم ﷺ نے بغیر جماع کرنے کے پہلے خاوند سے نکاح کرنے سے منع فرمادیا۔

البتہ " عسیلة" تصغیر ہے جس سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ صرف ذکر کا داخل کرنا کافی ہے، انزال (پانی کا نکلنا) ہونا ضروری نہیں، اور قریب البلوغ جس کا آلہ کھڑا ہوتا ہے، اس سے نکاح کرنا اور اس کا جماع کرنا بھی کافی ہے۔

حلالہ کیا ہے؟

دوطلاقوں تک رجوع کا حق تھا لیکن خاوند نے اگر تین طلاقیں دیں، خواہ ایک وقت میں یا وقفہ وقفہ سے، اب رجوع کا کوئی حق نہیں۔ تمام معاملہ اب عورت کے اختیار میں ہے۔ تین طلاقوں کے بعد مرد کا اختیار ختم ہوگیا، کیونکہ شریعت میں طلاق دینے کا جو طریقہ ناپسند تھا، وہ اس نے استعمال کیا ہے۔ اس لئے اب یہ شخص اس سزا کا مستحق ہے کہ اس کا اختیار چھین لیا جائے۔

دوران عدت عورت کو کہیں نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ البتہ عدت گزارنے کے بعد وہ مکمل بااختیار ہے، چاہے تو کسی سے بھی نکاح نہ کرے، اسی طرح مجرد زندگی گذاردے اور چاہے تو کسی اور شخص سے نکاح کرلے، عورت نے اگر اپنی مرضی سے کسی دوسرے سے نکاح کرلیا پھر وہ شخص یعنی دوسرا خاوند بعد از جماع فوت ہوگیا یا اس نے طلاق دے دی، عدت گزارنے کے بعد یہ عورت پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو اسے اختیار حاصل ہے، کسی دوسرے شخص سے نکاح اور مجامعت کے بغیر پہلے خاوند سے نکاح کرنا یا اس کا رجوع کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ اسی کا نام حلالہ ہے۔

حلالہ کے نام کی وجہ:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے " فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره " پھر اگر اس نے تیسری طلاق دے دی تو اب وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے کے پاس نہ رہے۔ (کنز الایمان)

"(فان طلقها) مرة ثالثة بعد المرتين (فلا تحل له من بعد) اى من بعد التطليقة الثالثة (حتى تنكح زوجا غيره) حتى تتزوج غيره والاصابة شرطت بحديث العسيلة" (مدارک)

اگر مرد نے عورت کو دوطلاقوں کے بعد تیسری طلاق دے دی تو تیسری طلاق کے بعد وہ اس کے لئے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ دوسرے زوج سے نکاح کرے اور وطی کی شرط حدیث سے ثابت ہے، جس میں زوجیت سے حاصل ہونے والے منافع کا ذائقہ چکھنا لازم قرار دیا گیا ہے۔

"(فان طلقها)الزوج بعد الثنتین(فلا تحل له من بعد)بعد الطلقة الثالثة(حتی تنکح زوجا) تتزوج (غیره) ویطا کمافی الحدیث" "رواه الشیخان" (جلالین)

اگر خاوند نے دو طلاقوں کے بعد طلاق دے دی تو وہ اس کے لئے تیسری طلاق کے بعد حلال نہیں یہاں تک کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے اور وہ اس سے وطی بھی کرے جیسا کہ بخاری اور مسلم کی حدیث سے ثابت ہے (وہ حدیث رفاعہ قرظی کی زوجہ کی ابھی قریب ہی بیان کی جا چکی ہے)

" ثم یطلقها قبل ان ید خل بها لا تحل حتی یجا معها الآخر" (نسائی)

(جماع سے پہلے) اگر دوسرے زوج نے طلاق دے دی تو وہ پہلے کے لئے حلال نہیں یہاں تک کہ دوسرا اس سے جماع کرے۔

" اذا طلق الرجل امرأته ثلا ثا لا تحل له حتی تنکح زوجا غیره ویذوق کل منهما عسیلة صاحبه" (قرطبی، ج۱، ص۹۵۶)

جب مرد نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں رہی، یہاں تک کہ وہ اور شخص سے نکاح کرے اور ہر ایک میں سے ایک دوسرے کا مزہ بھی چکھ لیں۔

قرآن پاک میں لفظ " فلا تحل له " استعمال ہوا ہے۔ اور حدیث شریف میں بھی "لا تحل حتی یجامعها الآخر" لفظ استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسرا خاوند پہلے کے لئے عورت کو حلال کر دیتا ہے، اسی وجہ سے اس کا نام حلالہ رکھ لیا گیا۔

حلالہ کا یہ حکم اجماع امت سے ثابت ہے:

علامہ بدرالدین محمد عینی رحمہ اللہ شارح بخاری فرماتے ہیں۔

" اجمعت الامة علی ان الدخول شرط الحل للاول ولم یخالف فی ذلک انا سعید بن المسیب والخوارج والشیعة وداؤد الظاهری والبشر المراسی و ذلک اختلاف لا خلاف لعدم اسناد هم الی دلیل ولو قضی به القاضی لا ینفذ "

اس مسئلہ پر اجماع امت ہے کہ تین طلاقوں کے بعد پہلے خاوند کے لئے عورت اس وقت حلال ہو گی جب اس کا نکاح دوسرے سے ہواور وہ بھی جماع کرے اس میں شیعہ اور خارجیوں وغیرہ کا جو اختلاف ہے کہ وہ صرف نکاح شرط قرار دیتے ہیں، اس کا اختلاف بلا دلیل ہے اگران کے مذھب کے مطابق کسی قاضی نے فیصلہ کر دیا تو وہ نافذ نہیں ہوگا۔

سبحان اللہ علامہ عینی رحمہ اللہ نے عرصہ دراز پہلے ہی کیا خوب فرمادیا کہ اگر رافضیوں اور خارجیوں کے کسی قاضی نے کوئی فیصلہ کیا تو وہ اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہوگا۔

دوسرے نکاح اور مجامعت میں حکمت:

''والحکمة من هذا التشریع الردع عن المسارعة الی الطلاق والعود الی المطلقة ثلاثا والرغبة فیها'' (تفسیر ابی السعود)

دوسرے شخص سے نکاح اور مجامعت کو شریعت نے لازم قرار دیا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو جلد بازی سے تین طلاقیں استعمال کرنے سے اور پھر مطلقہ کی طرف لوٹنے اور اس کی طرف رغبت کرنے سے روکنا مقصود ہے۔

کیونکہ طبعی طور پر انسان اس کی طرف کم ہی راغب ہوتا ہے کہ کسی اور سے جب عورت شادی کرلے تو پھر بھی یہ اس کا خواہشمند رہے، شرعی حدود وقیود حکمت سے کبھی خالی نہیں ہوتیں، کیونکہ مالک الملک حکیم ہے اور یہ نہیں ہوسکتا کہ حکیم ذات کے احکام میں کسی قسم کی حکمت نہ پائی جائے، اس حکم سے تین طلاقوں کے وقوع کی کافی حد تک روک تھام ہوئی۔

بغیر شرط کے حلالہ جائز ہے:

''ویروی عدم الکراهة فیما لم یکن الشرط مصرحا به'' (تفسیر ابی السعود)

جب تک واضح طور پر شرط نہ لگائی جائے تو حلالہ جائز ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں۔

یعنی عورت نے دوسرے خاوند سے اپنی مرضی سے شادی کرلی اور وہ فوت ہوجائے یا طلاق دے دے تو یہ پہلے خاوند کی طرف لوٹ سکتی ہے، اس کے لئے حلال ہوگی۔

یہ اصل میں حلالہ ہے جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ جب تک دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے پہلے کے لئے حلال نہیں، البتہ دوسرے کا جماع کرنا ضروری ہے، اس میں رافضیوں اور خارجیوں نے ایک دوسرے کے بھائی بن کر اختلاف کیا ہے، لیکن ان کا اختلاف حدیث نبوی اور اجماع امت کے مخالف ہے، اس لئے اس اختلاف کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ایسے فیصلے مردود ہی ہوں گے۔

شرط کے ساتھ حلالہ مکرہ ہے:

دوسرے شخص سے نکاح کرتے وقت اگر یہ شرط لگائی گئی کہ میں تم سے نکاح تو کر رہی ہوں لیکن اس شرط پر کہ تم نے مجھے مجامعت کے بعد طلاق دینی ہے تاکہ میں پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح کرلوں اور اس کے لئے حلال ہو جاؤں، یہ شرط لگانی مکروہ ہے۔ اگرچہ اس نکاح اور مجامعت کے بعد بھی عورت پہلے خاوند کے لئے حلال ہو جائے گی۔

"والنکاح بشرط التحلیل مکروہ عندنا وفاسد عند الاکثرین لقولہ لعن اللہ المحلل والمحلل لہ" (تفسیر ابی السعود)

حلالہ کی شرط لگا کر دوسرے شخص سے نکاح کرنا ہمارے نزدیک مکروہ ہے اور کئی حضرات کے نزدیک یہ شرط لگانے سے نکاح ہوتا ہی نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ کی لعنت ہو حلالہ کرنے والے پر اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا ہے۔

اصل اختلاف کی وجہ حدیث کی تشریح وتوضیح میں اختلاف ہے:

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک بشرط تحلیل نکاح تو مکروہ ہے لیکن زوج ثانی کی مجامعت کے بعد پہلے زوج کے لئے عورت حلال ہو جائے گی۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی حدیث پاک میں "المحلل" ذکر ہے۔

" لما سماه محللادل علی صحة النکاح لان المحلل هو المثبت للحل فلو کان فاسدالماسماه محللا" (فتح القدیر)

جب آپ نے اسے محلل کہا ہے تو یہ نکاح کی صحت پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ محلل کہتے ہی اسے ہیں جو حلت ثابت کرنے والا ہو، اگر نکاح فاسد ہوتا تو اسے محلل نہ کہا جاتا۔

امام احمد رحمہ اللہ مشروط نکاح کی حرمت کے قائل ہیں۔ "وظاهره التحريم كماهو مذهب احمد" حدیث پاک میں لعنت کا ذکر ہے اس لئے ظاہر طور پر اس سے حرمت سمجھ آتی ہے جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ بھی اس نکاح کو صحیح نہیں مانتے۔

" فانه یصح العقدو تحلل للاول عند عامة العلماء وقال مالک رحمه الله لا یصح " (کفایة)

تحلیل کی شرط کے باوجود عام علماء کے نزدیک نکاح صحیح ہے اور پہلے کے لئے حلت ثابت ہو جائے گی اور امام مالک رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نکاح صحیح نہیں۔

حضرت امام احمد و امام مالک رحمہما اللہ کی دلیل کا انحصار صرف اس پر ہے کہ حدیث پاک میں لعنت کا ذکر ہے اور لعنت رب کی رحمت سے دوری کا نام ہے، اس لئے نکاح صحیح نہیں بلکہ حرام ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے جواب:

علامہ ابن ہمام صاحب فتح القدیر امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"اماالاعتراض فمنشوه عدم معرفة اصطلاح اصحابناو ذلک انهم لا یطلقون اسم الحرام الاعلی منع ثبت بقطعی فاذاثبت بظنی سموه مکروها وهو مع ذلک سبب للعتاب" (فتح القدیر)

اعتراض کا دارو مدار معترضین کی ہمارے اصحاب کی اصطلاح سے بے خبری ہے، کیونکہ ہمارے اصحاب اس وقت تک حرام ثابت نہیں کرتے جب تک قطعی دلیل سے ممانعت ثابت نہ ہو۔ جب ظنی دلیل سے ثابت ہو تو اسے ہمارے اصحاب مکروہ کہتے ہیں، یعنی حرام نہیں کہتے، البتہ اس کو عذاب کا سبب قرار دیتے ہیں۔

لعنت دلیل ظنی کیوں؟

"اللعن فی الاصل الطرد وشرعافی حق الکفار الابعادمن رحمة الله تعالیٰ وفی حق المؤمنین الاسقاط عن درجة الابرار" (شامی)

لعنت کا اصل لغوی معنی ہانکنا، دھتکارنا۔ اور لعنت جب کافروں کے لئے ذکر کی جائے تو شرعاً اس کا معنی ہوگا اللہ کی رحمت سے دور کرنا۔ اور جب مومنوں کے لئے لعنت کا اطلاق ہو تو مطلب ہوگا نیک لوگوں کے درجہ سے کم کرنا۔

"ان المرادباللعن فی مثل ذلک الطردعن منازل الابرار لاعن رحمةالعزیز الغفار"

یعنی اس قسم کے مقاموں میں جب بھی لعنت کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد نیک لوگوں کے مراتب سے دور رکھنا ہوتا ہے۔ کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور رکھنا مراد نہیں ہوتا۔

اس معنی کے لحاظ سے لعنت سے حرمت ثابت نہیں ہوسکتی، اس قسم کے کئی مقاموں پر لعنت کا ذکر ہے لیکن ان میں حرمت مراد نہیں۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول:

"وعن ابی یو سف انه یفسد النکاح لا نه فی معنی الموقت فیه ولا یحلها علی الاول لفساده" (هدایة)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک تحلیل کی شرط سے نکاح فاسد ہوگا، اس لئے اس نکاح سے پہلے کے لئے حلت ثابت نہیں ہوگی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے جواب دیا جائے گا کہ موقت نکاح وہ ہوتا ہے جس میں وقت مقرر ہوتا ہے۔ کہ میں تمہارے ساتھ اتنے مقرر دنوں کے لئے نکاح کر رہا ہوں، یا عورت کی طرف سے یہی الفاظ ادا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ اتنے مقرر وقت کے لئے نکاح کر رہی ہوں۔

لیکن شرط تحلیل میں صرف یہ طے ہوتا ہے کہ تم نے مجھے طلاق دینی ہے۔ اس میں وقت مقرر نہیں کیا جاتا، کیونکہ اس کی مرضی پر منحصر ہے، چاہے تو وہ مجامعت پہلی رات کرے یا کئی دن گزار کر۔

امام محمد رحمہ اللہ کا قول:

" وعن محمد انی یصح النکاح ولا یحلھا علی الاول لانه استعجل مااخره الشرع فیجازی بمنع مقصود کما فی قتل المورث" (ازھدایة)

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شرط تحلیل سے نکاح تو صحیح ہے لیکن اس نکاح سے وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوگی، کیونکہ اس نے جلد بازی سے کام لیا، جس کو شریعت نے موخر کیا تھا، لہٰذا اس مقصد کو حاصل نہیں ہونے دیا جائے گا، جس طرح کوئی شخص اسے قتل کردے جس کا اس نے وارث ہونا تھا، اس قتل کی وجہ سے اسے وراثت سے محروم کردیا جائے گا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے جواب دیا جائے گا، اگر مذکر صیغوں سے مراد پہلا خاوند لیا جائے تو یہ قول درست ہی نہیں، کیونکہ اسے کوئی اختیار ہی نہیں کہ وہ شرط لگائے، اس لئے اس کی طرف سے شرط لگانا اور تعجیل کرنا اور مقصود سے محروم ہونے کا کوئی مقصد ہی نہیں اور اگر شخص کی تاویل سے مراد عورت لی جائے تو کسی حد تک ظاہری معنی درست ہوگا، لیکن شریعت نے صرف یہ قید لگائی ہے کہ پہلے خاوند کے لئے عورت اس وقت تک حلال ہوگی جب دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور وہ مجامعت بھی کرے، اس میں دوسرے کا طلاق دیر سے دینا یا جلدی دینا مذکور نہیں۔ مورث کے قاتل کو وراثت سے اس لئے محروم کیا جاتا ہے کہ اس نے اس کی طبعی موت کا انتظار نہیں کیا، بلکہ وراثت جلدی حاصل کرنے کے لئے اسے قتل کردیا ہے، اس لئے زجراً اسے محروم کیا جائے گا، یہاں یہ صورت نہیں۔

شرط تحلیل بالاتفاق گناہ ہے:

"فان قلت مامعنی لعنهماقلت معنی اللعن علی المحلل لانه نکح علی قصد الفراق والنکاح شرط للدوام وصار کالتیس المستعار"

حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر تم کہو کہ محلل اور محلل لہ پر لعنت کا کیا مطلب ہے؟ میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ محلل (حلال کرنے والے دوسرے خاوند) پر لعنت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ نکاح فراق کی غرض سے ہوا ہے، حالانکہ نکاح کرتے وقت ارادہ یہ ہونا چاہئے کہ یہ نکاح ہمیشہ کے لئے ہوگا، یعنی تا حیات برقرار رکھیں گے، یہ شخص ایسا ہی ہوگیا جس طرح بکریوں کے لئے بکرا مانگ کر لایا جائے۔

"واللعن علی المحلل له لانه صار سببالمثل هذاالنکاح"

محلل لہ (جس کے لئے وہ حلال کررہا ہے یعنی پہلا خاوند) پر لعنت اس لئے کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے (یعنی فراق والے) نکاح کا سبب بن رہا ہے۔ کیونکہ عورت اس کی طرف لوٹنے کی خواہش کی وجہ سے ہی دوسرے سے نکاح اسی شرط پر کررہی ہے کہ تم نے مجھے بعد از مجامعت طلاق دینی ہے۔

" والمراد اظهار خسا ستهما لان الطبع السلیم ینفرعن فعلهما لاحقیقة اللعن لانه ما بعث لعانا "

دراصل مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان پر لعنت فرما کر ان کی خساست، رذالت کی ظاہر فرمایا، کیونکہ طبع سلیم ان دونوں کے فعل سے متنفر ہوتی ہے، یہاں حقیقی لعنت (یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنا) مراد نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ کو لعنت بھیجنے والا بنا کر معبوث نہیں فرمایا گیا۔ (مرقاۃ)

نوٹ: مودودی صاحب نے شرط تحلیل پر نکاح نہ ہونے کا جو قول کیا وہ سراسر باطل ہے۔

اعتراض: جب شرط تحلیل بالاتفاق گناہ ہے تو نکاح کیسے صحیح ہوگا اور پہلے کے لئے عورت کیسے حلال ہوگی؟

جواب : کئی ناجائز، گناہ والے کاموں پر احکام مرتب ہوتے ہیں، جیسے جمعہ کی اذان کے بعد خرید و فروخت ناجائز اور باعث گناہ ہے، لیکن اگر کسی نے بیع کر لی تو اس پر احکام بیع و شراء مرتب ہو جائیں گے، خریدار اس چیز پر قبضہ کرنے کا مالک ہو جائے گا اور اس پر لازم ہو گا کہ وہ ثمن (اس دونوں کے درمیان طے ہونے والی رقم) ادا کرے۔ اسی طرح غصب کی ہوئی زمین پر نماز ادا کرنا ناجائز ہے، لیکن اگر نماز ادا کر لی تو فریضہ ادا ہو جائے گا، اسی طرح یہاں بھی شرط لگانا کہ تم نے طلاق دینی ہے اگرچہ ناجائز ہے لیکن نکاح صحیح ہو جائے گا اور پہلے کے لئے نکاح و مجامعت سے عورت حلال ہو جائے گی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل کا کوئی جواب ہی نہیں:

ضابطہ یہ ہے کہ جب کسی لفظ کا حقیقی معنی مراد لیا جا سکے تو مجازی معنی مراد نہیں لیا جائے گا، جب محلل کہتے ہی اسے ہیں جو حلت ثابت کرے اور اگر نکاح ہی صحیح نہیں اور حلت ہی ثابت نہیں تو وہ محلل کیسے ہوا؟

امام اعظم رحمہ اللہ سے مقابلہ بھی کیسے؟ جبکہ سوائے امام مالک رحمہ اللہ کے باقی تمام ائمہ کرام آپ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد ہیں، خواہ وہ ائمہ احناف ہوں، جیسے امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ یا وہ مستقل فقہ رکھنے والے ہوں جیسے امام شافعی و امام محمد رحمہما اللہ۔

مقام تفکر:

سیاسی عورتیں یا بعض وہ عورتیں جو آزادی کے نام سے دین اسلام سے بغاوت کرتی ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ عورت کے لئے کیا مصیبت ہے کہ وہ طلاق کا غم بھی برداشت کرے اور پھر حلالہ کی مصیبت سے بھی گزرے۔

کاش کہ ان عورتوں کو یہ سمجھ آ جائے کہ ایک یا دو طلاقوں کے بعد عدت گذرنے پر عورت خود مختار ہے، وہ بالکل نکاح نہ کرے ساری عمر اسی طرح گذار دے یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔ کسی اور شخص سے نکاح کرے یا اس کا اختیار ہے اور چاہے تو پہلے خاوند سے ہی نکاح کرے یہ اس کا اپنا معاملہ ہے، اسے روکنے کا بھی کسی کو حق نہیں اور اس پر

کوئی جبر بھی نہیں کہ تو پہلے خاوند سے ہی نکاح کر، قرآن پاک، حدیث پاک اور کسی فقہ میں عورت پر جبر کرنے کا کوئی حکم نہیں، اگر پہلے خاوند سے ہی نکاح کر رہی ہے تو اپنی مرضی اور اختیار سے، جب اس کی اجازت کے بغیر نکاح صحیح ہی نہیں تو وہ کیوں اجازت دے رہی ہے، اسے چاہئے نہ اجازت دے، نہ نکاح ہو۔

اگر اسے تین طلاقیں دے دی گئیں تو طلاقوں کے ساتھ ہی مرد کا رجوع کرنے کا حق ختم ہو چکا ہے، عدت گذرنے کے بعد عورت خود مختار ہے، ساری عمر نکاح نہ کرے تو کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس کا جبراً نکاح کر سکے، اور کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے یہ بھی اس کی مرضی پر منحصر ہے، اب دوسرا خاوند فوت ہو جائے یا اس نے طلاق دے دی، اب عدت گذرنے کے بعد عورت پھر خود مختار ہے، چاہے تو کسی سے بھی نکاح نہ کرے اور چاہے تو کسی تیسرے شخص سے نکاح کرے اور چاہے تو پہلے خاوند سے نکاح کرے، پہلے سے نکاح کرنے پر کسی نے اس پر جبر نہیں کیا۔

اس طرح تین طلاقوں کے بعد عدت گذر جانے پر اگر دوسرے خاوند سے وہ نکاح اس شرط پر کر رہی ہے کہ تو نے مجھے طلاقیں دینی ہیں اور اس کی طلاقوں اور عدت گذر جانے پر پہلے خاوند کے پاس آ رہی ہے تو یہ سب کام وہ اپنے اختیار سے کر رہی ہے، شریعت اسلامیہ نے اسے مجبور نہیں کیا۔

حلالہ کرنے والی عورت اور اس کے پہلے خاوند سے تو پوچھئے:

انسانی طبیعت حلالہ کی شرط سے متنفر ہے، البتہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح ہو جائے اور وہ فوت ہو جائے یا طلاق دے دے، اور پھر اسی طرح پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح ہو جائے، اسے طبائع قبول کرتی ہیں۔

حلالہ کی شرط سے دوسرے خاوند سے نکاح کرنے میں عورت کو بھی نفرت ہے اور پہلے خاوند کو بھی نفرت ہے، تو پھر حلالہ کو قبول کرنے میں پتہ نہیں ان کی کیا مجبوری ہے، بچوں کی خاطر اس کڑوی دوا کو پینے پر مجبور ہوئے ہیں تو ان کی مجبوری کو بھی دیکھئے اور یہ سمجھئے کہ اس میں شریعت نے عورت کو مجبور نہیں کیا اور کسی مرد نے بھی مجبور نہیں کیا اور کسی مولوی نے بھی فتویٰ نہیں دیا کہ اس پر لازم ہے کہ وہ ضرور ہی حلالہ کرے، عورت اپنی مرضی اور اختیار اور اجازت سے سب کچھ کر رہی ہے۔ غیر اسلامی عورتیں اگر کچھ کہنا چاہتی ہیں تو عورت کو ہی کہیں، شریعت کا مزاح نہ اڑائیں۔

گناہ سے بچنے کا شاندار حیلہ:

جب عورت پہلے خاوند کی طرف لوٹنے کی خواہش بھی رکھتی ہو، اس کی کوئی مجبوری ہو اور یہ بھی خطرہ ہو کہ دوسرا خاوند ہوسکتا ہے طلاق نہ دے، تو اب عورت کے لئے یہ صورت نکالی گئی۔

"ولو خافت ان لا یطلقها تقول زوجتک نفسی علی ان امری بیدی" (زیلعی)

اگر عورت کو یہ خوف ہو کہ یہ دوسرا شخص مجھے طلاق نہیں دے گا تو وہ نکاح اس شرط پر کرے کہ میں تمہارے ساتھ نکاح اس شرط پر کرتی ہوں کے تم میرا معاملہ میرے ہاتھ کردو۔ یعنی طلاقوں کا حق مجھے دے دو۔

مرد نے جب طلاقوں کا حق عورت کو دے دیا تو اب عورت کی مرضی ہے چاہے، تو اسی نئے خاوند کے پاس رہے، طلاقوں کا حق استعمال نہ کرے اور چاہے تو اپنا حق استعمال کر کے آزاد ہو جائے، اس شرط پر کوئی گناہ نہیں اور نہ ہی کوئی اختلاف ہے۔

"فان طلقها فلا جناح علیهما ان یتراجعا ان ظنا ان یقیما حدود الله"

پھر اگر وہ (دوسرا) طلاق دے دے اسے تو نہیں گناہ ان دونوں پر کہ وہ آپس میں رجوع کرلیں، اگر وہ دونوں گمان کریں کہ اللہ کی حدیں قائم کرسکیں گے۔

اگر دوسرے خاوند نے طلاق دے دی (بعد از مجامعت) تو پہلا زوج اور زوجہ دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف رجوع کا ارادہ کریں تو ان دونوں پر رجوع کرنے میں یعنی دوبارہ نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں، البتہ جب ان دونوں کو یہ گمان ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم کرسکیں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی حدوں سے مراد حقوق زوجیت ہیں یعنی جب یہ گمان رکھتے ہوں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے وہ احکام جو زوجیت سے متعلق ہیں ان کو بجالائیں گے۔ تو وہ دونوں نکاح کرلیں، لیکن جب نکاح سے پہلے ہی دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پائی جائے تو وہ ایک دوسرے سے دور ہی رہیں تاکہ دوبارہ ایک دوسرے سے جدا ہونے کی نوبت نہ آئے۔

دینی طلباء کرام کے ذوق کے لئے:

" ظن " کبھی یقین کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی گمان کے معنی میں ہوتا ہے۔لیکن اس مقام میں " ظن " کو "یقین" کے معنی میں لینا جائز نہیں۔لفظاً بھی اس معنی میں نہیں لے سکتے اور معنوی طور پر بھی درست نہیں۔

لفظی ممانعت یہ ہے کہ "ان مصدریه" توقع کے لئے آتا ہے،اس لئے یہ صحیح نہیں کہ "ظن" بمعنی "یقین" کے لے کر اس کے ساتھ "ان مصدریه" کو بھی ذکر کیا جائے، یہاں تو اس کے بعد "ان یقیما" میں "ان مصدریه" استعمال ہے۔

معنوی ممانعت یہ ہے کہ کوئی شخص مستقبل کے متعلق یقین نہیں کر سکتا،اسی وجہ سے آیۃ کریمہ میں "ان ظنا" کا معنی ہوگا "اگر وہ دونوں گمان کریں" لیکن یہ معنی نہیں ہوگا "اگر وہ دونوں یقین کریں"

اعتراض: مستقبل کے بعض امور کے متعلق یقین حاصل ہوتا ہے تو اتنی قدر کافی ہے کہ "ظن" کو "یقین" کے معنی میں لے لیا جائے،اور سیبویہ جو کہ علم نحو کا امام ہے اس نے بھی یہی کہا ہے،اور مثال سے واضح کیا " ماعلمت االا ان یقوم زید " مجھے یقین حاصل نہیں سوائے زید کے قائم ہونے کے۔

اس مسئلہ میں اختلاف ابوعلی فارسی کا ہے جو سیبویہ کا ہم مرتبہ نہیں۔

جواب: جو یہ کہا جاتا ہے " ان المصدریه للتو قع وهو ینافی العلم " (ان مصدریہ توقع کے لئے آتا ہے وہ یقین کے منافی ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مستقبل کے متعلق کسی طرح بھی علم حاصل نہ ہو وہاں "ان مصدریه" کا استعمال درست نہیں۔اور اگر کچھ قرائن سے مستقبل کے متعلق یقین ہو تو ان مصدریہ کا وہاں استعمال درست ہے۔اور اگر مستقبل کے متعلق یقین نہ ہو تو وہاں "ظن" کا معنی گمان ہی کیا جائے،خصوصاً جب اس کے ساتھ "ان مصدریه " بھی استعمال ہو۔

آیۃ کریمہ میں یہی آخر صورت پائی گئی ہے، کیونکہ زوج اور زوجہ کو ایک دوسرے کی طرف رجوع کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ یقین کریں کہ اللہ تعالیٰ کی حدیں قائم کر سکیں گے، بلکہ ان کا گمان کرنا کافی ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

"وتلک حدوداللّٰہ یبینہالقوم یعلمون": اور یہ اللہ کی حدیں ہیں وہ بیان کرتا ان کو اس قوم کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔

یعنی یہ احکام جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام اس قوم کے لئے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں، یعنی علم کا تقاضا ہے عمل، چونکہ رب تعالیٰ کے بیان کئے ہوئے احکام پر عمل کرنے والے اصحاب علم ہی ہیں، لہٰذا رب تعالیٰ کے بیان سے وہی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

(از مظہری)

" لقوم یعلمون "ای المعاریض ویفهمون الا شارات "

رب تعالیٰ اس قوم کے لئے بیان کرتا ہے جو اشارات کو سمجھتے ہیں، اور تعریض کو جانتے ہیں۔

(تاویلات نجمیہ میں یوں ہی ذکر ہے)

"قال احمدبن خضرویه الطریق واضح والدلیل لائح والداعی قد اسمع فما التحیر بعدهذاالامن العمی "

احمد بن حضرویہ رحمہ اللہ نے فرمایا راستہ واضح ہے اور دلیل روشن ہے اور دعوت دینے والے نے سنا دیا ہے، یعنی بات کو مخفی نہیں رکھا، بلکہ واضح کر دیا، اس کے بعد سوائے اندھے کے کوئی بھٹک نہیں سکتا۔

حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

وصف رخسارۂ خورشید زخفاش مپرس

کہ دریں آئنہ صاحب نظراں حیرانند

سورج کے رخسار کا وصف چمگادڑ سے نہ پوچھ، کہ اس آئنہ میں اصحاب نظر بھی حیران ہیں۔ (از روح البیان)

☆☆☆☆☆☆

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ☆ (سورۃ البقرہ آیت ۲۳۱)

﴿۱﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی میعاد آ لگے تو اس وقت تک یا بھلائی کے ساتھ روک لو یا نکوئی کے ساتھ چھوڑ دو اور انہیں ضرر دینے کے لیئے روکنا نہ ہو کہ حد سے بڑھو۔ اور جو ایسا کرے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اور اللہ کی آیتوں کو ٹھٹھا نہ بنا لو اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور وہ جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری تمہیں نصیحت دینے کو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

﴿۲﴾

اور جب تم طلاق دو عورتوں کو تو وہ پہنچ جائیں اپنی عدت کے ختم ہونے کے قریب تو روک لو ان کو اچھے طریقہ سے، یا آزاد کر دو ان کو اچھا طریقہ سے، اور نہ رکو ان کو ضرر پہنچانے کے لئے کہ تم تجاوز کرو، اور جو شخص کرے گا یہ، تحقیق ظلم کیا اس نے اپنی ذات پر، اور نہ بناؤ اللہ کی آیات کو ٹھٹھا، اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے، اور (یاد کرو) جو نازل کی اس نے تم پر کتاب و حکمت، وہ نصیحت کرتا ہے تمہیں اس کی، اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

مختصر مطلب:

جب تم اپنی عورتوں کو رجعی طلاق دے دو تو ان کو بھلائی کے طریقہ سے اپنے پاس روک لو، یعنی اگر تم یہ خیال رکھتے ہو کہ تم حقوق شرع کا پاس کر سکو گے تو رجوع کرلو، اور تم سمجھتے ہو کہ حقوق شرع کا لحاظ نہیں کر سکو گے تو رجوع نہ کرو تا کہ وہ عدت گزار کر آزاد ہو جائیں۔ لیکن ان کی عدت بڑھانے اور ضرر پہنچانے کے لئے رجوع نہ کرو، جو شخص عورت کو نقصان پہنچانے اور تجاوز کرنے کی غرض سے رجوع کرے گا وہ اپنی جان پر ظلم کرے گا، کیونکہ اس کا وبال اسی پر آتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے ٹھٹھا نہ کرو، ان کو کھیل نہ بناؤ، اور اللہ تعالیٰ کی جو تم پر نعمتیں ہیں انہیں یاد کرو، اور اللہ تعالیٰ نے جو تم پر کتاب و حکمت کو نازل کیا (اتارا) اسے یاد کرو کہ وہ اس کے ذریعے تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو، اور جان رکھو یعنی علم پر ہمیشہ قائم رہو، بھولو نہیں بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

شان نزول:

" واخرج ابن جرير وابن المنذر عن السدی قال نزلت هذه الآية فی رجل من الانصار يدعی ثابت بن يسار طلق امرأته حتی اذاانقضت عد تهاالايومين او ثلاثة راجعهاثم طلقهافـفعل ذلک بهاحتی مضت لهاتسعةاشهريضارهافانزل اللہ ولا تمسکوهن ضرارا لتعتدوا"

یہ آیۃ انصار میں سے ایک شخص ثابت بن یسار کے متعلق نازل ہوئی کہ جب انہوں نے اپنی زوجہ کو طلاق دے دی یہاں تک کے عدت کے ختم ہونے سے دو تین دن باقی رہ گئے تو رجوع کرلیا، پھر طلاق دے دی پھر یہی کیا یعنی جب عدت ختم ہونے کے قریب ہوئی تو رجوع کرلیا اور پھر طلاق دے دی اس طرح اس عورت نے نو ماہ میں اپنی عدت ختم کی جو اس کے لئے ضرر کا سبب بنی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا" ولا تمسکوهن ضرارا لتعتدوا" اور ان کو نہ روکو ضرر پہنچانے کے لئے کہ تم حد سے تجاوز کر جاؤ۔ (درمنثور)

بلکہ یہی عام رواج تھا جیسا کہ دوسری روایات میں مطلقاً ذکر ہے۔

" ان الرجل کان یطلق المرأة ثم یراجعھا و لاحاجة له بھا و لایرید امساکھا الاکیما یطول علیھا بذلک العدة لیضارھا فانزل اللّٰه"

بے شک مرد اپنی عورت کو طلاق دیتا تھا پھر رجوع کر لیتا تھا اسے عورت سے کوئی حاجت نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی وہ اسے بھلائی کے طریقہ سے روکنے کی کوشش کرتا مقصد اس کا صرف عورت کی عدت کو لمبا کرنا ہوتا جس سے عورت کو ضرر پہنچایا جاتا تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

(در منثور)

اعتراض: اس مسئلہ کو پہلے 'الطلاق مرتا ن فامساک بمعروف او تسریح باحسان'' (طلاق دو تک ہیں پھر روکنا ہے بھلائی کے طریقہ سے یا آزاد کرنا ہے احسان سے) میں بیان کر دیا گیا ہے تو پھر اس آیۃ کریمہ میں بیان کرنے کا کیا مقصد ہے؟ یہ تو تکرار ہے۔

جواب: یہ تکرار نہیں بلکہ علیحدہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے جو شان نزول سے ہی واضح ہے، کیونکہ پہلی آیۃ میں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں طلاق کی کوئی حد نہیں تھی، طلاق دے کر رجوع کر لیا پھر طلاق دے دی وہ عورت عمر بھر ظلم کی چکی میں پستی رہتی تھی یعنی نہ تو وہ آزاد ہوتی اور نہ ہی اسے زوجیت حاصل ہوتی۔ تو رب تعالیٰ نے طلاق کی حد مقرر کر کے اس ظلم کو ختم کر دیا اور اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ تین طلاقیں مکمل ہونے تک رجوع کرتے رہتے اور اپنی عورت کو عدت کو لمبا کرنے کے لئے رجوع نہ کرو ورنہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آؤ گے جس سے حقیقت میں نقصان تمہیں ہی ہونا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

"واذا طلقتم النساء": اور جب طلاق دو تم عورتوں کو۔

جب پہلی آیۃ میں رجوع کرنے کی حد بیان کر دی گئی کہ رجوع دو طلاقوں تک ہو سکتا ہے، اور تین طلاقوں کے بعد رجوع کا حق ہو جاتا ہے تو اس آیۃ کریمہ میں بھی مراد رجعی طلاق ہے کیونکہ بعد میں اچھی طرح رجوع کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

"فبلغن اجلھن": تو وہ پہنچ جائیں عدت ختم ہونے کے قریب۔

یہاں یہ معنی درست نہیں کہ وہ عدت پوری کر لیں بلکہ معنی یہ ہے۔

" معنی بلغن قاربن باجماع من العلماء ولان المعنی یضطر الی ذلک لانہ بعد بلوغ الاجل لاخیار لہ فی الامساک " (قرطبی)

"کہ عدت ختم ہونے کے قریب ہو" یہ معنی اجماع امت سے ثابت ہے۔ یہ مجازی معنی لینا مجبوری ہے حقیقی معنی "عدت پوری ہو جانا" نہیں لیا جا سکتا کیونکہ عدت کے ختم ہونے کے بعد مرد کو روکنے یعنی رجوع کرنے کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔

" فبلغن اجلھن" کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی یعنی عدت کا ختم ہو جانا اور دوسرا مجازی معنی عدت ختم ہونے کے قریب ہو۔ یہاں مجازی معنی مراد ہے جو بیان کیا جا چکا ہے۔

اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "اور ان کی معیاد آ لگے" لیکن راقم نے " فبلغن" کا لغوی معنی بھی ذکر کیا ہے اور ساتھ ساتھ وضاحت بھی کی ہے "تو وہ پہنچ جائیں عدت ختم ہونے کے قریب"

راقم کا ترجمہ روح البیان کی تفسیر کے مطابق ہے۔

"(فبلغن اجلھن) ای آخر عدتھن وشارفن منتھاھا"

وہ عدت کے آخر تک پہنچ جائیں ایسے حال میں کہ عدت کی انتہاء کے قریب ہوں۔ (روح البیان)

تنبیہ:

"وھو فی الآیۃ التی بعدھا بمعنی التناھی، لان المعنی یقتضی ذلک، فھو حقیقۃ فی الثانیۃ مجاز فی الاولی" (قرطبی)

آنے والی آیہ کریمہ میں بھی یہی الفاظ " فبلغن اجلھن" آ رہے ہیں جن کا معنی یہ ہے کہ وہ پہنچ جائیں عدت کے ختم ہونے کو" کیونکہ وہاں یہی معنی لیا جا سکتا ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی

آرہا ہے۔لہٰذا یہ آیۃ جس کی وضاحت جاری ہے اس میں مجازی معنی لیا گیا ہے اور آنے والی آیت میں حقیقی معنی لیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں اور مثالیں:

" واذ اطلقتم النساء فطلقو ھن لعد تھن"ومعناہ اذا اردتم الطلاق وقاربتم ان تطلقوا فطلقوا للعدۃ"

بظاہر معنی" واذ اطلقتم النساء "کا یہ ہے''اور جب تم طلاق دو عورتوں کو' لیکن مندرجہ بالا آیۃ میں مراد یہ ہے اور جب تم طلاق دینے کا ارادہ کرو اور طلاق دینے کے قریب ہو تو طلاق دو عدت کے لئے۔

اورذکر ہے"فاذاقرأت القرآن فاستعذ باللہ"معناہ اذا اردت قرأتہ" بظاہر معنی"فاذاقرأت القران "کا یہ معنی ہے''جب تم قرآن پاک پڑھ لو' لیکن مندرجہ بالا آیۃ میں معنی یہ ہے جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو اللہ کی پناہ پکڑو (شیطان مردود سے)۔ (احکام القرآن للجصاص)

"فامسکوھن بمعروف" تو روک لو ان کو اچھے طریقہ سے۔

یعنی عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کرلو،ان الفاظ مبارکہ کی یہی تفسیر حضرت ابن عباس اور حسن اور مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ (احکام القران للجصاص)

ان کی طرف رجوع کرو لیکن ان کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہو۔

"والمعروف ما الفتہ العقول واستحسنہ النفوس شرعاوعرفاوعادۃوالمرادبہ ھنا حسن المعاشرۃ"

معروف سے مراد یہ ہے کہ جس سے عقلیں محبت کریں اور لوگ ان کو اچھا سمجھیں ،یعنی شرعا اور عرفا اور عادۃً وہ کام مستحسن ہوں، یہاں مراد ان کا اچھی طرح رہنا ہے۔ (روح البیان)

"او سرحوھن بمعروف": یا آزاد کر دو ان کو اچھے طریقے سے۔

یعنی رجوع نہ کرو، ان کی عدت گزر نے دو یا ان کو طلاق دے کر آزاد کر دو، تا کہ ان کی عدت لمبی نہ ہو جائے۔

"ولا تمسکوھن ضرارالتعتدوا": اور نہ روکو ان کو ضرر پہنچانے کے لئے کہ تم تجاوز کرو۔

سوال: جب "فامسکو ھن بمعروف" (ان کو روک لو اچھے طریقہ سے) ذکر ہو گیا تو "ولا تمسکو ھن ضرار" ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے، کیونکہ امر اپنی ضد میں نہی کا تقاضا کرتا ہے۔

جواب: امر میں تکرار نہیں پایا جاتا، بلکہ ایک مرتبہ کو شامل ہے، لیکن نہی کل اوقات کو شامل ہے، اس لئے صرف "فامسکو ھن بمعروف" سے یہ سمجھ آ رہا تھا کہ "ان کو اچھی طرح روک لو" ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ تو بھلائی سے روک لیتا لیکن مستقبل میں ضرر پہنچانے کا ارادہ رکھتا" ولا تمسکو ھن ضرارا" کہہ کر ہمیشہ کے لئے ضرر پہنچانے سے منع کر دیا۔ (از کبیر)

"ضرار" کا مطلب ہے "دشمنی پیدا کرنا، محبت کو زائل کرنا، اور وحشت واقع کرنا، اور ہر قسم کے نفرت کے اسباب پیدا کرنا۔

ضرر پہنچانے کا کیا مطلب:

مختصر الفاظ سے ہر قسم کے ضرر پہنچانے سے منع کر دیا گیا۔

۱۔ ایک وجہ تو وہی ہے جس کا شان نزول میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ طلاق دے دیتے اور عدت ختم ہونے کے قریب رجوع کر لیتے اس طرح تین طلاقوں تک بار بار رجوع کر کے عدت کو لمبا کرنے کا سبب بنتے جس سے عورت کو ضرر ہوتا اس سے منع کیا گیا۔

۲۔ معاشرت میں ہر طرح سے نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا، کیونکہ بد اخلاقی، بد کلامی، گالی گلوچ، مار کٹائی، ترشروئی وغیرہ سے عورت کو ضرر پہنچتا ہے اس سے منع کیا گیا۔

﴿۳﴾ عورت کو خرچ صحیح نہ دے کر ضرر پہنچانے سے منع کیا گیا کہ ان کا خرچ اپنی طاقت کے مطابق ادا کرو، اس میں کمی نہ کرو، ہاں البتہ غریب خاوند سے امیرانہ خرچ کا مطالبہ کرنا منع ہے۔

" واعلم انهم كانوا يفعلون في الجاهلية اكثر هذه الأعمال رجاء ان تختلع المرأة منه بما لها"

زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو ہر طرح تنگ کیا جاتا تھا، ان کو ضرر پہنچایا جاتا تھا اس امید سے کہ عورت تنگ ہو کر مال دے کر خلع کر لے گی، تو رب تعالیٰ نے ان کو منع کیا کہ عورتوں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔

(از کبیر)

آزادیٔ نسواں (عورتوں کی آزادی) کے دعویدار اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ عورت کے حقوق کا اسلام نے لحاظ کیا ہے یا یہود و انصار نے۔ مغربیت نے عورتوں کو بے حیا تو بنایا ہے لیکن ان کی شایان شان ان کے حقوق کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔

"لتعتدوا": (کہ تم تجاوز کرو)

اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک احتمال یہ ہے " لا تضاروهن فتكونوا معتدين " کہ ان کو ضرر نہ پہنچاؤ کہ تم ضرر پہنچانے کی وجہ سے حد سے تجاوز کر جاؤ۔

اس صورت میں " لام " عاقبت کے لئے ہوگا۔ یعنی ان کو ضرر نہ پہنچاؤ جس کا انجام حد سے تجاوز ہو۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں ہے۔ " فالتقطه آل فرعون ليكون لهم عدوا وحزنا" آل فرعون نے اس کو (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صندوق) اٹھالیا، جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ ان کے دشمن اور ان کے غم کا ذریعہ بن گئے۔

دوسرا احتمال یہ ہے۔

" لا تضاروهن على قصد الاعتداء عليهن فحينئذ تصيرون عصاة الله وتكونون متعمدين قاصدين لتلك المعصية ولا شك ان هذا اعظم انواع المعاصي "

کہ ان پر تجاوز کرنے کے ارادہ سے ان کو ضرر نہ پہنچاؤ، تم اس سے اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہو جاؤ گے، جان بوجھ کر اپنے ارادہ سے اس گناہ کے مرتکب ہو گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ (از کبیر)

"ومن یفعل ذلک فقد ظلم نفسه":

اور جو شخص یہ کرے گا تو تحقیق اس نے ظلم کیا اپنی جان پر۔

یعنی جو شخص اپنی زوجہ کو ضرر پہنچائے گا وہ درحقیقت اپنے آپ پر ہی ظلم کریگا۔

"یعنی عرض نفسه للعذاب لان اتیان ما نهی الله عنه تعرض لعذاب الله" (قرطبی)

یعنی جو شخص عورت کو ضرر پہنچاتا ہے وہ اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کر رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے روکا ہے ان پر عمل کرنا اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کر رہا ہے۔

سوال: مقام قریب کا ہے لیکن اشارہ (ذلک) بعید کا کیوں لایا گیا؟

جواب: (ومن یفعل ذلک) المذکور ومافیه من البعد للایذ ان یبعد منزلته فی الشر والفساد"

اگرچہ مراد تو قریب ہی ہے یعنی جس عورت کو ضرر پہنچایا جس کا ذکر ساتھ ہی ہے، لیکن اشارہ بعید کا لا کر یہ بتایا گیا کہ اس کے اوپر عظیم شر اور فساد مرتب ہوگا جو بعید مرتبہ والا ہے۔ (روح المعانی)

" فقد ظلم نفسه" تحقیق اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا، یعنی اپنے آپ کو عذاب میں پیش کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا؟ یا اس نے اپنے دینی اور دنیاوی منافع کو ضائع کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا، کیونکہ اپنی ازواج سے اچھا سلوک رکھنا باعث ثواب ہے، جو دینی نفع ہے عورت کو ضرر پہنچا کر اس نے اسے ضائع کر دیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص عورتوں سے اچھا سلوک رکھے تو اس کی عورت کے فوت ہو جانے پر یا پہلی زوجہ کے موجود ہوتے ہوئے دوسری شادی کی خواہش پر عورتیں اس کی طرف رغبت کریں گی، اور اگر اس نے عورتوں کو ضرر پہنچایا تو عورتین اس کی طرف توجہ نہیں کریں گی، اس کے قبیح فعل میں مشہور ہونے کی وجہ سے عورتیں اس کا نام سن کر ہی دور بھاگیں، یہ اس کا دنیاوی نفع میں نقصان ہے۔ (از کبیر و روح المعانی)

"ولا تتخذوا آیات اللّٰہ ھزوا": اور نہ بناؤ اللہ کی آیات کو ٹھٹھا (مزاح)

یعنی جب اللہ تعالٰی نے حلال وحرام اور اوامر ونواہی کو وحی کے ذریعہ بیان فرمادیا ہے، تو تم اللہ تعالٰی کی بیان کی ہوئی آیات کو کھیل کود، ٹھٹھا ومزاح نہ بناؤ۔ جب تم پر لازم ہے کہ اللہ تعالٰی کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو تو پھر اگر تم نے اللہ تعالٰی اور اس کے رسول ﷺ اطاعت سے اعراض کیا تو تم نے اللہ کی آیات کا مزاح اڑایا۔

تنبیہ شدید:

" فکل من خالف امرا من امور الشرع فھو متخذ آیات اللہ ھزوا "

ہر وہ شخص جس نے اللہ تعالٰی کے احکام میں سے کسی ایک حکم کی مخالفت کی اس نے اللہ تعالٰی کی آیات کا مزاح اڑایا۔ اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اللہ تعالٰی کی آیات کا مزاح اڑانا شدید نقصان کا سبب ہے۔

ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے:

" وقیل کان الرجل یطلق ویعتق ویتزوج ویقول کنت لاعبافنھوا عن ذلک "

اس وقت رواج یہ تھا کہ کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دیتا تو کہتا کہ میں نے تو یہ مزاح کے طور پر طلاق دی تھی، میرا طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسی طرح کبھی کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کر کے کہتا میں نے تو مزاح کے طور پر آزاد کیا تھا، میرا آزاد کرنے کا حقیقت میں کوئی ارادہ نہیں تھا، اسی طرح کبھی مرد اور عورت نکاح کر لیتے پھر کبھی ایک کہتا کبھی دوسری طرف سے کہا جاتا یہ نکاح مزاح سے کیا گیا تھا کوئی حقیقی نکاح تو نہیں تھا، تو رب تعالٰی نے اس سے ان کو منع فرمایا کہ اللہ تعالٰی کی آیات کو مزاح نہ بناؤ۔

☆ "عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال ثلاث جد هن جد وهزلهن جد النکاح والطلاق والرجعة" (اخرج ابو داؤد والترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزوں میں حقیقت بھی حقیقت ہے اور ان میں مزاح بھی حقیقت ہے، وہ یہ ہیں نکاح اور طلاق اور رجوع کرنا۔

(از خازن)

ایک اور روایت میں عتاق (غلام آزاد کرنے) کا بھی ذکر ہے، کہ مزاح سے آزاد کیا ہوا غلام آزاد ہو جائے گا۔

"واذکروا نعمت اللّٰہ علیکم وما انزل علیکم من الکتاب والحکمة یعظکم بہ":

اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں، اور (یاد کرو) جو نازل کیا تم پر یعنی کتاب وحکمت نصیحت کرتا ہے تمہیں اس کے ذریعے۔

"نعمت اللہ" سے مراد کیا:

"(واذکروا نعمت الله علیکم) بالاسلام" (جلالین)

اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں اسلام کی نعمت عطاء فرمائی ہے اسے یاد کرو۔

"ومن جملتها الهدایة وانزال آیات القرآن علی محمد ﷺ بالشکر والقیام بحقوقها"

یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو اس نے تمہیں ہدایت عطاء فرمائی اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو اس نے حضرت محمد ﷺ پر قرآن کی آیات کو نازل کیا، یاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی نعمت کا شکر یہ ادا کرو، اور اس کے حقوق کو قائم کرو۔ (مظهری)

"(واذکروا نعمت الله علیکم) ای فی ارساله الرسل بالهدی والبینات الیکم" (صابونی)

اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یعنی اس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور واضح دلائل عطاء کر کے تمہاری طرف بھیجا ہے۔

"(واذ کروا نعمت اللہ علیکم) یعنی بالایمان الذی انعم به الله علیکم فهداکم له وسائر نعمه التی انعم بها علیکم" (خازن)

اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یعنی اس نے تمہیں ایمان عطاء کر کے تم پر انعام کیا ہے اور تمہیں اس کی ہدایت دی ہے اور تمام نعمتیں جو اس نے تم پر انعام کی ہیں انہیں یاد کرو۔

مقام توجہ: خازن کے پہلے حصہ کو دیکھیں تو اس کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ نظر آئے گا "اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے"۔

اور آخری حصہ کے مطابق راقم کا ترجمہ ہے "اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں"

"وما انزل علیکم من الکتاب والحکمة یعظکم به":

اور (یاد کرو) جو نازل کیا تم پر یعنی کتاب وحکمت نصیحت کرتا ہے تمہیں اس سے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

واؤ عطف کے لئے ہے، اس جملہ کا عطف "نعمت الله" پر ہے، جملہ محل نصب میں ہے، اور "اذکروا" ساتھ ملے گا "ما" موصولہ ہے "من" بیانیہ ہے، جس کا معنی ہوتا ہے، یعنی "به" میں ضمیر "ما انزل" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

طلباء کرام بیان کردہ ترکیبی ضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے ان شاء اللہ راقم کا ترجمہ بالکل مطابق پائیں گے۔

"الکتاب" سے مراد "قرآن پاک" اور "الحکمة" سے مراد "حدیث پاک" ہے۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "الکتاب" اور "الحکمة" دونوں سے مراد قرآن پاک ہو، اور ان میں دونوں وصفوں کے تغائر کی وجہ سے ہے۔

پہلے مبہم ذکر کیا "وما انزل علیکم" اور جو نازل کیا تم پر، پھر اس کا بیان لایا گیا "من الکتاب

والحکمۃ " یعنی کتاب وحکمت، اس انداز سے بیان کرنے کو عربی گرائمر میں " تفخیم " کہتے ہیں، یعنی اس میں زیادتی وضاحت اور بلندی شان پائی جاتی ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

" واتقوا اللہ ": اور اللہ سے ڈرو۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کرو اور حقوق واجبہ کو ادا کرو۔

" واعلموا ان اللہ بکل شیٔ علیم ":

اور جان رکھو بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہ ترجمہ ہے اور یہی ترجمہ راقم نے بھی نقل کیا، کیونکہ خطاب مسلمانوں کو ہے جو پہلے ہی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، اس لئے " واعلموا " کا ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے کیا 'اور جان رکھو' یعنی اپنے علم پر قائم رہو۔

بعض حضرات نے جو یہ ترجمہ کیا ہے ''اور خوب جان لو'' یہ ترجمہ بھی خوب ہے۔

کیونکہ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم جانتے تو پہلے ہی ہو، لیکن اب خوب جان لو بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اس میں وعید بھی پائی گئی ہے:

" فلا یخفی علیه شیٔ مما تاتو ن وما تذرون فیؤاخذکم بأفانین العقاب "

اور جان رکھو کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے جو کام تم کرتے ہو اور جو چھوڑتے ہو وہ اس پر پوشیدہ نہیں وہ تمہیں مختلف عذاب دے کر تمہاری گرفت کرے گا، یعنی اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا اور اس کے حکم کو چھوڑا تو وہ تمہیں عذاب دے گا۔ (تفسیر ابی السعود)

طلاق کا حق مردوں کو دیا گیا:

تمام آیات میں جن میں طلاق دینے کا ذکر ہے ان میں مردوں کو ہی خطاب ہے کہ ''جب تم عورتوں کو طلاق دو،، یہ کہیں ذکر نہیں کہ جب عورتیں مروں کو طلاق دیں تو اسی سے واضح ہو گیا کہ طلاق دینا مردوں کا حق ہے۔ اگر چہ مرد طلاقوں کا حق عورت کو تفویض کر دے تو عورت کو مرد کی عطاء سے طلاق کا حق تو مل گیا لیکن غور کیا جائے تو قانون قدرت کے خلاف ہے۔

رب تعالٰی نے طلاق کا حق مردوں کو دیا کیونکہ مرد صبر سے کام لیتا ہے، قوت برداشت مرد میں زیادہ ہے عورت انتقامی کاروائی کرنے میں جلد باز ہے، اس لئے مرد کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر مجبوری کی حالت میں اسے استعمال کرے گا۔ لیکن اگر عورت کو یہ حق دیا جاتا تو وہ بہت جلدی استعمال کرتی، آئے دن طلاقیں واقع ہوتی رہتیں۔

ترقی یافتہ ممالک یا انسانیت سے دور، عریانت وفحاشی کے دلدادہ، خدا کے دشمنوں کے ممالک میں جہاں عورت کو طلاق کے حقوق دئے گئے ہیں، خدارا ان سے پوچھ کر تو دیکھئے وہ اس سے کتنے مطمئن ہیں؟

آج عورت کا ایک سے معاشقہ اور کل دوسرے سے اور پرسوں تیسرے سے، اسی وجہ سے طلاقیں واقع ہو رہی ہیں۔ انسان کو انسان سے محبت کم اور نفرت زیادہ ہو چکی ہے، کتوں اور بلیوں سے وہ اپنی محبت پوری کر رہیں ہیں۔ جس قانون سے غیر مسلم بیزار ہیں اسے مسلمان حاصل کرنے کے لئے بے تاب کیوں ہیں؟

اخبارات میں کم از کم ان واقعات میں تناسب تو دیکھئے، یقیناً ایک اور سو کی نسبت نظر آئے گی، وہ کیا واقعات ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ فلاں عورت نے اپنے عاشق سے مل کر اپنے خاوند کو قتل کر دیا، ان وقعات کی تعداد کو دیکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ کتنے ایسے واقعات آپ کی نظر سے گزرتے ہیں کہ فلاں مرد نے اپنی زوجہ کو اپنی محبوبہ کی مدد سے قتل کر دیا۔

ان واقعات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑھتا ہے کہ رب تعالٰی اپنے بندوں پر اتنا شفیق ہے جتنی ماں اپنے بیٹے پر شفیق نہیں۔ اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے، اس کے ہر حکم میں بندوں پر مہربانیاں ہی مہربانیاں پائی گئی ہیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ☆ (سورہ بقرہ آیت: ۲۳۲)

﴿۱﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور اُن کی میعاد پوری ہو جائے تو اے عورتوں کے والیو! انہیں نہ روکو اس سے کہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں، جبکہ آپس میں موافق شرع رضامند ہو جاویں۔ یہ نصیحت اسے دی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔ یہ تمہارے لیئے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

﴿۲﴾

اور جب طلاق دو تم عورتوں کو تو وہ پہنچ جائیں اپنی معیاد (پوری ہونے) کو تو تم نہ رکو ان کو کہ وہ نکاح کریں اپنے (پہلے) شوہروں سے، جبکہ رضامند ہو جائیں آپس میں بھلائی کے طریقے سے، یہ نصیحت کی جاتی ہے اسے جو شخص تم سے ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر، تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ ہے۔

شان نزول:

یہ آیۃ کریمہ جملاء بنت یسار، معقل بن یسار کے حق مین نازل ہوئی۔

بخاری، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے اس واقعہ کوذکر کیا۔

" وعن معقل بن یسار قال زوجت اختالی من رجل فطلقها حتی اذا انقضت عد تها جاء یخطبها فقلت له زوجتک وفر شتک واکر متک فطلقها ثم جئت تخطبها لا واللہ ولا تعودالیک ابداوکان الرجل لاباس به وکانت المرأة تریدان ترجع الیه فانزل اللہ تعالٰی (فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن) فقلت الآن افعل یا رسول اللہ قال فزجھاایاہ"

معقل بن یسار کہتے ہیں میں نے اپنی بہن کا نکاح ایک شخص (بداح بن عاصم) سے کیا، پھر اس شخص نے اسے طلاق دے دی یہاں تک کہ عدت ختم ہوگئی (اس کے رجوع نہ کرنے کی وجہ سے وہ بائنہ ہوگئی) وہ شخص پھر اس (میری بہن) سے نکاح پر آمادہ ہونے کی حالت میں آیا تو میں نے اسے کہا میں نے تمہارا نکاح کیا، تمہیں فراش عطاء کیا اور تمہاری عزت کی لیکن تم نے اسے طلاق دے دی، اب پھر اس سے نکاح کرنے کا خطبہ کررہے ہو، یعنی نکاح پر آمادگی کا اظہار کررہے ہو، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اب وہ تمہاری طرف نہیں لوٹے گی۔ وہ مرد نکاح میں کوئی حرج محسوس نہیں کررہا تھا (یعنی خوشی سے نکاح پر آمادہ تھا) اور وہ عورت (یعنی میری بہن) بھی چاہتی تھی کہ وہ اس سے پھر نکاح کرلے، تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی (ان کو نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کریں) تو میں نے کہا یا رسول اللہ اب میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ تو اس طرح معقل بن یسار نے اپنی بہن جملاء کا نکاح اس کے شوہر بداح بن عاصم سے کردیا۔

☆ ابن جریر نے متعدد اسناد سے روایت کی، پھر سدی سے اس روایت کی تخریج کی۔

" قال نزلت فی جابر بن عبداللہ الانصاری کانت له ابنت عم فطلقھازوجھا فانقضت عدتھا ثم رجع یرید نکاحھافابی جابر "

کہ یہ آیۃ کریمہ جابر بن عبداللہ الانصاری کے حق میں نازل ہوئی، کیونکہ ان کے چچا کی بیٹی کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی، پھر عدت ختم ہونے پر نئے نکاح کی غرض سے اس نے ان کی

طرف رجوع کیا، تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے اپنی چچازاد بہن کا نکاح کرنے سے انکار کردیا۔

اگرچہ پہلی روایت زیادہ مشہور ہے اور سند کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے، لیکن ان میں کوئی تعارض نہیں۔

"ولعلها نزلت في القصتين معا" کیونکہ ہوسکتا ہے یہ دونوں واقعات کے بعد نازل ہوئی ہو۔

اب خطاب عام ہے کہ عورتوں کے والیو! اگر عورتیں اپنے پہلے خاوندوں سے نکاح کرنا چاہیں اور وہ دونوں رضامند ہوں اور حقوق شرع کو بجالانے پر آمادہ ہوں تو تم ان عورتوں کو اپنے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو۔

(از مظھری)

الفاظ مبارکہ کی مختصر وضاحت:

"واذا طلقتم النساء" (اور جب تم طلاق دو عورتوں کو) یعنی تم سے اگر کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دے۔ "فبلغن اجلهن" انقضت عدتهن" (تو ان کی عدت ختم ہوجائے)

راقم نے لغوی اور مرادی معنی کو ترجمہ میں یکجا جمع کیا ہے (تو وہ پہنچ جائیں اپنی معیاد پوری ہونے کو)

" فلا تعضلوهن" (تو ان کو نہ روکو) "فلا تعضلو هن" کا معنی " فلا تمنعوهن "تو ان کو نہ روکو

"خطاب للاولياء اى تمنعوهن من (ان ينكحن ازواجهن) المطلقين لهن" یہ خطاب عورتوں کے ولیوں کو ہے کہ تم ان عورتوں کو اپنے ان خاوندوں سے نکاح کرنے سے منع نہ کرو جنہوں نے ان کو طلاق دی۔

شان نزول سے بھی یہی واضح ہے۔ "(اذا تراضوا) اى الازواج والنساء (بينهم بالمعروف) شرعا" جب شوہر اور بیبیاں آپس میں شرع کا پاس کرتے ہوئے رضامند جائیں۔

خیال رہے کہ "تراضوا" باب تفاعل سے جمع مذکر کا صیغہ ہے، لیکن اس میں مذکر کی شرافت کی وجہ سے قاعدہ تغلیب استعمال کیا ہے۔

"(ذلك) النهى عن العضل (يوعظ به من كان يؤمن بالله واليوم الآخر) لانه المنتفع به

یہ ولیوں کو روکنے سے منع کرنے سے نصیحت کی جاتی ہے ان کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ، اس لئے کہ اس نصیحت سے فائدہ ایمان والوں نے ہی حاصل کرنا ہے۔

"(ذلکم)ای ترک العضل(ازکی)خیر الکم واطھرلکم ولھم لما یخشی علی الزوجین من الریبۃبسبب العلاقۃ بینھما"

جس چیز سے تمہیں منع کیا گیا ہے، اس سے رکنا تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ ہے، یہ بہتری اور پاکیزگی تمہارے لئے بھی ہے اور ان کے لئے بھی جو زوجین پر خوف رکھتے ہیں کہ ان کا آپس میں اچھا سلوک رکھنا مشکوک ہے۔

"(واللہ یعلم) مافیہ المصلحۃ(وانتم لا تعلمون)ذلک فاتبعوا امرہ"

اور اللہ جانتا ہے جو اس میں مصلحت ہے، اور تم اسے نہیں جانتے ،لہٰذا اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرو۔

بالغہ لڑکی خودمختار ہے:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر ہوا" حتی تنکح زوجا غیرہ" (یہاں تک کہ وہ نکاح کرے اور زوج سے)اور اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہوا"ان ینکحن ازواجھن" (یہ کہ وہ نکاح کریں اپنے شوہروں سے)"لان الاصل فی الاسنادحقیقۃ ان تباشر المراۃ" ان دونوں آیتوں میں نکاح کرنے کی نسبت حقیقت میں عورت کی طرف کی گئی، جس سے واضح ہو رہا ہے کہ بالغہ عورت کو اپنا نکاح کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

آیت کریمہ میں عورت کے ولیوں کو جو یہ کہا گیا ہے" فلا تعضلو ھن"(تم ان کو نہ روکو)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت معاشرہ میں یہ رواج تھا کہ عورت نکاح کرنا چاہتی تو اس کے ولی یعنی باپ اور بھائی وغیرہ رکاوٹ بن جاتے کہ تم یہاں نکاح نہیں کرسکتی، آجکل بھی یہی رواج ہے، رواج کے غلط ہونے کی وجہ سے قانون شریعت نہیں بدلتا۔

☆ "عن ابی ہریرہ قال رسول اللہ ﷺ لا تنکح الثیب حتی تستأذن و لا تنکح البکر حتی تستأمر قالوا یارسول اللہ کیف اذنہا قال اذنہا ان تسکت" (نسائی، ج ۲، ص ۶۴)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ثیبہ (یعنی بالغہ) کا نکاح اس سے اس کے معاملات طلب کرنے کے لئے نہ کیا جائے، اور باکرہ (یعنی بالغہ) کا نکاح اس سے اس کے معاملات طلب کرنے کے بغیر نہ کیا جائے (یعنی اس سے بھی اجازت طلب کی جائے) صحابہ کرام نے عرض کیا اس کی طرف سے اجازت ہے۔

یعنی اس کا خاموش رہنا اور اس طرح اس کا مسکرانا یا رونا بھی اجازت متصور ہوں گے، اگر اسے یہ نکاح منظور نہیں تو اسے صراحۃً انکار کردینا چاہئے۔

☆ "عن ابن عباس مرفوعا الایم احق من ولیہا والبکر تستاذن فی نفسہا اذنہا صماتہا"

(رواہ مسلم ومالک وابوداؤد والترمذی والنسائی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں غیر شادی شدہ عورت (ثیبہ بالغہ عورت) اپنے آپ پر اپنے ولی سے زیادہ حق رکھتی ہے، اور باکرہ (جوکہ بالغہ ہو) اس کی ذات کے متعلق اس سے اجازت طلب کرلی جائے، اس کا، خاموش رہنا (بھی) اس کی طرف سے اجازت ہے۔

حدیث پاک سے بہت واضح طور پر ثابت ہوا کہ بالغہ عورت خواہ ثیبہ ہو یا باکرہ ہو اپنے نفس پر خود اختیار رکھتی ہے، اس کے ولی کو اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کرنا جائز ہے۔

ثیبہ (بیوہ یا مطلقہ) لیکن جب بالغہ ہو وہ زبان سے اجازت دے اور باکرہ جو بالغہ ہے اس کا بول کر اجازت دینا اور خاموش رہنا اور مسکرانا بلکہ نکاح کی اجازت طلب کرنے پر اس کا رونا بھی اجازت متصور ہوگا۔

باپ اپنی بالغہ لڑکی کا نکاح جبراً نہ کرے:

"عن خنساء بنت خذام ان اباہا زوجہا وھی ثیب فکرھت ذلک فاتت رسول اللہ ﷺ فرد نکاحہ" (نسائی، ج ۲، ص ۶۴)

خنساء بنت خذام سے مروی ہے کہ بیشک اس کے باپ اس کا نکاح کر دیا کہ وہ ثیبہ (اور بالغہ) تھی، اس نے نکاح کو ناپسند کیا تو نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی تو آپ نے اس کے باپ کے کئے ہوئے نکاح کو توڑ دیا۔

یعنی بالغہ عورت سے اجازت کے بغیر نکاح کرنا اور اس کا رد کر دینا کہ مجھے یہ پسند نہیں یا پہلے ہی سے اس نے انکار کر دیا ہو، پھر اس کا نکاح جبراً کر دیا ہو یہ نکاح درحقیقت درست نہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ کے نکاح کو توڑنے کا مطلب یہی ہے کہ یہ نکاح ہوا ہی نہیں اور " فرد نکاحه "کا معنی یوں کر لیا جائے" آپ نے اس کے باپ کے کئے ہوئے نکاح کو باطل قرار دیا" تو یہ زیادہ آسان اور واضح ہے۔

☆ " عن عائشة ان فتاة دخلت عليها فقالت ان ابى زوجنى ابن اخيه ليرفع بى خسيسته وانا كارهة فقالت اجلسى حتى ياتى النبى ﷺ فجاء رسول الله ﷺ فاخبرته فارسل الى ابيها فدعاه فجعل الأمر اليها فقالت يارسول الله قد اجزت ماصنع ابى ولكن اردت ان اعلم أللنساء من الأمر شئ" (نسائی، ج ۲، ص ۶۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بیشک ایک جوان لڑکی ان کے پاس حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ میرے باپ نے میرا نکاح اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دیا ہے تاکہ وہ میرے ذریعے اس کی خساست (گھٹیا پن) کو دور کرے، حالانکہ میں یہ نکاح ناپسند کرتی ہوں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے کہا، نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے تک بیٹھ جا، نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے۔ اس لڑکی نے آپ کو بتایا تو آپ نے اس کے باپ کی طرف پیغام بھیج کر اسے بلایا۔ (اس کے آنے پر) معاملہ لڑکی کے سپرد کر دیا تو اس نے کہا یارسول اللہ جو میرے باپ نے کیا ہے میں اس کی اجازت دے رہی ہوں، لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا عورتوں کا بھی اس معاملہ میں کوئی حق ہے۔

وضاحت حدیث:

"لیرفع بی خسیسته" کا مطلب یہ ہے کہ میرے باپ کے بھائی کا بیٹا خسیس یعنی گھٹیا ہے جسے کوئی پسند نہیں کرتا میرا نکاح اس سے کر کے میرے باپ نے اسے عزت دینی چاہی کہ وہ اپنے گھٹیا پن سے نکل جائے۔

"انا کارھة" حالانکہ میں اس نکاح کو پسند نہیں کرتی ہوں، لڑکی چونکہ بالغہ تھی اور نکاح اس کی اجازت کے بغیر ہو گیا تھا، اس لئے نبی کریم ﷺ نے اسے اختیار دے دیا تھا کہ اگر تو چاہتی ہے تو نکاح کو برقرار رکھ اور اگر تو چاہتی ہے تو نکاح کو توڑ دے۔

واضح ہوا کہ بالغہ لڑکی کی اجازت کے بغیر کیا ہوا نکاح اس کی اجازت پر موقوف ہو جاتا ہے، وہ چاہے تو برقرار رکھے یا توڑ دے، ہاں البتہ اجازت طلب کرنے اور اس کے خاموش رہنے پر نکاح ہو جائے گا، اب اسے توڑنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

عورت اپنے نکاح میں بزرگوں سے مشورہ کرے:

فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ان کے خاوند ابوعمرو بن حفص نے طلاق دے دی، جب انہوں نے عدت گزار لی تو نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا۔

"ان معاویة بن سفیان و اباجهم خطبانی فقال رسول الله ﷺ اما ابو جهم فلا یضع عصاه عن عاتقه واما معاویة فصعلوک لا مال له ولکن انکحی اسامة بن زید فکرهته ثم قال انکحی اسامة بن زید فنکحته فجعل الله فیه خیرا واغتبطت به"

(نسائی باب اذااستشارت المرأۃ رجلا، ج ۲، ص ۶۱)

کہ بیشک مجھے معاویہ بن سفیان اور ابوجہم نے پیغام نکاح دیا ہے (میں کس سے نکاح کروں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابوجہم تو اپنا عصا اپنے کندھے سے نہیں اتارتا اور معاویہ غریب انسان ہے اس کے پاس کوئی مال نہیں، تم اسامہ بن زید سے نکاح کرلو (یہ کہتی ہیں) میں نے ان سے

نکاح کرنا پسند نہ کیا۔آپ نے فرمایا اسامہ بن زید سے نکاح کرلو۔تو میں نے ان سے نکاح کرلیا، اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی برکت عطاء فرمائی کہ مجھ پر رشک کیا جانے لگا۔

وضاحت حدیث:

جب نکاح کے لئے مختلف اطراف سے پیغام ملیں تو بزرگوں سے مشورہ کرلیا جائے کہ کون سا شخص بہتر ہے، جس سے نکاح کیا جائے مشورہ دینے والا اگر ان میں سے کوئی بہتر پائے تو اس کے متعلق مشورہ دے دے اور تیسرے شخص کے متعلق مشورہ دے دے، کہ میرے خیال میں ان تمام سے فلاں شخص زیادہ بہتر ہے، ان میں کوئی ایک بھی بہتر نہیں۔

جب تک کسی ایک سے بات طے نہ ہو جائے اس وقت تک کئی آدمی رشتہ پوچھ سکتے ہیں، جب کسی سے بات طے ہو جائے تو دوسرے کا پوچھنا ناجائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" لایخطب احدکم علی خطبۃ بعض"

(نسائی باب النھی ان یخطب الرجل علی خطبۃ اخیہ)

تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے پیغام نکاح (طے ہو جانے) کے بعد نکاح کا پیغام نہ دے۔

مشورہ دیتے وقت، فتوی دیتے وقت، فتوی پوچھتے وقت کسی کے عیب بیان کرنا غیبت نہیں، بلکہ " المستشار مؤتمن" جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہوتا ہے، اسے چاہیے کہ بہتر مشورہ دے، ورنہ امانت میں خیانت کرنے کے مترادف ہوگا۔

بزرگوں کے مشورہ میں برکت ہوتی ہے جیسے نبی کریم ﷺ کے مشورہ پر باوجود اس عورت کے ناپسند کرنے کے اللہ تعالیٰ نے نکاح میں اتنی برکتیں عطاء فرمائی کہ دوسری عورتیں رشک کرنے لگیں۔ کاش کہ ہمارا نکاح اسامہ بن زید سے ہوتا تو کتنا بہتر ہوتا۔

ابوجہم اپنا عصا کندھے سے نہیں اتارتا۔ اس کا ایک معنی یہ بیان کیا گیا ہے وہ سفر میں زیادہ رہتا ہے، جس سے حقوق زوجیت ادا نہیں کر پائے گا۔

اس معنی کے لحاظ سے تبلیغی حضرات کے سال سال اور کئی کئی مہینے کے لئے بستر اٹھا کر مختلف ممالک کی سیر کرتے رہنا کہاں درست ہوگا؟

دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات عورتوں پر ظلم کرتا ہے، مارکٹائی سے کام لیتا ہے، اس لئے وہ اس قابل نہیں کہ اس سے نکاح کیا جائے۔

اس معنی کو ہی زیادہ طور پر شارحین نے پسند کیا ہے، اس معنی سے واضح ہوا کہ خاوند کے ظلم مارکٹائی کو نبی کریم ﷺ نے ناپسند فرمایا ایسے شخص سے نکاح نہ کرنے کا مشورہ دیا۔

معاویہ بن سفیان کے متعلق فرمایا کہ وہ غریب ہے اس کے پاس مال نہیں، اس سے واضح ہوا کہ جب کسی شخص کے پاس اتنا مال بھی نہ ہو جس وہ مہر و اور نفقہ ادا کر سکے تو اس کے ساتھ نکاح نہ کرنے کا مشورہ دینا بہتر ہے، لیکن کار، بنگلہ کی تلاش میں اپنی بچیوں کی زندگیاں برباد کر دینا بھی عقل و دانش کا کام نہیں۔

نیک مرد پر عورت کا اپنے آپ کو پیش کرنا سنت ہے:

" عن انس ان امرأة عرضت نفسها علی النبی ﷺ فضحکت ابنة انس فقالت ما کان اقل حیا نها فقال انس هی خیر منک عرضت نفسها علی النبی ﷺ "

(نسائی باب عرض المرأة نفسها علی من ترضی، ج ۲، ص ۶۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک ایک عورت نے اپنے آپ کو نکاح کے لئے خود ہی نبی کریم ﷺ پر پیش کیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بیٹی اس پر ہنسنے لگی کہ یہ عورت کتنی کم حیاء والی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا یہ تم سے بہتر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ پر پیش کیا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ کسی کو نیک سمجھ کر عورت پسند کرے اور اپنے نکاح کا خود ہی اسے پیغام دے تو یہ سنت صحابیہ ہے اس میں بے حیائی نہیں بلکہ یہ بہتر پسند ہے۔

نکاح کے لئے عوت یا اس کے والدین استخارہ کریں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب حضرت زینب بنت جحش کی عدت ختم ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید کو کہا کہ اسے میری طرف سے پیغام نکاح دے دو، حضرت زید کہتے ہیں میں چلا اور زینب کو جا کر کہا تم خوش ہو جاؤ، مجھے تمہاری طرف رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے، جو تمہیں یاد کر رہے ہیں یعنی پیغام نکاح دے رہے ہیں۔

"فقالت ماانابصانعة شيأحتى استأمر ربى فقامت الى مسجدها"

(نسائی، ج ۲، ص ۶۲ باب صلوة المرأة اذاخطبت و استخار تهار بها)

تو حضرت زینب نے کہا میں اس معاملہ میں خود اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی یہاں تک کہ میں اپنے رب تعالیٰ سے فیصلہ طلب کر لوں، پھر وہ اپنے نماز پڑھنے کے مقام پر جا کھڑی ہوئیں۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نکاح سے پہلے عورت نوافل ادا کر کے استخارہ کر لے، یہ اس کے لئے بہتر ہے۔

استخارہ کیسے کرے؟

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ہمیں تمام امور میں استخارہ کرنا ایسے سکھاتے تھے جس طرح قرآن پاک کی سورت سکھاتے، آپ فرماتے تھے کہ تم میں سے جب بھی کوئی کسی کام کا ارادہ کرے تو دو رکعت نوافل ادا کر کے پھر یہ دعا پڑھے۔

"اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَعِيْنُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَيْرٌ لِّىْ فِىْ دِيْنِىْ وَمَعَاشِىْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِىْ (اوقال) فِىْ عَاجِلِ اَمْرِىْ وَآجِلِهٖ فَاقْدُرْهُ لِىْ وَيَسِّرْهُ لِىْ ثُمَّ بَارِكْ لِىْ فِيْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّىْ فِىْ دِيْنِىْ وَمَعَاشِىْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِىْ (اوقال) فِىْ عَاجِلِ اَمْرِىْ وَآجِلِهٖ فَاصْرِفْهُ عَنِّىْ وَاقْدُرْ لِىَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِىْ بِهٖ"

(نسائی، ج ۲، ص ۶۲)

پھر آپ نے فرمایا اپنی حاجت اور اپنے کام کو ذہن میں رکھے، یعنی جس کام کے لئے استخارہ کر رہا ہے وہ ذہن میں رکھے، استخارہ کے بعد اگر دل اس کام کی طرف راغب ہو رہا تو وہ کام کرے یہ اس کے لئے بہتر ہے، اور اگر دل اس کام کی طرف رغبت نہیں کر رہا تو وہ کام نہ کرے کیونکہ وہ کام اس کے حق میں بہتر نہیں۔

استخارہ کے نوافل کی نیت عام نوافل کی طرح ہوگی، اسی طرح ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی بھی سورۃ ملا لے تو درست ہے، تاہم اگر پہلی رکعت میں " **سورۃ الکافرون** " اور دوسری رکعت میں " **سورۃ اخلاص** " پڑھ لے تو زیادہ مناسب ہے۔

تنبیہ: دعاء میں الفاظ " او قال " دونوں جگہ نہیں پڑھنے، اسی لئے راقم نے ان کو بریکٹ میں کر دیا ہے۔ دراصل یہ راوی کو شک تھا کہ آپ نے " **وعاقبة امری** " ذکر فرمایا، یا کہ " **فی عاجل امری و آجله** " ذکر فرمایا۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ صرف " او قال " کے لفظ دونوں جگہ چھوڑ دے باقی تمام دعاء پڑھ لے۔

ولی کے بغیر نکاح نہ ہو سکنے پر احادیث اور ان کے جوابات:

" عن عائشة ان رسول الله ﷺ قال ایما امر اة نکحت بغیر اذن ولیها فنکا حها باطل فنکا حها باطل فنکا حها باطل فان دخل بها فلما المهر بما استحل من فرجها فان اشتجر فالسلطان ولی من لاولی له" (رواہ السنن وحسنہ الترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔ تو اس کا نکاح باطل ہے۔ تو اس کا نکاح باطل ہے، اگر اس سے وطی کرے تو فرج کو حلال سمجھنے کی وجہ سے اس پر مہر لازم ہے، اگر اختلاف ہو جائے تو جس کا ولی نہ ہو تو اس کا ولی بادشاہ ہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ عورت خواہ بالغہ ہو یا نابالغہ اس کا نکاح ولی کے بغیر درست نہیں۔

جواب:

"قال الطحاوی حدثنا ابن ابی عمران قال اخبرنا یحیی بن معین عن علیة عن ابن جریج انه قال لقیت الزھری فاخبر ته عن ھذاالحدیث فانکرہ" (مظھری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے راوی ابن جریج ہیں وہ روایت کرتے ہیں سلیمان بن موسیٰ سے وہ روایت کرتے ہیں زہری سے وہ روایت کرتے ہیں عروہ سے وہ روایت کرتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے۔

طحاوی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جریج کہتے ہیں کہ میں، خود زہری کو ملا اور اس حدیث کے متعلق ان سے پوچھا تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔لہذا راوی کے انکار کی وجہ سے حدیث ضعیف ہوگئی، ضعیف حدیث سے کسی چیز کا حرام ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔

☆ "وعن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ لا نکاح الا بو لی وشاھدی عدل" (رواہ الدارقطنی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح صحیح نہیں۔

جواب:

"وفیه یزید ابن سنان وابوہ قال الدار قطنی ھو وابوہ ضعیفان وقال النسائی ھو متروک الحدیث وضعفه احمد وغیرہ" (مظھری)

اس حدیث کے راویوں میں یزید ابن سنان اور اس کا باپ ہیں، دارقطنی نے کہا ہے کہ یزید بن سنان اور اس کا باپ ضعیف راوی ہیں، نسائی نے متروک الحدیث کہا اور احمد وغیرہ نے اسے ضعیف کہا۔

واضح ہوا کہ یہ حدیث بھی ضعیف ہے جس پر حلت وحرمت کو موقوف نہیں کیا جاسکتا۔

"وعن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ لابدللنکاح من اربعة الولی والزوج وشاهدین"
(رواہ الدارقطنی)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا نکاح میں چار شخصوں کا ہونا ضروری ہے (وہ یہ ہیں) ولی اور زوج اور دو گواہ۔

جواب:

"وفیه نافع بن میسر ابو خطیب مجهول"

یہ حدیث بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کے راویوں میں نافع بن میسر ابوخطیب پایا گیا ہے جو مجہول ہے۔ (مظہری)

"عن ابی بردة عن ابیه ابی موسی عن النبی ﷺ لا نکاح الابولی" (رواہ احمد)

حضرت ابوہریرہ اپنے باپ حضرت ابوموسی سے روایت کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ولی کے بغیر نکاح نہیں۔

"وعن ابن عباس مرفوعا لا نکاح الابولی، والسلطان ولی من لا ولی له"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بغیر ولی کے نکاح نہیں، اور بادشاہ اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہیں۔

جواب:

"رواہ احمد من طریق الحجاج بن ارطاة وهو ضعیف ومن طریق آخر فیه عدی بن الفضل وعبد الله بن عثمان ضعیفان"

یہ دونوں حدیثیں مسند احمد میں حجاج بن ارطاۃ سے روایت کی گئی ہیں جو ضعیف راوی ہیں۔ اور ایک دوسری سند سے بھی روایت ہیں لیکن اس میں عدی بن فضل اور عبداللہ بن عثمان راوی ہیں جو ضعیف ہیں۔

مظہری نے چند اور روایات بھی ذکر کی ہیں، ہر روایت میں کوئی نہ کوئی راوی ضعیف پایا گیا ہے۔

احناف کا فیصلہ کن جواب:

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے کہ عورت بالغہ خود مختار ہے اس کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر جائز ہے تو آپ کی طرف سے ان احادیث کے متعلق جن میں ولی کے بغیر نکاح جائز نہ ہونے کا ذکر ہے، فیصلہ کن جواب یہ ہے۔

"قالت الحنفية اذا تعارضت النصوص فيحب سلوک طريق التر جيح او الجمع بضرب من التا ويل"

احناف نے یہ بیان کیا ہے کہ جب نصوص (آیات واحادیث) میں تعارض آ جائے تو وجہ ترجیح تلاش کی جائے یا کسی تاویل کے ذریعے ان میں تطبیق دے کر ان کو جمع کیا جائے۔

"فعلى طريقة التر جيح ماروا ه مسلم اصح واقوى سندا بخلاف ماروو ه من الاحاديث فانها لم تخل من ضعف او اضطراب"

وجہ ترجیح واضح ہے کیونکہ جو روایت مسلم کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے (جو پہلے ذکر دی گئی) وہ زیادہ صحیح اور زیادہ قوی ہے سند کے لحاظ پر اس میں بالغہ کو نکاح کرنے کا اختیار دے دیا گیا، بخلاف اس کے وہ روایت جن میں ولی کے بغیر نکاح صحیح نہ ہونے کا ذکر ہے وہ تمام ضعیف یا مضطرب ہیں جو صحیح حدیث کے مقابل نہیں ہوسکتیں۔ (مظہری)

خیال رہے کہ حدیث مسلم جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ مؤطا امام مالک اور ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی میں بھی مذکور ہے۔

"وعلى طريقة الجمع فنقول معنى قوله ﷺ لا نكاح الابولى يعنى لانكاح على الوجه المسنون او نقول لا نكاح الا بمن له ولا ية لينفى نكاح الكافر المسلمة والنكاح مع المحر مية والنكاح فى عدة زوج قبله وغير ذلک من الا نكحة الفاسدة"

احادیث میں تطبیق اس طرح پائی جاسکتی ہے کہ جن احادیث میں ''لانکاح الابولی'' ان کا یہ مطلب نہیں کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ولی کے بغیر نکاح سنت کے خلاف ہے۔

اور دوسرا معنی یہ ہے'' لانکاح الابمن له ولایة'' کہ عورت کا نکاح اس شخص سے جائز نہیں جسے اس عورت سے نکاح کرنے کی ولایت (حق) حاصل نہیں۔ یعنی مسلمان عورت کافر مرد سے نکاح نہیں کرسکتی اور کوئی عورت اپنے محرم (باپ، بیٹا، بھائی، چچا، ماموں، بھتیجا، بھانجا وغیرہ) سے نکاح نہیں کرسکتی۔ اور اگر کوئی عورت پہلے خاوند کی عدت گزار رہی ہے تو وہ دوران عدت نکاح نہیں کرسکتی، اسی طرح کسی قسم کا فاسد نکاح نہیں کرسکتی۔ (مظهری)

ان معانی کے لحاظ پر یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ بالغہ عورت اگر ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

''ویحمل حدیث عائشة علی امرأةنکحت نفسهامن غیر کفو،والمرادبالباطل حقیقة علی قول من لم یصح ماباشرته من غیر کفو وحکما علی قول من یصححه ویثبت للولی حق الخصومة فی فسخه'' (مظهری)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت جس میں ذکر ہے کہ جو عورت ولی کے بغیر نکاح کرے وہ باطل ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ جو عورت اپنی کفو سے گھٹیا کفو میں نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔

باطل ہونے میں بھی پھر دو قول ہیں ایک یہ کہ عورت جب غیر کفو میں نکاح کرے تو اس کا نکاح خود بخود فسخ ہو جاتا ہے لیکن اس وقت جب کہ اس کے ولیوں کو اعتراض ہو، وہ نکاح حکام سے فسخ کرانے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ولیوں کو اعتراض ہو تو وہ نکاح حکام سے فسخ کرائیں، اس لحاظ پر باطل ہونے کا معنی مجازی ہوگا۔

یہی تحقیق علامہ شامی رحمہ اللہ کی ہے۔

اگرچہ مظہری کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ باطل سے مراد حقیقی طور پر باطل ہونا ہے، جن کے نزدیک عورت کا غیر کفو میں نکاح کرنا صحیح نہیں ان کے نزدیک باطل کا حقیقی معنی مراد ہے اور بعض کے نزدیک نکاح کرنا تو صحیح ہے لیکن ولیوں کو نکاح فسخ کرانے کا حق ہے ان کے نزدیک مجازی معنی مراد ہے۔

نکاح میں گواہوں کا ہونا ضروری:

جب تک نکاح میں گواہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں نہ ہوں س وقت تک نکاح فاسد ہوگا۔

☆ "قال رسول اللہ ﷺ لانکاح الابشھود" (رواہ الدار قطنی مرقاۃ، ج۶، ص۲۱۷، کتاب النکاح)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بغیر گواہوں کے نکاح نہیں۔

☆ "عن ابن عباس البغایا التی ینکحن انفسھن بغیر بینۃ" (رواہ الترمذی (مرقاۃ ج۶، ص۲۱۷ کتاب النکاح)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں وہ عورتیں زانیہ ہیں جو بغیر گواہوں کے نکاح کر لیتی ہیں۔

یہ قول باطل ہے:

یہ کہنا کہ لڑکا اور لڑکی کہہ دیں کہ ہمارا نکاح ہے تو گواہوں کی ضرورت نہیں۔ یہ قول لغو اور باطل ہے۔ اگر یہی قول درست ہو تو ہر فاحشہ عورت اپنے پاس آئے ہوئے مرد کے متعلق یہی کہہ دے گی کہ یہ میرا خاوند ہے۔

نکاح مسجد میں مستحب ہے:

"عن عائشۃ قالت رسول اللہ ﷺ اعلنوا ھذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوا علیہ بالدفوف" (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب، مشکوۃ کتاب النکاح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس نکاح کا اعلان گواہوں (کے ذریعے) کرو اور نکاح مسجد میں کرو اور نکاح کے وقت دف بجاؤ۔

"(اعلنو اھذاالنکاح) ای بالبینة فالامر للوجوب"

اس نکاح کا اعلان گواہوں کے ذریعے کرو، یہ امر وجوب کے لئے ہے۔

مسجد میں نکاح کرو، مسجد میں نکاح کرنے کی وجہ تو یہ ہے کہ نکاح میں لوگ گواہ بن جائیں "اولحصول برکة المکان" یا مکان کی برکت حاصل کرنے کے لئے مسجد میں نکاح کرنے کا حکم دیا گیا۔

" و ینبغی ان یر اعی ایضافضیلة الزمان لیکو ن نوراعلی نوروسروراعلی سرور"

مناسب یہ ہے کہ جس طرح بابرکت جگہ پر نکاح کرنا مستحب ہے اسی طرح دن اور وقت بھی ایسا مقرر کرے جس میں فضیلت پائی جائے تا کہ "نورعلی نور" ہو جائے اور خوشی پر خوشی حاصل ہو۔

"قال ابن الھمام یستحب مباشرةعقدالنکاح فی المسجد لکونه عبادة و کو نه فی یوم الجمعة"

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں مستحب ہے کہ نکاح مسجد میں کیا جائے کیونکہ نکاح عبادت ہے، اور جمعہ کے دن ہو، کیونکہ جمعہ برکت والا دن ہے۔

نکاح کے اعلان کے لئے دف بجائی جائے لیکن دف مسجد کے باہر بجائی جائے، جیسا کہ دیہاتوں میں رمضان المبارک شریف میں دف (نقارہ) وضوخانہ یا مسجد کے ساتھ ملحق حجرہ کی چھت پر بجائی جاتی تھی۔

نکاح میں خطبہ پڑھا جائے:

الحمدلله نستعینه و نستغفره و نعوذ بالله من شرور انفسنا من یهده الله فلا مضل له ومن یضلل فلا هادی له واشهدان لا اله الا الله و اشهد ان محمد اعبده ورسوله "

اور خطبہ میں یہ تین آیتیں پڑھی جائیں

یا ایها الذین امنوا اتقوا الله حق تقاته و لا تمو تن الا و انتم مسلمون ☆

یاایها النا س اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا کثیرا ونساء واتقوا الله الذی تساء لون به والارحام ان الله کان علیکم رقیبا☆

یاایهاالذین امنو اتقوا الله وقولوا قولا سدیدا یصلح لکم اعمالکم ویغفر لکم ذنو بکم و من یطع الله ورسوله فقد فاز فوزا عظیما ☆

تنبیہ:

ولی کے بغیر نکاح سنت کے خلاف ہے، خطبہ کے بغیر نکاح سنت کے خلاف ہے، گواہوں کے بغیر نکاح فاسد ہے۔ ان مسائل کو واضح کرتے رہیں، آجکل کے معاشرہ میں لڑکیوں کو آزاد کرنے کی وجہ سے اپنی مرضی سے عشق بازی میں مبتلا ہو کر خود بخود نکاح کر رہی ہیں، چند دنوں کے بعد عاشق صاحب منہ موڑ لیتے ہیں اور یہ ذلیل ہو کر در بدر بھٹکتی ہیں۔ نہ والدین منہ لگاتے ہیں اور نہ ہی خاوند صاحب وفا کرتے ہیں۔ اگر والدین کی مرضی سے نکاح کریں بیشک اپنی رائے کا بھی اظہار کریں تو اسی میں کامیابی ہے، اگر خاوند بے وفائی کرے تو کم از کم والدین تو اس کا سہارا بن سکیں۔

☆☆☆☆☆

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَاتُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّاوُسْعَهَا لَاتُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَامَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَافِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِمَاوَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَاسَلَّمْتُمْ مَّآاٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ☆ (سورہ بقرہ آیت، ۲۳۳)

اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس، اس کے لیئے جو دودھ کی مدت پوری کرنی چاہے اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا ہے حسب دستور، کسی جان پر بوجھ نہ رکھا جائے گا، مگر اس کے مقدور بھر ماں کو ضرر نہ دیا جائے اس کے بچہ سے اور نہ اولاد والے کو اس کی اولاد سے (یا ماں ضرر نہ دے اپنے بچہ کو، اور اولاد والا اپنی اولاد کو) اور جو باپ کا قائم مقام ہے اس پر بھی ایسا ہی واجب ہے۔ پھر اگر ماں باپ آپس میں رضا اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر گناہ نہیں۔ اور اگر تم چاہو کہ دائیوں سے اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو بھی تم پر مضائقہ نہیں۔ جب کہ جو دینا ٹھہرا تھا بھلائی کے ساتھ انہیں ادا کر دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

۲

اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل جو ارادہ رکھیں کہ پوری کریں دودھ پلانے کی مدت۔ اور جس کا بچہ ہے اس پر لازم ہے عورتوں کا خرچ اور لباس شرع کے مطابق، نہ تکلیف دی جائے کسی نفس کو سوائے اس کی طاقت کے۔ نہ ضرر دیا جائے ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ (ضرر دیا جائے) باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور وارث پر مثل اسی کے۔ پھر اگر ارادہ کریں دونوں (ماں باپ) دودھ چھڑانے کا آپس میں رضامندی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر، اور اگر ارادہ کرو تم کہ دودھ پلواؤ (دائیوں سے) اپنی اولاد کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر جب سپرد کر دو ان کے وہ چیز جو تم نے ان کو دینی تھی، بھلائی کے طریقہ سے، اور ڈرو اللہ سے، اور جان رکھو بیشک اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔

مختصر مطلب:

مائیں اپنی اولاد کو اگر پوری مدت دودھ پلانا چاہتی ہوں تو دو سال تک دودھ پلائیں اور اگر بچوں کے ماں باپ آپس میں رضامندی اور مشورہ سے دو سال سے پہلے ہی دودھ چھڑانا چاہیں تو چھڑا لیں، اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بچوں کے باپ پر لازم ہے کہ ان کی ماؤں کا خرچ اور لباس دیں۔ لیکن کسی نفس کو طاقت سے زائد تکلف نہیں دی جاتی، بلکہ اپنی وسعت کے مطابق وہ رزق اور کپڑے دے، بچے کی وجہ سے ماں کو ضرر نہ دیا جائے یعنی ماں پر دودھ پلانے میں جبر نہ کیا جائے، اور باپ کو بچے کی وجہ سے ضرر نہ پہنچایا جائے کہ وہ وسعت نہیں رکھتا تو اس پر جبر نہ کیا جائے کہ تم دودھ پلانے کے لئے ضرور ہی دایہ طلب کرو، اگر اولاد کے دودھ پلانے کے لئے دائیوں کو حاصل کیا جائے تو اس میں حرج نہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ جو اجرت ان سے طے کی گئی تھی وہ ادا کر دی جائے اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

”والوالدات يرضعن اولادهن حولين كاملين لمن اراد ان يتم الرضاعة“:

اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل جو ارادہ رکھیں کہ پوری کریں دودھ پلانے کی مدت۔

”والوالدات“ میں تین قول ہیں:

پہلا قول:

اس سے مراد عام ہے تمام والدات (ماؤں) کو شامل ہے، خواہ وہ نکاح میں ہوں یا ان کو طلاق دی گئی ہو۔

” والدليل عليه ان اللفظ عام وما قام دليل التخصيص فوجب تركه على العموم “

اس پر دلیل یہ ہے کہ لفظ عام ہے، اور تخصیص کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ تخصیص کے قول کو چھوڑ دیا جائے اور اس کو عموم پر ہی رکھا جائے۔

دوسرا قول:

کہ اس سے مراد وہ مائیں ہیں جن کو طلاق دے دی گئی ہو۔

اس قول والے حضرات نے اس موقف پر دو دلیلیں قائم کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو طلاق کے احکام کے بعد ذکر کیا ہے، تو گویا کہ یہ آیت پہلی آیت کا تتمہ (تکمیل کرنے والی) بن گئی۔

اس آیت کو ماقبل (پہلی) آیات سے متصل کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی زوجہ کو طلاق دے دیتا ہے تو ان دونوں کے درمیان بغض اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ہو سکتا ہے ماں بچے کو دودھ نہ پلائے، تو بچے کو ضرر پہنچے، اور خصوصاً جب عورت کی رغبت دوسرے خاوند کی طرف ہو جائے تو وہ بچے کی طرف توجہ نہیں کرے گی۔

” فلما كان هذا الاحتمال قائماً لا جرم ندب الله الوالدات المطلقات الى رعاية جانب الاطفال والاهتمام بشانهم“

جب یہ احتمال قائم ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان ماؤں کے لئے مستحب قرار دیا جن کو طلاق دی جائے کہ وہ اپنے بچوں کی رعایت کریں اور ان کے حالات کا اہتمام کریں۔

ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں "والدات" سے مراد وہ مائیں ہیں جن کو طلاق دے دی گئی ہو۔ کیونکہ اس کے بعد ذکر ہے "وعلی المولود له رزقهن و کسو تهن" (باپ پر ان کا خرچ اور لباس لازم ہے) زوج پر اسی وقت تک زوجہ کا خرچ اور لباس لازم ہے جب تک زوجیت قائم ہو، صرف دودھ پلانے کی وجہ سے یہ لازم نہیں، لہٰذا یہ علیحدہ حکم ہے۔

ان حضرات کی دلیلوں کا جواب یہ ہے۔

"ان هذه الآية مشتملة على حكم مستقل بنفسه فلم يحب تعلقها بما قبلها"

کہ ضروری نہیں کہ ماقبل آیت سے ضرور ہی تعلق ہو بلکہ یہ آیت مستقل بذاتہ ہے، اس کا ماقبل سے تعلق نہیں۔ چند احکام بیان کئے جا رہے ہیں، ان احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے۔

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے۔

" لا يبعد ان تستحق المرأة قدرا من المال لمكان الزوجية وقدرا آخر المكان الرضاع فانه لا منافاة بين الامرين "

یہ بعید نہیں کہ عورت مستحق ہو کچھ قدر مال کی زوجیت کی وجہ سے اور کچھ اور قدر مال مستحق ہو، دودھ پلانے کی وجہ سے، ان دو علیحدہ علیحدہ صورتوں کو ایک جملہ سے بیان کر دینے میں کسی قسم کی کوئی منافات نہیں۔

بلکہ مطلب یوں ہوا کہ زوجہ جب تک زوجیت میں ہو اس وقت تک خرچ اور لباس کی مستحق ہے، اور جب اسے طلاق دے دی جائے اور وہ دودھ پلانے کی مقرر اجرت لے۔

تیسرا قول:

علامہ واحدی نے بسیط میں بیان کیا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اس آیہ کریمہ میں "والدات" سے مراد وہ عورتیں ہوں جو اپنے خاوندوں کے نکاح میں موجود ہوں، اس لئے کہ بعد میں جو خرچ اور لباس کا ذکر ہے اس کی مستحق صرف وہ بیویاں ہیں جو زوجیت میں ہوں۔ (از کبیر)

پسندیدہ قول:

تفسیر خازن اور کبیر نے پہلے قول کو ہی زیادہ پسند کیا ہے اور بیضاوی کا بھی پسندیدہ قول یہی ہے کہ "والدات" سے مراد عام ہے خواہ زوجیت میں ہوں یا مطلقہ ہوں۔

اعتراض:

جب خرچ اور لباس کا تعلق زوجیت سے ہے تو یہاں دودھ پلانے سے نفقہ ولباس کو کیوں معلق کیا ہے۔

پہلا جواب:

اس کو دودھ پلانے سے معلق نہیں کیا گیا بلکہ احکام میں سے ایک حکم بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب:

نفقہ ولباس کا تعلق صرف زوجیت سے نہیں، کیونکہ زوجیت قائم ہو لیکن عورت خاوند کے پاس نہ رہے، باوجود اس کے کہ خاوند اسے اپنے پاس رکھنے کا مطالبہ کرے اور وہ انکار کرے تو اس صورت میں وہ نفقہ ولباس کی مستحق نہیں رہتی۔ وہ مستحق اسی وقت ہوتی ہے جب خاوند کے پاس رہے۔ خاوند کے پاس رہنے کی حالت میں ایک صورت یہ ہے کہ وہ بچے کو دودھ بھی پلائے تو اس وقت بھی وہ مستحق ہے۔ (از کبیر بتصرف)

"یرضعن اولادھن": وہ دودھ پلائیں اپنی اولاد کو۔

بظاہر یہ جملہ خبریہ ہے لیکن اس کا معنی امر والا ہے۔ اب اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ امر استحباب کے لئے ہو اور دوسرا یہ کہ امر وجوب کے لئے ہو۔

اس مسئلہ میں امر اصل میں استحباب کے لئے ہے:

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر عورت زوجیت میں ہو تو وہ دودھ پلائے یا نہ پلائے اسے اختیار ہے لیکن دودھ پلانے پر وہ اجرت نہیں لے سکتی۔ اور اگر عورت کو طلاق دے دی گئی ہو تو اسے بھی اختیار حاصل ہے، چاہے تو دودھ پلائے اور چاہے تو نہ پلائے لیکن اگر وہ دودھ پلائے تو اجرت لے سکتی ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا" **فان ارضعن لکم فآتو ھن اجو رھن** "اگر (طلاق دی ہوئی مائیں) تمہاری اولاد کو دودھ پلائیں تو تم ان کو اجرت دو۔

اس آیۃ کریمہ میں اجرت دینے کو دودھ پلانے پر معلق کر کے واضح کر دیا کہ دودھ پلانا ان پر لازم نہیں۔ ہاں اگر وہ تمہاری اولاد کو دودھ پلائیں تو تم پر لازم ہے کہ ان کو اجرت دو۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا" **وان تعاسرتم فستر ضع له اخری**" (اور اگر تمہیں آپس میں مشکل درپیش ہے تو دوسری عورت دودھ پلانے کے لئے طلب کر لی جائے) یعنی اگر طلاق دی ہوئی عورت اور اس کے سابق خاوند کے درمیان بچے کو دودھ پلانے کے معاملہ میں اتفاق مشکل ہو تو کسی اور دایہ سے دودھ پلوالیا جائے۔ اس سے واضح ہوا کہ دودھ پلانا اس پر لازم نہیں۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ماؤں پر دودھ پلانا لازم نہیں۔

"فھذاالا مر محمول علی الندب من حیث ان تر بیة الطفل بلبن الأ م اصلح له من سائرالالبان ومن حیث ان شفقة الام علیه اتم من شفقة غیر ھا "

تو یہ امر استحباب پر محمول ہوگا، اس لئے کہ بچے کی تربیت ماں کے دودھ سے بچے کے لئے جو نفع مند ہوتی ہے وہ دوسری عورتوں کے دودھ سے حاصل نہیں، اور ماں کو بچے پر بہت زیادہ شفقت حاصل ہوتی ہے جو دوسری عورتوں کو حاصل نہیں ہوتی۔

امر وجوب کے لئے ہوسکتا ہے:

ماں خواہ زوجیت میں ہو یا اسے طلاق مل چکی ہو، دودھ پلانا اس پر واجب ہوگا جب کہ باپ کو دایہ کی اجرت دینے کی استطاعت نہ ہو یا دودھ پلانے کے لئے کوئی دایہ نہ ملے یا بچہ کسی اور عورت کا دودھ نہ پئے۔ اس صورت میں امر وجوب کے لئے ہوگا کہ ماں پر واجب ہے کہ وہ دودھ پلا کر بچے کو ہلاکت سے بچائے، جس طرح کوئی شخص بھوک کی وجہ سے نڈھال ہو، اس کی موت کو خطرہ ہو تو اس شخص پر اس کی امداد کرنا، یعنی اسے کھانا کھلانا، موت سے بچانا واجب ہوگا جسے کھانا کھلانے کی طاقت حاصل ہوگی۔ (ماخوذ از کبیر و خازن و روح المعانی)

"حولین کاملین": دو سال مکمل۔

"حولین" تثنیہ ہے اس کا واحد "حول" ہے جس کا معنیٰ "پھرنا" ہے، چونکہ سال بھی پھر پھر کر آتا ہے تو اسے "حول" کہہ لیا جاتا ہے۔ "کاملین" تاکید ہے کہ مراد مکمل دو سال یعنی چوبیس مہینے ہیں، یہ مراد نہیں کہ سال کے اکثر مہینے لئے جائیں۔

عام طور پر اکثر پر حکم کل کا لگایا جاتا ہے جیسا کہ کوئی شخص کہے" **اقمت عندہٗ فلان حولا و ان لم تستکمله** " میں فلاں شخص کے پاس ایک سال ٹھہرا حالانکہ اس نے سال مکمل نہیں کیا ہوتا، لیکن سال کا زیادہ وقت ٹھہرنے کی وجہ سے سال کہہ دیا۔

"لمن اراد ان یتم الرضاعة" جو ارادہ رکھیں کہ پوری کریں دودھ پلانے کی مدت' اس سے یہ واضح کیا گیا کہ دو سال کو پورا کرنا لازم نہیں' بلکہ باہمی مشاورت سے چاہیں تو دودھ پلانے کی مدت پوری کریں اور چاہیں تو

پہلے ہی دودھ چھڑا دیں۔ ہاں البتہ دو سال مکمل کرنے پر دودھ چھڑانا واجب ہو جائے گا یعنی انتہاء مدت کا حکم وجوبی ہے اس سے پہلے استحبابی۔ (از خازن)

البتہ یہ خیال رہے کے بچے کی بہتر پرورش کے لئے بغیر کسی عذر کے دودھ نہ چھڑایا جائے، بلکہ مدت رضاعت پوری کی جائے۔

رضاعت کے متعلق بیان:

مدت رضاعت دو سال ہے یہ مذہب صاحبین (امام ابو یوسف و امام محمد رحمہما اللہ) کا ہے اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہا اللہ نے اڑھائی کا قول کیا ہے، لیکن فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ اب یہی مذہب احناف کا ہے۔ تاہم اہل علم کا علمی اختلاف اور دلائل کا ثبوت صحابہ کرام کے زمانہ سے رہا ہے، یہی اختلاف باعث رحمت ہے اور اسی اختلاف سے مسائل روز روشن کی طرح واضح ہوئے۔

صاحبین کی دلیل:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" **وحمله وفصاله ثلاثون شهرا** " حمل کی مدت اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے۔ جب حمل کی مدت کم از کم چھ ماہ ہے تو دودھ چھڑانے کی مدت دو سال باقی رہ جائے گی۔

اور دلیل ان کی یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا۔

"**لارضاع الافی حولین** "دودھ صرف دو سال پلایا جا سکتا ہے۔ (دار قطنی، السابقہ)

امام اعظم رحمہ اللہ کا ارشاد:

آپ فرماتے ہیں آیۃ کریمہ میں دو چیزوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر ہے۔

" **وحمله وفصاله ثلاثون شهرا** " کا مطلب یہ ہے کے مدت حمل تیس مہینے ہے اور دودھ چھڑانے کی

مدت تیس مہینے ہے۔یعنی "ثلاثون شھرا" کا حکم ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ ہے۔

دینی طلباء کرام بخوبی سمجھتے ہیں کہ امام اعظم رحمہ اللہ نے حمل کالحاظ پہلے کیا اور ربط کا بعد میں ،لیکن صاحبین نے ربط کالحاظ پہلے کیا اور حمل کا بعد میں۔

لیکن امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدت حمل کے متعلق ایک حدیث شریف مزاحم ہونے کی وجہ سے حمل کی اکثر مدت دوسال رہ گئی ،کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں۔

"لا یبقی الولد فی بطن امه اکثر من سنتین ولو بفلکة مغزل"(اخرجه البیهقی والدار قطنی)

بچہ ماں کے پیٹ میں دوسال سے زیادہ نہیں رہ سکتا،اگر چہ تکلے پر چھلی بنانے کی مقدار ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن دودھ چھڑانے کی مدت اپنی جگہ پر اڑھائی سال ہی رہے گی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے صاحبین نے جو حدیث پیش کی ہے،اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ حدیث شریف میں استحقاق بیان کیا گیا ہے حرمت بیان نہیں کی گئی۔حدیث شریف کا مطلب یہ نہیں کہ دوسال سے زیادہ دودھ پلانا حرام ہے،بلکہ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ دوسال تک دودھ پلانا حق ہے،یعنی بہتر ہے۔

صاحبین کے قول پر فتویٰ کیوں؟

"روی ان رجلا تزوج امرأة فولد لستة اشهر فجی بها الی عثمان رضی الله فشاور فی رجمها فقال ابن عباس رضی الله عنه ان خاصمتکم بکتاب الله تعالی خصمتکم قالوا کیف قال ان الله تعالی یقول (وفصاله ثلاثون شهرا) وقال الله تعالی(والوالدات یرضعن اولادهن حولین کاملین)فحمله ستة اشهر وفصاله حولان فترکها"(البنایة)

ایک روایت میں مذکور ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا تو اس کا بچہ چھ ماہ بعد پیدا ہو گیا تو وہ شخص اپنی عورت کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے پاس لایا اور مشورہ کیا کہ اسے سنگسار کیا جائے۔

تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا اگر یہ عورت تمہارے ساتھ اللہ کی کتاب یعنی قرآن

پاک کے ذریعے جھگڑا کرے تو کر سکتی ہے، انہوں نے پوچھا یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا رب تعالیٰ نے فرمایا" وحملہ وفصا لہ ثلاثون شھرا" مدت حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے اور دوسرے مقام میں ارشاد فرمایا" والو الدات یر ضعن اولاد ھن حولین کاملین" اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو دو سال مکمل۔

جب دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے تو حمل کی مدت چھ ماہ ہے۔ جب اس عورت کا بچہ چھ ماہ بعد پیدا ہوا تو تم اسے سنگسار نہیں کر سکتے اس طرح ان حضرات نے سنگسار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

راقم کی نظر میں کسی کتاب سے یہ بھی گزرا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کیا۔

رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں:

"قال النبی ﷺ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب"

(اخرجہ البخاری و مسلم من حدیث ابن عباس و من حدیث عائشۃ رضی اللہ عنھما)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا رضاع سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔

☆ "وعن عائشۃ رضی اللہ عنھا انہ علیہ الصلوۃ والسلام قال ان اللہ حرم من الرضاع ما حرم من الولادۃ" (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے رضاع (دودھ پلانے) سے وہ رشتے حرام کر دئے ہیں جو ولادت سے حرام کر دئے ہیں۔

بخاری و مسلم میں یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔" یحرم من الرضاع ما یحرم من الرحم" رضاع سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو رحم سے حرام ہوتے ہیں۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔" وامھا تکم اللاتی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعۃ" اور حرام ہیں تم پر تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور حرام ہیں تم پر تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں۔

دودھ قلیل پیئے یا کثیر پیئے حرمت ثابت ہو جائے گی:

ابھی جن احادیث کو ذکر کیا ہے اور آیہ کریمہ کے جس حصہ کو ذکر کیا ہے ان سے واضح ہو رہا ہے کہ ان میں قلیل وکثیر (تھوڑی مقدار یا زیادہ مقدار) کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے حکم عام ہی رہے گا۔

تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ والی احادیث منسوخ ہیں:

مندرجہ بالا احادیث اور قرآن پاک کی آیۃ کا جو حصہ پیش کیا گیا ہے ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جن احادیث میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ پستان کو منہ میں ڈالنے سے حرمت ثابت نہیں وہ منسوخ ہیں۔ وہ حدیثیں یہ ہیں۔

☆ "عن عائشة رضی الله عنها قالت قال رسول الله ﷺ **لا تحرم المصة والمصتان**"

(رواه مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک مرتبہ پستان چوسنا یا دو مرتبہ چوسنا حرمت ثابت نہیں کرتا۔

☆ "عن ام الفضل بنت الحارث قالت دخل اعرابی علی رسول الله ﷺ **وهو فی بیتی فقال یا رسول الله انی کانت لی امرأة فتز وجت علیها اخری فزعمت امرأتی الاولی انها** ارضعت الحدثی رضعة او رضعتین فقال ﷺ **لا تحرم الاملاجة والاملاجتان**"

(رواه مسلم)

حضرت ام الفضل بنت حارث رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ **کی خدمت میں** حاضر ہوئے جبکہ حضور ﷺ میرے گھر تشریف فرماتے تھے، وہ اعرابی عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! میری ایک زوجہ پہلے تھی اور میں نے ایک اور عورت سے شادی کر لی، میرا گمان یہ ہے کہ میری پہلی زوجہ نے نئی زوجہ کو ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دودھ پلا دیا، تو حضور ﷺ نے فرمایا ایک مرتبہ (پستان کو) بچے کے منہ میں ڈالنا یا دو مرتبہ ڈالنا حرمت ثابت نہیں کرتا۔

صحیح ابن حبان میں عبداللہ بن زبیر کی اپنے باپ سے روایت ہے۔

"قال رسول اللہ ﷺ لا تحرم المصة ولا المصتان ولا الاملاجة ولا الاملاجتان"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (بچے کا) ایک مرتبہ چوسنا یا دو مرتبہ چوسنا اور ایک مرتبہ (پستان کو بچے کے منہ میں) ڈالنا یا دو مرتبہ ڈالنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

- پانچ مرتبہ جب تک دودھ نہ پیا جائے حرمت ثابت نہیں ہوتی، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے۔

☆ **"عن عائشة قالت كان فيما انزل من القرآن عشر رضعات معلومات يحرمن ثم نسخن بخمس معلومات فتوفي رسول الله ﷺ وهي فيما يقرا من القرآن"**

(رواه مسلم، مشكوة باب المحرمات)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں قرآن میں دس مرتبہ واضح طور پر دودھ پینے کی حرمت کو نازل کیا گیا، پھر پانچ مرتبہ واضح طور پر دودھ پینے سے دس مرتبہ والا حکم منسوخ ہو گیا، رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے وہ (پانچ مرتبہ والا حکم) پڑھا جا رہا ہے۔

اگر چہ بظاہر اس حدیث سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے، یہ حکم اب بھی باقی ہے، قرآن پاک میں پڑھا جا رہا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے یہ مطلب ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ قرآن پاک میں پانچ مرتبہ دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہونے کی کوئی آیۃ اب نہیں پڑھی جا رہی۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ **"ان نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون"** (بیشک قرآن ہم نے نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اس سے واضح ہوا کہ اگر یہ حکم باقی ہوتا تو اب بھی وہ آیت پڑھی جاتی۔

"قوله فيما يقرأ القرآن" يعني ان بعض من لم يبلغه النسخ كان يقرأ على الرسم الاول لان النسخ يكون الا في زمان الوحي وكيف النسخ بعد موت النبي ﷺ"

جب پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہونے والی آیۃ قرآن پاک میں نہیں پڑھی جا رہی تو اسی

سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم بھی منسوخ ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد تو کوئی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا۔ یہی کہنا پڑے گا کہ منسوخ آپ کی ظاہری حیات میں ہی یہ حکم ہو چکا تھا۔

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے۔" **فیما یقرا القرآن** "اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کے منسوخ ہونے کا علم نہیں وہ ابھی تک پڑھ رہے ہیں۔

حضرت مولانا جلال الدین خوارزمی رحمہ اللہ نے کفایہ میں ذکر فرمایا کہ صریح حدیث سے یہ تمام حدیثیں منسوخ ہیں۔

"**وفی حدیث علی رضی اللہ عنه الر ضاع قلیله و کثیره سواء یعنی فی ایجاب الحرمة**"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ" دودھ قلیل مقدار میں پلائیں یا کثیر حرمت کے ثابت کرنے میں برابر ہے"

دو سال تک دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوگی:

یعنی جس بچے کو دودھ پلایا گیا اس بچے کی عمر دودھ پیتے وقت دو سال سے زائد نہ ہو، اگر بچے نے دودھ اس وقت پیا جب اس کی عمر دو سال سے زیادہ تھی تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

اس مسئلہ پر احادیث مبارکہ:

"**عن ام مسلمة قالت قال رسول اللہ ﷺ لا یحرم من الرضاع الا ما فتق الامعاء فی الثدی و کان قبل الفطام**" (رواہ الترمذی ، مشکوۃ باب المحرمات)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دودھ پلانے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ جو چیز پستانوں میں ہے (دودھ) انتڑیوں کو کھولے۔ اور یہ دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہے۔

" قولہ"مافتق"ای الذی شق امعاء الصبی کا لطعام ووقع منه الغذاء و ذلک انما یکون فی اوان الرضاع" (مرقاۃ)

یعنی حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح غذا سے انتڑیاں بھری جانے کی وجہ سے کھل جاتی ہیں جو پہلے سکڑی ہوئی ہوتی ہیں، اسی طرح بچے کو دودھ پلانے سے حرمت اس وقت ثابت ہوگی جبکہ دودھ یہی اثر کرے، یہ اثر اس کا دودھ پلانے کے وقت تک ہوتا ہے جو غذا کا کام کرتا ہے، اس مدت کے بعد دودھ غذا کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔

☆ عن عائشة رضی الله عنها ان النبی ﷺ دخل علیها وعندها رجل فکأنه کره ذلک فقالت انه اخی فقال انظرن من اخوانکی فانما الرضاعة من المجاعة"
(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب المحرمات)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو ان کے پاس ایک مرد تھا جسے آپ نے ناپسند فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ یہ میرا (رضاعی) بھائی ہے۔ آپ نے فرمایا تم دیکھو تمہارے کون سے بھائی ہیں، رضاعت تو وہ معتبر ہے جو بھوک کو دور کرے۔

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سمجھ رہی تھیں کہ یہ میرا رضاعی بھائی ہے، لیکن نبی کریم ﷺ نے بتایا کہ اس نے دودھ چھڑانے کی مدت کے بعد دودھ پیا ہے، لہٰذا وہ رضاعت (دودھ پینا) معتبر نہیں۔

☆ "عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لا یحرم من الرضاع الا ما کان فی الحولین"
(اخرجه ابن عدی والدار قطنی والبیهقی، درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رضاع (دودھ پلانے) سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ وہ (بچہ دودھ پینے والا) دو سال کے اندر اندر ہو۔

☆ " واخرج الطیالسی والبیهقی عن جابر قال قال رسول الله ﷺ لا رضاع بعد فصال ولا یتم بعد الحلم" (درمنثور)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دودھ چھڑانے کی مدت کے بعد دودھ پلانا موثر نہیں اور بالغ ہونے کے بعد یتیمیت نہیں۔

☆ " مالک عن نافع ان عبداللہ بن عمر کا ن یقول لا رضاعة الا لمن ارضع فی الصغر ولا رضاعة لکبیر" (مؤطا امام مالک)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے رضاعت کا حکم ثابت نہیں سوائے اس کے کہ اسے چھوٹی عمر میں (دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے) دودھ پلایا جائے، بڑی عمر میں دودھ پلانے سے رضاعت ثابت نہیں۔

☆ " مالک عن ابراھیم بن عقبة انه سأل سعید بن المسیب عن الرضاعة فقال سعید کل ماکان فی الحولین وان کانت قطرة واحدة فهو یحرم وماکان بعد الحولین فانما هو طعام یأکله قال ابراهیم بن عقبة ثم سألت عروة ابن الزبیر فقال مثل ما قال سعید بن المسیب" (مؤطا امام مالک)

ابراہیم بن عقبہ نے سعید بن مسیب سے رضاعت کے متعلق سوال کیا تو سعید نے فرمایا دوسال کے اندر جو دودھ پیا گیا وہ ایسے ہی ہے جیسے طعام کھالیا گیا۔ ابراہیم بن عقبہ کہتے ہیں پھر میں نے عروہ بن زبیر سے سوال کیا تو انہوں نے بھی سعید بن مسیب کی طرح جواب دیا۔

رسول اللہ ﷺ کا اختیار:

☆ " عن ابی حذیفة بن عقبة بن ربیعة قال جاءت سهلة بنت سهیل وهی امرأة ابی حذیفة وهی من بنی عامر بن لوی الی رسول الله ﷺ فقالت یا رسول الله کنا نری سالما ولداوکان ید خل علی وانا فضل لیس لنا الا بیت واحد فما ذا تری فی شانه فقال لها رسول الله ﷺ فیما بلغنا ارضعیه خمس رضعات فیحرم بلبنها وکانت تراه ابنا من الرضاعة " (مؤطا امام مالک)

حضرت ابوحذیفہ بن عقبہ بن ربیعہ فرماتے ہیں سہلہ بنت سہیل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، یہ ابوحذیفہ کی زوجہ ہیں اور عامر بن لوی کے قبیلہ سے ہیں۔ (حجاب کے حکم نازل ہونے کے

بعد) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سالم کو ہم اپنا بیٹا سمجھتے تھے، وہ مجھ پر داخل ہوتے ہیں اور میں کام کاج کے کپڑوں میں ہوتی ہوں (یعنی جسم کا بعض حصہ بازو وغیرہ ننگے ہوتے ہیں) ہمارا صرف ایک ہی کمرہ ہے، آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو ہمیں تمہارے متعلق پتہ چلا ہے اس کا حکم یہ ہے کہ تم اسے پانچ مرتبہ دودھ پلا دو تو وہ ان کے دودھ سے ان کے محرم بن گئے اور یہ ان کو اپنا بیٹا سمجھتی تھیں۔

مسلم شریف میں مذکور ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ابوحذیفہ کی زوجہ کو حکم دیا کہ تم ابوحذیفہ کے غلام سالم جو تمہارے متبنٰی (منہ بولا بیٹا) ہیں ان کو دودھ پلا دو۔

"قالت کیف ارضعه وهو رجل کبیر فتبسم رسول اللہ ﷺ قال قد علمت انه رجل کبیر"

انہوں نے کہا یا رسول اللہ وہ تو بڑا مرد ہے میں اسے کیسے دودھ پلاؤں؟ تو رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور فرمایا میں جانتا ہوں کہ وہ بڑا مرد ہے۔

اس حدیث سے واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مختار بنایا ہے کہ آپ نے بڑی عمر کے شخص کو دودھ پلانے سے رضاعت کا حکم ثابت کر دیا۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دودھ دوہ کر پلایا گیا تھا۔

اس حدیث پاک سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ ثابت کیا کہ بڑی عمر کے شخص کو دودھ پلانے سے احکام رضاعت ثابت ہو جاتے ہیں، لیکن ان کا اجتہاد درست نہیں۔

" وابی سائر ازواج النبی ﷺ ان یدخل علیهن بتلک الرضاعة احد من الناس وقلن لا واللہ ما نری الذی امر به رسول اللہ ﷺ سهلة بنت سهیل الا رخصة من رسول اللہ ﷺ فی رضاعة سالم وحده" (موطا امام مالک)

لیکن باقی تمام ازواج مطہرات فرماتی تھیں کہ بڑی عمر کے شخص کو دودھ پلانے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی یعنی وہ محرم نہیں بنتا۔ رسول اللہ ﷺ نے سہلہ بنت سہیل کو خصوصی طور پر سالم کے معاملہ میں رخصت دی تھی۔

خاوند اپنی زوجہ کا دودھ پی لے تو کیا حکم ہے؟

عرب میں بعض اوقات چھوٹے دودھ پیتے بچے کا نکاح کسی بالغہ عورت سے کر دیا جاتا تھا، اگر ایسی صورت ہو کہ زوجہ بالغہ ہو، اس کا دودھ بھی ہو اور خاوند کی عمر دو سال سے زائد نہ ہو، بلکہ وہ دو سال کے اندر ہو، اسے دودھ پلا دیا گیا تو حرمت ثابت ہو جائے گی، نکاح ٹوٹ جائے دونوں ماں بیٹا کی حیثیت میں آ جائیں گے۔

لیکن اگر خاوند اور بیوی دونوں بڑے ہیں تو نکاح نہیں ٹوٹے گا، یعنی خاوند خواہ بالغ ہو یا نابالغ، البتہ دو سال سے زائد عمر کا ہو تو زوجہ کا دودھ پی لے تو نکاح نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ دودھ چھڑانے کی مدت کے بعد دودھ پینے کی وجہ سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

☆ "مالک بن یحیی بن سعید ان رجلا سأل ابا موسی الاشعری فقال انی مصصت عن امرأتی من ثدیها لبنا فذهب فی بطنی فقال ابو موسی الاشعری لا اراها الا قد حرمت علیک، فقال عبدالله بن مسعود انظر ما تفتی به الرجل فقال ابو موسی فما تقول انت فقال وعبدالله بن مسعود لا رضاعة الا ما کان فی الحولین فقال ابوموسی لا تسألونی عن شیٔ ماکان هذا الحبر بین اظهرکم" (مؤطا امام مالک)

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں یحییٰ بن سعید روایت کرتے ہیں کہ بیشک ایک شخص نے حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا اور کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کے پستان کو چوسا تو اس کا دودھ میرے پیٹ میں چلا گیا (اب میرے لئے کیا حکم ہے) تو ابو اشعری نے فرمایا میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ عورت تم پر حرام ہو گئی۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا دیکھو تم اس شخص کو کیا فتوی دے رہے ہو؟ تو حضرت ابوموسی اشعری نے ان سے پوچھا کہ تمہاری رائے اس کے متعلق کیا ہے؟ تو عبداللہ بن مسعود نے کہا، رضاعت صرف دو سال کے اندر ثابت ہوتی ہے (یہ رضاعت ثابت نہیں اور نہ ہی اس سے حرمت ثابت ہے) تو حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تک یہ محقق و مدقق عالم تمہارے اندر موجود ہیں، مجھ سے سوال نہ کیا کرو۔

سبحان اللہ! صحابہ کرام کا کیا جذبہ ایمانی تھا کہ کسی حق بات کو تسلیم کر لینا اور اپنی غلطی پر اکڑ کر قائم نہ رہنا ان کا مستحسن طریقہ صرف اسی وجہ سے تھا کہ وہ جذبہ ایمانی سے کام لیتے تھے، نہ کہ اپنی عزت نفس سے۔

دودھ پلانے کی مدت میں زوجہ سے جماع کرنا:

"مالک عن محمد بن عبدالرحمن بن نو فل انه قال اخبرنی عروة بن الز بیر عن عائشة ام المومنین عن جدا مة بنت وهب الا سدية انها اخبر تها انها سمعت رسول الله ﷺ يقول لقد هممت ان انهی عن الغيلة حتی ذكر ت ان الروم وفارس يصنعو ن ذلک فلا يضر او لاد هم شيأ" (مو طا امام مالک)

" قال مالک الغيلة ان يمس الرجل امرأته وهی ترضع "

جدامہ بنت وھب اسدیہ کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، تحقیق میرا ارادہ ہوا کہ میں مدت رضاعت میں جماع کرنے سے منع کر دوں، پھر مجھے یاد آیا کہ روم اور فارس کے لوگ تو ایسا کرتے ہیں تو اولاد کو نقصان نہیں ہوتا۔

یعنی اگر دودھ پلانے کی مدت میں جماع کرنا بچوں کے لئے نقصان دہ ہوتا تو روم اور فارس کے لوگ مدت رضاعت میں جماع نہ کرتے، کیونکہ ان میں کثیر تعداد میں طبیب موجود ہیں۔ اس لئے میں نے بھی مدت رضاعت میں جماع کرنے سے منع کرنے کا ارادہ کو ترک کر دیا۔

تنبیہ:

" وهذا الحديث مما رواه الشخيان فلا يعارضه ما روی ابو داؤد عن اسماء بنت يزيد فی النهی عن الغيلة"

یہی مندرجہ بالا حدیث بخاری و مسلم میں بھی ہے، اس حدیث کے معارض وہ حدیث نہیں ہو سکتی جو ابوداؤد نے اسماء بنت یزید سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے مدت رضاعت میں جماع کرنے سے منع فرمایا۔

ان دونوں احادیث میں تطبیق اس طرح موجود ہے کہ دودھ پلانے کی مدت کے دوران اگر جماع کرنا بچے کے لئے یا عورت کے لئے نقصان دہ ہوتو جماع کرنا منع ہے اور اگر نقصان دہ نہ ہوتو جائز ہے۔ (حاشیہ موطا امام مالک)

رضاعت کی نسبت مذکر کی طرف:

جس عورت نے بچے کو دودھ پلایا اس کا خاوند بچے کا باپ کا ہوگا، اور رضائی باپ کا بھائی رضاعی چچا ہوگا۔

☆ "مالک عن هاشم بن عروة عن عائشة ام المومنين انها قالت جاء عمي من الرضاعة يستأ ذن عليّ فابيت ان آذن له علي حتى اسأل رسول الله ﷺ قالت فجاء رسول الله ﷺ قالت فجاء رسول الله ﷺ فسألته عن ذلك فقال انه عمك فأذني له قالت فقلت يارسول الله انما ارضعتني المرأة ولم يرضعني الرجل فقال انه عمك فليلج عليك قالت عائشة وذلك بعد ما ضرب علينا الحجاب وقالت عائشة يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة" (موطا امام مالک)

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میرا رضاعی چچا (جس کا نام افلح تھا) آیا، اس نے میرے پاس آنے کی اجازت طلب کی تو میں نے اجازت دینے سے انکار کردیا یہاں تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لوں، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے یہ معاملہ آپ کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا ہاں درست ہے وہ تمہارا چچا ہے، تم اسے (آنے کی) اجازت دے دو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے عورت نے دودھ پلایا ہے، مرد نے تو دودھ نہیں پلایا۔ آپ نے فرمایا بیشک وہ تمہارا چچا ہے وہ تم پر داخل ہوسکتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں یہ واقعہ پردہ کا حکم آنے کے بعد کا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رضاعت سے وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو ولادت (نسب) سے حرام ہوتے ہیں۔

"وفي الحديث دليل على ان الفحل يحرم ويثبت الحرمة في جهة صاحب اللبن كما يثبت في جانب المرضعة"

حدیث پاک سے واضح ہوا کے مذکر کی طرف بھی حرمت ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے دودھ عورت کو حاصل ہوا ہے، لہذا دودھ پینے والے بچے، بچی کا وہ شخص باپ بن جاتا ہے جس کی مجامعت کی وجہ سے عورت کو دودھ حاصل ہوا، اور عورت جو دودھ پلانے والی ہے وہ ماں بن جائے گی، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے رضاعی چچا کو نسبی چچا والا حکم دیا، یعنی اس سے پردہ نہ کرایا جائے، کیونکہ دودھ مرد اور عورت دونوں کی طرف منسوب ہے۔ (حاشیہ موطا امام مالک)

اسی مسئلہ پر ایک اور حدیث پاک دیکھئے جس میں واضح طور پر ثابت ہے کہ دودھ کی وجہ سے حرمت مذکر کی طرف بھی منسوب ہے۔

☆ " مالک عن ابن شهاب عن عمرو بن الشريد ان عبد الله بن عباس سئل عن رجل كانت له امرأتان فارضعت احدهما غلاما و ارضعت الاخرى جارية فقيل له هل يتزوج الغلام الجارية فقال لا اللقاح واحد" (مو طا امام مالک)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے سوال کیا گیا ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، ان میں سے ایک نے ایک لڑکے کو دودھ پلایا ہے اور دوسری نے ایک لڑکی کو دودھ پلایا ہے، کیا اس لڑکے اور لڑکی کا آپس میں نکاح جائز ہے؟ آپ نے فرمایا یہ نکاح جائز نہیں کیونکہ ایک ہی مرد کا دودھ ہے۔

اس لحاظ پر لڑکے اور لڑکی کا رضاعی باپ ایک ہے، وہ دونوں رضاعی بہن اور بھائی بن گئے جن کا نکاح جائز نہیں۔

" اللقاح واحد بفتح اللام و القاف ماء الفحل والمعنى ان سبب العلوق واحد "

لقاح کا معنی مذکر کا نطفہ

رضاعت کے مسائل سمجھنے کے لئے ایک ضابطہ:

از جانب شیر دہ ہمہ خویش شوند   از جانب شیر خوار زوجان وفروع

دودھ پینے والے بچے پر پلانے والی عورت کے وہ تمام رشتے دار حرام ہوں گے جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں۔

اس عورت کا خاوند، اس کے خاوند کا بھائی اور اس عورت کی اولاد، دودھ پینے والے بچے یا بچی پر حرام ہیں۔

دودھ پلانے والی عورت یا اس کے خاوند یا اس کی اولاد پر دودھ پینے والا بچہ یا بچی اور ان کی اولاد اور بچہ تھا تو اس کی زوجہ اگر بچی تھی تو اس کا خاوند صرف حرام ہوں گے۔

رضاعی بچے کے بہن، بھائی۔ چچا، ماموں، خالہ پھوپھی حرام نہیں ہوں گے۔

دودھ پلانے والی ماں کا احترام:

"عن ابی الطفیل الغنوی قال کنت جالسا مع النبی ﷺ اذا اقبلت امرأة فبسط ﷺ ردائه حتی قعدت علیه فلما ذهبت قیل هذه ارضعت النبی ﷺ"

(رواہ ابو داؤد، مشکوۃ باب المحرمات)

ابوالطفیل غنوی کہتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب ایک عورت آپ کے پاس آئی تو نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے چادر بچھائی، یہاں تک کے وہ اس پر بیٹھ گئی، جب وہ عورت چلی گئی تو بتایا گیا کے اس عورت (حلیمہ سعدیہ) نے نبی کریم ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔

"وعلی المولودله رزقهن وکسوتهن بالمعروف":

اور جس کا بچہ ہے اس پر لازم ہے عورتوں کا خرچ اور لباس شرع کے مطابق۔

یعنی بچے کی ماں جب تک زوجیت میں ہو اس وقت تک اسے خرچ دینا اور کپڑے دینا اس لئے لازم ہیں کہ یہ زوجیت کے حقوق میں سے ہے۔ اور عورت کو اگر طلاق دے دی گئی تو دوران عدت بھی خرچ اور کپڑے دینا لازم ہے، کیونکہ یہ اس کا شرعی حق ہے۔ ہاں اگر اس کی عدت گذر جائے تو وہ اجنبیہ ہو جاتی ہے، اسے خرچ یا کپڑے دینا اس وقت لازم ہوگا جبکہ اسے بچے کو دودھ پلانے پر مقرر کیا گیا ہو اور طے یہ کیا گیا ہو کے بطور اجرت اتنا خرچ اور کپڑے دیئے جائیں گے، اب وہ اجرت دینا لازم ہوگا، جیسا کے رب تعالی نے فرمایا "فآتوهن اجورهن" "تو ان کو ان کا اجر دو۔"

(از مظهری)

" المولود له " کا معنی حاصل کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ لفظوں کو دیکھنا پڑے گا، الف لام موصول ہے بمعنی الذی کے، اور " مولود " اسم مفعول کا صیغہ ہے " له " جار اور مجرور مل کر متعلق ہوئے " مولود " کے۔

اب معنی واضح ہوگیا "وہ جس کے لئے بچہ پیدا کیا گیا" مراد اس سے باپ ہے، البتہ یہ مسئلہ سمجھ آگیا کہ "اب "(باپ) ذکر نہیں کیا بلکہ " المولود له " ذکر کیا گیا۔

"ان السبب فیه ان یعلم ان الوالدات انما ولدن الاولاد للآباء ولذلک ینسبون الیهم لا الی الامهات " (کشاف)

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے مائیں بچے ان کے باپوں کے لئے جنتی ہیں، اسی وجہ سے بچہ باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے ماں کی طرف نہیں۔

مامون بن رشید کے لئے یہ شعر پڑھا گیا۔

وانما امهات الناس اوعیة   مستودعات وللآباء ابناء

بیشک لوگوں کی مائیں خزانہ ہیں۔ اور مقام ودیعت (امانت) ہیں، اور باپوں کے بیٹے ہیں۔

" المولود له " کہنے سے اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ بچہ باپ سے لاحق ہوتا ہے، کیونکہ اس کے فراش پر پیدا ہوا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے "الولد للفراش" جس کا معنی یہ ہے "اذا ولدت المرأة الولد للرجل وعلی فراشه وجب علیه رعایه مصالحه " کہ عورت جب بچہ جنے اپنے خاوند کے لئے اور اس کے فراش پر تو اس شخص پر لازم ہے کہ بچے کی رعایت کرے اور اس کی مصلحت کا لحاظ کرے۔

حدیث پاک سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ نسب ثابت کرنے کے لئے صرف اتنا ثابت ہونا کافی ہے کہ یہ عورت فلاں کی منکوحہ ہے، لہٰذا اس عورت سے پیدا ہونے والا بچہ باپ کی طرف منسوب ہوگا۔

فائدہ:

حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا "یا ابن ام " (اے میری ماں کے بیٹے) اس میں مفسرین کرام نے بیان کیا۔

ان المراد منه ان الام مسفقه علی الولد،فکان الغرض من ذکر الام تذکیر الشفقة"

بیشک مراد اس سے یہ ہے اور ثابت کرنا یہ مقصود تھا کہ ماں بچے پر شفقت کرنے والی ہے، یعنی "یاابن ام " کہنے کی غرض یہ تھی کہ ماں جب شفقت کرنے والی تو ماں کے بیٹے کو بھی بھائی پر شفقت کرنی چاہئے۔ (از کبیر)

" لہ " میں لام تخصیص کے لئے ،یعنی جس کا بچہ ہے خاص کر کے۔لام تخصیص سے یہ مسئلہ حل ہوگیا کہ بالغہ بیٹی اور معذور بالغ بیٹے کا خرچ خاص کر کے باپ پر ہی لازم ہے ماں پر لازم نہیں، جس طرح چھوٹی اولاد کا خرچ باپ پر لازم ہے ماں پر نہیں۔ (از مظهری)

"رزقهن و کسوتهن با لمعروف": ان کا خرچ اور لباس شرع کے مطابق۔

"(رزقهن)ای طعامهن (و کسوتهن)ای لباسهن(بالمعروف)ای علی المیسرة یعنی بلا اسراف ولا تقتیر"

" رزق " سے طعام یعنی خرچ اور " کسوة " سے مراد لباس " با لمعروف " سے مراد جو طاقت کے مطابق ہو، نہ اس میں کمی کرے اور نہ ہی زیادتی۔یعنی خاوند پر لازم ہے کہ وہ زوجہ کو خرچ اور لباس دے جو شریعت کے مطابق ہو۔ (از خازن و مدارک)

فائدہ:

رب تعالیٰ نے پہلے ماں کو حکم دیا کہ وہ بچے کو دودھ پلائے۔پھر باپ کو حکم دیا کہ وہ بچے کی حفاظت کے لئے ... دودھ پلانے کے لئے دایہ کا انتظام کرے۔اسی سے یہ واضح ہوگیا کہ بچہ باپ کی نسبت ماں کا زیادہ محتاج ہے،اس لئے کہ بچہ ماں کا براہ راست محتاج ہے اور باپ کا بالواسطہ، کیونکہ باپ دودھ پلانے والی سے دودھ پلوائے گا اور ماں خود دودھ پلائے گی۔

" وذلک یدل علی ان حق الام اکثر من حق الاب "

یہاں سے ہی ایک اور مسئلہ واضح ہو گیا کہ ماں کا حق اولاد پر بنسبت باپ کے زیادہ ہے۔

اس پر احادیث واضح طور پر دلالت کر رہی ہیں۔ تفصیل کے لئے پہلے پارہ " وبالوالدین احسانا " کے تحت مذکور بحث نجوم الفرقان کی دیکھئے۔

اور یہ واضح ہوا کہ ماں کو اولاد پر شفقت حاصل ہے، وہ بچے کو شفقت کی وجہ سے دودھ پلاتی ہے، اگر دودھ نہیں پلا رہی تو کوئی عذر ہوگا، لہٰذا اس پر لازم نہیں کہ وہ دودھ پلائے، ہاں اگر دودھ پلائے تو اجرت نہیں لے سکتی کیونکہ اس کا حق بھی ہے کہ بچے کی رعایت کرے اور اس کی مصلحت کا لحاظ کرے۔ (از کبیر و تفسیرات احمدیہ)

"لا تکلف نفس الا وسعھا": نہ تکلیف دی جائے سوائے اس کی طاقت کے۔

تکلیف کا معنی ہے " الزام" جیسے کہا جاتا " کلفہ الامر فتکلف " اس پر حکم کو لازم کیا تو اس نے لزوم کو قبول کرلیا۔ اصل میں "الکلف" کا معنی ہے چہرے پر سیاہ اثرات کا آنا۔ چونکہ کوئی کام جب کسی پر لازم کیا جائے تو وہ اسے مشکل سمجھتا ہے اور اس کے چہرے پر مشکل کی وجہ سے آثار نمودار ہوتے ہیں، جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس شخص نے اس کام کو مشکل سمجھا ہے۔

" وسعت" کا معنی طاقت، اور " وسعت " کو قدرت کے درجہ میں بھی رکھا جاتا ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے " الوسع فوق الطاقۃ "وسعت طاقت سے زائد درجہ رکھتی ہے۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

لفظ " نفس " بطور لفظ مونث سماعی ہے، لیکن معنوی طور پر یہ مذکر اور مونث دونوں پر بولا جاتا ہے۔ یہاں حکم مذکر کو ہے، یعنی بچے کے باپ کو جو ماقبل حکم کی وضاحت کر رہا ہے۔

" والمعنی ان ابا الولد لا یکلف فی الانفاق علیہ و علی امہ الا قدر ما تتسع بہ مقدرتہ ولایبلغ اسراف القدرۃ" (خازن)

معنی یہ ہے کہ بچے کہ باپ کو خرچ کرنے میں طاقت سے زائد تکلیف نہ دی جائے بلکہ وہ اپنی طاقت کے مطابق بچے اور اس کی ماں پر خرچ کرے، اتنا خرچ بھی نہ ہو کہ حد سے بڑھ جائے اور اتنا خرچ بھی نہ ہو کہ پورا ہی نہ ہو سکے۔

''لا تضار والدۃ بولدھا ولا مولود لہ بولدہ:

نہ ضرر دیا جائے ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ (ضرر دیا جائے) باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" لا تضار" میں دو قرأتیں ہیں، ایک راء کے کسرہ سے معروف کا صیغہ اور ایک راء کے فتحہ سے فعل مجہول کا صیغہ۔ مشہور فعل مجہول ہی ہے، اسی کی مطابق تمام مترجمین کا ترجمہ ہے، فعل معروف کے مطابق ترجمہ اس طرح ہوگا ''نہ ضرر دے ماں اپنے بچے کی وجہ سے، اور نہ ضرر دے باپ اپنے بچے کی وجہ سے''۔

ماں کو ضرر نہ دیا جائے بچے کی وجہ سے:

یعنی ماں بچے کو دودھ پلانے پر راضی ہو جائے تو اس سے بچہ لے کر کسی اور کو نہ دیا جائے، ورنہ ماں کو ضرر پہنچانا لازم آئے گا اور ماں دودھ پلانے پر راضی نہیں تو ماں پر دودھ پلانے کے لئے جبر نہ کیا جائے کیونکہ اس پر دودھ پلانا واجب نہیں، ہاں اگر بچہ کسی اور عورت کا دودھ قبول ہی نہیں کرتا، یا کوئی اور دایہ ملتی نہیں یا باپ کسی دایہ کو اجرت دینے کی طاقت نہیں رکھتا تو ماں پر دودھ پلانا واجب ہو جاتا ہے۔

باپ کو ضرر نہ دیا جائے بچے کی وجہ سے:

ماں بچے کو باپ کے سپرد نہ کردے، کیونکہ چھوٹے بچے کی تربیت جس طرح ماں کر سکتی ہے اس طرح باپ نہیں کر سکتا، اور اسی طرح بچے کی ماں جو حالت نکاح میں ہو اسے طاقت سے زیادہ خرچ دینا بچے کی وجہ سے لازم نہیں۔

اور اگر طلاق دی گئی ہو تو باقی عورتوں سے ماں زیادہ اجرت طلب کرے تو باپ پر لازم نہیں کہ وہ بچہ ماں کے سپرد ہی کرے۔ ورنہ باپ کو ضرر دینا لازم آئے گا۔

تنبیہ:

فعل معروف سے بھی یہی مطالب مراد ہوں گے کہ ماں بچے کی وجہ سے باپ کو ضرر نہ دے کہ اس پر جو واجب نہیں اس کا مطالبہ کرے، اور باپ بچے کی وجہ سے ماں کو ضرر نہ دے کہ جو چیز اس پر واجب نہیں اس کا مطالبہ کرے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ صیغہ فعل معروف کا ہی ہو لیکن "بو لدھا" اور "بو لدہ" میں باء سببیہ نہ ہو بلکہ زائدہ ہو تو اب یہ معنی ہوگا "ماں بچے کو ضرر نہ دے اور باپ بچے کو ضرر نہ دے۔

ماں بچے کو دودھ نہ پلائے بچہ مر جائے تو ماں نے بچے کو ضرر پہنچایا، باپ بچے پر اور دودھ پلانے والی پر خرچ نہ کرے تو باپ نے بچے کو ضرر پہنچایا، والدین کو ضرر دینے سے منع کیا گیا۔ (از خازن)

دودھ طبیعتوں کو بدل دیتا ہے:

"الرضاع یغیر الطباع"

اسی وجہ سے ایک مرتبہ شیخ ابن محمد جوینی اپنے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ان کا بیٹا (امام) ابو المعالی اپنی ماں کے بغیر کسی اور عورت کا دودھ پی رہا ہے، تو آپ نے بچے کو اس سے ہٹایا اور اس کے سر کو الٹا کیا اور اس کے پیٹ کو ملا اور اس کے منہ میں انگلی ڈالی، یہی فعل آپ کرتے رہے تا کہ اس کا دودھ نکل جائے اور ساتھ ساتھ یہ کہہ رہے تھے۔

"یسھل علی موتہ ولا تفسد طباعہ بشرب لبن غیر امہ"

کہ مجھ پر بچے کا مر جانا آسان ہے لیکن بچے کی طبیعت نہ فاسد ہو اپنی ماں کے بغیر (گھٹیا خاندان کی) عورت کا دودھ پینے سے۔

وہی بچہ بڑا ہو کر جب علامہ اور امام بن گیا تو ایک مناظرہ میں اسے مشکل درپیش آئی تو باپ نے کہا یہ اسی دودھ کا اثر ہے جو پیٹ میں کچھ نہ کچھ رہ گیا تھا۔ (روح البیان)

• اس لئے ضروری ہے کہ بچے کو اگر کسی دایہ سے دودھ پلانا ہو تو وہ نیک سیرت ہو، اچھے خاندان کی ہو، تا کہ بچے پر اچھے اثرات مرتب ہوں، اسی سے واضح ہوا کہ جیسی ماں ہوگی ایسی اولاد ہوگی" الا ما شاء اللہ "کبھی نیک والدین کی اولاد بری اور کبھی برے والدین کی اولاد نیک بھی ہو سکتی ہے۔

"وعلی الوارث مثل ذلک": اور وارث پر مثل اس کے۔

یعنی بچے کا باپ جب فوت ہو جائے تو اس کے وارث پر لازم ہے اسی کے مثل جو اس کے باپ پر لازم تھا کہ وہ بچے اور دودھ پلانے والی کو خرچ اور لباس دے۔

وارث ہمارے نزدیک ہر ذی رحم محرم ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے۔

" وعلی الوارث ذی الرحم المحرم" اور وارث ذی رحم محرم پر مثل اسی کے۔

اور یہ ضابطہ بھی دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء کرام سے مخفی نہیں کہ وہ قرأت جو خبر واحد سے ثابت ہو اگر چہ اسے نماز وغیرہ میں تو نہیں پڑھا جا سکتا لیکن حکم ثابت کرنے کے لئے اسے بطور تائید پیش کیا جا سکتا ہے۔
(مدارک)

مقام توجہ:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے " وعلی الوارث مثل ذلک "کا ترجمہ کیا ہے۔

''اور جو باپ کا قائم مقام ہے اس پر بھی ایسا ہی واجب ہے''

آپ کا یہ ترجمہ خازن کی اس عبارت سے لیا گیا ہے۔

" فیلزم وارث الاب ان یقوم مقامه فی القیام بحق الوالد"

باپ کے وارث پر لازم ہے کہ بچے کے حقوق کو پورا کرنے میں وہ اس کے قائم مقام ہو۔

”فان ارادافصالا عن تراض منهما وتشا ورفلاجناح علیھا“:

پھر اگر ارادہ کریں دونوں (ماں باپ) دودھ چھڑانے کا آپس میں رضا مندی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر۔

یعنی اگر دو سال سے پہلے ماں باپ بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو آپس میں اتفاق کرلیں تا کہ ان کا نزاع بچے کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ خصوصاً میاں بیوی کے معمولی نزاع کو خاندان کے لوگ جب زیادہ ہوا دے کر فساد پھیلانے کی تاک میں ہوں تو ضروری ہے کہ آپس میں رضاء مندی سے اور اتفاق سے طے کرلیا جائے کہ دودھ چھڑالیا جائے اگر چہ دودھ چھڑانے کی مدت ابھی نہیں آئی۔

پھر وہ اہل علم سے مشورہ بھی کرلیں اس معاملہ میں، اگر وہ کہیں کہ دو سال کی مدت سے پہلے دودھ چھڑانے میں بچے کا کوئی نقصان نہیں تو دودھ چھڑالیں، مشورہ کرنے کا یہ فائدہ ہوگا کہ بہتر رائے سامنے آئے گی۔

جب دو سال سے پہلے دودھ چھڑانے میں بچے کو ضرر نہ ہو اور والدین آپس میں رضاء مند بھی ہوں اور سمجھدار مرد اور عورتوں سے مشورہ بھی کرلیا جائے تو والدین پر کوئی حرج نہیں اور کوئی گناہ نہیں کہ وہ دودھ چھڑائیں۔
(از خازن)

”وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم فلاجناح علیکم اذاسلمتم ما آیتتم بالمعروف“:

اور اگر ارادہ کرو تم دودھ پلواؤ (دایوں سے) اپنے اولاد کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر جب سپرد کردو ان کے ”وہ چیز جو تم نے ان کو دینی تھی“ بھلائی کے طریقہ سے۔

” استر ضع“ منقول ہے ”ارضع “ سے اس لئے یہ بھی متعدی بدو مفعول ہوتا ہے، جیسا ارضع کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا۔

”وان اردتم ان تسترضو االمراضع اولادکم “اور اگر تم ارادہ کرو کہ دائیوں سے تم دودھ پلواؤ۔
(مدارک)

دائیوں سے بچوں کو دودھ پلوانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی ماں بچے کو دودھ پلانے سے انکار کردیتی ہے، کبھی ماں کو کوئی عذر لاحق ہوتا ہے جس کی وجہ سے ماں بچے کو دودھ پلا نہیں سکتی اور کبھی اور مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ایک شہر کی آب وہوا اچھی نہ ہو اور دوسرے شہر کی آب وہوا اچھی ہو، اس لئے دوسرے شہر کی عورت سے بچے کی پرورش کرائی جائے، یا دوسرے شہر کی زبان اچھی فصیح ہو اس لئے وہاں بچے کو بھیجا جائے۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دوسری عورتوں سے دودھ پلوایا جائے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ ان دائیوں سے جو اجرت مقرر کی تھی وہ بھلائی کے طریقہ سے دے دے۔

خیال رہے کہ " ما آتیتم "کا معنیٰ ہے " **ما اردتم ایتا ہ من الاجرۃ**" جو ارادہ کیا تم نے اجرت دینے کا۔ (مدارک)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے'' جبکہ جو دینا ٹھہرا تھا'' راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے صرف الفاظ مختلف ہیں'' وہ چیز جو تم نے ان کو دینی تھی''

" **با لمعروف**" بھلائی کے طریقہ سے ان کے سپرد کردو، بھلائی کے طریقہ سے مراد یہ ہے کہ خوشی اور سرور سے دائیوں کو اجرت دے دو، اجرت میں کمی نہ کرو، اجرت دیتے ہوئے اچھا کلام بھی کرو، اور اجرت دینے میں تاخیر نہ کرو، ٹال مٹول سے کام نہ لو۔ (از مدارک و خازن)

''واتقوا اللہ'': اور اللہ سے ڈرو۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہاری بیویوں اور اولاد کے جو حقوق مقرر فرمائے ہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے پورا کرو، ان کو پورا کرنے میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ کرو۔

''واعلموا ان اللہ بما تعملون بصیر'':

اور جان رکھو بیشک اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ پر تمہارے کوئی اعمال بھی پوشیدہ نہیں، وہ انہیں دیکھ رہا ہے، اور جانتا ہے خواہ وہ تمہارے اعمال ظاہر ہوں یا پوشیدہ ہوں۔

ان الفاظ مبارکہ میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق جزا دے گا، اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں ثواب عطاء فرمائے گا یہ وعدہ ہے۔ اور گر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کام کیا تو وہ تمہیں عذاب دے گا، یہ وعید ہے۔

(از خازن وروح البیان)

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

- رب تعالیٰ کے ارشادگرامی "لَاتُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا" ماں کو اولاد کی وجہ سے ضرر نہ پہنچایا جائے۔

یعنی ماں (مطلقہ) جب دودھ پلانے پر اتنی مقدار میں اجرت لینے پر رضامند ہو جائے جتنی مقدار میں دوسری دایہ لیتی ہیں تو اولاد کا باپ وہ بچہ کسی اور دایہ کو دودھ پلانے کے لئے دے کر ماں کو ضرر نہ پہنچائے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا "فَاِنْ اَرْضَعْنَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ" اگر وہ (مائیں) تمہارے لئے (تمہارے بچے کو) دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دے دو۔

"وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰی" اور اگر تمہیں مشکل درپیش آئے تو دودھ پلانے والی اور (دایہ) طلب کر لو۔

یعنی ماں کا دودھ پلانے کا حق ختم تو نہیں ہوگا سوائے مشکل درپیش آنے کے۔ مشکل درپیش آنے کا یہ مطلب ہے کہ ماں بنسبت دوسری دایہ کے زیادہ اجرت طلب کرے یا دودھ پلانے سے ہی انکار کر دے۔

اور احتمال یہ بھی ہے کہ جب ماں دودھ پلانے سے انکار کر دے تو اس سے بچہ چھین نہ لیا جائے بلکہ دایہ طلب کی جائے جو بچے کو ماں کے پاس رکھ کر ہی دودھ پلائے۔

تو آیہ کریمہ سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک یہ کہ جب ماں مناسب مقدار میں کپڑے اور رزق بطور اجرت لینے پر رضامند ہو جائے تو اس سے بچہ لے کر کسی اور کو دودھ پلانے پر مقرر کرنا منع ہے، کیونکہ اس سے ماں کو ضرر پہنچانا لازم آئے گا۔

دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے سے انکار بھی کردے تو پھر بھی بچہ اس سے مکمل طور پر دور نہ کیا جائے بلکہ دایہ کو مقرر کرلیا جائے جو بچے کی ماں کے پاس رہ کر پرورش کرے، ورنہ ماں کو ضرر پہنچانا لازم آئے گا۔

طلاق کی صورت میں بچے کی پرورش کا حق کسے دیا جائے:

بچہ جب تک چھوٹا ہو یعنی سات سال تک اس کی پرورش کا حق اس کی ماں کو حاصل رہے گا، اگرچہ وہ دوسال پر دودھ پینے کا محتاج نہیں رہتا لیکن ماں کی پرورش کا وہ اسی طرح محتاج ہے جس طرح وہ دودھ پینے کی مدت میں محتاج تھا۔ ماں چونکہ بہت زیادہ شفقت کرتی ہے وہ اس بچے کی پرورش محبت سے کرے گی، اس لئے جب تک وہ اکیلے کھا پی نہ سکے اور اکیلے وضوء نہ کرسکے اس وقت تک وہ ماں کے زیر پرورش رہے گا۔

بچی کو جب تک حیض نہ آئے یعنی بالغہ نہ ہو اس وقت تک وہ ماں کے پاس رہے، کیونکہ وہ امور خانہ داری اور ایسے معاملات جو عورتوں سے متعلق ہوتے ہیں وہ ماں سے ہی سیکھ سکتی ہے۔ باپ سے نہیں سیکھ سکتی۔ اس لئے بلوغ کی مدت تک ماں کے پاس رہے۔

بچہ جب سات سال کا ہو جائے وہ تعلیم وتربیت کا محتاج ہوتا ہے، تعلیم وتربیت کا خیال جس طرح باپ کرسکتا ہے اس طرح ماں نہیں کرسکتی، اس حال میں ماں کے سپرد کرنا بچے کا نقصان ہے، بچے کو ضرر پہنچانے سے بچانا بھی ضروری ہے۔

سات سال کا استدلال حدیث پاک سے:

☆ "قال النبی ﷺ مروهم بالصلوة بسبع واضربوهم عليها العشر وفرقوا بينهم في المضاجع"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو ان کو مارو۔ (یعنی نماز نہ پڑھنے پر ان کی سرزنش کرو) اور ان کے لیٹنے کے مقام علیحدہ علیحدہ کردو۔ (یعنی جب دس سال کے بچے ہو جائیں تو بہن بھائی ملکر ایک چارپائی، ایک بستر پر نہ سوئیں)۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دینا تعلیم و تادیب کے لئے ہے تا کہ ان کو نماز ادا کرنے کی عادت پڑ جائے۔لہٰذا بچہ اس عمر میں ہر قسم کی تعلیم و تربیت کا محتاج ہے۔لہٰذا اس عمر میں بچے کو ماں باپ کے حوالے کر دیا جائے۔

لیکن بچی بالغہ ہونے تک تعلیم و تربیت میں ماں کی زیادہ محتاج ہے،اس لئے بلوغ کی مدت تک وہ ماں کے پاس رہے گی،بلوغ کے بعد وہ حفاظت کے محتاج ہے،اس کی حفاظت زیادہ طور پر باپ ہی کر سکتا ہے،اس لئے بچی کو بلوغ کے بعد باپ کے حوالے کر دیا جائے۔

☆ "روی عن علی کرم اللہ وجھہ وابن عباس رضی اللہ عنھما ان علیا اختصم ھو و زید بن حارثۃ و جعفر بن ابی طالب فی بنت حمزہ و کانت خالتھا تحت جعفر فقال النبی ﷺ ادفعوھا الی خالتھا فان الخالۃ والدۃ"

حضرت علی اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زید بن حارثہ اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی پرورش میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا (ایک کہتا میرا حق ہے،دوسرا کہتا میرا حق ہے اور تیسرا کہتا میرا حق ہے) اس بچی کی خالہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھی،تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ بچی اس کی خالہ کے حوالے کر دو،کیونکہ خالہ بھی ماں ہی ہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ بچے کی پرورش کا حق ماں کو دیا جاتا ہے کیونکہ ماں زیادہ شفقت کرتی ہے، اسی شفقت کی پیش نظر نبی کریم ﷺ سے بنت حمزہ کی ماں نہ ہونے پر اس کی خالہ کو حق دیا کہ خالہ بھی ماں کی طرح ہی شفقت کرتی ہے۔

اسی سے واضح ہوا کہ بچے کی پرورش کا حق ذی رحم محرم کو دیا جائے گا۔جس میں شفقت زیادہ ہوگی،اسے ہی حق دیا جائے گا۔نانی کا حق دادی سے مقدم ہوگا۔خالہ کا حق پھوپھی سے مقدم ہوگا کیونکہ نانی اور خالہ میں بنسبت دادی اور پھوپھی زیادہ شفقت پائی جاتی ہے۔

☆ "عن عبداللہ بن عمران امرأۃ جاءت بابن لھا الی النبی ﷺ فقالت یارسول اللہ حین کان بطنی لہ وعاء وثدیی لہ سقاء وحجری لہ حواء ارادابوہ ان ینتزعہ منی فقالت انت احق بہ مالم تتزوجی"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک ایک عورت اپنے بیٹے کوساتھ لئے ہوئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اورعرض کرنے لگی یارسول اللہ! میراپیٹ اس میرے بیٹے کے لئے ایک برتن کی حیثیت رکھتا ہے، اورمیرے پستان اس کے لئے پینے کاذریعہ ہیں، اور میری گوداس کی حفاظت گاہ ہے، لیکن اس کاباپ مجھ سے یہ چھیننا چاہتا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ تیرازیادہ حق ہے جب تک تواورنکاح نہ کرلے۔

اس سے اور یہ واضح ہوگیا کہ جب عورت دوسری شادی کرلے تواس کی شفقت پہلے بچے سے کم ہوجاتی ہے اوربعض اوقات دوسراخاوند بچے کی تربیت کامل طورپرنہیں کرنے دیتا، ایسی صورت میں بچہ سات سال سے کم بھی ہوتوماں سے لےکراس کی نانی وغیرہ کودے دیاجائے۔ اصل مقصد بچے کی پرورش اچھی طرح کرنی ہے، وہ جس طرح حاصل ہواس کوشریعت نے مدنظررکھا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کامذہب:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بچے کواختیاردیاجائے گاوہ ماں کے پاس رہناچاہے تواس کی ماں کوپرورش کاحق دیاجائے اوراگروہ باپ کے پاس رہناچاہے توباپ کوحق دیاجائے۔ وہ اپنے موقف پر یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

☆ "عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ خیرغلامابین ابویہ فقال لہ اخترایھماشئت"

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ایک لڑکے کواختیاردیاکہ تواپنے ماں باپ میں سے جسے چاہے پسندکرلے (اوراسی کے پاس رہ)۔

☆ "وروی عبدالرحمن بن غنم قال شھدت عمربن الخطاب خیرصبیابین ابویہ"

عبدالرحمٰن بن غنم فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا کہ آپ نے ایک بچے کو اختیار دیا کہ تو اپنے والدین میں سے چاہے پسند کر لے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا شاندار محاکمہ:

آپ فرماتے ہیں کہ جس بچے کو نبی کریم ﷺ نے اختیار دیا تھا وہ بالغ تھا، کبھی بالغ کو غلام (بچہ) بھی کہہ لیا جاتا ہے۔

یعنی اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب بچہ بالغ ہو تو وہ خود مختار ہے، اس لئے اسے اختیار دے دیا جائے گا تو وہ ماں کے پاس رہنا پسند کرے اور چاہے تو باپ کے پاس رہے۔

نابالغ بچے کے لئے وہی قانون ہے جو ذکر کر دیا گیا ہے کہ اسے اختیار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ سات سال کی عمر تک ماں کے زیر پرورش رہے گا اور اس کے بعد باپ کی زیر پرورش۔

اس پر ایک حدیث پاک شاہد ہے کہ اختیار بالغ کو دیا جاتا ہے نابالغ کو اختیار نہیں دیا جاتا۔

☆ "عن علی انه خیر غلاما وقال لوقدبلغ هذایعنی اخاله صغیر الخیر ته"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بچے کو اختیار دینے کا ارادہ فرمایا لیکن فرمایا اگر یہ بالغ ہوتا تو میں اسے اختیار دیتا لیکن میرے خیال میں یہ نابالغ ہے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

اس حدیث پاک سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب روز روشن کی طرح واضح نکھر کر سامنے آ گیا۔

اسلام کے سنہری اصول لیکن معاشرے کا بگاڑ:

آج جب ہم اپنے معاشرے کو دیکھتے ہیں تو صاحب علم بھی ایک مرتبہ سوچ کی گردش میں آ جاتا ہے کہ ماں نے بچے کو پیٹ میں اٹھانے کی تکالیف برداشت کیں، اور بچے کی پیدائش میں بہت بڑی تکالیف اٹھائی ہیں تو بچے کو سات سال کے بعد ماں سے جدا کر لینا کیا انصاف ہے؟

یہ ساری سوچ کی خرابی اسلام کے سنہری اصولوں اور معاشرہ کے بگاڑ پر نظر نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ اصل

میں یہ جاہلانہ رسم ورواج ہے کہ جب عورت کو طلاق دے دی جاتی ہے تو دونوں خاندانوں کا ایک دوسرے سے تعلق ختم ہو جاتا ہے، حالانکہ صحابہ کرام کے زمانہ میں خاندانوں کا تعلق نہیں ٹوٹتا تھا بلکہ صرف میاں بیوی کا تعلق ازدواجی ٹوٹتا تھا۔

ذرا غور تو کریں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دی لیکن نبی کریم ﷺ کے نکاح کا پیغام حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس لے جانے والے بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

اسی طرح بچہ ماں کے پاس ہو تو باپ کو نہ ملنے دیا جائے اور باپ کے پاس ہو تو ماں کو نہ ملنے دیا جائے یہ بھی معاشرہ کی خرابی ہے۔

آیئے ذرا معاشرہ کی اس خرابی کو دور کر کے دیکھیں کہ بچہ ماں کے پاس ہو تو باپ کو بھی ملتا رہے اور باپ کے پاس ہو تو ماں کو بھی ملتا رہے۔ پھر سات سال تک ماں پرورش کرے اس کے بعد باپ پرورش کرے، اب اسلام کے اس سنہری ضابطہ کا اندازہ لگائیں کہ بچے کی پرورش کتنے احسن انداز سے ہو گی اور بچے کو ماں اور باپ دونوں کی شفقت بھی حاصل رہے گی۔

مقام افسوس یہ ہے کہ معاشرہ کی خرابیوں کو دور نہیں کیا جاتا اور نہ ہی خرابیوں کو خرابیاں سمجھا جاتا ہے لیکن اپنی جہالت وحماقت سے اعتراض رب تعالیٰ کے عطاء کردہ سنہری اصولوں پر۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ سورج اور چاند کو دیکھ کر کتے کا بھونکنا۔

☆☆☆☆☆
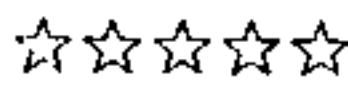
وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ☆ (سورۃ البقرہ آیت ۲۳۴)

﴿۱﴾

اور تم میں جو مریں اور بیبیاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں تو جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو اے والیو! تم پر مواخذہ نہیں اس کام میں جو عورتیں اپنے معاملہ میں موافق شرع کریں اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

﴿۲﴾

اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں اپنی بیویاں تو وہ (بیویاں) روک رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن، پھر جب وہ پہنچ جائیں اپنی مقررمدت کو (یعنی عدت پوری کرلیں) تو گناہ نہیں تم پر جو وہ (بیویاں) کریں اپنے نفسوں کے معاملہ میں شرع کے مطابق اور اللہ جو تم کرتے ہو ان پر خبر دار ہے۔

ماقبل سے تعلق:

جب پہلے طلاق کی عدت کو ذکر فرمایا پھر مدت رضاعت کو بیان فرمایا تو ساتھ ہی عدت وفات کا ذکر فرما دیا تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ عدت وفات بھی وہی ہے جو عدت طلاق ہے۔ (قرطبی)

شانِ نزول:

پہلے اس عورت کی عدت جس کا خاوند فوت ہو جائے ایک سال تھی جس کا ذکر آگے قریب ہی آ رہا ہے اس

آیۃ کو نازل فرما کر اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ یعنی اس آیۃ کریمہ کو دوسری آیۃ کے منسوخ کرنے کے لئے نازل کیا۔

اب حکم یہ ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ البتہ وہ حاملہ نہ ہو، حاملہ عورت کی عدت ہر حال میں وضع حمل (پیدائش) ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد حاملہ عورت کی عدت ختم ہو جاتی ہے خواہ اسے طلاق دی گئی ہو یا اس کا خاوند فوت ہو گیا ہو۔

اس مسئلہ پر کئی احادیث شاہد ہیں کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔

☆ ''قال ابن مسعود من شاء باهلته ان سورة النساء القصرى يعنى سورة الطلاق نزلت بعد سورة النساء الطولى يعنى سورة البقرة''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سورۃ طلاق جسے سورۃ النساء القصری بھی کہا گیا ہے وہ سورۃ البقرۃ کے بعد نازل ہوئی جسے سورۃ النساء الطولی بھی کہا گیا ہے۔

سورۃ بقرۃ میں مطلقاً ذکر ہے کہ جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ جس سے بظاہر پتہ چلتا ہے کہ خواہ عورت حاملہ ہو یا نہ ہو، خاوند کے فوت ہونے پر وہ اپنی عدت چار ماہ دس دن مکمل کرے، لیکن سورۃ طلاق بعد میں نازل ہوئی جس میں ذکر ہے ''وَاُولَاتِ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'' حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس مسئلہ میں میرے ساتھ اگر کوئی مباہلہ کرنا چاہے تو میں مباہلہ کرنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ (مظھری)

☆ ''عن سبيعة الاسلمى انها كانت تحت سعد بن خولة وهو من بنى عامر بن لؤى و كان ممن شهد بدرا فتوفى عنها فى حجة الوداع وهى حامل فلم تلبث ان وضعت حملها بعد وفاته فلما تعلت من نفاسها تجملت للخطاب فدخل عليها ابو السنابل بن يعكك رجل من بن عبد الدار فقال مالى اراك تجملت للخطاب لعلك ترجين النكاح و انك والله ما انت بناكح حتى تمر عليك اربعة اشهر و عشر قالت سبيعة فلما قال لى

ذلک جمعت علی ثیابی حین امسیت واتیت رسول اللہ ﷺ فسألته عن ذلک فافتانی بانی قدحللت حین وضعت حملی وأمرنی بالتزویج ان بدالی" (بخاری ومسلم خازن)

سبیعہ اسلمی سے مروی ہے جوکہ بنی عامر ابن لوی کے ایک شخص سعد بن خولہ کی زوجیت میں تھیں، وہ بدر میں بھی حاضر ہوئے تھے، حجۃ الوداع میں وہ فوت ہوگئے، یہ حاملہ تھیں، زیادہ وقت نہ گذرا کہ ان کے بچے کی پیدائش ہوگئی، جب یہ نفاس سے فارغ ہوگئی تو انہوں نے خطبہ کے لئے زیب وزینت کی، ان کے پاس ابوالسنابل آئے جوکہ بنی عبدالدار سے تھے، وہ کہنے لگے میں تمہاری زیب وزینت کو خطبہ کے لئے کیوں دیکھ رہا ہوں، کیا تم نکاح کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی بیشک تم نکاح نہیں کرسکتی جب تک تم پر چار ماہ دس دن نہ گذر جائیں۔ سبیعہ کہتی ہیں انہوں نے جب مجھے یہ کہا تو میں نے شام کے وقت اپنے کپڑوں کو سمیٹا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ سے سوال کیا تو آپ نے مجھے یہ فتویٰ دیا کہ تم بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی حلال ہوچکی ہو (یعنی تمہاری عدت ختم ہوچکی ہے) اور مجھے آپ نے حکم دیا کہ اگر تم نکاح کرنا چاہتی ہو تو نکاح کرلو۔ (خازن)

☆ "عن ابن عباس وروی عن عمرانه قال لو وضعت وزوجها علی السریر حلت"
(رواہ مالک والشافعی وابن ابی شیبة)

حضرت ابن عباس فرماتے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) فرماتے تھے کہ عورت کا جب بچہ پیدا ہو جائے اور اس کا خاوند ابھی تک چارپائی پر ہی ہو تو وہ حلال ہو جاتی ہے۔

یعنی ایک شخص فوت ہو جائے اور اس کے بعد اس کا بچہ، بچی پیدا ہو جائے تو اس کی عورت کی عدت ختم ہو جاتی ہے خواہ ابھی تک اس شخص کو دفن بھی نہ کیا گیا ہو۔ (مظہری)

"وعلیه انعقدالاجماع" اس مسئلہ پر امت کے مجتہدین ارباب علم کا اجماع ہے۔

"وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ" اور وہ لوگ جو تم سے فوت ہو جائیں۔

"اصل التوفی اخذالشئ وافیا" اصل معنی توفی کا کسی چیز کو مکمل طور پر لے لینا۔

"فمن مات فقداستوفی عمره کاملاویقال توفی فلان یعنی قبض و اخذ"

جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو وہ اپنی عمر کو کامل طور پر پالیتا ہے تو اس کے لئے **توفی** کا لفظ استعمال کرلیا جاتا ہے۔ (خازن)

طلبائے کرام یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ "توفی" کا حقیقی معنی مکمل طور پر پالینا، تکمیل کرنا، اور اس کا مجازی معنی "فوت ہونا" ہے۔

طلبائے کرام کو یہ بات ذہن نشین کر لینے کا مشورہ اس لئے دیا ہے کہ تیسرے پارہ میں "وَاِذْقَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ" آیۂ کریمہ انہیں سمجھ آجائے۔

"وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا" اور وہ چھوڑ جائیں بیویاں۔

"یـذرون" کا معنی ہے "یتـرکون" وہ چھوڑ جائیں۔ اور "ازواجا" سے مراد بیویاں ہیں۔ کیونکہ عرب حضرات "زوج" کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے ہی کرتے رہتے ہیں۔

"یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍوَّعَشْرًا"

وہ روک کر رکھیں اپنے نفسوں کو چار ماہ دس دن۔

"یتربصن" کا معنی ہے "ینتظرن" وہ انتظار کریں۔ یعنی عدت کے ختم ہونے کا انتظار کریں اور اپنے آپ کو زیب وزینت سے روک کر رکھیں۔ (خازن)

مسئلہ: لونڈیوں کی عدت خاوند کی وفات پر دو ماہ پانچ دن ہے۔ یعنی ان کی عدت سوائے وضع حمل کے بنسبت آزاد عورتوں کے نصف ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی دو حیض ہوتی ہے، کیونکہ ایک حیض کے نصف کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں۔ اور حیض نہ آنے کی صورت میں آزاد عورتوں کی عدت تین ماہ ہے اور لونڈیوں کی ڈیڑھ ماہ ہے۔

مسئلہ: عدت کا اعتبار چاند کی تاریخوں سے ہوگا جبکہ چاند کی پہلی تاریخ سے ہی عدت شروع ہو۔ اب چار ماہ دس دن چاند تاریخوں کے لحاظ سے جب مکمل ہوں گے تو عدت ختم ہو جائے گی خواہ مہینہ تیس دن کا تھا یا انتیس دنوں کا تھا۔

اگر عدت کسی مہینے کی پہلی تاریخ کو نہیں شروع ہوئی بلکہ درمیان میں شروع ہوئی تو اس میں بھی ائمہ کرام کا ایک قول تو یہی ہے کہ چاند تاریخوں کے اعتبار سے ہی چار ماہ دس دن مکمل کرے، لیکن ایک قول یہ ہے کہ ایک سوتیس دن مکمل کرے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

راقم کے نزدیک احتیاطی طور پر ایک سوتیس دن مکمل کرنے والا قول ہی معتبر ہے۔

عورتوں کا اپنے آپ کو روک کر رکھنے سے کیا مراد ہے؟

روک کر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عدت کے مکمل ہونے تک روک کر رکھیں۔ اور عدت کے مکمل ہونے تک اپنے آپ کو گھر سے نکلنے سے روک کر رکھیں۔ دن کو کسی مجبوری پر دوران عدت گھر سے نکلنا جائز ہوگا لیکن رات وہیں گذارنا لازم ہوگا۔ اور وہ اپنے آپ کو زیب و زینت سے روک کر رکھیں۔ مہندی نہ لگائیں۔ خوشبو استعمال نہ کریں۔ سرمہ نہ لگائیں۔ آنکھوں کی تکلیف کی صورت میں رات کو سرمہ لگالیں صبح آنکھوں کو دھولیں۔ شوخ رنگ کے کپڑے استعمال نہ کریں۔

☆ "عن سعید بن اسحاق بن کعب بن عجرة قال قال النبی ﷺ للفریعة (تصغیر) بنت مالک بن سنان و کانت متوفی عنها (زوجها) امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجله. قالت فاعتددت فیه اربعة اشهر و عشرا"

سعید کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فریعہ بنت مالک بن سنان جن کا خاوند فوت گیا تھا کو فرمایا تو اپنے آپ کو اپنے گھر میں روک کر رکھ یہاں تک کہ عدت مکمل ہو جائے۔ وہ کہتی ہیں میں نے چار ماہ دس دن عدت مکمل کی۔ (رواہ مالک، قرطبی)

☆ "عن ام سلمة قالت دخل علیّ رسول الله ﷺ حین توفی ابو سلمة و قد جعلت علی صبرا فقال ماهذا یاام سلمة فقلت انما هو صبر یارسول الله لیس فیه طیب فقال انه یشب الوجه فلاتجعله الابالليل وتنزعیه بالنهار ولاتمتشطی بالطیب ولا بالحناء فانه خضاب قلت بای شئ امتشط یارسول الله قال بالسدر تغفلین به راسک" (اخرجه ابوداؤد والنسائی)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے جبکہ ان کے خاوند ابوسلمہ فوت ہو چکے تھے، انہوں نے اپنے چہرے پر ایلوا (مصبر) لگایا ہوا تھا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اے ام سلمہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ یہ ایلوا (مصبر) ہے۔ اس میں کوئی خوشبو نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ چہرے کو جلاء عطا کرتا ہے یعنی چہرے میں اس سے چمک دمک آجاتی ہے اس لئے سوائے رات کے یہ استعمال نہ کرو۔ رات کو استعمال کرلو اور دن کو (دھو کر) اتار دیا کرو۔ اور خوشبو لگا کر کنگھی نہ کرو اور مہندی نہ لگاؤ، کیونکہ یہ بھی خضاب ہے۔ انہوں نے پوچھا یارسول اللہ میں کیا چیز لگا کر کنگھی کروں تو آپ نے فرمایا بیری کے پتے لگا کر۔ (خازن)

یعنی بیری کے پتوں سے سر کو دھولو جن سے سر کی میل دور ہو جائے گی، بال نرم ہو جائیں گے، کنگھی کا چلنا آسان ہو جائے گا، خوشبو بھی نہیں ہوگی اور رنگ بھی نہیں ہوگا۔

☆ ”عن زينب بن ابی سلمة قالت دخلت علی ام حبيبة زوج النبی ﷺ حين توفی ابوها ابو سفيان بن حرب فدعت ام حبيبة بطيب فيه صفرة خلوق اوغيره فدهنت به جارية ثم مست بعارضيها ثم قالت واللہ مالی بالطيب من حاجة غير انی سمعت رسول اللہ يقول علی المنبر لايحل لامرأة تؤمن باللہ واليوم الآخران تحد علی ميت فوق ثلاث الا علی زوج اربعة اشهر وعشرا قالت زينب ثم دخلت علی زينب بن جحش حين توفی اخوها فدعت بطيب فمست منه ثم قالت واللہ مالطيب من حاجة غير انی سمعت رسول اللہ ﷺ يقول علی المنبر لايحل لامرأة تؤمن باللہ واليوم الآخران تحد علی ميت فوق ثلاث الا علی زوج اربعة اشهر وعشرا“ (بخاری ومسلم)

حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی زوجہ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی جب کہ ان کے باپ حضرت ابوسفیان بن حرب فوت ہو چکے تھے۔ حضرت ام حبیبہ نے خوشبو منگائی وہ خوشبو خلوق تھی یا کوئی اور خوشبو تھی، وہ خوشبو آپ کو ایک غلامہ نے تیل کی طرح لگائی پھر آپ نے اپنے رخساروں پر وہ خوشبو لگائی، پھر فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی

مجھے خوشبو لگانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی سوائے اس کے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ کسی عورت کے لئے حلال نہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو کہ وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ منائے (زینت وغیرہ کو ترک کرے) سوائے اپنے خاوند کے کہ اس کے فوت ہونے پر وہ چار ماہ دس دن سوگ منائے۔

زینب بنت ابی سلمہ کہتی ہے پھر میں ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے گھر داخل ہوئی جبکہ ان کا بھائی فوت ہو چکا تھا، انہوں نے خوشبو منگائی اور وہ لگائی، پھر فرمایا کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مجھے خوشبو لگانے کی کوئی حاجت نہ تھی سوائے اس کے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ منائے سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ اپنے خاوند کے کہ وہ اپنے خاوند کا چار ماہ دس دن سوگ منائے۔ (خازن)

☆ "عن عائشة ان النبی ﷺ قال لایحل لامرأة تؤمن باللہ والیوم الآخر ان تحد علی میت فوق ثلاث الا علی زوج اربعة اشہر وعشرا" (مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ اپنے آپ کو زیب و زینت سے نہ روکے سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ اپنے خاوند کی وفات پر چار ماہ دس دن اپنے آپ کو روک کر رکھے۔

☆ "عن ام عطیة قالت کنا ننہی ان نحد علی میت فوق ثلاث الا علی زوج اربعة اشہر و عشرا ولا نکتحل ولا نتطیب ولا نلبس ثوبا مصبوغا الا ثوب عصب" (بخاری ومسلم)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ہمیں کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ منانے پر منع فرمایا گیا سوائے اپنے زوج کے، زوج پر چار ماہ دس دن تک سوگ منانے کا حکم دیا گیا کہ ہم سرمہ نہ لگائیں اور خوشبو نہ لگائیں اور زرد رنگ کے شوخ کپڑے نہ پہنیں سوائے اس کے جس کپڑے کا دھاگہ بننے سے پہلے رنگا گیا ہو اور شوخ رنگ نہ ہو (اس کی اجازت تھی)۔ (خازن)

چار مہینے دس دن عدت میں حکمت:

چار ماہ میں بچے میں روح پھونک دی جاتی ہے۔جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔

"عن ابن مسعود قال حدثنا رسول الله ﷺ وھو الصادق المصدوق ان خلق احدکم یجمع فی بطن امه اربعین یوما نطفة ثم یکون علقة مثل ذلک ثم یکون مضغة مثل ذلک ثم یبعث الله الیه ملکا یکتب رزقه واجله وعمله وشقی اوسعید ثم ینفخ فیه الروح"

(بخاری ومسلم)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بیان فرمایا کہ بیشک تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ کی حیثیت میں رہتا ہے، پھر چالیس دن منجمد خون کی صورت میں رہتا ہے، پھر گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں چالس دن رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتے کو بھیجتا ہے جو اس کا رزق اور موت اور عمل اور بد بخت ہونا اور نیک بخت ہونا لکھ دیتا ہے پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ (خازن)

یہ کل مدت چار ماہ ہی کہ پتہ چل جائے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں اور وہ بھی کامل طور پر بچے کی حرکت پر پتہ چل جائے ،اگر حاملہ ہوئی تو عدت وضع حمل ہے ورنہ چار ماہ دس دن عدت گذارے۔

البتہ روح جب چار ماہ میں پھونک دی جاتی ہے تو دس دن زیادہ کیوں رکھے گئے؟اس کی وجہ یہ ہے دس دن اوپر گذر جانے پر بچے کا ماں کے میں حرکت کرنا یقینی ہو جاتا ہے۔ (ماخوذ از خازن)

تنبیہ شدید: تین دنوں کے بعد کسی شخص کی موت پر زمانہ جاہلیت کی طرح سوگ منانا حرام ہے سوائے زوجہ کے خاوند کی موت پر، جو سوگ حرام ہے وہ یہ کہ خوشبو نہ لگانا ،سرمہ نہ لگانا ،عید اور جمعہ کے کپڑے نہ پہننا ،جب آپ پوچھیں کہ تم نے میلا کچیلا لباس کیوں پہنا ہوا ہے، آج تو جمعہ ہے یا عید ہے، وہ کہتا ہے "مات ابی وامی" میرے باپ فوت ہو گئے، یا وہ کہتا ہے کہ میری ماں فوت ہو گئی، حالانکہ ان کے فوت ہوئے کئی مہینے بھی گذر چکے ہوتے ہیں، جب اتنی قدر منع ہے تو یقیناً گریبان پھاڑنا، اور رخساروں پر طمانچے مارنا، بلند آواز سے رونا، چلانا، نوحہ (بین) کرنا،

بالوں کا منڈانا، سیاہ لباس پہننا، یہ کام حرام ہوں گے اور سنت یہی ہے کہ ان سے بچنا ضروری ہوگا۔

اسی طرح رافضیوں کا یوم عاشوراء کو ماتم کرنا اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر نوحہ کرنا، پیٹنا، غیر شرعی طریقہ سے تعزیتی پروگرام مرتب کرنا جن میں پیٹنا ہی پایا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ صحابہ کرام کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ یعنی تبرّا، ان کا فروع دین کا حصہ ہے یہ سب کام ناجائز اور حرام ہیں۔

" وهذاعمل اهل الضلال المستوجبين من اللهالغزی والنكال كأنهم لم يسمعوا ماوردفی النهی عن الحدادومن اللهالرشاد"

مذکورہ بالا اعمال گمراہ لوگوں کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسوائی اور عذاب کے مستحق ہیں، گویا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی راہنمائی کو نہیں قبول کیا اور جن چیزوں سے رکنے کا حکم تھا ان سے نہ رک کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی عدولی کی۔ (از روح البیان)

" فَاِذَابَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ " پھر جب وہ پہنچ جائیں اپنی مقرر مدت کو۔

"ای انقضت عدتهن" یعنی ان کی عدت ختم ہو جائے۔ (خازن، اور دیگر تفاسیر)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی تفاسیر کے مطابق ہے "تو جب ان کی عدت پوری ہو جائے" راقم نے لغوی ترجمہ کیا ہے تاہم بریکٹ میں الفاظ بڑھا کر وضاحت کر دی۔

"فَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَافَعَلْنَ فِيْ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ "

تو تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ کریں اپنے نفسوں کے معاملہ میں شرع کے مطابق۔

"فَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ" میں خطاب کسے ہے؟ "خطاب للاولیاء" یہ خطاب عورتوں کے والیوں کو ہے۔ (خازن)

"فَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ .ايها الائمة والحكام" یہ خطاب ائمہ اور حکام کو ہے، یعنی اے ائمہ اور حکام تم پر کوئی گناہ نہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر خازن کے مطابق ہے ''تو اے والیوتم پر مؤاخذہ نہیں''۔ لیکن اس میں جب ائمہ اور حکام کو خطاب بھی ہے تو راقم نے مطلق ذکر کیا ہے ''تو گناہ نہیں تم پر'' تا کہ تمام احتمالات کو شامل رہے۔

یعنی جب ان کی عدت ختم ہو جائے تو ان کو اپنے نفسوں کے معاملہ میں زیب و زینت سے نہ روکو۔ وہ جب عدت گذار چکی ہیں تو اس گھر سے منتقل ہونے سے نہ روکو جس گھر میں انہوں نے عدت گذاری ہے۔ اور اگر وہ اور کسی شخص سے نکاح کرنا چاہتی ہیں تو ان کو نکاح کرنے سے نہ روکا جائے۔

''بالمعروف'' کا مطلب ہی یہ ہے۔ ''بالوجه الذی لاینکره الشرع'' یعنی وہ اپنے نفسوں کے معاملہ میں جو کام اس طرح کریں کہ وہ شریعت میں منع نہ ہوں بلکہ شریعت کے مطابق ہوں، تو ان کو شرع کے مطابق کام کرنے سے تم منع نہ کرو۔

''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ'' اور اللہ تمہارے عملوں پر خبردار ہے۔

جب ''خبیر'' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام چیزوں کی حقیقتوں کا بلاشک علم رکھتا ہے اور کوئی چیز اس پر مخفی نہیں، اور خبیر کی نسبت جب بندوں کی طرف ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اجتہاد اور فکر کی وجہ سے علم رکھتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اجتہاد و فکر سے پاک ہے۔ (خازن)

جب اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خبردار ہے تو تم اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کسی قسم کا کوئی عمل نہ کرو۔ (از روح المعانی)

مسئلہ: ایک عورت کا خاوند فوت ہو جائے وہ کسی دوسرے گھر میں تھی تو اسے خاوند کی موت کی خبر ملی، کیا وہ وہاں ہی عدت گذارے یا کہ خاوند کے گھر آجائے؟ اگرچہ اس مسئلہ میں اختلاف تو ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کے گھر منتقل ہو جائے۔

یاد رکھنے کے قابل:

''وفی المؤطا ان عمر بن الخطاب کان یرد المتوفی عنهن ازواجهن من البیداء یمنعهن الحج''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقام بیداء سے ہی ان عورتوں کو واپس لوٹا دیتے تھے جن کے خاوند فوت ہو چکے ہوتے، ابھی وہ عدت میں ہوتیں تو ان کو حج کرنے سے منع کر دیا جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رات گھر گذارے۔

"وهومقتضى القران والسنة،فلايجوزلهاان تخرج فی حج ولاعمرة حتى تنقضي عدتها"

قرآن وسنت کا تقاضا یہی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اس لئے عورت کو اپنی عدت کے ختم ہونے تک حج اور عمرہ کرنے کے لئے گھر سے نکلنا جائز نہیں۔

اعتراض:

"عن عروة قال خرجت عائشة باختهاام كلثوم حين قتل زوجهاطلحة بن عبيدالله الى مكة فی عمرة"

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بہن ام کلثوم کو عمرہ کے لئے اپنے ساتھ مکہ مکرمہ لے گئیں جب ام کلثوم کے خاوند شہید کر دیئے گئے تھے، ابھی وہ عدت گذار رہی تھیں۔

اس سے تو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورت کے لئے دوران عدت حج اور عمرہ کے لئے جانا جائز سمجھتی تھیں۔

جواب:

"حدثناالثوری عن عبیدالله بن عمر انه سمع القاسم بن محمدیقول ابی الناس ذلک علیها"

عبیداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس اجتہاد کو صحابہ کرام نے رد کر دیا تھا، گویا کہ اجماع امت سے ناجائز ہونا ثابت ہے۔ (از قرطبی)

کتابیہ عورت اور عدت:

احادیث میں چونکہ ایمان والی عورتوں کا ذکر ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کی وفات کے بغیر کسی اور کی وفات پر اپنے آپ کو تین دنوں سے زائد روک کر نہ رکھیں۔

اس سے ابن کنانہ اور ابن نافع نے یہ استدلال کیا ہے کہ کتابیہ عورت کو زیب وزینت سے رکنا لازم نہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔لیکن ابن قاسم رحمہ اللہ کی روایت میں یہ ہے کہ کتابیہ پر بھی عدت گذارنا اسی طرح لازم ہے جیسا کہ مسلمان عورت پر لازم ہے۔لہٰذا اسے بھی زیب وزینت وغیرہ سے رکنا لازم ہوگا۔ لازم

لانه حكم من احكام العدة فلزمت الكتابية للمسلم كلزوم المسكن والعدة

کیونکہ اپنے آپ کو روک کر رکھنا بھی عدت کے احکام میں سے ایک حکم ہے،اس لئے گھر میں ٹھہرنا اور عدت گذارنا کتابیہ کے لئے بھی اسی طرح لازم ہے جیسا کہ مسلمان عورت کے لئے لازم ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔ (ماخوذ از قرطبی)

دینی طلبائے کرام کی توجہ کے لئے:

"اربعة" اسم عدد مؤنث ہے،کیونکہ اس کی تمیز "اشهر" ہے جو مذکر ہے،لیکن "عشرا" مذکر ہے اس لئے اس کی تمیز "ليالی" ہے جو مؤنث ہے "ایام" کا ذکر بالتبع ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

مسئلہ: نابالغہ لڑکی یا لونڈی کا خاوند فوت ہو جائے تو ان کو زیب وزینت چھوڑنا لازم نہیں کیونکہ زیب وزینت چھوڑنے کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ دوران عدت یہ کسی کو اپنے ساتھ نکاح کی طرف مائل نہ کریں۔چونکہ نابالغہ لڑکی اور لونڈی کی طرف میلان کم ہی ہوتا ہے اس لئے ان پر یہ حکم لازم نہیں۔

تاہم بعض ائمہ نے یہ حکم مطلق رکھا ہے کہ نابالغہ اور بالغہ کا حکم ایک ہی ہے،اس پر علامہ باجی مالکی رحمہ اللہ کا محاکمہ راقم کو بہتر نظر آیا۔آپ فرماتے ہیں اگر وہ لڑکی حکم شرع کو سمجھتی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ زیب وزینت سے رک جائے،اور اگر بہت چھوٹی ہے،حکم شرع کو نہیں سمجھتی تو اس پر یہ حکم لازم نہیں۔

وہ حضرات جو حکم کو عام رکھتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے۔

"روی ان النبی ﷺ سألتہ امرأۃ عن بنت لھاتوفی عنھازوجھافاشتکت عینھا افنکحلھا فقال النبی ﷺ لا .مرتین اوثلاثا"

ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس کی بیٹی کا خاوند فوت ہو گیا تھا، اس نے آپ سے پوچھا کہ اس کی بیٹی کی آنکھوں میں تکلیف ہے، کیا اسے سرمہ لگا دیا جائے، تو آپ نے فرمایا، "نہیں" دو یا تین مرتبہ سوال پر آپ نے جواب یہی دیا کہ سرمہ نہ لگایا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے چونکہ یہ نہیں پوچھا کہ اس کی عمر کیا ہے تو اس سے پتہ چلا کہ یہ حکم عام ہے بالغہ اور نابالغہ دونوں کو شامل ہے، تاہم اس کا جواب امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ عورت نے جو اپنی بیٹی کے متعلق سوال کیا تھا اس کے بالغہ ہونے کا نبی کریم ﷺ کو خود ہی علم تھا اس لئے اس کی عمر کا سوال نہ کیا۔

یہ خیال رہے کہ آنکھوں میں تکلیف ہونے کے باوجود سرمہ لگانے سے منع کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ سرمہ رات کو لگایا جائے، دن کو نہ لگایا جائے، کیونکہ جب رات کو سرمہ لگانے سے مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو دن کو سرمہ لگانے کے متعلق بار بار پوچھنے کا کیا مطلب ہے۔ (قرطبی بتصرف)

تنبیہ:

جب عورتیں عدت پوری کر لیں تو ان کو زیب و زینت سے نہ روکا جائے، گھر سے منتقل ہونے سے نہ روکا جائے اور دوسرا نکاح کرنے سے نہ روکا جائے، یہ حکام عورتوں کے والیوں کو اور حکام اور ائمہ اور اہلِ علم حضرات کو جب ہے تو اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ اگر دوران عدت اس حکم کے خلاف کریں تو سب حضرات ان کو منع کریں۔ (از قرطبی)

☆☆☆☆☆

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ☆ (سورۃالبقرۃ آیت ۲۳۵)

﴿۱﴾
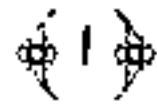
اورتم پر گناہ نہیں اس بات میں جو پردہ رکھ کرتم عورتوں کے نکاح کا پیام دویا اپنے دل میں چھپا رکھو اللہ جانتا ہے کہ اب تم ان کو یاد کرو گے ہاں ان سے خفیہ وعدہ نہ کر رکھو مگر یہ کہ اتنی بات کہو جو شرع میں معروف ہے اور نکاح کی گرہ پکی نہ کرو جب تک لکھا ہوا حکم اپنی میعاد کو پہنچ لے اور جان لو کہ اللہ تمہارے دل کی جانتا ہے تو اس سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔

﴿۲﴾
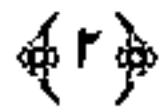
اور نہیں گناہ پراس میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو، یا چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں، جانتا ہے اللہ کہ بیشک ذکر کرو گے ان کا، لیکن ان سے نہ وعدہ لینا خفیہ طور پر، مگر یہ کہ تم کہو ان سے کوئی بات شریعت کے مطابق، اور نہ پختہ کرو عقد نکاح یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہاء کو، اور جان لو یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، تو اس سے ڈرو، اور جان لو کہ بیشک اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔

مختصر مطلب:

جن عورتوں کے خاوند فوت ہوجائیں، ان سے نکاح کی بات ظاہر طور پر کرنا منع ہے، اور ان سے نکاح کا پختہ وعدہ لینا بھی منع ہے، ہاں البتہ اشارہ اور کنایہ سے پیغام نکاح پہچانے میں کوئی حرج نہیں، دل میں ارادہ رکھنا کہ میں اس عورت سے عدت گذرنے پر نکاح کروں، اور اس ارادہ کو چھپا کر رکھنا، اور دل ہی دل میں اس عورت کو یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام سے عدول کرنے میں ڈرتے رہو، اگر غلطی سے کوئی خطاء واقع ہوگئی تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا، بردبار ہے۔

تعریض کیا ہے؟

تعریض ضد ہے تصریح کی، یعنی کسی چیز کو ظاہر طور پر بیان کرنا تصریح ہے، اور کسی چیز کو اشارۃً بیان کرنا تعریض ہے۔ یعنی اس طرح کلام کرنا جس میں مقصود اور غیر مقصود دونوں کا احتمال پایا جائے۔ البتہ مقصود کا احتمال زیادہ راجح اور قوی ہو۔

عام طور پر کہا جاتا ہے۔ "**عرض الشئ**" وہ ایک چیز کے اردگرد گھوما اور ظاہر نہیں ہوا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ محتاج شخص اس شخص کو کہے جس نے اس کی حاجت کو پورا کرنا ہے۔ "**جئتک لاسلم علیک**" بس ویسے ہی میں آپ کو سلام کرنے کے لئے آ گیا۔

اسی وجہ سے تعریض کے طور پر اپنی حاجت کو پیش کرنے کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے۔

"**وحسبک بالتسلیم منی تقاضیا**" میرا تقاضاءِ حاجت صرف تمہیں سلام پیش کرنا ہی ہے۔

تعریض کو تلویح بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ تلویح کا معنی ظاہر کرنا، تو انسان اپنے ارادہ کو جب اشارہ سے ظاہر کرتا ہے تو اس وقت اسے تلویح بھی کہہ لیا جاتا ہے۔

کنایہ اور تعریض میں فرق:

کنایہ میں لوازمات کا ذکر ہوتا ہے اور مراد ملزومات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جائے۔

"طويل النجاد" فلاں شخص طویل حمائل والا ہے، مراد اس سے طویل قد والا ہے، کیونکہ "طويل النجاد" مستلزم ہے "طويل القامة" کو۔

"كثير الرماد" ذکر کر کے مراد سخی لیا جاتا ہے۔ کیونکہ سخی شخص کے گھر مہمانوں کو کھانا کھلانے کے لئے آگ زیادہ جلتی ہے، آگ زیادہ جلنے سے خاکستر زیادہ ہوتی ہے، تو کثیر الرماد مستلزم ہے سخاوت کو۔ (از کبیر)

خطبہ: (بکسر الخاء) نکاح کا پیغام دینا جس میں قول و فعل میں نرمی پائی جائے۔ اور خُطبہ (بضم الخاء) ہر وہ کام جس کی ابتداء بھی ہو اور انتہاء بھی۔ جس طرح جمعہ کا خطبہ، عید کا خطبہ، نکاح کا خطبہ وغیرہ۔

خِطبہ نکاح (پیغام نکاح) کی تین قسمیں:

(۱) ان قسموں میں سے پہلی قسم یہ ہے نکاح کا پیغام ظاہر طور پر دینا بھی جائز ہے اور اشارہ سے بھی پیغام دینا جائز ہے۔ یہ اس وقت ہوگا جبکہ کسی عورت کا نکاح نہیں، اور نہ ہی وہ عدت گذار رہی ہو، اس سے جب نکاح کرنا جائز ہے تو پیغام نکاح دینا بھی ہر طرح جائز ہوگا، خواہ ظاہر طور پر ہو یا اشارہ سے ہو۔

البتہ یہ خیال رہے کہ ایک صورت میں منع ہوگا۔ وہ صورت جس کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

"لايخطبن احدكم على خطبة اخيه" تم میں کوئی شخص اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نکاح نہ دے۔

لیکن یہ ممانعت اس وقت ہوگی جب ایک عورت کا رشتہ ایک شخص نے طلب کیا ہو تو صراحۃً اسے قبول بھی کر لیا گیا ہو، پھر دوسرا سبز باغ دکھا کر پہلے شخص کے رشتہ کو توڑنا چاہے تو اس صورت میں پیغام نکاح دینا ناجائز ہوگا۔

اور اگر ایک شخص کے پیغام نکاح کو صراحۃً رد کر دیا گیا ہو تو دوسرا شخص پیغام نکاح دے تو جائز ہے۔ اور اگر کسی

شخص کے ''خطبہ'' (پیغام نکاح) کو صراحۃً نہ رد کیا گیا ہو اور نہ قبول کیا گیا ہو تو اس میں دو قول ہیں۔

ایک یہ کہ صراحۃً رد نہ کرنے سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اسے یہ نکاح پسند ہے اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے یہ نکاح پسند نہیں۔ اگر بعض اور وجوہ سے اشارہ سے یہ بھی چلتا ہے کہ ہوسکتا ہے یہ نکاح پسند ہو۔ اس لئے دوسرا شخص پیغام نکاح نہ دے۔ (احتیاط اور تقوی اسی صورت میں ہے)

اور دوسرا قول یہ ہے کہ جب صراحۃً پہلے شخص کے قول کو رد بھی نہیں کیا گیا اور قبول بھی نہیں کیا گیا تو دوسرا شخص پیغام نکاح دے سکتا ہے۔ (جواز اسی قول میں ہے)

﴿۲﴾ خطبہ کی دوسری قسم وہ ہے جو ہر صورت میں ناجائز ہے، صراحۃً بھی اور اشارۃً بھی۔ یہ اس وقت ہوگا جبکہ ایک عورت دوسرے شخص کی منکوحہ ہو، اس صورت میں پیغام نکاح کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے خاوند سے اختلاف شروع کرلے اور حقوق زوجیت کو پائمال کردے اور میری طرف میلان کرلے۔ یہ صورت بھی ناجائز، کیونکہ اس میں فتنہ وفساد کو ہوا دینا لازم آئے گا۔

جس عورت کو رجعی طلاق دی گئی ہو اسے بھی نکاح کا پیغام دینا منع ہے، کیونکہ وہ ابھی تک حکم نکاح میں ہے۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس کا خاوند اس کی طرف رجوع کرلے۔

﴿۳﴾ خطبہ (پیغام نکاح) کی تیسری صورت یہ ہے کہ ظاہر طور پر پیغام دینا تو ناجائز ہو لیکن اشارہ سے پیغام دینا جائز ہو۔ یہ وہ عورت ہے جو عدت گذار رہی ہو لیکن وہ طلاق رجعی کی عدت نہ ہو۔

اس میں پھر تین صورتیں ہیں۔

ان میں سے پہلی صورت یہ ہے کہ عورت کا خاوند فوت ہوچکا ہو، اور وہ عدت وفات میں ہو تو اسے ظاہر طور پر پیغام نکاح دینا جائز نہیں البتہ اشارہ سے نکاح کا پیغام دے دے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کو تین طلاقیں دے دی گئیں۔ وہ تین طلاقوں کی عدت گذار رہی ہے تو اسے پیغام نکاح دینا جائز ہے یا نہیں، اس میں اہل علم کا اختلاف تو ہے لیکن صحیح قول یہی ہے کہ جب اس سے نکاح کرنا جائز

ہے تو اسے پیغام نکاح دینا بھی جائز ہے، البتہ پیغام نکاح تعریض (اشارہ) کے طور پر ہو، ظاہر نہ ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک عورت کا نکاح فسخ کر دیا گیا ہے یا اسے بائن طلاق دے دی گئی تو اس صورت میں اگر اس کا اپنا خاوند ہی اس سے پھر نکاح کرنا چاہتا ہے تو وہ دوران عدت خواہ ظاہر طور پر پیغام نکاح دے یا اشارہ سے اس کے لئے جائز ہے۔ لیکن اس صورت میں کوئی اور شخص اس عورت کو دوران عدت کسی طرح بھی پیغام نکاح نہیں دے سکتا، کیونکہ اس عورت سے اس کا خاوند دوبارہ نکاح کرسکتا ہے، اس لئے ابھی انتظار کی جائے ہوسکتا ہے وہ نکاح پر دوبارہ آمادہ ہو جائے تو اسی سے نکاح کرنا بہتر ہے۔ (از کبیر)

تعریض کیسے کرے؟

☆ ''وقال ابن عباس التعريض بالخطبة ان يقول انی اريدان اتزوج امرأة من امرهاو امرهايعرض لهابالقول''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تعریضاً نکاح کا خطبہ (پیغام) اس طرح دیا جائے کہ اس عورت کے سامنے یہ ذکر کرے کہ میں کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں جس میں اس اس طرح صفات ہوں، ان صفات کا ذکر کرے جو اس میں پائی جاتی ہوں لیکن ظاہر طور پر اس سے نکاح کرنے کی بات نہ کرے، بلکہ اشارہ پر ہی اکتفاء کرے۔

☆ ''وقال الحسن هوان يقول لهاانی بک بمعجب وانی فيک لراغب ولاتفوتينا نفسک''

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس عورت کو اس طرح کہے بیشک میں تمہیں پسند کرتا ہوں، بیشک میں تم میں رغبت رکھتا ہوں، تم اپنے نفس کے معاملہ میں ہمیں نہ بھلانا یعنی اپنے معاملہ میں ہم سے بھی مشورہ کر لینا۔

☆ ''وقال النبی ﷺ لفاطمة بنت قيس وهی فی العدة لاتفوتينابنفسک ثم خطبها بعد انقضاء العدة علی اسامة بن زيد''

نبی کریم ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت قیس کوان کی عدت کے دوران فرمایاتم اپنے نفس کے معاملہ میں ہمیں نہ بھلانا، یعنی ہم سے مشورہ کرلینا۔ پھر جب ان کی عدت ختم ہوگئی تو نبی کریم ﷺ نے اسامہ بن زید سے نکاح کرنے کے لئے ظاہر طور پر پیغام دے دیا۔ اس طرح فاطمہ بنت قیس کا نکاح اسامہ بن زید سے کردیا گیا۔

☆ "قال عبدالرحمن بن القاسم عن ابیه قال هوان یقول لهاوهی فی العدة انک لکریمة وانی فیک لراغب وان الله سائق الیک خیرا او نحوهذا من القول"

عبدالرحمن بن قاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ عورت کو دوران عدت کہے تم کریم عورت ہو، بیشک مجھے تم سے محبت ہے، بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھلائی سے نوازا ہے، اس طرح کی باتیں اس سے کرے جن سے نکاح کرنے کا اشارہ ملتا ہو لیکن ظاہر طور پر بات نہ کرے۔

☆ وقال عطاء هوان یقول انک لجمیلة وانی فیک لراغب وان قضی الله شیا کان

عطا کہتے کہ وہ اس طرح کہے بیشک تو خوبصورت ہے اور بیشک میں تم میں رغبت رکھتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کا فیصلہ کردے تو بہتر ہوگا۔

نتیجہ واضح کہ تعریض کے لئے الفاظ معین نہیں، بلکہ صرف یہ ضروری ہے۔

"فکان التعریض ان یتکلم بکلام یدل علی فحواه علی رغبته فیهاو لایخطبهابصریح القول"

تعریض یہ ہے کہ اس طرح کلام کرے جس سے مقصد سمجھ آئے کہ وہ اس عورت سے نکاح کرنے میں رغبت رکھتا ہے لیکن ان الفاظ میں بھی غیر مقصد کا احتمال پایا جائے۔ یعنی بات اشارہ سے ہو ظاہر طور پر نہ ہو۔ (از احکام القرآن للجصاص)

"اَوْاَكْنَنْتُمْ فِىْ اَنْفُسِكُمْ" یا چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں۔

"اکنان" کا معنی ہے "اخفاء وستر" پوشیدہ رکھنا۔ اس میں دو لغتیں ہیں۔ ایک "کننته" اور دوسری "اکننه"

کبھی دونوں کا معنی چھپانا کیا جاتا ہے، کوئی خاص فرق نہیں کیا جاتا۔ اور کبھی دونوں کے استعمال میں فرق کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے۔ " کننت الشیٔ" میں نے فلاں چیز کو محفوظ کرلیا، آفت سے بچالیا، اس صورت میں اسے چھپانا ضروری نہیں۔ اسی معنی کے مطابق کہا جاتا ہے۔ "درمکنون" موتی سیپ میں محفوظ۔ "جاریة مکنونة" لڑکی جو حفاظت میں ہو۔ "بیض مکنون" انڈہ لڑھکنے سے محفوظ کرلیا گیا۔

"اکننت" کا مطلب ہوتا ہے میں چھپالیا، یعنی "اکننت" میں اخفاء اور ستر ضروری ہے۔ یہ ضد ہے "اعلنت اور اظہرت" کی، جس کا معنی ہوتا ہے ظاہر کرنا۔

الفاظ مبارکہ کا مفہوم:

یعنی عدت وفات میں عورت کو تعریض خطبہ یعنی اشارہ سے پیغام نکاح جس طرح جائز ہے اور اس میں کوئی گناہ نہیں اس طرح دل میں ارادۂ نکاح کو چھپا رکھنا اور اس کا ذکر اشارہ سے بھی نہ کرنا جائز ہے۔

بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ جب اشارہ سے نکاح کا پیغام دینا جائز ہے تو دل میں نکاح کے ارادہ کو چھپا کر رکھنے کا جواز خود بخود معلوم ہو جائے گا، تعریض کے جواز کے بعد "اکنان" دل میں چھپانے کا ذکر تو "تحصیلِ حاصل" ہے یا "ایضاح الموضحات" ہے، جو فصاحت کے منافی ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو حکم علیحدہ علیحدہ ذکر ہیں۔ پہلے ذکر کیا گیا کہ وفات کی عدت گذارنے والی عورت کو اشارہ سے پیغام نکاح دینا جائز ہے لیکن فی الحال (ابھی) صراحۃ پیغام نکاح دینا جائز نہیں۔

اس حکم کو "وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ" سے بیان کردیا گیا۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ دل میں ارادۂ نکاح فی الحال جائز ہے جسے تم نے مستقبل میں ظاہر کر دینا ہے۔ اس حکم کو "اَوْ اَكْنَنتُمْ" سے ذکر کر دیا گیا۔ مستقبل میں ظاہر کرنے کا ذکر آنے والے الفاظ مبارکہ میں کر دیا گیا۔

"عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا"

اللہ جانتا ہے کہ بیشک ذکر کرو گے تم ان کا لیکن ان سے نہ وعدہ لینا خفیہ طور پر۔

جب انسان کو نکاح کے معاملہ میں شہوت نفس حاصل ہے تو شہوت رکھنے والا شخص عزم اور تمنا بھی یقینا رکھے گا، اللہ تعالیٰ نے جب ان کو اس مشکل کام کا حکم دیا کہ ان کو صراحۃً ابھی پیغام نکاح نہ دو۔ تو پھر آسانی پیدا کرنے کے لئے یہ حکم دیا کہ دل میں ارادۂ نکاح کو چھپا کر رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم نے انہیں یاد کرنا ہے، تو ان کو یاد کرو، لیکن ان سے خفیہ وعدہ نہ کرلو۔

"اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا" مگر یہ کہ تم کہو کوئی بات شریعت کے مطابق۔

ابھی تک بیان کردہ بحث سے یہ حاصل ہوا کہ جو عورت اپنے خاوند کے فوت ہونے پر عدت گذار رہی ہو اسے اشارہ سے پیغام نکاح دینا جائز ہے، ظاہر طور پر پیغام نکاح دینا جائز نہیں۔ اور دل میں ارادۂ نکاح بھی جائز ہے، لیکن ظاہر طور پر اسے ذکر نہ کرے، البتہ اشارہ سے ذکر کرنا بھی جائز ہے، اور عورتوں سے اکیلے اکیلے مخفی طور پر دوران عدت نکاح کا وعدہ لینا بھی ناجائز ہے۔ ہاں البتہ شریعت کے مطابق تعریض کے طور پر ان سے نکاح کا ذکر کرنا بھی جائز ہے۔ (از کبیر)

"وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ"

اور نہ پختہ کرو عقد نکاح یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہاء کو۔

یعنی عدت کے ختم ہونے تک ان سے نکاح کرنا حرام ہے، اس لئے عدت کے ختم ہونے کی انتظار کی جائے۔

"عقدة" کا معنی ہے گرہ، جس طرح گرہ لگا کر رسی کو مضبوط کرلیا جاتا ہے، اسی طرح نکاح کا بندھن بھی مضبوط ہوتا ہے، لہٰذا اسے عقد سے تعبیر کرلیا جاتا ہے۔

"الکتاب" بمعنی المکتوب ہے، یعنی لکھی ہوئی چیز اپنی انتہاء کو پہنچ جائے، مراد اس سے عدت ہے۔ اور "الکتاب" بمعنی فرض بھی آتا ہے۔ اب اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا، یہاں تک کہ فرض اپنے انتہاء کو پہنچ جائے۔ مراد اس سے بھی عدت ہی ہے۔ (قرطبی)

”وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَافِیْ اَنْفُسِکُمْ فَاحْذَرُوْہُ“

اور جان لو یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے تو ڈرو اس سے۔

ان الفاظ گرامی سے متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر اور چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے، لہٰذا جب بھی تم کوئی کام کرو تو اللہ تعالیٰ کا ڈر رکھو تا کہ تمہارا کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو۔ (کبیر)

”وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ“

اور جان لو بیشک اللہ بخشنے والا، حلم والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو معصیت پر جلدی سزا نہیں دیتا بلکہ اس کے گناہوں کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔(خازن)

پہلے وعید فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور قہر وغضب سے ڈرو، اللہ تعالیٰ کے حکم سے عدولی نہ کرو، اور اب وعدکا ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اگر تم سے کوئی لغزش ہو جائے تو اس سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرو تو وہ اپنی رحمت کاملہ سے تمہیں بخش دے گا، اور وہ حلم والا ہے، جلدی کسی کو عذاب نہیں دیتا۔

☆☆☆☆☆

لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْتَفْرِضُوْالَهُنَّ فَرِيْضَةً وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّاعَلَى الْمُتَّقِيْنَ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۶)

﴿۱﴾

تم پر کچھ مطالبہ نہیں تم عورتوں کو طلاق دو جب تک تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو یا کوئی مہر مقرر کر لیا ہو اور ان کو کچھ برتنے کو دو۔ مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگدست پر اس کے لائق حسبِ دستور کچھ برتنے کی چیز یہ واجب ہے بھلائی والوں پر۔

﴿۲﴾

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم طلاق دو عورتوں کو جب تک تم نے ان کو مس نہیں کیا اور نہیں مقرر کیا ان کا مہر اور ان کو نفع پہنچاؤ (وہ نفع پہنچانا) غنی پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگ دست پر اس کی طاقت کے مطابق نفع پہنچانا شرع کے مطابق واجب ہے احسان کرنے والوں پر۔

مختصر مطلب: جن عورتوں کا نکاح کے وقت کسی طرح مہر مقرر کرنا رہ گیا تھا، ان کو جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ ان کو نفع پہنچانا یعنی تین کپڑوں پر مشتمل (قمیص، شلوار، دوپٹہ) ایک جوڑا دے، یہ کپڑوں کا جوڑا دینا واجب ہے۔

شانِ نزول:

ایک وجہ: شانِ نزول کی یہ بیان کی گئی کہ جب نبی کریم ﷺ نے صرف ذوق اور قضاء شہوت کے لئے نکاح کرنے

سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ نکاح کرنے کا مقصد اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا ہو، اور اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنا ہو، اور ہمیشہ کی صحبت کا ارادہ ہو، اور نیک اولاد کی طلب ہو، تو صحابہ کرام کے دلوں میں یہ خیال واقع ہوا کہ اگر کسی شخص نے جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی تو وہ گنہگار ہوگا، تو اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر یہ واضح کیا کہ اصل مقصد نکاح میں نیک ارادہ ہو، کسی وجہ سے جماع سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اس میں کوئی خاص گناہ اس وجہ سے لازم نہیں کہ اس نے جماع سے پہلے طلاق دی ہے۔ البتہ مطلقاً طلاق دینا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ (قرطبی، روح المعانی)

دوسری وجہ: انصار میں سے ایک شخص نے بنی حنیفہ کی ایک عورت سے شادی کی، لیکن جماع سے پہلے ہی طلاق دے دی اور مہر بھی مقرر نہیں کیا تھا تو اس کے سوال پر کہ میں اب کیا کروں تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، تو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو فرمایا۔ "**امتعھا ولو بقلنسوتک**" تم اسے نفع پہنچاؤ خواہ اپنی ٹوپی دے کر ہی۔

حدیث شریف میں ٹوپی دینے کا ذکر عام محاورہ کے مطابق ہے۔ مراد خاص ٹوپی نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی زوجہ کو اپنی طاقت کے مطابق کپڑوں کا جوڑا دے کر نفع پہنچاؤ، خواہ اس کی قیمت تمہاری ٹوپی کی طرح کم ہی کیوں نہ ہو۔

(خازن)

دونوں وجہ کا اجتماع ممکن ہے:

شان نزول کے دونوں وجہ کا اجتماع ممکن ہے، کیونکہ نکاح کے متعلق نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے بعد مومنین کے دلوں میں بھی واقع ہوا کہ شائد جماع سے پہلے طلاق دینا خاص گناہ ہو، اور ایک صحابی کا واقع بھی در پیش آیا تو اس کے بعد آیۃ کریمہ نازل ہوئی، لہٰذا دونوں وجہ ہی شان نزول ہیں۔

اعتراض: جب جماع کے بعد بھی طلاق دینا علیحدہ کسی خاص گناہ پر مشتمل نہیں تو طلاق سے پہلے گناہ کی نفی کا کیا مطلب ہے؟ عام گناہ تو ہر طرح طلاق میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "**ان ابغض الحلال الی اللہ الطلاق**" بیشک حلال چیزوں میں سے اللہ تعالیٰ کو طلاق ناپسند ہے۔

جواب: سوال ہی جماع سے پہلے طلاق کے متعلق تھا، کیونکہ زیادہ وہم اسی میں ہوا تھا کہ یہ نکاح تو نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے خلاف ہوگیا، تو صحابہ کرام کے خصوصی سوال کا جواب بھی اسی خاص قسم کے مطابق ہی دیا گیا۔

مسئلہ کی تفصیل:

اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی "ومتعوھن" سے فقہائے کرام نے لفظ "متعہ" اخذ کیا ہے کہ جس عورت کو طلاق دے دی جائے اسے متعہ بھی دیا جائے۔

متعہ کیا ہے؟ متعہ تین کپڑوں پر مشتمل ایک جوڑا ہے۔

البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ ایک غلام دینا اعلیٰ قسم کا متعہ ہے، اور تین کپڑوں پر مشتمل ایک جوڑا درمیانی قسم کا متعہ ہے، اور اس سے کم صرف چادر یا دوپٹہ وغیرہ دینا گھٹیا قسم کا متعہ ہے۔ (حازن)

تاہم زیادہ طور پر اہلِ علم کا اتفاق ہی نظر آتا ہے کہ متعہ تین کپڑوں پر مشتمل ایک جوڑا ہی ہے۔

مسئلہ کی چار صورتیں:

﴿۱﴾ عورت کا مہر مقرر نہیں کیا گیا اور جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق بھی دے دی گئی تو اسے متعہ دینا واجب ہے۔ اس کا اور کوئی مہر نہیں۔ مسئلہ کی اس صورت کو اس آیۃ کریمہ میں ذکر کردیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ مہر مقرر کیا گیا تھا اور طلاق جماع یا خلوت صحیحہ سے پہلے دی گئی تو نصف مہر دینا لازم ہے اور ساتھ ہی متعہ دینا مستحب ہے۔ اس مسئلہ کا ذکر آنے والی آیۃ کریمہ "وان طلّقتموھنّ من قبل ان تمسّوھنّ وقد فرضتم لھنّ فریضۃ" میں ہے۔

﴿۳﴾ عورت کا مہر مقرر کیا گیا تھا اور طلاق جماع یا خلوت صحیحہ کے بعد دی تو ایسی صورت میں مکمل مہر دینا ہوگا، اور متعہ دینا مستحب ہے۔

اس مسئلہ کا ذکر پہلے "ولایحلّ لکم ان تأخذوا ممّا اٰتیتموھنّ شیئاً" کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

۵۔ مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا لیکن طلاق جماع یا خلوت صحیحہ کے بعد دی گئی تو اسے مہر مثل دیا جائے گا اور متعہ دینا مستحب ہے۔

تنبیہ: اگر مہر مقرر کیا گیا تھا اور طلاق جماع یا خلوت صحیحہ سے پہلے دے دی گئی تو نصف مہر دینا لازم ہے۔ لیکن اس صورت کے متعلق فقہی کتب میں متعہ نہ دینے کا جو ذکر ہے وہ نفی وجوب ہے کہ متعہ بطور وجوب دینا لازم نہیں، استحباب کی نفی نہیں۔

دینی مدارس کے طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

راقم نے اپنے ترجمہ میں "لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ" کا ترجمہ کیا ہے "تم پر گناہ نہیں" اور "اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ" کا ترجمہ کیا ہے "اور نہیں مقرر کیا ان کا مہر"

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے "لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ" کا ترجمہ فرمایا ہے "تم پر کچھ مطالبہ نہیں" اور "اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً" کا ترجمہ کیا ہے "یا کوئی مہر مقرر کر لیا ہو"۔

نوٹ: اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تاج کمپنی اور ضیاء پبلیکیشنز کے مطبوعہ نسخوں سے نقل کیا گیا ہے۔ اگرچہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے تفسیر نعیمی میں اعلیٰ حضرت کا ترجمہ نقل کیا ہے "یا کوئی مہر مقرر نہ کر لیا ہو" لیکن یہ سہو کتابت ہے۔ آپ کا ترجمہ مثبت ہے منفی نہیں۔ خیال رہے کہ یہاں مودودی صاحب کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کے مطابق ہے۔

اصل میں مفسرین کرام نے یہاں دو طرح کی تفاسیر بیان فرمائی ہیں۔

ایک قسم کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے اور دوسری قسم کے مطابق راقم کا ترجمہ ہے۔

راقم نے دوسری قسم کی تفسیر کے مطابق اس لئے ترجمہ کیا ہے تاکہ دونوں قول طلبائے کرام ذہن نشین کر لیں۔

ابھی تک قرطبی اور خازن سے جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے راقم کے ترجمہ کو تائید حاصل ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ

راقم کے ترجمہ میں "اَوْ" کا ترجمہ "اور" کیا گیا ہے۔

"قال اللہ عزوجل (لاجناح علیکم ان طلقتم النساء مالم تمسوھن اوتفرضوالھن فریضۃ)
تقدیرہ مالم تمسوھن ولم تفرضوالھن"

یعنی آیۂ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ "تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب تک ان کو مس نہ کرو اور مہر مقرر نہ کرو۔

"وقدتکون اوبمعنی الواوقال اللہ تعالی "ولاتطع منھم آثمااو کفورا" معناہ ولا کفورا. وقال اللہ تعالی "وان کنتم مرضی اوعلی سفراوجاء احدمنکم من الغائط" والمعنی وجاء احدمنکم من الغائط وانتم مرضی ومسافرون. وقال اللہ تعالی "وارسلناہ الی مائۃ الف اویزیدون" معناہ ویزیدون. وھذاموجودفی اللغۃ وھی فی النفی اظھرفی دخولھا علیہ انھابمعنی الواو" (احکام القرآن للجصاص)

"اَوْ" کبھی بمعنی "واؤ" کے آتا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں آیتوں میں یعنی "او کفورا" میں اور "او جاء احدمنکم" میں، اور "اویزیدون" میں، "اَوْ" بمعنی "واؤ" استعمال ہے۔ "او" کا "واؤ" کے معنی میں استعمال لغت میں موجود ہے۔ بلکہ نفی کے مقام میں اس معنی میں استعمال اور زیادہ واضح ہے۔

جلالین میں بھی "تفرضوا" سے پہلے "لم" ذکر کیا گیا ہے۔

"(او)لم(تفرضوالھن فریضۃ)"

اس کی وضاحت کمالین میں یوں کی گئی ہے۔

"قولہ او،لم یشیربتقدیرلم الی انہ مجزوم للعطف علی تمسوھن"

مفسر رحمہ اللہ نے "تفرضوالھن" سے پہلے "لم" مقدر کو ظاہر کر کے اشارہ کیا ہے کہ اس کا عطف "تمسوھن" مجزوم پر ہے۔ جس طرح "تمسوھن" سے پہلے "لم" ہے، اسی طرح "تفرضوالھن" سے پہلے بھی "لم" ہوگا، کیونکہ ضابطہ یہی ہے کہ جو عبارت معطوف علیہ سے پہلے ہوتی ہے وہ معطوف سے پہلے بھی ہوتی ہے۔ (حاشیہ جلالین)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اور روح المعانی:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر روح المعانی کے مطابق ہے۔ آیئے روح المعانی کو دیکھئے۔

"(لاجناع علیکم) لاتبعه من مهر وهو الظاهر"

یعنی "لاجناح" کا ترجمہ جو زیادہ ظاہر ہے وہ یہ ہے تم پر مہر کا پیچھا کرنا یعنی مہر کا مطالبہ کرنا نہیں۔

"(او تفرضوا لهن) ای حتی تفرضوا لهن، او الاان تفرضوا لهن"

یہاں تک کہ تم ان کا مہر مقرر کرو۔ یا یہ ترجمہ ہے۔ مگر یہ کہ تم ان کا مہر مقرر کرو۔

یعنی اس مقام پر "او" بمعنی "الی ان" یا "اِلاّاَن" کے استعمال ہوا ہے۔

علیحدہ علیحدہ الفاظ کی تفسیر کرنے کے بعد مکمل مسئلہ روح المعانی میں ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

"والمعنی انه لاتبعة علی المطلق بمطالبة المهر اصلا اذا کان الطلاق قبل المسیس علی کل حال الافی حال الفرض فان علیه حینئذ نصف المسمی کماسیصرح به، وفی حال عدم تسمیته علیه المتعة لانصف مهر المثل، واما اذا کان بعد المساس فعلیه فی صورة التسمیة تمام المسمی، وفی صورة عدمها تمام مهر المثل"

معنی یہ ہے کہ طلاق دینے والے کا مہر کے مطالبہ سے بالکل پیچھا نہ کیا جائے جبکہ طلاق اس نے مس کرنے سے پہلے دی ہو، یہ مطالبہ کسی حال میں بھی نہ کیا جائے سوائے مہر کے مقرر کرنے کے مس سے پہلے طلاق دی گئی ہو اور مہر مقرر کیا گیا تھا تو نصف مہر دیا جائے گا جس کا صراحۃً عنقریب ذکر آ رہا ہے۔ مس سے پہلے طلاق ہو اور مہر مقرر نہیں کیا گیا تو متعہ دینا لازم ہے، کیونکہ مہر مثل کو نصف نہیں کیا جاتا۔ اگر طلاق مس کے بعد دی گئی اور مہر مقرر کیا گیا تھا تو مکمل مہر دینا لازم ہوگا اور اگر مہر مقرر نہیں کیا گیا اور طلاق مس کرنے کے بعد دی گئی تو مہر مثل دینا لازم ہوگا۔

ابھی تک روح المعانی سے بیان کردہ بحث کو دیکھ کر یہ سمجھنا مشکل نہ رہا کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔ تاہم یہ بھی خیال رہے کہ روح المعانی میں دوسرا معنی بھی ذکر کیا گیا ہے۔ "لاجنتاح" کے متعلق فرماتے

ہیں۔"قیل من الوزر"بعض حضرات نے بیان کیا ہے"تم پر کوئی گناہ نہیں"۔

اور"اوتفرضوالھن"کے متعلق بیان فرماتے ہیں۔

"ومن الناس من جعل کلمة"او"عاطفة لمدخولھاعلی ماقبلھامن الفعل المجزوم.

بعض حضرات"اوتفرضوالھن"کا عطف مجزوم"تمسوھن"پر کیا ہے،اس صورت میں"لم" ساتھ ملے گا،معنی یہ ہوگا"کہ تم نے مہر مقرر نہ کیا ہو"۔

اعتراض: روح المعانی نے پہلے معنی کے بعد خود ہی اعتراض کیا ہے کہ "او"بمعنی"الی ان" کے آنے کے لئے غایة پائی جاتی ہے،جیسا کہ کہا جاتا ہے۔"لالزمنک اوتعطینی حقی" میں تمہیں ضرور بضرور لازم پکڑوں گا یہاں تک کہ تو میرا حق ادا کردے۔یعنی میرے لازم پکڑنے کی انتہاء تمہارا اعطاء کرنا ہے۔

اس قانون کے لحاظ پر مہر مقرر کرنا غایت بنے گا"عدم مساس"(نہ چھونے کا) نہ کہ عدم جناح(گناہ نہ ہونے کا) یہ معنی مقصود نہیں۔

جواب: یہاں فعل مقید معتبر ہے،معنی یہ ہے۔"انتم مالم تمسوھن بغیر جناح وتبعة الااذافرضت الفریضة"،تم نہ مس کرو جب تک بغیر گناہ کے اور بغیر مطالبہ مہر کے مگر جبکہ مہر تم نے مقرر کیا ہو۔(یہی معنی مقصود ہے)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح البیان،جواہر طنطاوی کی تفسیر کے بھی مطابق ہے،اور قرطبی کی ایک تفسیر کے بھی مطابق ہے اور تفسیر ابی السعود کی دو تفسیروں میں سے ایک کے مطابق ہے۔

"وَمَتِّعُوْهُنَّ" اور ان کو نفع پہنچاؤ۔

یعنی جب تم نے مہر مقرر نہیں کیا اور طلاق جماع یا خلوت صحیحہ سے پہلے دے دی تو تم پر واجب ہے کہ ان کو نفع پہنچاؤ یعنی ان کو متعہ دو جو تین کپڑوں پر مشتمل جوڑا ہے۔

متعہ دینے میں حکمت:

"والحکمةفی ایجاب المتعة جبرایحاش الطلاق" (تفسیر ابی السعود)

متعہ دینے میں حکمت یہ ہے کہ مرد نے عورت کو طلاق دے کر اسے وحشت میں مبتلاء کر دیا ہے، جب اسے متعہ دیا جائے گا تو اس کی دلجوئی ہوگی، کچھ نہ کچھ اس کی تسلی ہوگی۔

سبحان اللہ! کیسا خوب معاشرہ تھا کہ بلاوجہ طلاق نہیں دی جاتی تھی، اگر کسی مجبوری کی وجہ سے طلاق دے دی جاتی تو پھر بھی اسلامی تعلق برقرار رکھا جاتا تھا، دونوں خاندان ایک دوسرے کے دشمن نہیں بن جاتے تھے، بلکہ ایک دوسرے سے اخوت اسلامیہ برقرار رہتی۔

خلوتِ صحیحہ کیا ہے؟

خلوت صحیحہ یہ ہے کہ مرد اور عورت علیحدہ ملکر بیٹھیں جہاں وطی کرنے سے کوئی مانع حسی اور مانع طبعی اور مانع شرعی نہ پائے جائیں۔

اگر دونوں میں سے کوئی ایک مریض ہو تو خلوت صحیحہ نہیں پائی گئی، کیونکہ مانع طبعی پایا گیا ہے، اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک روزہ دار ہو، روزہ بھی رمضان کا ہو، یا کسی ایک نے حج کا احرام باندھا ہوا ہے، خواہ حج فرضی ہو یا نفلی، یا عمرہ کا احرام باندھا ہوا ہے، یا عورت حیض میں مبتلا ہو تو ان صورتوں میں بھی خلوت صحیحہ نہیں پائی جاسکتی۔ کیونکہ یہاں مانع شرعی پایا گیا ہے۔

اور اگر دونوں کے پاس کوئی شخص ہو، خواہ بچہ ہی اتنی عمر کا ہو جس کے سامنے وطی کرنے میں انسان کو حیاء آتی ہو تو خلوت صحیحہ نہیں۔ کیونکہ مانع حسی پایا گیا ہے۔

خلوت صحیحہ میں اگرچہ جماع تو نہیں پایا جاتا لیکن احکام جماع والے جاری ہو جاتے ہیں۔

”عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ.“

غنی پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگ دست پر اس کی طاقت کے مطابق۔ یعنی خاوند پر متعہ دینا واجب ہے لیکن وہ کپڑوں کا جوڑا خاوند کی حیثیت کے مطابق ہو۔

اگر خاوند غنی ہو تو وہ اپنی طاقت کے مطابق وہ اچھے قیمتی کپڑے لے کر دے اور اگر تنگ دست ہو تو وہ اپنی طاقت کے مطابق کپڑے لے کر دے۔

"موسع" وسعت رکھنے والا۔ یعنی مالی وسعت رکھتا ہو۔ "مقتر" تنگی رکھنے والا۔ یعنی تنگ دست۔

قتر یقتر۔ کم کرنا، گھٹانا۔ "قدرہ علی قدر الامکان و الطاقة" یعنی جہاں تک ممکن ہو اور طاقت ہو۔

"مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ" نفع پہنچانا شرع کے مطابق۔

یعنی متعہ دینے میں شریعت کا پاس کیا جائے، نہ عورت پر ظلم ہو کہ خاوند اپنی حیثیت سے گھٹیا متعہ دے اور نہ خاوند پر ظلم ہو کہ خاوند سے اس کی حیثیت سے بڑھ کر متعہ کا مطالبہ کیا جائے۔

"حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ" واجب ہے احسان کرنے والوں پر۔

اس پر بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ متعہ دینا جب واجب ہے تو احسان کرنے والوں کے ذکر کا کیا مطلب ہے، کوئی احسان کرنے والا ہو یا نہ ہو، ہر حال میں واجب ہوگا۔

تو اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ محسنین بمعنی مؤمنین ہے۔ یعنی متعہ دینا مومنوں پر واجب ہے، کیونکہ احکام شرع مومنوں پر ہی واجب ہیں نہ کہ کافروں پر۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ محسنین کا معنی احسان کرنے والا ہی ہو، لیکن مطلب یہ ہوگا کہ احکام شرع پر عمل کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ ہیں جو احسان و بھلائی کرنے والے ہیں۔ (ماخوذ از خازن و مدارک)

فائدہ جلیلہ: ایک عورت سے نکاح کیا گیا لیکن مہر مقرر نہیں کیا اور وہ جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے فوت ہوگئی تو اسے مہر مثل دیا جائے گا، اور اس پر وفات کی عدت گذارنا لازم ہوگا، اور وہ وراثت کی حقدار ہوگی، اس مسئلہ پر حدیث پاک شاہد ہے۔

☆ "عن ابن مسعود انه سئل عن رجل تزوج امرأة لم يفرض لها و لم يدخل بها حتى مات، فقال ابن مسعود لها مثل صداق نسائها لا وكس و لا شطط، و عليها العدة و لها الميراث، فقام معقل بن

سنان الاشجعی فقال قضی رسول اللہ ﷺ فی بروع بن واشق امرأة منامثل الذی قضیت ففرح بهاابن مسعود.قال الترمذی حدیث ابن مسعود حدیث حسن صحیح"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور مہر مقرر نہیں کیا اور جماع بھی نہیں کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہو گیا (اس کا حکم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، میں اس مسئلہ میں اجتہاد کر کے بتاؤں گا۔ میرے پاس اس کے متعلق کوئی روایت تو نہیں، آپ نے ایک ماہ اجتہاد کرنے کے بعد بتایا) کہ اس عورت کو اس کی خاندانی عورتوں کے مہر کی طرح مہر (یعنی مہر مثل) دیا جائے، نہ اس میں کمی اور نہ زیادتی۔ اور اس پر عدتِ (وفات) لازم ہے، اور اس کے لئے وراثت بھی ہے۔ معقل بن سنان اشجعی کھڑے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارے خاندان کی ایک عورت بروع بنت واشق کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا، جیسا تم نے اس عورت کے متعلق فیصلہ کیا ہے۔ تو حضرت ابن مسعود بڑے خوش ہوئے۔ (از قرطبی)

خوش ہونے کی وجہ واضح ہے کہ آپ کا اجتہاد نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق ہو گیا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد کے بعد مسئلہ بتانے پر فرمایا ہی یہ تھا کہ یہ میرا اجتہاد ہے اگر یہ درست ہوا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا اور اگر درست نہ ہوا تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہوگا، جب آپ کے اجتہاد کو رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ سے تائید مل گئی تو آپ نے سمجھ لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوا۔

تنبیہ: "ومتعوھن" امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور "حقا علی المحسنین" میں "حقا" کا معنی بھی وجوب ہے۔ لیکن وجوب اسی خاص صورت میں ہے جس کا آیۃ کریمہ میں ذکر ہو رہا ہے۔

"المتعة واجبة للمطلقة قبل البناء والفرض ومندوبة فی حق غیرھا"

جس عورت کو جماع یا خلوت صحیحہ سے پہلے اور مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اسے متعہ دینا واجب ہے۔ دوسری مطلقات کو متعہ دینا مستحب ہے۔ تفصیل پہلے ذکر کر دی گئی۔

(ماخوذ از قرطبی)

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ بِيَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّكَاحِ ‌ؕ وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى ‌ؕ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ☆ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۷)

﴿۱﴾

اور اگر تم نے عورتوں کو بے چھوئے طلاق دے دی اور ان کے لئے کچھ مقرر کر چکے تھے تو جتنا ٹھہرا تھا اس کا آدھا واجب ہے مگر یہ کہ عورتیں کچھ چھوڑ دیں یا وہ زیادہ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیزگاری کے نزدیک تر ہے اور آپس میں ایک دوسرے پر احسان کو بھلا نہ دو بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

﴿۲﴾

اور اگر تم نے طلاق دی ان کو پہلے ان کو مس کرنے کے اس حال میں کہ تم نے مقرر کرلیا ہو ان کا مہر تو نصف (واجب ہے) جو تم نے مقرر کیا مگر یہ کہ وہ (عورتیں) معاف کردیں، یا زیادہ دے وہ شخص جس کے ہاتھ میں گرہ ہے نکاح کی، اور تمہارا معاف کرنا زیادہ قریب ہے تقوی کے اور نہ چھوڑو فضل (احسان و مہربانی) کو آپس میں، بیشک اللہ جو تم عمل کرتے ہو (انہیں) دیکھ رہا ہے۔

مختصر مطلب: اگر مرد نے عورت کو جماع کرنے سے پہلے طلاق دے دی اور مہر مقرر کیا ہوا تھا تو نصف مہر دینا واجب ہے۔ ہاں اگر عورت اپنا مہر معاف کردے تو وہ معاف کردے، اس کا معاف کرنا احسان و فضل ہے۔

اور اگر خاوند مہر زیادہ دے دے تو یہ اس کی طرف سے احسان ہے۔تمہارا معاف کرنا تقوی کے زیادہ قریب ہے۔تم آپس میں ایک دوسرے پر فضل و احسان کرنے کو نہ چھوڑو۔بیشک اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

''وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ''

اور تم ان (عورتوں) کو طلاق دو ان کو مس کرنے سے پہلے۔

یہاں ''مس کرنا'' جماع اور خلوت صحیحہ دونوں کو شامل ہے۔یعنی اگر تم اپنی عورتوں کو طلاق دو ان سے جماع کرنے سے پہلے اور اسی طرح ان سے خلوت صحیحہ سے پہلے۔

''وَقَدْفَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً'' اس حال میں کہ تم نے مقرر کرلیا ہو ان کا مہر۔

راقم نے جملہ حالیہ کا معنی تفسیر کبیر کے ان الفاظ سے ماخوذ کیا ہے۔

''قوله تعالىٰ ''وقدفرضتم لهن فريضة''حال من مفعول ''طلقتموهن'' والتقدير طلقتموهن حال مافرضتم لهن فريضة''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ''وقدفرضتم لهن فريضة'' حال واقع ہو رہا ہے ''طلقتموهن'' کے مفعول سے۔اس لئے حال کی صورت میں معنی یہ ہوگا۔اگر تم نے ان کو طلاق دی ان کو مس کرنے سے پہلے اس حال میں کہ تم نے مقرر کرلیا ہو ان کا مہر۔

''فريضة'' کا معنی اگرچہ ''مقرر کرنا'' ہے۔تاہم مراد اس سے ''مہر'' ہے۔جیسا کہ پہلی آیۃ کریمہ میں گذر چکا ہے۔

''فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ'' تو نصف (واجب) ہے جو تم نے مقرر کیا۔

یعنی جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے اس کا نصف دینا تم پر واجب ہے جب تم نے ان کو جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی۔

"اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ" مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کر دیں۔

اگر چہ آیۃ کریمہ میں تو نصف مہر کا ذکر ہے، اس لحاظ پر مفہوم یہ ہوگا کہ عورتیں جب نصف مہر لینے کی مستحق ہوں تو وہ اپنا مکمل حق معاف کر دیں یا اس میں سے کچھ حصہ معاف کر دیں، یہ ان کا حق ہے۔ بلکہ ان کا معاف کرنا احسان ہے، کیونکہ "ولاتنسوا الفضل" سے یہ مفہوم سمجھ آرہا ہے کہ آپس میں احسان کرنے کو نہ بھولو۔ یعنی عورت بھی وہ کام کرے جس میں احسان پایا جائے وہ یہی ہے کہ مہر معاف کر دے، اور مرد بھی وہ کام کرے جس میں احسان پایا جائے یعنی وہ مہر زیادہ دے۔

لیکن خیال رہے کہ "الاان یعفون" کا مفہوم اور بھی وسیع ہے کہ اگر وہ عورتیں بعد از مجامعت مکمل مہر لینے کی حقدار ہوں تو پھر بھی ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنا کل مہر یا بعض مہر معاف کر دیں۔

دینی طلبائے کرام توجہ فرمائیں:

"یعفون" جمع مذکر غایب کا بھی صیغہ ہے، اور جمع مؤنث غائب کا بھی۔ جب جمع مذکر غائب کا صیغہ ہوگا تو اصل میں "یعفوون" ہوگا، واؤ پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے ضمہ کو گرا دیا اور التقائے ساکنین کی وجہ سے ایک واؤ کو حذف کر دیا گیا تو "یعفون" ہو گیا۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ جمع مذکر غائب کے صیغہ میں "نون" اعرابی ہے جو نواصب و جوازم کے داخل ہوتے وقت حذف ہو جاتا ہے۔ اگر یہ مذکر کا صیغہ ہوتا تو "ان یعفوا" ہوتا۔

اور جب یہ "یعفون" جمع مؤنث غائب کا صیغہ ہو تو اصل میں یہ لفظ اس طرح تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یعنی جمع مذکر بروزن "ینصرون" کے ہوگا، اور جمع مؤنث بروزن "ینصرن" کے ہوگا۔

جب "یعفون" جمع مؤنث کا صیغہ ہوگا تو اس وقت "نون" ضمیر ہوگا، جو مبنی ہے اس لئے نواصب و جوازم کے وقت وہ برقرار رہے گا، حذف نہیں ہوگا۔

آیۃ کریمہ میں ''یعفون'' پر ''ان'' ناصبہ داخل ہے اور نون موجود ہے تو واضح ہوا کہ یہ صیغہ جمع مؤنث کا ہے، اس لئے اس کا معنی یہی ہوگا ''مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کردیں''۔

''**اَوْيَعْفُوَالَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ**'' یا زیادہ دے وہ جس کے ہاتھ میں گرہ ہے نکاح کی۔

جس کے ہاتھ میں گرہ نکاح کی، وہ کون ہے؟

اس میں دو قول ہیں۔ایک یہ کہ اس سے مراد ولی ہے۔اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد خاوند ہے۔

خاوند مراد ہونے کا قول حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن میبّب رضی اللہ عنہ اور کثیر صحابہ کرام اور کثیر تابعین کا ہے اور یہی قول حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

خاوند مراد ہونے پر دلائل:

﴿۱﴾ پہلی دلیل یہ ہے کہ ولی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی مولیہ (جس کی اسے ولایت حاصل ہے) کا مہر معاف کردے، خواہ اس کی مولیہ صغیرہ (چھوٹی) ہو یا کبیرہ (بڑی)۔

البتہ خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ مہر زیادہ دے دے، اس لئے ولی مراد لینا درست نہیں۔

﴿۲﴾ دوسری دلیل یہ کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔''**الذی بیدہ عقدۃ النکاح**'' یہ نہیں فرمایا'**عقد النکاح**'' ولی کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے وہ بھی اس وقت جب مولیہ صغیرہ نابالغہ ہو۔

یعنی ولی کو صغیرہ نابالغہ کا نکاح کر کے دینے کا حق ہے جسے عقد نکاح کہا جاتا ہے۔بعد میں نکاح کی گرہ ولی کے ہاتھ نہیں ہوتی بلکہ خاوند کے ہاتھ ہوتی ہے، خواہ وہ اسے برقرار رکھے یا طلاق وغیرہ کے ذریعے کھول دے۔

واضح ہوا کہ گرہ لگانا عقد ہے اور لگی ہوئی گرہ کو اپنے قبضہ میں رکھنا عقدہ۔ولی کے ہاتھ عقد ہے اور زوج کے ہاتھ عقدہ۔

﴿۳﴾ تیسری دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ''**الذی بیدہ عقدۃ النکاح**'' کا مطلب یہ ہے کہ جس

کے ہاتھ نکاح کی گرہ ثابت ہے۔ چونکہ نکاح کی گرہ ثابت زوج کے ہاتھ میں ہی ہے لہٰذا آیۃ کریمہ میں وہی مراد ہے۔ یہ ثابت ہونے والا معنیٰ اس آیۃ کریمہ میں بھی پایا گیا ہے۔ ''ونھی النفس عن الھوی فان الجنة ھی المأوی''

اس کا معنیٰ یہ ہے ''ونھی النفس عن الھوی الثابت له لالغیرہ کانت الجنة ثابتة له فتکون ماواہ'' (اور وہ شخص جس نے) اپنے نفس کو ان خواہشات سے روکا جو اس کے لئے ثابت ہیں نہ کہ اور کسی کے تو جنت اس کے لئے ثابت ہوگی اور اس کا ٹھکانا ہوگی۔

﴿۴﴾ چوتھی دلیل یہ ہے۔

''روی عن جبیر بن مطعم انه تزوج امرأة فطلقھاقبل ان یدخل بھافاکمل الصداق و قال انااحق بالعفو''

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک عورت سے نکاح کیا، اسے جماع (اور خلوت صحیحہ) سے پہلے ہی طلاق دے دی، انہوں نے عورت کو مکمل مہر دیا، اور کہا کہ میں عفو کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔

یعنی انہوں نے آدھا مہر دینا تھا لیکن کل مہر دے کر اسے عفو کہا اور یہ کہا کہ میں عفو کا حق زیادہ رکھتا ہوں۔

''وھذایدل علی ان الصحابة فھموامن الآیة العفوالصادرمن الزوج''

حضرت جبیر رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے واضح ہوا کہ صحابہ کرام نے اس آیۃ کریمہ سے یہی مراد لیا کہ جس کے ہاتھ میں گرہ ہے نکاح کی وہ زیادہ دے۔

نتیجہ واضح ہوا: کہ زوج نے اگر زوجہ کو مس کرنے سے پہلے طلاق دی اور مہر مقرر کیا گیا تھا تو نصف مہر دینا اس پر واجب ہے لیکن مکمل دے تو اسے حق حاصل ہے۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ یہ حکم بھی عام ہے۔ خاوند عورت کو طلاق دے یا نہ دے، خواہ جماع سے پہلے طلاق دے یا بعد میں، جو مہر مقرر کیا تھا اس سے زیادہ دے دے تو بہتر ہے۔ (از کبیر)

(اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بھی راقم کو مقصد کے بیان کے لئے خوب نظر آیا، اسی وجہ سے راقم نے بھی وہی نقل کیا ''یا وہ زیادہ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے'')

ولی مراد لینا:

جن حضرات نے آیۃ کریمہ میں ''الذی بیدہ عقدۃ النکاح'' مراد لیا ہے وہ حضرات حسن بصری، مجاہد، علقمہ اور امام شافعی رحمہم اللہ ہیں۔

اگر اس قول کو مقید کیا جائے ''مولیہ کی اجازت سے'' جیسا کہ تفسیر حقانی میں مقید کہا گیا تو یہ قول بھی درست ہو گا کہ عورت کا ولی عورت کی اجازت سے معاف کردے تو یہ اسے حق حاصل ہے۔ یہ معاف کرنا بھی اس کا حق ہے۔ لیکن اگر مقید نہ کیا جائے اور مطلب یہ مراد لیا جائے کہ ولی کو خود بخود معاف کرنے کا حق ہے تو یہ قول درست نہیں۔ اس پر دیئے جانے والے دلائل کمزور ہیں۔ زیادہ بحث کوئی دیکھنا چاہے تو کبیر میں دیکھ لے۔

زوج کا زیادہ مہر دینا عفو کیسے ہے؟

اس کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ اگرچہ بظاہر معنی معاف کرنا ہے۔

۱۔ اس کی ویک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس وقت عام رواج یہی تھا کہ نکاح کے وقت ہی تمام مہر ادا کر دیا جاتا تھا۔ جب مہر مقرر کر کے کل مہر ادا کر دیا پھر طلاق جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے دے دی گئی تو خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ آدھا مہر واپس کر لے، لیکن وہ آدھا مہر واپس نہ لے بلکہ معاف کر دے تو اس کے لئے یہ بہتر ہے۔ اس صورت کے لحاظ پر ''یعفو'' حقیقی معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مشاکلت کے طور پر زوج کے لئے بھی عفو کو استعمال کر لیا گیا ہے، کیونکہ زوجہ جب اپنا مہر معاف کر دے تو اس کا فائدہ زوج کو حاصل ہے یہاں تو عفو حقیقی معنی میں استعمال ہے، لیکن زوج زیادہ مہر دے اور زوجہ کو فائدہ پہنچائے تو مجازاً مشاکلت کے طور پر اسے بھی ''عفو'' سے بیان کر دیا گیا۔

﴿۳﴾ ''عفو'' کبھی بمعنی تسہیل کے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''فلان وجدالمال عفوا صفوا'' فلاں شخص نے مال آسانی سے حاصل کیا۔

آیۂ کریمہ میں بھی اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی اس معنی کے لحاظ پر ترجمہ یہ ہوگا ''اویعفوا الذی بیده عقدة النکاح'' یا آسانی پہنچادے (زیادہ مہر دے کر) وہ شخص جس کے ہاتھ میں گرہ ہے نکاح کی۔

''وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی'' اور تمہارا معاف کرنا زیادہ قریب ہے تقویٰ کے۔

ان الفاظ کا ترجمہ اعلی حضرت رحمہ اللہ نے یوں کیا ہے ''اور اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے''۔ اعلی حضرت رحمہ اللہ کا یہ ترجمہ ظاہری الفاظ کے مطابق ہے، کیونکہ ''ان تعفوا'' مذکر کا صیغہ ہے۔

اور ممکن ہے کہ اعلی حضرت رحمہ اللہ نے تفسیرات احمدیہ کی اس عبارت کو مدنظر رکھا ہو۔

''وفی قرأة ابونهیک ''وان یعفوا بالیاء، کماصرح به فی الکشاف''

ابونہیک کی قرأۃ میں ''وان یعفوا (یا کے ساتھ) اقرب للتقوی ہے۔ کشاف نے بھی اسی کی وضاحت کی ہے کہ یہ حکم خاوندوں کو ہے کہ اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیزگاری کے قریب تر ہے۔

راقم نے اپنے ترجمہ میں ''اے مردو'' کا ذکر نہیں کیا۔ اور ''عفو'' کا معنی بھی معاف کرنا کیا ہے۔ اس کی وجہ تفسیر کبیر کی مندرجہ ذیل عبارت ہے۔

''هذا خطاب للرجال والنساء جمیعا. الاان الغلبة للذکور اذا اجتمعوا مع الاناث. و سبب التغلیب ان الذکورة اصل والتانیث فرع اللفظ وفی المعنی. امافی اللفظ فلانک تقول ''قائم'' ثم تریدالتانیث فتقول ''قائمة'' فاللفظ الدال علی المذکر هو الاصل. والدال علی المؤنث فرع علیه. واما فی المعنی فلان الکمال للذکور والنقصان للاناث فلهذا السبب متی اجتمع التذکیر والتانیث کان جانب التذکیر مغلبا. (کبیر)

''وان تعفوا'' میں خطاب مذکر اور مؤنث دونوں کو ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اے مردو تمہارا زیادہ دینا اور اے عورتو تمہارا معاف کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

البتہ صیغہ مذکر کا ذکر ہے تغلیب کے طور پر، یعنی جب مذکر اور مؤنث کا ذکر ایک ہی صیغہ سے کرنا ہو تو وہاں صیغہ مذکر کا ذکر کیا جاتا ہے، کیونکہ مذکر کا صیغہ اصل ہے لفظاً بھی اور معنیً بھی۔

لفظی طور پر اصل ہونے کی وجہ واضح ہے کہ پہلے مذکر کا صیغہ "قائم" ذکر کیا جاتا ہے، جب تانیث کا ارادہ کریں تو مذکر کے صیغہ سے ہی تاء تانیث بڑھا کر "قائمة" بنالیا جاتا ہے۔

واضح ہوا کہ مذکر کا صیغہ لفظ کے لحاظ پر اصل ہے اور مؤنث کا صیغہ اس کی فرع ہے کیونکہ اسی سے بنتا ہے۔ معنوی طور پر بھی مذکر میں کمال پائے جانے کی وجہ سے مذکر اصل ہے اور مؤنث میں نقصان پائے جانے کی وجہ سے وہ فرع ہے۔

اسی وجہ سے مذکر و مونث جب جمع ہو جائیں تو تغلیبی طور پر صیغہ مذکر کا استعمال ہوگا۔ (از کبیر)

تنبیہ: تفسیر کبیر کے مطابق ہی تفسیر قرطبی، روح المعانی اور حسینی میں بھی مذکور ہے۔

تقوی کے قریب ہونے کی دو وجہ:

ایک وجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنا حق چھوڑنے کی سخاوت کرے وہ محسن ہے، جو شخص محسن ہے وہ مستحق ثواب ہے، اور جو شخص مستحق ثواب ہوگا وہ یقیناً عذاب سے محفوظ رہے گا۔ یہ وجہ تقوی کے قریب ہونے کی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے پر احسان کرنا ترک ظلم کا سبب ہے، ترک ظلم ہی حقیقت میں تقوی کا سبب ہے۔ اس لئے کہ جو شخص کسی پر فضل و احسان کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو مان کر ہی احسان کرتا ہے، وہ دوسرے پر ظلم نہیں کرتا، یہی تقرب الٰہی کا سبب ہے۔ (از کبیر)

"وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ" اور نہ چھوڑو فضل (احسان و مہربانی) کو آپس میں۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "ولا تنسوا" کا حقیقی معنی مراد لیا ہے۔ آپ کا ترجمہ یہ ہے "اور آپس میں ایک دوسرے کو نہ بھلا دو"۔

راقم نے مجازی ترجمہ کیا ہے، جو تفسیر کبیر کی مندرجہ ذیل عبارت سے ماخوذ ہے۔

"ولیس المرادمنه النهی عن النسیان لان ذلک لیس فی الواسع،بل المرادمنه الترک،

فقال اللہ تعالی ولاتترکوا الفضل والافضال فیمابینکم"

یہاں بھولنے سے نہی نہیں پائی گئی۔ کیونکہ نہ بھولنا کسی کے اختیار میں نہیں۔ بلکہ مراد ترک کرنے سے نہی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی کا مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے پر احسان کرنے کو نہ چھوڑو۔

اس حکم کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب عورت سے مرد نے نکاح کیا تو عورت کا دل اس سے معلق ہو گیا، پھر جب جماع سے پہلے اسے طلاق دے دی گئی تو اسے اذیت پہنچائی گئی۔

اور مرد کو جب بغیر نفع حاصل کرنے کے آدھا مہر دینے کا حکم دیا گیا تو یہ اس کے لئے اذیت کا سبب بنا اس لئے ہر ایک کو دوسرے پر مہربانی کرنے کا حکم دیا تا کہ قلبی تکلیف دور ہو سکے۔ (از کبیر)

"اِنَّ اللّٰہَ بِمَاتَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ" بیشک اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

یعنی جو تم نیک عمل کرو گے،ایک دوسرے پر فضل واحسان کرو گے وہ ضائع نہیں جائیں گے،تمام کام اللہ تعالیٰ پر کامل طور پر منکشف (واضح) ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نظر عطا فرمائی ہے تا کہ بندہ یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نظر عطا فرمائی ہے،جس کے ذریعے مجھے اس کی نشانیاں دیکھنی چاہیں،اور ایسے عمل کروں کہ میری نظر میں ملکوت اور سماوات کے عجائب آ جائیں،اور جب انسان یہ سمجھے گا کہ مجھے رب تعالیٰ نے نظر اور کان عطا کئے تو وہ اپنی نظر کو کوتاہ نہیں کرے گا بلکہ اپنے نیک اعمال کے ذریعے اپنی نظر کو بلند کرے گا،اور یہ تصور کرے گا کہ جب رب تعالیٰ بصیر ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، تو رب تعالیٰ نے مجھے بھی بصر عطا کی ہے،وہی میری بصارت کو بھی وسعت عطاء کرے گا،جہان کی مخفی چیزیں اسی کی قدرت کاملہ سے مجھے بھی نظر آئیں گی۔ (ماخوذ از روح البیان)

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۸)

﴿۱﴾

نگہبانی کرو سب نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے حضور ادب سے۔

﴿۲﴾

ہمیشہ حفاظت کرو تمام نمازوں کی اور درمیانی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے لئے اطاعت کرتے ہوئے۔

ماقبل سے رابطہ:

اللہ تعالیٰ نے مکلفین کے لئے دین کے احکام بیان فرمائے، شرعی مسائل کی وضاحت بیان فرمادی پھر ان کو نمازوں کی حفاظت کا حکم دیا، اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

پہلی وجہ:

یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان شرعی احکام پر اس وقت عمل کر سکتا ہے جبکہ وہ عجز اختیار کرے اور سرکشی کو دور کردے، نماز میں قراءت وقیام، رکوع وسجود، خضوع وخشوع کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ ان پر عمل اسی وقت کرے گا جب اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا رعب پایا جائے گا، اور اس کی طبیعت سے سرکشی کا زوال ہوگا، اللہ تعالیٰ کے اوامر پر عمل کرنے کے لئے اسے اطاعت حاصل ہوگی اور نواہی سے دور رہے گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط" بیشک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

دوسری وجہ:

یہ ہے کہ نمازی جب نماز میں "مالک یوم الدین" پڑھتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ ذات

ہے جسے جلال حاصل ہے، اور وہی باکمال ہے، اسے زوال نہیں کیونکہ جزاء کے دن کا وہی مالک ہے۔ اور جب "ایاک نعبد" پڑھتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ میں عاجز ہوں، میں اسی کا بندہ ہوں، میں سراپا نقصان ہوں مجھے زوال ہے، اسی لئے تو میں رب تعالیٰ کی عبادت کر رہا ہوں۔

پھر "ایاک نستعین" سے اور ہی زیادہ اسے پتہ چل جاتا ہے کہ میری امداد کرنے والا اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی نہیں اگر کسی اور نے امداد کرنی بھی ہے تو رب تعالیٰ کی توفیق سے امداد کرنی ہے۔ پھر "اھدنا الصراط المستقیم" سے لے کر "ولا الضالین" جب پڑھتا ہے تو اسے پتہ چل جاتا ہے کہ ثواب و عذاب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

فعندذلک یسھل علیه الانقاد للطاعة ولذلک قال تعالیٰ "استعینوا بالصبر و الصلوة"

جب انسان کو علم حاصل ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر اسے سر جھکانا آسان ہو جائے گا۔

اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا "استعینوا بالصبر و الصلوة" صبر اور نماز سے امداد طلب کرو۔

تیسری وجہ:

یہ ہے کہ پہلے جو احکام ذکر کئے گئے ہیں یعنی نکاح، طلاق اور عدت ان مسائل کا تعلق دنیاوی مصلحت سے تھا اب اس آیہ کریمہ میں نماز کا ذکر فرمایا جس کا تعلق اخروی مصلحت سے ہے۔

گویا کہ پہلے بیان کئے گئے تیرہ احکام کا تعلق دنیا سے ہے اور اس آخری چودھویں حکم کا تعلق آخرت سے ہے۔ جس طرح دنیا کی انتہا آخرت ہے، اسی طرح دنیاوی احکام کے بیان کی انتہا اخروی حکم کے بیان سے کر دی گئی۔

(از کبیر متصرف)

پانچ نمازوں پر شاندار دلیل:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی "حٰفظوا علی الصلوٰت" (حفاظت کرو نمازوں کی) میں لفظ "صلوٰت" جمع

ہے اور جمع کے تین فرد ہوتے ہیں۔ اس کے بعد "والصلوۃ الوسطی" ذکر کیا ہے، جو تین افراد سے ایک زائد ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اگر تین فردوں سے ایک فرد کے زیادہ ہونے پر دلالت نہ کرے تو تکرار لازم آئے گا، حالانکہ اصل یہی ہے کہ تکرار مراد نہ ہو بلکہ علیحدہ علیحدہ معنی مراد ہو۔ پھر چار نمازیں مراد نہیں ہوسکتیں کیونکہ چار میں ایک درمیانی نہیں ہوسکتی، لہذا جمع میں ایک فرد اور بڑھایا جائے گا، اس طرح پانچ نمازیں ثابت ہوں گی، جن میں سے درمیانی نماز کا ثبوت بھی ممکن ہوگا۔ (از کبیر)

نمازوں کے اوقات کا ثبوت قرآن پاک سے:

تفسیر کبیر میں اسی مقام پر ذکر کیا گیا ہے کہ اگرچہ اس آیۃ مبارکہ سے یہ تو ثابت ہے کہ نمازیں پانچ ہیں، لیکن نمازوں کے اوقات کا ثبوت اس آیۃ سے نہیں بلکہ اور آیات سے اوقات کا ثبوت ہے۔

"**فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون وله الحمد فی السماوات والارض وعشیا وحین تظهرون**"

تو اللہ کی پاکی بولو جب شام کرو اور جب صبح ہو، اور اسی کی تعریف ہے آسمانوں اور زمین میں اور کچھ دن باقی رہے اور جب تمہیں دوپہر ہو۔

اس آیۃ کریمہ میں "**تمسون**" سے مراد مغرب اور عشاء کا وقت ہے، اور "**تصبحون**" سے مراد صبح کی نماز ہے، اور "**عشیا**" سے مراد عصر کی نماز ہے، اور "**حین تظهرون**" سے مراد ظہر کی نماز ہے۔ "**سبحان اللہ**" اور "**وله الحمد**" سے مراد نماز ہی ہے۔

"**اقم الصلوۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشهودا**"

نماز قائم رکھو سورج ڈھلنے سے رات کی اندھیری تک، اور صبح کا قرآن، بیشک صبح کے قرآن میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات اندھیری ہو جانے تک نماز پڑھنے کا حکم ہوا جس میں چار نمازوں (ظہر، عصر، مغرب اور عشاء) کا ذکر ہو گیا، اور "قرآن الفجر" میں صبح کی نماز (فجر) کا ذکر ہے۔ کیونکہ صبح کی نماز میں رات والے فرشتے کراماً کاتبین بھی حاضر رہتے ہیں نماز ادا کر کے جاتے ہیں اور دن والے بھی صبح کی نماز میں آ جاتے ہیں وہ بھی نماز ان کے ساتھ ہی ادا کرتے ہیں۔

"اقم الصلوة طرفی النهار وزلفا من اللیل"

نماز قائم کرو دن کی دونوں طرفوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔

دن کی دونوں طرفوں میں تین نمازیں (فجر، ظہر، عصر) آ گئیں کیونکہ دن کی ابتدائی طرف میں فجر آ گئی، اور دن کی آخری طرف میں ظہر اور عصر آ گئیں، اس لئے سورج کے ڈھل جانے پر شام کی طرف شروع ہو جاتی ہے۔

"حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ" ہمیشہ نمازوں کی حفاظت کرو۔

یہاں راقم نے اپنے ترجمہ میں لفظ "ہمیشہ" ذکر کیا ہے، یعنی "ہمیشہ نمازوں کی حفاظت کرو"۔ یہ ترجمہ روح المعانی کی اس عبارت سے ماخوذ ہے۔

"حفظوا علی الصلوت" داوموا علی ادائها لاوقاتها من غیر اخلال کماینبئی عنه صیغة المفاعلة المفیدة للمبالغة.

ہمیشہ تمام نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرو، ان میں کوئی خلل واقع نہ ہونے دو، جیسا کہ مفاعلہ کا صیغہ اس معنیٰ کی خبر دے رہا ہے، کیونکہ مفاعلہ مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے۔ (روح المعانی)

"حفظوا" ای داوموا و اظبوا "ہمیشہ حفاظت کرو" (خازن)

مفکرِ اسلام، مفسرِ قرآن پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہاں قرآن کے الفاظ غور طلب ہیں "حٰفظوا علی الصلوات" فرمایا "احفظوها" نہیں فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مفاعلہ کا صلہ علیٰ آ جائے تو اس وقت اس کے معنی بار بار اور علی الدوام کرنے کے ہوتے ہیں (المنار) یہاں بھی مقصد یہی بتانا ہے کہ بار بار ہمیشہ نماز ادا کرتے رہو یہ نہیں کہ ایک بار نماز ادا کر لی اور ہفتہ بھر کے لئے چھٹی مل گئی۔ (ضیاء القرآن)

محافظت جو معتبر ہے:

نماز کی محافظت کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے مراد نماز کی بمع جمیع شرائط کے محافظت کرنا، یعنی بدن اور کپڑے اور نماز کی جگہ کا پاک ہونا، ستر عورت (ننگیز ڈھانپنا) قبلہ کا استقبال، اور نماز کی حفاظت اس کے ارکان کی حفاظت کے ساتھ کرے، اور نماز توڑ دینے والی چیزوں سے بچا کر حفاظت کرنا مقصود ہے، خواہ اعمال قلب ہوں، زبان کے اعمال ہوں یا ظاہری اعضاء کے اعمال ہوں۔

نماز کے اہم امور میں سے نیت ہے، اسلئے نیت کی حفاظت کرنا بھی نماز کا مقصد اصلی ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ''واقم الصلوة لذکری'' (اور نماز ادا کرو میری یاد کے لئے)

''فمن ادی الصلوة علی هذا الوجه کان محافظا علی الصلوة والا فلا''

جس شخص نے نماز اس طرح ادا کی اس نے نماز کی حفاظت کی ورنہ اس نے نماز کی حفاظت نہیں کی

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

''حافظوا'' باب مفاعلہ ہے اور مفاعلہ شرکتِ جانبین کو چاہتا ہے، جیسے کہا جائے ''خاصم شاهد حامدا'' تو اس کا معنی ہے شاہد نے حامد سے اور حامد نے شاہد سے جھگڑا کیا۔

آیۃ کریمہ میں جانبین کا معنی کیسے پایا گیا؟ اس کے کئی جواب دیئے گئے۔

ایک جواب یہ ہے کہ شرکت کا معنی پایا جانا ہمیشہ لازم نہیں کیونکہ کبھی بغیر شرکت کے معنی کے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے کہا جائے ''عاقب الحاکم اللص'' حاکم نے چور کو سزا دی۔ یہاں شرکت کا معنی نہیں پایا گیا، یہ کہنا درست نہیں کہ چور نے حاکم کو سزا دی۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں جانبین والا معنی پایا گیا ہے، اس میں پھر دو صورتیں پائی گئی ہیں، ایک یہ ہے کہ محافظت رب تعالیٰ اور بندے کے درمیان مراد ہے گویا کہ یہ کہا گیا ہے۔

" احفظ الصلوة لیحفظک اللہ الذی امرک بالصلوۃ"

تم نماز کی حفاظت کرو تا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے جس نے تمہیں نماز کا حکم دیا ہے۔

یہ حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ "فاذکرونی اذکرکم" (تو تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا) میں پایا گیا ہے، اور جیسا کہ اس حدیثِ پاک میں پایا گیا ہے "احفظ اللہ یحفظک" تم اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت کرو، وہ تمہاری حفاظت کرے گا۔

دوسری صورت جانبین والے معنی کی یہ ہے کہ نمازی اور نماز کے درمیان محافظت مراد ہے، اس میں تین وجوہ پائی گئی ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ تم نماز کی حفاظت کرو اور نماز تمہاری گناہوں سے حفاظت کرے گی، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر" بیشک نماز روکتی ہے بے حیائی اور برے کاموں سے، یعنی مطلب یہ ہو گیا "فمن حفظ الصلوۃ حفظتہ الصلوۃ عن الفحشاء" جس شخص نے نماز کی حفاظت کی نماز اسے بے حیائی سے روکنے کی حفاظت کرے گی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تم نماز کی حفاظت کرو نماز تمہیں مصیبتوں سے بچانے کی حفاظت کرے گی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "واستعینوا بالصبر والصلوۃ" اور امداد طلب کرو صبر اور نماز سے۔

اور رب تعالیٰ کا ارشادِ گرامی یہ ہے۔

"وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوۃ واتیتم الزکوۃ"

اور اللہ نے کہا بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نے نماز قائم کی اور تم نے زکوٰۃ دی۔

"و معناہ انی معکم بالنصرۃ والحفظ ان کنتم اقمتم الصلوۃ واتیتم الزکوۃ"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے نماز ادا کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی حفاظت کی تو میں تمہاری امداد کروں گا اور تمہاری حفاظت کروں گا، یعنی تمہیں مصیبتوں اور تکالیف سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ

نماز ہوگی، جس کی وجہ سے میں تمہاری حفاظت کروں گا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تم نماز کی حفاظت کرو، نماز تمہاری حفاظت کرے گی یعنی تمہاری شفاعت کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"واقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وماتقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عنداللہ"

اور تم نماز قائم کرو اور زکوۃ دو اور جو تم نے اپنے نفسوں کے لئے بھلائی کو آگے بھیجا تم اسے اللہ کے ہاں پالو گے۔

اور نماز میں قراءت بھی ہے، اور قرآن پاک شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

"انہ تجی البقرۃ وال عمران کانھماعما متان فیشھدان و یشفعان"

بیشک سورۃ بقرہ اور آل عمران (قیامت کے دن) آئیں گی، گویا کہ وہ پگڑیوں کی طرح چھا جائیں گی (پڑھنے والے کے لئے) گواہی دیں گی اور اس کیلئے شفاعت کریں گی۔

اور حدیث شریف میں ہے۔

"سورۃالملک تصرف عن المتھجدبھاعذاب القبراتجادل عنہ فی الحشروتقف فی الصراط عند قدمیہ وتقیل للنا ر لا سبیل لک علیہ"

سورہ ملک رات کو پڑھنے والے کو عذاب قبر سے بچائے گی اور حشر میں اس کی طرف سے جھگڑا کرے گی اور پل صراط سے گذرنے میں اس کی معاونت کرے گی، اور جہنم کی آگ کو کہے گی کہ تمہیں اس شخص سے کوئی واسطہ نہیں۔ (ماخوز از کبیر بزیادۃ)

ترکِ نماز پر وعید اور اقوال آئمہ:

کوئی شخص جان بوجھ کر نماز چھوڑ دے تو حضرت امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ کافر ہو گیا، اور امام شافعی

امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کی ایک روایت کے مطابق وہ کافر تو نہیں ہوگا کیونکہ اگر وہ توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوگی، اور اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے قتل تو نہیں کیا جائے گا البتہ اسے قید کر لیا جائے، یا وہ توبہ کرے یا قید میں ہی مر جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے احادیث کے ظاہر مطالب کو دیکھ کر کفر کا ایک قول کیا ہے، اور دوسرے آئمہ کرام نے ان احادیث کی تاویل بیان کی ہے۔ وہ احادیث یہ ہیں۔

☆ عن جابر قال قال رسول اللہ ﷺ بین العبد وبین الکفر ترک الصلوۃ۔ (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن بندے اور کافر کے درمیان فرق نماز کا چھوڑنا ہے۔

☆ عن بریدہ قال قال رسول اللہ ﷺ العھد الذی بیننا وبینھم ترک الصلوۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ (رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہمارے اور ان کے درمیان عہد ہے نماز کے چھوڑنے تک، جس شخص نے نماز کو چھوڑ دیا وہ کافر ہو گیا۔

☆ عن عبداللہ بن عمرو عن النبی ﷺ انہ ذکر الصلوۃ یوما فقال من حافظ علیھا کانت لہ نوراو برھانا ونجاۃ یوم القیامۃ ومن لم یحافظ علیھا لم یکن لہ نور ولا برھان ولا نجاۃ وکان یوم القیامۃ مع قارون وفرعون وھامان وابی بن خلف۔ (رواہ احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ایک دن نماز کا ذکر فرمایا، پھر ارشاد فرمایا جس شخص نے نماز کی حفاظت کی نماز اس کیلئے قیامت کے دن نور، برہان اور نجات ہوگی، اور جس شخص نے نماز کی حفاظت نہ کی اسے قیامت کے دن کوئی نور، برہان اور نجات حاصل نہیں ہوں گے، وہ شخص قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

جمہور آئمہ کرام،علماء ربانیین نے یہ بیان کیا ہے کہ ایمان کے بعد نماز کا ذکر عطف سے عام آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ میں ہے،اور عطف مغائرت کو چاہتا ہے،اس لئے نماز عین ایمان نہیں کہ ترکِ نماز سے ایمان ضائع ہو جائے اور کفر آ جائے ، بلکہ گناہ کبیرہ لازم ہوگا۔

ان احادیث کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے۔

''وحاصل هذه الاحاديث ان امر الصلوة اشد من سائر الاحكام والعبادات فمن تركها فكانه كفر اوالمعنى انه من تركها استخفافا فقد كفر والله اعلم''

ان احادیث سے یہ حاصل ہوا کہ نماز کا معاملہ تمام احکام وعبادات سے زیادہ سخت ہے،جس نے نماز کو چھوڑا گویا کہ وہ کافر ہوا، یعنی اگر چہ کافر تو نہیں ہوا لیکن کافروں کے مشابہ ہو گیا،البتہ اس نے نماز کو حقیر اور گھٹیا سمجھ کر ''معاذ اللہ'' چھوڑ دیا تو وہ کافر ہو گیا۔

نماز کی فضیلت:

نماز کی فضیلت بہت سی احادیث سے ثابت ہے، پہلے پارہ میں ذکر کر دیا گیا ہے،البتہ اسی مقام میں قاضی محمد ثناء اللہ رحمہ اللہ نے دو حدیثوں کا ذکر کیا ہے،ان کو ہی بطور تبرک ذکر کیا جارہا ہے۔

☆ عن ابی هريرة قال قال رسول الله ا ارأيتم لو ان نهرا بباب احدكم يغتسل فيه كل يوم خمسا هل يبقى من درنه شئى قالوا لا يبقى من درنه شئى قال فذلک مثل الصلوات الخمس يمحو الله بهن الخطايا. (رواه مسلم و بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے کہ تم میں سے کسی شخص کے دروازہ کے پاس نہر ہو اور وہ اس میں ہر دن پانچ مرتبہ غسل کرے، کیا اس پر کوئی میل رہ جائے گی؟ صحابہ کرام نے عرض کیا اس پر کوئی میل باقی نہیں رہے گی۔آپ نے فرمایا پانچ نمازوں کی یہی مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

☆ وعن عبادة ابن الصامت قال قال رسول الله ا خمس صلوات افترضهن الله تعالٰى من

احسن وضوء هن وصلا هن لو قتهن واتم رکوعهن وخشوعهن کان له علی الله عهدا ان یغفرله ومن لم یفعل فلیس علی الله عهدان شاء غفرله وان شاء عذابه.

(رواه احمد وابو داود وروی مالک و النسائی نحوه)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہیں جس شخص نے ان کیلئے اچھا وضوء کیا اور ان کو اپنے اپنے اوقات میں ادا کیا، اوران کا کامل رکوع کیا اور خشوع سے ادا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر وعدہ لازم کرلیا کہ وہ اس کی مغفرت فرمائے گا، اور جس شخص نے ایسا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ پر کوئی وعدہ نہیں، ہاں اگر چاہے تو مغفرت فرمادے اور چاہے تو عذاب دے۔

جمہور حضرات نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ترک نماز کفر نہیں، ورنہ حدیث شریف میں یہ نہ آتا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو مغفرت فرمادے۔ (از مظہری)

نمازِ وسطیٰ:

(درمیانی نماز) ایک وجہ پہلے کبیر کے حوالہ سے بیان ہوئی کہ "صلوات" سے مراد اور نمازیں ہیں، اور "وسطیٰ" سے مراد اور نماز ہے تاکہ تکرار لازم نہ آئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تخصیص بعد از تعمیم پائی گئی، یعنی "الصلوات" میں الف لام استغراقی ہے تمام نمازوں کی حفاظت کرو پھر خصوصی طور پر درمیانی نماز کی حفاظت کا حکم دے کر تخصیص پیدا کی گئی، یعنی خصوصی طور پر درمیانی نماز کی اور ہی زیادہ حفاظت کرو۔ (زیادہ تاکید کی وجہ ان شاء اللہ آگے ذکر ہوگی)

درمیانی نماز سے مراد کون سی نماز ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں۔

درمیانی نماز سے مراد نمازِ فجر:

"الصلوة الوسطیٰ" سے مراد فجر کی نماز ہے، یہ قول حضرت عمر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس،

حضرت معاذ، حضرت جابر، حضرت عطاء، حضرت عکرمہ، حضرت مجاہد، حضرت ربیع بن انس (رضی اللہ عنہم) کا ہے، اور یہی قول امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا بھی ہے۔

خیال رہے کہ بعض حضرات کے مختلف اقوال ہیں، دوسری نماز کے متعلق مذکورہ بالا اسماء میں سے پھر کسی کا نام آ جائے تو تعارض نہیں ہوگا بلکہ مراد یہ ہوگی کہ درمیانی نماز یہ بھی ہے اور اس کے بغیر اور بھی ہے۔

عن مالک انه بلغه ان علی بن ابی طالب و ابن عباس کانا یقو لان الصلوة الو سطی صلوة الفجر. (اخرجه مالک فی المؤطا)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھ تک روایت پہنچی ہے کہ بیشک حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ درمیانی نماز سے مراد نماز فجر ہے۔

ترمذی نے بھی حضرت ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہما سے تعلیقاً یہی روایت ذکر کی ہے۔

فجر کی نماز کو درمیانی نماز کہنے پر ایک اور دلیل یہ ہے کہ دن کی دو نمازیں یعنی ظہر و عصر جمع ہیں یعنی آگے پیچھے ہیں، اور رات کی دو نمازیں یعنی مغرب اور عشاء جمع ہیں، فجر کی نماز کے ساتھ کوئی اور نماز جمع نہیں تو فجر کی نماز کو درمیانی نماز کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو جمع کے درمیان واقع ہے۔

صبح کی نماز کو درمیانی نماز کہنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اس نماز کو ادا کرنا بہت مشکل ہے، سردیوں کا صبح شدید سردی میں وضوء کرنا بہت دشوار ہے۔ اور گرمیوں میں صبح کی نماز کے وقت میٹھی نیند آ رہی ہوتی ہے، اعضاء میں سستی طاری ہوتی ہے، اونگھ کی کثرت ہوتی ہے اور لوگ اس سے غافل ہوتے ہیں، اسلئے اس نماز کو ادا کرنے کا خصوصی حکم دیا گیا کہ یہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔

اس کے بعد "**وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ**" ذکر فرمایا، قنوت کے کئی معانی ہیں، ان میں سے ایک لمبا قیام ہے، اور فجر میں بنسبت دوسری نمازوں کے قراءت لمبی ہوتی ہے جس کی وجہ سے قیام بھی لمبا ہوتا ہے، صبح کی نماز کو درمیانی نماز کہنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

"وقرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشهودا" اور صبح کا قرآن، بیشک صبح کے قرآن میں فرشتے

حاضر ہوتے ہیں، یعنی صبح کی نماز میں رات اوردن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں، صبح کی نماز رات والے فرشتوں کے دیوان میں بھی لکھی جاتی ہے اور صبح والے فرشتوں کے دیوان میں بھی۔ (خازن)

درمیانی نماز سے مراد ظہر کی نماز:

اقوال صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ درمیانی نماز سے مراد ظہر کی نماز ہے، یہ قول زید بن ثابت اور اسامہ بن زید اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم کا ہے اور ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی کے مطابق آتی ہے، اور یہی قول عبید اللہ بن شداد رضی اللہ عنہ کا بھی ہے، اور یہی روایت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی بھی ہے، اس پر یہ روایات بھی دلالت کررہی ہیں۔

☆ "عن زید بن ثابت وعائشة قالا الصلوة الوسطى صلوة الظهر"
(اخرجه مالک فی الموطأ عن زید والترمذی عنهما تعليقا)

حضرت زید بن ثابت اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں درمیانی نماز سے مراد ظہر کی نماز ہے۔

ظہر کی نماز ادا کرنے میں مشقت پائی جانے کی وجہ سے اسے درمیانی نماز کہا گیا ہے اور ادا کرنے کی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

☆ "عن زید قال کان رسول اللہ ﷺ یصلی الظهر بالها جرة ولم یكن یصلی صلوة اشد علی اصحاب رسول اللہ ﷺ"

حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز تیز گرمی میں ادا فرماتے تھے، صحابہ کرام پر اس سے زیادہ کوئی نماز شدید مشقت والی نہیں تھی۔

اسی وجہ سے اس نماز کو درمیانی نماز کہا گیا ہے اور اس کے ادا کرنے اور حفاظت کرنے کی خصوصی تاکید کی گئی ہے۔ (خازن)

درمیانی نماز سے مراد نماز عصر:

یہ قول حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوایوب، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن

عباس، حضرت ابو سعید خدری اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور یہی قول ابو عبیدہ سلمان، حسن بصری، ابراہیم نخعی، قتادہ، ضحاک، کلبی، مقاتل رحمہم اللہ کا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے، اور امام احمد، داود اور ابن منذر رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے، ترمذی نے کہا کہ یہ قول اکثر صحابہ کرام کا ہے اور ان کے بعد آنے والے اہل علم اکثر حضرات کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے، اس میں احادیث مبارکہ مروی ہیں۔

"عن ابن مسعود قال حبس المشركون رسول الله ﷺ عن صلوة العصر حتى احمرت الشمس او اصفرت فقال رسول الله ﷺ شغلونا عن الصلوة الوسطى صلوة العصر ملأ الله اجوافهم وقبورهم نارا، او حشا الله اجوافهم وقبورهم نارا" (مسلم)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو عصر کی نماز سے پھیرے رکھا یہاں تک کہ سورج سرخی مائل یا زردی مائل ہو گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور قبروں کو آگ سے بھر دے انہوں نے ہمیں درمیانی نماز یعنی نماز عصر سے روکے رکھا۔

ایک روایت میں "ملأ" اور ایک روایت میں "حشا" ہے، معنی دونوں لفظوں کا ایک ہی ہے "بھرنا" یہ واقعہ یوم احزاب کا ہے، تمام کفار جمع ہو کر مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہو گئے تھے، خندق کھود کر ان کا دفاع کیا گیا، اس موقع پر نماز عصر بھی خندق کھودنے کی مشغولیت کی وجہ سے رہ گئی تھی۔

خیال رہے کہ اسی قسم کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جو بخاری و مسلم نے تخریج کی ہے اور اسی قسم کی روایت ترمذی میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی گئی ہے، ترمذی میں ہی اسی قسم کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

"عن ابی یونس مولی عائشة قال امرتنی عائشة ان اكتب لها مصحفا وقالت اذا بلغت هذه الآية فآذنی "حافظوا على الصلوات والصلوة الوسطى" قال فلما بلغتها آذنتها فاملت علی حافظوا علی الصلوات والصلوة الوسطى وصلوة العصر وقوموا لله قانتين قالت عائشة سمعتها من رسول الله ﷺ، ويروى عن حفصة نحو ذلك" (مسلم)

حضرت ابو یونس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قرآن پاک کا ایک نسخہ لکھوایا، اور مجھے فرمایا کہ جب تم "حافظوا علی الصلوات والصلوة الوسطی" آیۃ پر پہنچو تو مجھے بتانا، جب میں اس آیۃ پر پہنچا تو میں نے آپ کو بتایا، تو آپ نے مجھ سے لکھوایا "حافظوا علی الصلوات والصلوة الوسطی وصلوة العصر وقوموا للّٰہ قانتین" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی سنا ہے، اور اسی طرح حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔

خیال رہے کہ خبر واحد سے جو قرأت ثابت ہوتی ہے وہ نماز میں تلاوت نہیں ہو سکتی لیکن مسئلہ پر دلیل بن سکتی ہے، اسلئے اس روایت کو "درمیانی نماز سے مراد نماز عصر" پر دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

درمیانی نماز سے مراد نماز عصر ہے اس پر اور دلیل یہ دی گئی ہے کہ یہ نماز دن کی دو نمازوں فجر اور ظہر، اور رات کی دو نمازوں مغرب اور عشاء کے درمیان واقع ہے۔

"اور اس کی زیادہ تاکید اور زیادہ حفاظت کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ وقت دن کے ختم ہونے کا ہے، ہر قسم کا کاروبار کرنے والا اپنے کام کو مکمل کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے، اس لئے اس نماز کے ضائع ہونے کے خطرہ سے اس کی محافظت کا خصوصی حکم دیا گیا ہے۔" (راقم)

عصر کی نماز کو ضائع کرنے پر احادیث مبارکہ سے وعید ثابت ہے۔

☆ "عن ابی الملیح قال کنا مع بریدة فی غزوة فقال فی یوم ذی غیم بکروا بصلوة العصر فان النبی ﷺ قال من ترک صلوة العصر فقد حبط عمله. (قوله بکروا بصلوة العصر ای قدموها فی اول وقتها)" (اخرجه البخاری)

حضرت ابو الملیح رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ہم ایک غزوہ میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، ایک دن بادل چھائے ہوئے تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا عصر کی نماز جلدی یعنی اول وقت میں ادا کرلو (کہیں سورج کے غروب ہونے کا پتہ ہی نہ چل سکے) کیونکہ نبی کریم ﷺ نے

فرمایا جس شخص نے عصر کی نماز کو ضائع کر دیا اس کے عمل برباد ہو گئے۔

"عن ابن عمر ان رسول اللہﷺ قال الذی تفوته صلوة العصر فکأنما وتر اهله وماله"

(بخاری، مسلم)

"قوله وتر اهله نقص وسلب اهله وماله فیبقی فردا بلا اهل ولا مال،ومعنی الحدیث لکن حذره من فوت صلوة العصر کحذره من ذهاب اهله وماله"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک رسول اللہﷺ نے فرمایا وہ شخص جس کی عصر کی نماز فوت ہو گئی (یعنی بغیر عذر کے) گویا کہ اس کے اہل وعیال اور مال ودولت میں نقص واقع ہو گیا۔

یعنی عصر کی نماز کو انسان فوت ہونے سے اس طرح ڈرتا رہے جس طرح اہل وعیال اور مال ودولت کے ضائع ہونے سے ڈرتا ہے۔ (خازن)

درمیانی نماز سے مراد نماز مغرب:

یہ قول قبیصہ بن ذویب کا ہے، ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ یہ نماز دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی کے درمیان واقع ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نماز کو صبح اور عشاء کی نماز کے درمیان بحیثیت تعداد رکعات کے رکھا، کیونکہ صبح کی دو رکعتوں سے اس نماز (مغرب) میں ایک رکعت زائد رکھی گئی اور عشاء کی نماز کی چار رکعتوں سے ایک رکعت کم کی گئی یعنی اس کی تین رکعتیں ہیں۔

یہ نماز سفر میں قصر بھی نہیں کی جاتی جس طرح نماز وتر قصر نہیں ہوتی، گویا کہ یہ دن کی نماز وتر ہے۔

اس نماز کی درمیانی نماز ہونے پر اور دلیل یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حکم سے نبی کریمﷺ کو نماز اوقات بتانے کیلئے سب سے پہلے جو نماز پڑھائی وہ نماز ظہر تھی، اس لحاظ پر پہلی نماز ظہر کی نماز ہے تو واضح ہوا کہ مغرب کی نماز درمیانی نماز ہے۔ (خازن)

اور یہ نماز پڑھنی دشوار ہوتی ہے اس لئے کہ رات کی تاریکی چھا رہی ہوتی ہے، لوگ اندھیرے سے پہلے گھر

پہنچنا چاہتے ہیں وہ نماز کی پرواہ کئے بغیر اپنی منزل طے کررہے ہوتے ہیں، اس لئے اس نماز کی تاکید کی گئی اور خصوصی طور پر حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا۔

درمیانی نماز سے مراد نماز عشاء:

یہ قول متقدمین سلف صالحین (تبع تابعین تک) سے تو منقول نہیں، البتہ متاخرین حضرات سے یہ منقول ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ یہ نماز ان دو نمازوں کے درمیان ہے جن کی قصر نہیں ہوتی یعنی صبح اور مغرب کی نماز سفر میں مکمل ادا کرنی ہوتی ہے ان کو قصر نہیں کیا جاتا، یہ نماز جب ان کے درمیان واقع ہے تو درمیانی نماز ہے۔

اس نماز کی درمیانی نماز ہونے پر اور دلیل یہ ہے کہ یہ نماز منافقوں پر بھاری تھی، وہ اسے ادا نہیں کرتے تھے اس وجہ سے اسے درمیانی نماز کہہ کر اسکی زیادہ حفاظت کرنے کی تاکید فرمائی گئی۔ (خازن)

اس نماز کو جماعت سے ادا نہ کرنے پر نبی کریم ﷺ نے شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا تو خود اندازہ کریں کہ مطلقاً اس نماز کو چھوڑنے پر آپ ﷺ کتنے ناراض ہوتے ہوں گے۔

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ والذی نفسی بيده لقد هممت ان آمر بحطب فيحطب ثم آمر بالصلوة فيؤذن لها ثم آمر رجلا فيوم الناس ثم اخالف الی رجال وفی رواية لا يشهدون الصلوة فاحرق عليهم بيو تهم والذی نفسی بيده لو يعلم احدهم انه يجد عرقا سمينا او مرماتين حسنتين لشهد العشاء"

(رواه البخاری، والمسلم نحوه، مشكوة باب الجماعة وفضلها)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں ارادہ رکھتا ہوں کہ میں کسی کو حکم دوں لکڑیاں جمع کرنے کا، وہ لکڑیاں جمع کرلے، پھر میں نماز کا حکم دوں، تو نماز کے لئے اذان کہی جائے، پھر میں ایک شخص کو حکم دوں کہ وہ امامت کرائے اور میں مردوں کے گھروں میں چکر لگاؤں جو لوگ نماز میں حاضر نہیں ہوتے ان کے گھروں کو جلادوں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان

ہے اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ (نماز میں حاضر ہونے پر) موٹا تازہ گوشت ملے گا، یا خوبصورت کو ہا
نوں والی دو اونیاں ملیں گی تو وہ عشاء کی نماز میں ضرور حاضر ہوں۔

یعنی منافقین عشاء کی نماز میں حاضر نہیں ہوتے، اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ یہ نماز ان پر بھاری ہوتی تھی، البتہ
اگر ان کو دنیا کا لالچ دیا جاتا تو وہ نماز میں حاضر ہوتے، جبکہ دنیاوی مال سے ثواب کہیں زیادہ ملتا تھا لیکن اس کی انہیں کو
ئی پرواہ ہی نہیں تھی کیونکہ وہ تو درحقیقت کافر تھے بظاہر مومن بن کر کچھ نمازیں ادا کر لیتے تھے۔

تمام اقوال میں شاندار محاکمہ:

اگر چہ درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہونے پر زیادہ حضرات کا اتفاق ہے اور نبی کریم ﷺ نے بھی نماز عصر
کو درمیانی نماز کہا اس لحاظ سے بھی عصر کی نماز کی طرف زیادہ رجحان ہے، لیکن دوسرے اقوال میں بعض اقوال صحابہ
کرام کے ہیں، صحابہ کرام کا قول بھی حدیث کا درجہ رکھتا ہے، پھر خاص کر کے جو حکم فقط عقل سے ثابت نہیں اس کے
متعلق صحابی کا قول حدیث مرفوع کا درجہ رکھتا ہے، پھر یہ کہ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ کوئی اور نماز درمیانی نماز نہیں
ہوسکتی، اس لئے راقم کو مندرجہ ذیل قول جو محاکمہ کی حیثیت رکھتا ہے پسند آیا۔

"ان الصلوة الوسطی ھی احدی الصلوات الخمس لا بعینھا"

درمیانی نماز پانچ نمازوں میں سے کوئی ایک نماز ہے، لیکن وہ معین نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام (پانچ) نمازوں کا حکم دیا، پھر بطور عطف **"الصلوة الوسطی"**
(درمیانی نماز) کا ذکر فرمایا، پھر بیان نہیں فرمایا کہ درمیانی نماز سے مراد کون سی نماز ہے، جب معاملہ اس طرح ہے تو ممکن
ہے کہ یہ کہا جائے کہ پانچ نمازوں میں سے ہر نماز کو درمیانی نماز سمجھا جائے۔

**"ابھمھا اللہ علی عبادہ مع ماخصھا بمزید التوکید تحریضالھم علی المحافظة علی
اداء جمیع الصلوات علی صفة الکمال والتمام"**

اللہ تعالیٰ نے درمیانی نماز کو ادا کرنے پر ابھارا ہے، اس کی حفاظت کرنے کی خصوصی تاکید فرمائی

ہے، لیکن درمیانی نماز کو مبہم (پوشیدہ) طور پر ذکر فرمایا معین نہیں کیا تاکہ مومنین ہر نماز کو درمیانی نماز سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ ہر نماز کی شدید تاکید کی گئی ہے، تاکہ وہ تمام نمازوں کو کامل طریقہ سے مکمل ادا کریں۔

"ولهذا السبب اخفى الله تعالى ليلة القدر في شهر رمضان واخفى ساعة الاجابة في يوم الجمعة واخفى اسمه الاعظم في جميع اسمائه ليحافظوا على ذلك كله"

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رمضان میں لیلۃ القدر کو مخفی رکھا تاکہ ہر رات کو لیلۃ القدر سمجھ کر عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول رہے، اور اسی وجہ سے جمعہ کے دن میں دعا کی قبولیت کی ساعت کو مخفی رکھا گیا تاکہ تمام دن کی ہر ساعت کو مقبولیت کی گھڑی سمجھ کر ذکر و دعا میں مشغول رہے۔

یہ قول کثیر علماء کرام کا ہے، حضرت محمد ابن سیرین فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے سوال کیا "الصلوة الوسطى" (درمیانی نماز) کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا "حافظ على الصلوات كلها تصبها" تمام نمازوں کی حفاظت کرو تو خود بخود درمیانی نماز کو تم پالو گے۔

حضرت ربیع بن خثیم سے درمیانی نماز کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

"الوسطى واحدةمنهن فحافظ على الكل تكن محافظاعلى الوسطى"

پانچ نمازوں میں ہی درمیانی نماز ہے، سب نمازوں کی حفاظت کرو تو درمیانی نماز کی محافظت بھی پائی جائے گی۔ (خازن)

راقم کو تو یہی قول پسند آیا، تاہم یہ تمام اقوال و مذاہب نقل کرنے کے بعد ناصر الشریعۃ ومحی السنۃ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی صوفی المعروف بالخازن رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"ان تمام اقوال میں سے دو قول زیادہ معتبر اور صحیح ہیں ایک یہ ہے کہ درمیانی نماز سے مراد صبح کی نماز ہے اور دوسرا قول کہ درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اس کے بعد ترقی کر کے فرمایا ہے "واصح الاقوال كلها انها العصر" سب اقوال سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے کیونکہ اس میں احادیث صحیحہ وارد ہیں"۔ (خازن)

"**وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ**" اور کھڑے ہو اللہ کے لئے اطاعت کرتے ہوئے۔

قنوت کے کئی معانی ہیں جو اس آیہ کریمہ میں متصور ہیں۔

قنوت بمعنی طاعت:

راقم نے یہ معنی تفسیر خازن سے ہی لیا ہے" **قانتین ای مطیعین**" کھڑے ہو اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت کرتے ہوئے یعنی کامل اطاعت کرو اور پوری پوری اطاعت کرو کہ نماز کے ارکان اور سنن میں خلل واقع نہ ہونے دو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں یہ معنی بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ قول ابن عباس اور حسن اور شعبی اور سعید بن جبیر اور طاؤس اور قتادہ اور ضحاک اور مقاتل رضی اللہ عنہم کا ہے۔

اس پر دو وجہ سے دلیل قائم کی گئی۔

پہلی یہ کہ روایت میں آتا ہے۔"**کل قنوت فی القرآن فهو الطاعة**" قرآن پاک میں جہاں بھی قنوت کا ذکر ہے اس سے مراد طاعت ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے متعلق فرمایا گیا "**ومن یقنت منکن لله و رسوله**" اور جس نے تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کی۔ اور ارشاد فرمایا" **فالصالحات قانتات**" نیک عورتیں، طاعت کرنے والیاں۔

جب واضح ہوا کہ مراد کامل طاعت ہے کہ نماز کے ارکان وسنن (سنتوں) میں خلل نہ ہونے دے تو اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نماز کو کامل طریقہ سے ادا کرنے میں انسان کا اپنا بھلا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کی عبادت کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ بھی خیال رہے کہ نماز کو درست ادا نہ کرنا اور یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادت کی حاجت نہیں یہ جہالت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اور سلف صالحین جو لوگوں سے زیادہ علم رکھنے والے تھے، انہوں نے خشوع سے نماز ادا کی۔ (کبیر)

قنوت بمعنی خشوع:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ''اور کھڑے ہو اللہ کے حضور ادب سے''
آپ کا ترجمہ تفسیر کبیر میں مذکور اس قول کے مطابق ہے۔
'' القنوت عبارة عن الخشوع وحفض الجناح و سکون الاطراف وترک الالتفات من هیبة الله''
قنوت کا معنی اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے خشوع کرنا، عاجزی کرنا، اعضاء کو حرکت نہ دینا بلکہ ساکن رکھنا، اِدھر اُدھر توجہ کو چھوڑ دینا۔
'' وکان احدهم اذا قام الی الصلوة یهاب ربه فلا یلتفت ولا یقلب الحصی ولا یعبث بشیٔ من جسده ولا یحدث نفسه بشیٔ من الدنیا حتی ینصرف''
اس معنی کے لحاظ سے یہ سمجھ آ گیا کہ جب کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اِدھر اُدھر توجہ نہ کرے اور کنکریوں وغیرہ کو نہ پلٹے، اور اپنے جسم اور کپڑوں وغیرہ سے نہ کھیلے، اور اپنے دل میں دنیاوی معلات کی کوئی چیز نہ واقع ہونے دے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حضور ادب سے کھڑے ہو کر نماز مکمل کرے۔ (کبیر)

قنوت بمعنی دعاء وذکر:

یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اس پر دو وجہ سے دلیل قائم کی گئی ہے۔
ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ''حافظوا علی الصلوات'' سے نماز میں پائے جانے افعال کی حفاظت کا حکم دیا، تو اس کا لحاظ کرتے ہوئے قنوت کا معنی نماز میں پائے جانے والے ذکر ودعا کیا جائے، اس معنی کا اعتبار کرتے ہوئے آیۃ کریمہ کا ترجمہ یہ ہوگا ''وقوموا للہ ذاکرین داعین منقطعین الیہ'' اور کھڑے ہو اللہ تعالیٰ کیلئے ذکر کرتے

ہوئے، دعاء کرتے ہوئے، تمام چیزوں سے منقطع ہوکر صرف اسی کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔

دوسری دلیل یہ قائم کی گئی کہ ایک اور آیۃ کریمہ میں قنوت ذکر و دعاء کے معنی میں استعمال ہے۔

"امن هو قانت آناء الليل ساجداوقائما" الخ

کیا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کی حالت میں اور قیام کی حالت میں ذکر و دعاء کرتے ہوئے۔

اور صبح کی نماز میں منسوخ ہونے سے پہلے جو قنوت پڑھا جاتا رہا یا وتر میں جو قنوت پڑھا جارہا ہے اس کا معنی بھی دعاء ہے، اور کہا جاتا ہے "قنت علی فلان" اس سے مراد لیا جاتا ہے "دعاء علی فلان" فلاں پر بددعاء کی۔ (از کبیر)

قنوت بمعنی سکوت:

یہ قول ابن مسعود اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

"كنا نتكلم فی الصلوة فيسلم الرجل فيردون عليه ويسألهم كم صليتم كفعل اهل الكتاب فنزل قوله تعالى (وقوموا لله قانتين) فامرنا بالسكوت ونهينا عن الكلام"

اہل کتاب کی طرح نماز میں ہم کلام کرلیا کرتے تھے، سلام دے دیتے تھے، سلام کا جواب دے دیتے تھے، اور نماز پڑھنے والوں سے پوچھ لیا کرتے تھے تم کتنی رکعتیں پڑھ چکے ہو، تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرما دیا "وقوموا لله قانتين" (اور تم کھڑے ہو اللہ کیلئے خاموش ہوکر) تو اس حکم کے نازل ہوتے ہوئے ہمیں نماز میں کلام کرنے سے منع کر دیا گیا۔ (از کبیر)

☆ عن عبدالله بن مسعود كنا نسلم على النبی ﷺ وهو فی الصلوة فيرد علينا قبل ان نأتی ارض الحبشة فلما رجعت سلمت عليه فلم يرد علی فذكرت ذلك له فقال ان الله يحدث من امره ما يشاء وانه قضى ان لا تتكلموا فی الصلوة.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کو حبشہ کی ہجرت سے پہلے سلام کرتے جب آپ ﷺ نماز ادا کر رہے ہوتے، آپ ﷺ نماز کی حالت میں ہی جواب دے دیتے

تھے، جب میں حبشہ سے واپس لوٹا تو میں نے آپ ﷺ کو (دوران نماز) سلام کیا، آپ ﷺ نے مجھے سلام کا جواب نہ دیا تو میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا (کہ آپ ﷺ نے مجھے سلام کا جواب نہیں دیا) تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جو امر دینا چاہتا ہے وہی حکم فرماتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ نے حکم فرما دیا ہے کہ تم نماز میں کلام نہ کیا کرو۔

☆ عن عطاء بن یسار عن ابی سعید الخدری ان رجلا سلم علی النبی ﷺ فرد علیه بالاشارة فلما سلم قال کنا نرد السلام فی الصلوة فنھینا عن ذلک.

عطاء بن یسار کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کو (دوران نماز) سلام کیا تو آپ ﷺ نے اشارہ سے اسے جواب دیا، آپ ﷺ نے جب نماز کا سلام پھیر لیا تو ارشاد فرمایا ہم نماز میں سلام کا جواب دے دیا کرتے تھے، اب ہمیں اس سے منع کر دیا گیا ہے۔

"وفی حدیث معاویة بن الحکم السلمی ان النبی ﷺ قال ان صلوتنا ھذہ لایصلح فیھا شئ من کلام الناس انما ھی التسبیح والتکبیر وقرأة القرآن"

معاویہ بن حکم سلمی کی روایت میں ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک ہماری یہ نماز نہیں صلاحیت رکھتی کہ اس میں لوگوں کا کلام کیا جائے (یعنی دنیاوی کلام کیا جائے) بیشک یہ نماز تسبیح وتکبیر اور قراءت قرآن ہی ہے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

معاویہ بن حکم سلمی کی روایت ایک طویل حدیث کا حصہ احکام القرآن میں منقول ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک صحابی نماز میں حاضر ہوئے ان کو علم نہ تھا کہ نماز میں کلام کرنا منسوخ ہو چکا ہے، انہوں نے حسب معمول سابق (جو پہلے عمل ہو رہا تھا) نمازیوں سے سوال کیا کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں (چونکہ نمازیوں کے بتانے پر وہ رکعتیں پہلے ادا کی جاتیں پھر بقیہ نماز ادا کی جاتی) تو وہ اشارہ سے انہیں خاموش رہنے کے متعلق کہہ رہے تھے، یہ کہتے ہیں میں نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کو کہا تمہاری ماں تمہیں پیٹے تم مجھے بتاتے کیوں نہیں تو انہوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، میں خاموش ہو گیا، نماز سے فارغ ہونے پر نبی کریم ﷺ نے مجھے اپنے پاس بلایا، نہ ڈانٹا، نہ جھڑکا اور (پیار ومحبت

سے) فرمایا کہ نماز میں دنیاوی کلام کی گنجائش نہیں، بلکہ نماز صرف تسبیح وتکبیر (یعنی اللہ کے ذکر) اور قرآن پاک پڑھنے پر مشتمل ہے۔

سبحان اللہ! میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا کیا خوب انداز تبلیغ تھا کہ آپ ﷺ پیار و محبت سے مسائل سمجھاتے تھے جس کی وجہ سے لوگ قریب ہوتے، لیکن آج دیکھتے ہیں کہ کسی سے نماز میں کوئی غلطی واقع ہو جائے تو سمجھانے والے اس طرح سخت لہجہ سے سمجھاتے ہیں کہ وہ شخص دوبارہ مسجد کی طرف رخ نہیں کرتا۔

قنوت بمعنی قیام:

یعنی قانتین بمعنی قائمین کے ہے۔ اس قول والے حضرات نے اپنے مؤقف کو حدیث پاک سے ثابت کیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

"سئل النبی ﷺ ای الصلوۃ افضل؟ قال طول القنوت" یریدبہ طول القیام.

نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کون سی نماز افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "لمبا قنوت" یعنی آپ ﷺ کی مراد لمبا قیام تھا۔

تاہم اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا، آپ فرماتے ہیں اگر یہی معنی مراد ہوتا تو تقدیر عبارت کی یہ ہوگی "وقوموا اللہ قائمین" یہ درست نہیں، البتہ اسی معنی کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ مطلب یوں ہو "وقوموا للہ مدیمین کذلک القیام" کھڑے ہو اللہ کیلئے اس قیام میں مداومت (ہمیشگی) کرو، اس صورت میں قنوت کی تفسیر "ادامة" سے ہوگی نہ کہ قیام سے۔ (از کبیر)

فائدہ: "قوموا للہ" سے سمجھ آیا کہ فرض نماز میں قیام فرض ہے، خواہ نماز ادا کرنے والا منفرد ہو یا امام ہو۔

☆ قال ﷺ انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا صلی قائما فصلوا قیاما.

نبی کریم ﷺ نے فرمایا امام بنایا گیا ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے، جب وہ نماز کھڑے ہو کر ادا کرے تم بھی کھڑے ہو کر ادا کرو۔

خیال رہے کہ امام مریض ہو کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور مقتدی تندرست ہوں کھڑے ہونے کی

طاقت رکھتے ہوں تو امام بیٹھ کر نماز پڑھائے اور مقتدی کھڑے ہو کر نماز ادا کریں تو نماز صحیح ہوگی "لان کلا یؤدی فرضه علی قدر طاقته" اس لئے کہ ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق فرض ادا کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی مرض وصال میں نماز بیٹھ کر پڑھائی، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے تھے اور لوگ آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے تھے "ولم یشر الی ابی بکر ولا الیهم بالجلوس واکمل صلوته بهم جالسا وهم قیام" تو آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر اور دوسرے صحابہ کرام کو بیٹھنے کا اشارہ نہیں فرمایا، بلکہ آپ ﷺ نے بیٹھ کر ان حضرات کو نماز پڑھائی اور انہوں نے کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ (از قرطبی)

یہی مؤقف ہے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا، مالکی اور حنفی مذہب کے متعلق قیل وقال قرطبی میں دیکھی جائے۔

تنبیہ: قانتین کے جتنے معانی بیان کئے ہیں اور جتنے اقوال بیان کئے ہیں ان میں کوئی تعارض نہیں تمام جمع ہو سکتے ہیں اسی کو علی بن عیسیٰ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

"ان القنوت عبارة عن الدوام علی الشئ والصبر علیه والملازمة له وهو فی الشریعة صار مختصا بالمداومة علی طاعة الله والمواظبة علی خدمة الله تعالیٰ"

قنوت کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز پر ہمیشگی کی جائے اور اسی پر صبر کیا جائے یعنی اس پر قائم رہا جائے، اور اسے لازم پکڑا جائے، اب شریعت میں قنوت اس معنی کے ساتھ خاص ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت پر ہمیشگی پائی جائے اور اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے میں ہمیشگی پائی جائے۔

"وعلی هذا التقدیر یدخل فیه ماقاله المفسرون" اس معنی کے لحاظ پر مفسرین کرام کے تمام اقوال اس میں داخل ہوں گے۔ (از کبیر)

یعنی مطلب یہ ہو گیا کہ "کھڑے ہو اللہ کیلئے دعاء وذکر کرتے ہوئے اور اس کی طاعت کرتے ہوئے اور خاموش رہتے ہوئے اور خشوع وخضوع کرتے ہوئے اور قیام پر ہمیشگی کرتے ہوئے"

ان تمام پر عمل کرنے سے ہی رب تعالیٰ کی طاعت پائی جائے گی اور اس کے احکام کو بجالا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ☆ (سورة البقرة آیت ۲۳۹)

﴿۱﴾

پھر اگر خوف میں ہو تو پیادہ یا سوار جیسے بن پڑے پھر جب اطمینان سے ہو تو اللہ کی یاد کرو جیسا اس نے سکھایا جو تم نہ جانتے تھے۔

﴿۲﴾

پھر اگر تم خوف میں ہو تو پاؤں پر کھڑے یا سوار، پھر جب تم امن میں ہو تو یاد کرو اللہ کو جیسا کہ اس نے سکھایا تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

نماز خوف کا ذکر کیا جا رہا ہے یعنی دوران جنگ نماز کیسے ادا کی جائے؟

نمازِ خوف کی دو قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ جنگ نہیں ہو رہی لیکن دشمن سامنے ہو تو ان کو نماز جماعت سے امام پڑھائے، اس کا ذکر انشاء اللہ سورۃ النساء کی آیۃ "واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوۃ" میں آئے گا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ جنگ ہو رہی ہے یعنی تلوار چل رہی ہو تو پھر جیسے ممکن ہو نماز ادا کرے، اس حال میں بھی نماز معاف نہیں ہوگی، بلکہ بغیر جماعت کے اکیلے اکیلے اپنی سواریوں پر نماز ادا کریں، سواری پر نماز یقیناً اشارہ سے ہوگی یعنی رکوع و سجود پر بھی عمل نہیں ہوگا، اسی طرح قبلہ کی طرف منہ کرنا بھی لازم نہیں ہوگا بلکہ جس طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا ممکن ہو نماز ادا کر لے۔

اسی طرح کھڑے کھڑے نماز ادا کر سکے تو کھڑے ہو کر اکیلے ہی اشارہ سے نماز ادا کرے جس طرف بھی منہ کرنا ممکن ہو اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے۔

تنبیہ: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جب جنگ جاری ہو تو چلتے ہوئے، مقابلہ کرتے ہوئے، تلوار چلاتے ہوئے، دوڑتے ہوئے ہر حال میں نماز جائز ہوگی۔

"وقال ابو حنیفة لا یصلی الماشی بل یؤخر الصلوۃ ویقضیها" (خازن)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں چلتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ اگر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا ممکن نہ ہو اور سواری پر نماز ادا کرنا بھی ممکن نہ ہو تو نماز کو مؤخر کردے اور قضاء کرلے، امام اعظم رحمہ اللہ نے اپنے موقف پر یہ دلیل دی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خندق کے دن چار نمازیں رہ گئیں، جن کو آپ ﷺ نے بعد میں ترتیب وار قضاء کیا، اگر قتال وغیرہ میں مشغول ہوتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز ہوتا تو نبی کریم ﷺ کی نمازیں قضاء نہ ہوتیں بلکہ دوران مشغولیت آپ ﷺ ادا فرمالیتے۔ (خازن)

اعتراض: آیۃ کریمہ میں "فرجالا" ذکر ہے، رجال جمع ہے راجل کی جیسے صحاب جمع ہے صاحب کی، رجال کا معنی ہے پیدل چلنا، اس سے پتہ چلا کہ چلتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز ہے۔

جواب: "ولیس فی الآیة دلیل علی جواز الصلوۃ حال المسابقة فانه لیس معنی الراجل الماشی بل الراجل القائم علی الرجلین"

آیۃ کریمہ سے اس مسئلہ پر دلیل قائم نہیں ہوسکتی کہ مقابلہ کے دوران چلتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز ہے، کیونکہ "راجل" کا معنی پیدل چلنا نہیں، بلکہ دونوں پاؤں پر کھڑا ہونا مراد ہے۔ (مظہری)

راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "پیادہ" اس کا معنی بھی پاؤں پر کھڑا ہونا ہی ہے، چلنا نہیں۔

تاہم تفسیرات احمدیہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ "راجل" کا معنی پیدل چلنا بھی ہے اور پاؤں پر کھڑا ہونا بھی ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے پیدل چلنے والا معنی لیا ہے، اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے پاؤں پر کھڑے ہونے والا معنی لیا ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل حدیث پاک سے:

عن نافع ان ابن عمر كان اذا سئل عن صلوة الخوف وصفها ثم قال وان كان الخوف اشد من ذلک صلوا رجالا وقيا ماعلى اقدامهم او ركبانا مستقبلي القبلة او غير مستقبليها قال نافع لا ارى ابن عمر ذكر ذلک الا عن رسول الله ﷺ.

(رواه البخاری)

حضرت نافع کہتے ہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے خوف کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے اس کا طریقہ بیان کیا (کہ جنگ نہ ہو رہی ہو، دشمن سامنے ہو تو امام کس طرح نماز پڑھائے) پھر آپ نے فرمایا کہ اگر خوف زیادہ ہو تو قدموں پر کھڑے ہو کر یا سوار ہو کر نماز ادا کریں قبلہ کی طرف توجہ کر سکیں یا نہ کر سکیں، حضرت نافع کہتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ قول رسول اللہ ﷺ سے ہی سن کر کیا ہے۔

اس حدیث میں ''صلوا رجالا وقيا ماعلى اقدامهم'' جو ذکر ہے اس میں ''رجالا'' کی تفسیر عطف تفسیری سے کی گئی، یعنی ''رجالا'' سے مراد ''قیاما علی اقدامهم'' ہے کہ پاؤں پر کھڑے ہونا، یعنی سخت خوف کی حالت میں زمین پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرو یا سواری پر۔ (از مظہری)

اعتراض: نماز خوف میں تو ایک یا دو رکعت پڑھ کر لوگ دشمن کے مقابل چلے جاتے ہیں اور دوسرے (لوگ) امام کے پیچھے آ جاتے ہیں، پھر یہ چلے جاتے ہیں اور پہلے لوگ آ جاتے ہیں اور اپنی نماز مکمل کرتے ہیں، یہ نماز میں چل رہے ہیں تو ان کی نماز صحیح ہے، یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ چلتے ہوئے نماز ادا کرنا درست نہیں۔

جواب: جو کام خلافِ قیاس شرع سے ثابت ہو وہ اپنے مورد (مقام) پر موقوف ہو جاتا ہے، اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، اسلئے نماز خوف کی ایک یا دو رکعت ادا کر کے دشمن کی طرف جانا نص سے ثابت ہے لہذا یہ جائز رہے گا اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جائے گا، البتہ کوئی اور صورت بھی شرع سے ثابت ہو تو وہ بھی جائز رہے گی جیسا کہ نماز میں وضو ٹوٹ جائے تو وہاں ہی نماز کو چھوڑ کر کوئی کام نماز کے منافی (خلاف) کئے بغیر وضو کرنے کے لئے جائے اور وضو کر کے

واپس آئے تو وہاں سے ہی نماز مکمل کرلے جہاں چھوڑ کر گیا تھا، یہ حکم بھی شرع سے ثابت ہے لہذا جائز ہے۔

اسی طرح نماز کی حالت میں سانپ اور بچھو کو قتل کرنا بھی جائز ہے اگر چہ اس میں بھی چلنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ حکم بھی شرع سے ثابت ہے۔

تنبیہ: یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ نماز میں چلنا جائز ہے جیسے تین مسئلہ اوپر ذکر کئے گئے لیکن ان تمام صورتوں میں نماز موقوف رہتی ہے، چلتے ہوئے نماز ادا نہیں کی جاتی پہلے مسئلہ میں بھی نماز کی ایک رکعت یا دو رکعت ادا کر کے لوگ دشمن کی طرف چلے جائیں، پھر دوسرا گروہ امام کے ساتھ آ کر باقی نماز ادا کرے، جب یہ دشمن کی طرف جائیں گے تو پہلے لوگ وہاں ہی یا واپس آ کر جہاں پہلے نماز ادا کی تھی وہاں اپنی باقی نماز کو مکمل کریں گے، اگر چلتے ہوئے نماز جائز ہوتی تو یہ لوگ دشمن کی طرف جاتے جاتے نماز مکمل کر لیتے حالانکہ ایسا نہیں کیا گیا۔

وضو کرنے کے لئے جو شخص گیا وہ بھی وضو کر کے واپس آتے ہوئے چلتے چلتے نماز ادا نہیں کر سکتا بلکہ اپنی جگہ یعنی مسجد وغیرہ میں واپس آ کر نماز مکمل کرے گا۔

سانپ اور بچھو کو قتل کرتے ہوئے بھی نماز میں چلنا تو جائز ہے لیکن اتنی دیر کے لئے نماز موقوف رہے گی یہ نہیں کہ چلتے ہوئے اور سانپ، بچھو کو ضربیں لگاتے ہوئے بھی نماز جاری رکھے گا۔

اس بحث سے یہ مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا۔

"ان المشی فی الصلوۃ کالمشی لاجل الوضوء الذی احدث فی الصلوۃ اھون من الصلوۃ ما شیا فلا یلحق الا علی بالادنی"

کہ بیشک دوران نماز چلنا آسان ہے بنسبت چلتے ہوئے نماز ادا کرنے کے، جیسا کہ وضو کرنے کے لئے جانا اور وضو کر کے آنا تو جائز ہے لیکن چلتے ہوئے نماز ادا کرنا جائز نہیں، لہذا واضح ہوا کہ ادنیٰ چیز کے ثابت سے اعلیٰ چیز کا ثبوت نہیں ہو سکتا، یعنی نماز میں چلنے کے جواز سے (جو بھی بحکم شرع) چلتے ہوئے نماز کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا۔ (ماخوذ از مظہری بوصاحب)

مسئلہ: سخت خوف میں سواریوں پر نماز رکوع اور سجود کے اشارہ سے جائز ہے خواہ قبلہ کا استقبال کیا جا سکے یا نہ کیا جا سکے لیکن یہ نماز اکیلے اکیلے ادا ہوگی جماعت سے ادا نہیں ہوگی، یہی قول امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، ایک قول امام محمد رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا گیا کہ آپ جماعت سے نماز ادا کرنا جائز مانتے ہیں، لیکن ہدایہ میں اسے رد کیا گیا "ولیس بصحیح لانعدام الاتحاد فی المکان" جب ہر شخص اپنی اپنی سواری پر نماز ادا کر رہا ہے تو امام اور مقتدی حضرات کا مکان متحد نہیں ہوتا لہذا جماعت نہیں ہو سکتی۔

مسئلہ نماز خوف کی رکعتوں کی تعداد کم نہیں ہو سکتی:

اگر جنگ سفر کی مقدار سے کم مسافت پر ہو رہی ہے تو اسی طرح نماز فجر دو رکعت، مغرب تین رکعت، ظہر، عصر اور عشاء چار رکعت ہوگی جس طرح امن کی حالت میں ہوتی ہے۔ اگر مسافر ہو تو اس کے لئے نماز اسی طرح قصر ہوگی جیسے امن کی حالت میں مسافر کے لئے قصر ہوتی ہے۔

اعتراض: حدیث شریف میں تو اس کے خلاف ذکر ہے جس سے سمجھ آتا ہے کہ نماز خوف کی تعداد رکعات میں عام نمازوں سے فرق ہے۔

☆ عن ابن عباس قال فرض اللہ تعالٰی الصلوة علی لسان نبیکم فی الحضر اربعا وفی السفرُ رکعتین وفی الخوف رکعة۔ (مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالٰی نے تمہارے نبی کریم ﷺ کی زبان سے حضر (غیر سفر) میں چار رکعت نماز فرض کی اور سفر میں دو رکعت اور خوف میں ایک رکعت۔

جواب: اس حدیث میں جماعت سے نماز پڑھنے کا حکم ہے کہ حضر میں چار رکعت والی نماز چار رکعت ہی امام کے ساتھ ادا ہوگی، اور سفر میں چار رکعت والی نماز دو رکعت ادا کی جائے گی جبکہ امام بھی مسافر ہو، اور سفر میں خوف کی حالت میں ایک رکعت نماز امام کے ساتھ ادا کی جائے گی اور ایک رکعت خود ادا کرے گا۔

☆☆☆☆☆

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًاۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۰)

﴿۱﴾

اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لئے وصیت کر جائیں سال بھر نان ونفقہ دینے کی بے نکالے پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس کا مؤاخذہ نہیں جو انہوں نے اپنے معاملہ میں مناسب طور پر کیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

﴿۲﴾

اور وہ جو فوت ہونے کے قریب ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ رہے ہوں بیویاں تو ان پر وصیت (فرض) ہے بیویوں کیلئے تم نفع پہنچاؤ ان کو سال تک سوائے نکالنے کے، پھر اگر وہ نکلیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر جو کریں وہ اپنے نفس کے متعلق شرع کے مطابق اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

مختصر مطلب:

ابتداء اسلام میں بیوہ کی عدت ایک سال کی تھی اور ایک سال کامل وہ شوہر کے یہاں رہ کر نان ونفقہ (روٹی، خرچ) پانے کی مستحق ہوتی تھی، پھر ایک سال کی عدت تو "یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا" سے منسوخ ہوگئی جس میں بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن مقرر فرمائی گئی، اور سال بھر کا نفقہ آیۃ میراث سے منسوخ ہوا جس میں عورت کا حصہ شوہر کے ترکہ سے مقرر کیا گیا لہذا اب اس وصیت کا حکم باقی نہ رہا۔

حکمت اس کی یہ ہے کہ عرب کے لوگ اپنے مورث کی بیوہ کا نکلنا یا غیر سے نکاح کرنا بالکل گوارا ہی نہ کرتے تھے، اور اس کو عار سمجھتے تھے اس لئے اگر ایک دم چار ماہ دس روز کی عدت مقرر کی جاتی تو یہ ان پر بہت شاق ہوتی، لہٰذا بتدریج (آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ) انہیں راہ پر لایا گیا۔ (خزائن العرفان)

قدرِ تفصیل:

"وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ" اور وہ جو فوت ہونے کے قریب ہو جائیں تم میں سے۔

"منکم" میں مخاطب ضمیر ذکر کی گئی کہ یہ خطاب مردوں کو ہے، اسی لئے اکثر مفسرین کرام نے "یا معشر الرجال" کے الفاظ ذکر کئے ہیں "اے مردوں کی جماعت"

"والذین یتوفون" کا معنی ملاجیون رحمہ اللہ نے فرمایا "والرجال الذین یقربون الموت منکم" اور وہ مرد جو تم میں سے موت کے قریب ہوں۔ (تفسیرات احمدیہ)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس معنی کی وجہ بیان فرمائی "وفی یتوفون مجاز المشارفة" (یتوفون میں مجاز مشارفت پایا گیا ہے) مجاز مشارفت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز پر قریب چیز کا حکم لگا دیا جائے۔

یعنی یہاں وفات کے قریب لوگوں کو "یتوفون" (جو مر جائیں) سے تعبیر کر لیا گیا، ظاہری معنی وہی ہے جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے، راقم نے مجاز کو طلباء پر واضح کرنے کیلئے "فوت ہونے کے قریب" والا معنی کیا ہے، وجہ صرف یہ ہے کہ طلباء کرام وسیع تر مطالب حاصل کر لیں۔

"وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا" اور چھوڑ رہے ہوں بیویاں۔

"ازواج" کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں پر ہے، اسی وجہ سے مفسرین کرام نے "ازواجا" کی تفسیر "زوجات" سے کی، یعنی یہاں مراد مؤنث ہے مذکر نہیں، کیونکہ خطاب مردوں کو ہے کہ جب وہ بیویاں چھوڑ کر جا رہے ہوں فوت ہونے کے قریب ہوں تو ان پر وصیت کرنا فرض ہے۔

"**وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ**" تو ان پر وصیت (فرض) ہے بیویوں کے لئے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں "وصیة" پر نصب بھی پڑھی گئی ہے، اور رفع بھی پڑھا گیا ہے، نصب والی قراءت ابو عامر، ابن عامر اور حمزہ رحمہم اللہ کی ہے جو عاصم رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت کی ہوگی "لیوصوا او یوصون وصیة" وہ وصیت کر جائیں۔ یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے۔ یا تقدیر عبارت یہ ہوگی "کتب اللہ تعالی علیهم وصیة" اللہ تعالیٰ نے ان پر وصیت کرنا فرض کر دیا۔ اس کو عبداللہ رحمہ اللہ کی قراءت سے تائید بھی حاصل ہے، انہوں نے پڑھا "کتب علیکم الوصیة لا زواجکم متاعا الی الحول" تم پر فرض کر دی گئی وصیت تمہاری بیویوں کیلئے ایک سال تک نفع پہنچانے کی۔

ایک اور قراءت میں "وصیة" پر رفع ہے، اس صورت میں تقدیر عبارت کی ہو "علیهم وصیة" ان پر وصیت لازم ہے، یا تقدیر عبارت کی یہ ہو "کتب علیهم وصیة" ان پر وصیت فرض کی گئی۔ (از روح المعانی)

راقم نے ان تقادیر کے مطابق ترجمہ کیا جن میں فرض ہونے کا ذکر ہے۔

شانِ نزول:

طائف کے ایک شخص تھے جن کو حکیم بن الحارث کہا جاتا تھا جنہوں نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی ان کی اولاد، ان کے ماں باپ اور ان کی زوجہ بھی ان کے ساتھ تھی وہ فوت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا تو نبی کریم ﷺ نے ان کے والدین اور اولاد کو وراثت سے مال دیا اور ان کی زوجہ کو کوئی چیز نہ عطا کی اور ان کے ورثا کو حکم دیا کہ ان کی زوجہ کو ایک سال گھر میں رہنے دیں اور خرچ دیتے رہیں۔

(ذکرہ البغوی، وکذا اخرج اسحاق بن راھویہ فی تفسیرہ)

شانِ نزول کا قول ضعیف ہے:

یہ واقع اپنی جگہ درست ہے، لیکن یہ واقع آیۃ کریمہ کے نزول کا سبب نہیں قاضی مظہری رحمہ اللہ نے اس شان نزول پر ان الفاظ سے اعتراض کیا۔

"قلت لکن سیاق الآیة ینافی هذا الحدیث لان الآیة تقتضی وجوب الوصیة والحدیث یقتضی وجوب نفقتها من ترکة زوجها من غیر وصیة ولعله مات بعد نزول الآیة واوصی بالانفاق حولا علی حسب تلک الآیة فعمل النبی ﷺ کذالک"

میں کہتا ہوں آیۃ کریمہ کا سیاق یعنی مقصدِ بیان اس حدیث کے منافی ہے کہ یہ واقعہ شانِ نزول بن سکے کیونکہ آیۃ کریمہ وصیت کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے، اور حدیث اس کو نفقہ (خرچ) دینے کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کی زوجہ کو اس کے ترکہ سے خرچ دیا جائے، حدیث پاک میں وصیت کا کوئی ذکر نہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آیۃ کریمہ کا نزول پہلے ہوا ہو، وہ صحابی بعد میں فوت ہوئے ہوں (وصیت کا انہیں موقع نہیں ملا جیسا کہ بعض مفسرین کرام نے ذکر کیا کہ ان کی موت اچانک واقع ہوئی) یا بقول مظہری رحمہ اللہ انہوں نے وصیت کر دی ہو اور نبی کریم ﷺ نے اس پر عمل فرمایا ہو۔ (واللہ اعلم بالصواب) (مظہری)

آیۃ کریمہ کے منسوخ ہونے کا قول:

اکثر حضرات کا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ منسوخ ہے پہلی آیۃ کریمہ سے وہ یہ ہے "یتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا" وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روک کر رکھیں) یعنی ایک سال کی عدت منسوخ ہے چار ماہ دس دن کی عدت سے۔

خیال رہے کہ پہلی آیۃ کریمہ نزول کے لحاظ سے بعد میں ہے تلاوت کے لحاظ سے پہلے ہے، جیسے "اقراء باسم ربک" الخ آیات نازل سب سے پہلے ہوئیں حالانکہ تیسویں پارہ میں تلاوت ہوتی ہیں۔

☆ قال ابن الزبیر قلت لعثمان بن عفان" والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا" قد نسختها الآیة الأخری فلم تکتبها او تدعها،قال یاابن اخی لاأغیر شیا منه مکانه"

(رواہ البخاری)

حضرت ابن زبیر کہتے ہیں میں نے حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہم) کو کہا جب آیۃ کریمہ "والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا" دوسری آیۃ کریمہ سے منسوخ ہے تو اسے نہ ہی لکھا جاتا بلکہ چھوڑ دیا جاتا، یعنی اس کو قرآن پاک کے نسخہ میں لکھنے کا کیا فائدہ؟ تو آپ نے فرمایا میں کسی آیۃ کو اس جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔

یعنی آیۃ کریمہ اگرچہ حکم کے لحاظ پر منسوخ ہے لیکن تلاوت کے لحاظ پر منسوخ نہیں۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے سوال کا اصل مقصد یہ تھا کہ آیۃ کریمہ کا حکم جب منسوخ ہو چکا ہے تو اس کو قرآن پاک میں لکھنے کا کیا فائدہ ہے، بلکہ اس کے لکھنے سے تو یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ شائد اس کا حکم باقی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا۔

"ھذاامر توفیقی وانا وجدتھا مثبتۃفی المصحف کذلک بعد ھا فاثبتھا حیث وجدتھا"

یہ معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے تقاضا پر موقوف ہے، جب میں نے قرآن پاک کے نسخہ میں اس آیۃ کریمہ کو لکھا ہوا پایا تو بعد میں بھی اسی طرح قرآن پاک میں موجود رہے گا۔

(صابونی، ابن کثیر)

☆ وروی عن ابن عباس قال کان الرجل اذا مات وترک امرأتہ اعتدت سنۃ فی بیتہ ینفق علیھا من مالہ ثم انزل اللہ بعد(والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھروعشرا)فھذہ عدۃ المتوفی عنھا زوجھا الا ان تکون حاملا فعدتھا ان تضع مافی بطنھا،وقال"ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلھن الثمن مماترکتم"فبین میراث المرأۃ وترک الوصیۃ والنفقۃ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص جب فوت ہو جاتا تھا اور اپنی زوجہ چھوڑ جاتا تو وہ ایک سال اس کے گھر عدت گذارتی اور اس کے مال سے اس عورت کو ایک سال خرچ دیا جاتا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیۃ کریمہ "والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا

یتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا" نازل فرمائی، اب یہ "چار ماہ دس دن" عدت ہے اسی عورت کی جس کا خاوند فوت ہو جائے سوائے حاملہ عورت کے اس کی عدت ہے بچے کی پیدائش خواہ اس کا خاوند فوت ہو جائے یا اسے طلاق دی گئی ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے "ولهن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلهن الثمن مما ترکتم" جب ان عورتوں کا حصہ (مذکورہ بالا) آیۃ کریمہ میں بیان فرمادیا کہ خاوند کی اولاد ہونے کی صورت میں ان کا آٹھواں حصہ ہے اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ان کا چوتھا حصہ ہے۔

تو اس آیۃ کریمہ سے عورتوں کے سال کے خرچ والا حکم منسوخ ہو گیا، اور وراثت والی آیۃ سے ورثاء کیلئے وصیت کا حکم بھی منسوخ ہو گیا۔ (از صابونی وابن کثیر)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ہے "لا وصية للوارث" وارث کے لئے وصیت نہیں۔

عدم منسوخیت کا قول:

مجاہد اور عطاء کا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ منسوخ نہیں، بلکہ چار ماہ دس دن عدت گذارنی ان پر واجب ہے، اس مدت کے دوران ان کو خرچ دینا اور رہنے کیلئے مکان دینا واجب ہے۔ اور ان کیلئے ایک سال تک خرچ دینے اور مکان دینے کی وصیت کرنا مستحب ہے، یعنی دونوں حکم علیحدہ علیحدہ ہیں، دونوں ہی برقرار ہیں ایک وجوبی اور ایک استحبابی۔
(ماخوذ از ابن کثیر و کبیر)

تنبیہ: جن حضرات نے منسوخ کا قول کیا ہے کہ پہلے عدت ایک سال واجب تھی ان حضرات کے نزدیک "غیر اخراج" کا حکم وجوبی ہے کہ ان کو گھروں سے نہ نکالا جائے، اب ان کے نزدیک "فان خرجن فلا جناح علیکم فیما فعلن من معروف" کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر وہ عورتیں سال مکمل کرنے کے بعد خود نکل جائیں اور اپنے نفسوں کے متعلق شرع کے مطابق کام کریں تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ عدت ختم کرنے سے پہلے ان کا گھر سے نکلنا جائز نہیں۔

اگر منسوخ نہ ہونے کا قول مراد ہو تو اب مطلب یہ ہوگا کہ چار ماہ دس دن تک تو ان کا عدت گذارنا واجب ہے اور چار ماہ دس دن کے بعد ان کو خرچ دینا اور مکان میں رہنے دینا واجب نہیں، لیکن چار ماہ دس دن کے بعد اگر وہ نکلنا چاہیں تو ان کی مرضی رہنا چاہیں تو ایک سال تک ان کو نہ نکالا جائے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ منسوخ نہ ہونے والے قول کو پسند فرماتے ہوئے یوں ارشاد فرماتے ہیں "وتنزیل الآیتین علی ھذا التقدیرین اولی حتی یکون کل واحد منھا معمولا بہ" دونوں آیتوں میں سے کسی ایک کو بھی منسوخ نہ ماننا زیادہ بہتر ہے تاکہ ہر ایک آیۃ پر عمل ہو سکے۔ (کبیر)

مسئلہ: عدت کے دوران رہنے کیلئے مکان دینا واجب ہے۔

اعتراض: فاطمہ بنت قیس کی حدیث سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ دوران عدت رہنے کیلئے مکان دینا واجب نہیں۔

عن فاطمۃ بنت قیس ان رسول اللہ ﷺ لم یجعل لھا سکنی و لا نفقۃ. (مسند احمد)

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ان کا عدت میں خرچ اور مکان مقرر نہیں فرمایا۔

جواب: "وقد ترک العمل بہ عمر بن الخطاب بمحضر من الصحابۃ" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے سامنے اس حدیث کو چھوڑنے کے متعلق فرمایا "لاندع کتاب اللہ وسنۃ نبینا ﷺ بقول امرأۃ لاندری احفظت ام نسیت" ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن پاک) اور نبی کریم ﷺ کی مشہور احادیث کے حکم کو ایک عورت کے قول پر نہیں چھوڑ سکتے، ہمیں معلوم نہیں کہ اسے یاد ہے یا وہ بھول گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کو کسی نے بھی رد نہیں کیا لہذا اس پر اجماع امت ہو گیا کہ عورت کو دوران عدت خرچ اور رہنے کے لئے مکان دینا واجب ہے۔ (از مظہری)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں فریعہ بنت مالک بن سنان جو ابو سعید خدری کی بہن ہیں کی حدیث بیان کی جس میں یہ الفاظ مبارکہ ہیں۔

"فقال ﷺ امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ، قالت فاعتددت فیہ

اربعة اشهر و عشرا، فلما کان (عثمان بن عفان) ارسل الیّ فسألنی عن ذلک فاخبرته فاتبعه و قضی به" (رواه مالک و ابوداود و الترمذی و قال الترمذی حسن صحیح)

رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا کہ تم اپنے گھر میں ٹھہرو یہاں تک کہ کتاب اپنی اجل کو پہنچ جائے (یعنی قرآن پاک میں بیان کردہ عدت کی مدت ختم ہو جائے) فریعہ کہتی ہیں میں نے اپنے خاوند کے مکان میں ہی چار ماہ دس دن عدت گذاری، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے تو آپ نے مجھ سے اس حدیث کے متعلق پوچھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد انہیں بتایا، آپ نے اسی کی تابعداری کی اور اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ (از ابن کثیر و کبیر)

تنبیہ: "لاجناح علیکم" کا خطاب میت کے ورثاء کو بھی ہے اور حکام کو بھی۔ "فان خرجن" کے دو مطلب ہیں، وہ خود چار ماہ دس دن مکمل کرنے کے بعد نکل جائیں (عدم منسوخیت کے قول کے مطابق) یا وہ خود نکل جائیں ایک سال عدت گذارنے کے بعد (منسوخیت کے قول کے مطابق) تو تم پر اے حاکمو اور میت کے ورثاء کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے نفسوں کے متعلق شرع کے مطابق کام کریں، یعنی عدت گذار کر اور نکاح کرنے کیلئے شرع کے مطابق اپنی زینت وغیرہ کریں تو انہیں اجازت ہے، تم انہیں منع نہ کرو۔

"وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ" اور اللہ غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔

اس میں وعید بھی ہے اور وعدہ بھی، یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکم سے عدولی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے عذاب دے گا، اسے عذاب دینے سے کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ وہ غالب ہے (یہ وعید ہے)۔ اور اگر کوئی شخص اس کے احکام کے مطابق عمل کرے گا تو رب تعالیٰ اسے اجر و ثواب عطاء فرمائے گا، وہ غالب ہے اسے ثواب دینے سے بھی کوئی روک نہیں سکتا۔

وہ حکمت والا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، اس لئے اس کا اچھے عمل کرنے والوں کو ثواب دینا بھی حکمت کا کام ہے، اور برے کام کرنے والوں کو عذاب دینا بھی اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔

☆☆☆☆☆

وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ☆

(سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۱)

۱

اور طلاق والیوں کے لئے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر۔

۲

اور طلاق والیوں کو (بھی) نفع پہنچانا مناسب طور پر واجب ہے مومنوں پر۔

مختصر مطلب اور ماقبل سے تعلق:

پہلی آیۃ میں جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کو دوران عدت نان ونفقہ اور رہنے کیلئے مکان دینے کا ذکر تھا۔اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جن عورتوں کو طلاق دے دی جائے ان کو دوران مدت خرچ دیا جائے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مرادی ہے کہ "متاع بالمعروف" سے مراد کیا ہے؟ اور راقم کا ترجمہ لغوی ہے کہ اصل لغت کے مطابق ترجمہ کیا ہے، تاہم راقم کے ترجمہ سے مکان دینا بھی سمجھ آ سکتا ہے۔

اتنا واضح ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور راقم کے ترجمہ کا مقصد تقریبا ایک ہی ہے۔

شان نزول:

جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا "ومتعوھن" اور نفع پہنچاؤ انہیں۔اور آیۃ کریمہ کا اختتام فرمایا "حقا علی المحسنین" سے (کہ یہ واجب ہے احسان کرنے والوں پر) تو ایک شخص کہنے لگے کہ یہ حکم تو احسان کرنے والوں پر واجب ہے، اس سے تو یہ واضح ہوا کہ اس میں اختیار ہے اس لئے میرے لئے تو گویا کہ یوں حکم ہے "ان اردت فعلت وان لم ارد لم افعل" اگر میں چاہوں تو ان کو نفع پہنچاؤں اور اگر میں نہ چاہوں تو نفع نہ پہنچاؤں۔

فقال تعالیٰ "وللمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین" یعنی علی کل من کان متقیا عن الکفر۔

تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا جس میں ذکر کیا گیا کہ طلاق والی عورتوں کو دوران عدت نان ونفقہ دینا تمام مومنوں پر لازم ہے، کیونکہ اس مقام میں ''متقین'' سے مراد کفر سے بچنے والے۔ (کبیر)

راقم نے کبیر کی بحث کے مطابق ''متقین'' کا ترجمہ ''مؤمنین'' کر دیا ہے۔ باقی مترجمین کا ترجمہ تقریباً ''پرہیز گارلوگ'' ہی ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ کے حکم کو مان کر اس پر عمل کرنے والے اور ثواب حاصل کرنے والے پرہیز گارلوگ ہی ہیں اگر چہ یہ حکم سب مومنوں کو ہے۔

''متاع'' میں دوقول:

﴿۱﴾ ایک قول یہ ہے کہ ''متاع'' سے مراد ''متعہ'' ہے، یعنی طلاق والی عورتوں کو متعہ (تین کپڑوں پر مشتمل جوڑا) دینا واجب ہے۔ یہ آیۃ کریمہ ظاہری طور پر تقاضا کرتی ہے کہ ہر طلاق والی عورت کو متعہ دیا جائے، بعض حضرات نے اس آیۃ کریمہ کے ظاہر سے دلیل پکڑی ہے کہ متعہ تمام طلاق والی عورتوں کو دینا واجب ہے، یہ قول سعید بن جبیر، ابو العالیہ اور زہری رحمہم اللہ کا ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر چہ ہر طلاق والی کو متعہ دینا واجب ہے لیکن وہ عورت جس کا مہر مقرر کیا گیا تھا اور اسے جماع اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی گئی اسے صرف نصف مہر دینا واجب ہے، متعہ دینا واجب نہیں، یہ مسئلہ ''ومتعوھن علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ'' میں بیان کیا جاچکا ہے۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ متعہ کا پھر یہاں ذکر کیوں کیا گیا ہے حالانکہ اس کا ذکر پہلے "ومتعوھن علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ'' میں آچکا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے "ھناک ذکر حکما خاصا وھھنا ذکر حکما عاما" وہاں خاص حکم کا ذکر تھا جس کا تعلق غنی سے علیحدہ اور تنگدست سے علیحدہ تھا، یہاں عام حکم ہے کہ طلاق والی عورتوں کو متعہ دیا جائے۔

﴿۲﴾ دوسرا قول یہ ہے ''ان المراد بھذہ المتعۃ النفقۃ قد تسمی متاعا، واذا حملنا ھذا المتاع علی

النفقة اندفع التکرار فکان ذلک اولی''اس آیۃ کریمہ میں "متعة" سے مراد''خرچ دینا ہے''۔خرچ دینے کو کبھی "متعة" کہہ دیا جاتا ہےاور کبھی "متاع" کہہ لیا جاتا ہے۔

جب آیۃ کریمہ میں"متـــاع"کا معنی خرچ کیا جائے تو تکرار اٹھ جائے گا،یعنی متعہ معنی کرنے میں تکرار ہے اور''نان ونفقہ''ترجمہ کرنے میں تکرار نہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی معنی کے متعلق بیان فرمایا'فکان ذلک اولی" یہی معنی بہتر ہے۔ (از کبیر)

''وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ'' ففی بیان نفقة المطلقات اذالمتاع النفقة وهو المختار لصاحب المدارک فمعنی الآیة ان المطلقة تجب نفقتها علی الزوج ما دامت معتدة سواء کانت مطلقة الرجعی او البائن او غیر ذلک وهذه الآیة باق حکمها الآن غیر منسوخ بالاتفاق.

اس آیۃ کریمہ میں طلاق والی عورتوں کے خرچ کا ذکر ہے،جبکہ "متاع" سے مراد ہی''نان ونفقہ''ہے۔یہی مختار ہے صاحب مدارک التنزیل کا،آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ طلاق والی عورتوں کو خرچ دیا جائے جب تک وہ عدت میں ہوں خواہ ان کو طلاق رجعی دی گئی یا بائن وغیرہ،اور یہ آیۃ کریمہ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے اوراس کا حکم ابھی تک باقی ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

متعہ دینے کا وجوبی حکم منسوخ ہے۔منسوخ نہ ہونے والا قول منسوخ ہونے والے قول سے بہتر ہے۔

بیان کردہ تفسیر کے بعد دیکھیں:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے جس قول کو ترجیح دی ہے،اور علامہ احمد المعروف بملا جیون رحمہ اللہ نے جس قول کو ترجیح دی ہے اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے،لیکن بعض جہلاء نے اپنی جہالت کی وجہ سے اسے مورد طعن وتشنیع بنایا۔ایسے ہی ایک رسالہ''کنزالایمان پر پابندی کیوں؟''کو دیکھ کر راقم نے سب سے پہلے "تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان" تصنیف کی،اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں نے اپنے تصور سے بھی بالاتر تصنیفی کام کیا۔

معترض کا تفصیلی نوٹ:

طلاق شدہ عورت: البقرۃ میں طلاق کے احکام بیان کرنے کے بعد قرآن کریم نے طلاق شدہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے ساتھ احسان سے پیش آنے کا حکم بطور یاد دہانی کے مکرر فرمایا اور کہا "وللمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین" اس جگہ مترجم حضرات نے "متاع بالمعروف" کا ترجمہ......

کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا	(تھانوی)
فائدہ دینا ساتھ اچھی طرح کے	(شاہ رفیع الدین)
خرچ دینا ہے موافق دستور کے	(شاہ عبدالقادر)
کپڑے کے جوڑے وغیرہ سے کچھ سلوک کرنا	(ڈپٹی نذیر احمد)

......کیا، تاکہ اس آیۃ میں طلاق شدہ عورتوں کے حقوق واجبہ اور اخلاق حسن سلوک کی تمام صورتیں شامل ہو جائیں، وہ صورتیں حسب ذیل ہیں۔

﴿۱﴾ مہر مقرر تھا اور اب خلوت وملاقات کے بعد طلاق دے دی گئی، تو اب عورت کو پورا مہر دیا جائے گا، اور تاعدت نان ونفقہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

﴿۲﴾ مہر مقرر نہ تھا اور خلوت کے بعد طلاق دے دی گئی، تو اب مہر مثل واجب ہوگا اور عدت کا نان نفقہ بھی۔

﴿۳﴾ مہر مقرر تھا اور خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اب آدھا مہر واجب ہوگا۔

﴿۴﴾ لڑکی صغیرہ اور ناقابل خلوت ہے یا قابل خلوت ہے مگر خلوت نہیں ہوئی تو اب اسے کپڑے ایک جوڑا دینا واجب ہوگا اور اس پر عدت نہ ہوگی۔

ان تمام صورتوں میں عورت کو فائدہ پہنچانا صادق آتا ہے، کہیں پورے مہر کی صورت، کہیں مہر مثل کی صورت میں اور کہیں آدھے مہر کی صورت اور آخری مسئلہ میں صرف ایک جوڑا کپڑے دینے کی صورت میں۔

اس آیۃ مذکورہ میں تمام صورتیں شامل ہیں اور قرآن کریم نے اس کیلئے ایک عام لفظ "متاع بالمعروف" استعمال کیا ہے لیکن مولنا احمد رضا خان صاحب نے "متاع بالمعروف" کا ترجمہ فرمایا ہے "اور طلاق والیوں کیلئے بھی مناسب نان ونفقہ ہے یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر"

خان صاحب کے ترجمہ کے مطابق مذکورہ چوتھی صورت بھی آیۃ کے حکم (نان ونفقہ) میں شامل ہے کیونکہ وہ بھی طلاق والیوں میں شامل ہے، حالانکہ یہ وہ طلاق والی ہے جس پر عدت واجب نہیں تو پھر شرعی نان نفقہ کیا؟ بطور حسن سلوک کے صرف کپڑے کا ایک جوڑا دینا کافی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ مولانا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرحوم نے پیروی کی ہے، لیکن بقول رضا خانی حضرات کے جس مجتہد وفقیہ بے مثال نے فتاوی رضویہ کے نام سے بارہ ہزار صفحات پر مشتمل فقہی مسائل کا خزانہ امت کے لئے چھوڑا ہو اس کی نظر آیت پاک کی اس باریکی کی صورت کی طرف کیوں نہیں گئی اور آیۃ کے مفہوم کو ایک صورت میں خاص کر کے آیۃ کی حقیقی روح کو بے اثر کر دیا، اس پر تعجب ہوتا ہے۔

حضرت شاہ عبد القادر صاحب کا مختصر تفسیری حاشیہ ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ قرآن فہمی کی خداداد صلاحیت کیا چیز ہوتی ہے، لکھتے ہیں پہلے خرچ فرمایا تھا یعنی جوڑا اس طلاق پر کہ مہر نہ ٹھہرا ہو اور ہاتھ نہ لگایا ہو، یہاں سب پر حکم فرمایا، سب طلاق شدہ عورت کو مہر واجب کے ساتھ ساتھ کپڑے کا جوڑا دینا بھی مستحسن ہے تاکہ علیحدگی کے باوجود آپس میں صلح واحسان کے جذبات موجود رہیں، اور پہلی صورت میں یہ جوڑا دینا اور کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا ضروری ہے۔

امید کی جاسکتی تھی کہ محشی مرحوم اس آیۃ پر تشریحی نوٹ لکھ کر مسئلہ کو صاف کرتے لیکن مرحوم محشی بھی یہاں سے صاف بچ کر نکل گئے، اور قرآن کریم کی ایک فقہی آیۃ کا ترجمہ تشنہ رہ گیا۔

میں نہیں چاہتا کہ خان صاحب مرحوم کے ترجمہ کا علماء دیو بند کے تراجم اور تفاسیر سے موازنہ کر کے اپنے رضا خانی بھائیوں کو تکلیف پہنچاؤں لیکن جو حضرات علمی مسائل کو علمی مسائل کی نظر سے دیکھتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ حضرات شیخ الہند کا تفسیری حاشیہ اور مولانا اشرف علی خان صاحب تھانوی کی بیان القرآن اور مولانا عبد الحق

صاحب حقانی کی تفسیر حقانی کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان حضرات نے البقرۃ کی قانونی آیات طلاق کو قانونی اسلوب و انداز میں کس سلیقہ سے واضح کیا ہے اور کنز الایمان ان تفاسیر کے مقابلہ میں ایک سطحی اور طالب علمانہ تفسیر نظر آتی ہے۔ (معترض کی بحث ختم)

راقم کا تبصرہ:

راقم نے تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان میں آج سے کئی سال پہلے یوں تبصرہ کیا، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ پر یہ اعتراض کرنا کہ آپ فقہ کی باریکیوں سے بے خبر ہیں، لیکن خود معترض صاحب نے جو چوتھی صورت مطلق ذکر کی ہے اس میں مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی، وہ محل نظر ہے کیونکہ لڑکی صغیرہ اور نا قابل خلوت ہے اور مہر مقرر تھا تو طلاق کی صورت میں نصف مہر ہے صرف جوڑا کپڑوں کا دینا کافی نہیں ہاں اگر مہر مقرر نہ ہو تو یہ صورت ہے لیکن معترض صاحب نے مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی۔

اسی طرح یہی دو صورتیں اس عورت میں بھی ہیں جو قابل خلوت تو ہے لیکن اس کو طلاق قبل از خلوت دی جائے تو مہر مقرر ہونے کی صورت میں نصف مہر اور مہر کے مقرر نہ ہونے کی صورت میں متعہ (کپڑوں کا جوڑا) دیا جائے گا، حالانکہ مہر کے مقرر ہونے کی صورت میں یہ لازم نہیں۔

"وان تزوجها ولم يسم لها مهرا او تزوجها على ان لا مهر لها فلها مهر مثلها ان دخل بها او مات عنها ولو طلقها قبل الدخول فلها المتعة. (بداية المبتدی)

اگر نکاح کیا لیکن مہر مقرر نہیں کیا یا نکاح ہی اس شرط پر کیا کہ مہر نہیں دیا جائے گا، ایسی صورت میں اس عورت کو طلاق دخول کے بعد دی گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو اس عورت کو مہر مثل دیا جائے گا فوت ہونے کی صورت میں دخول یا عدم دخول کی قید نہیں۔ اگر اسی صورت میں یعنی مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا یا مہر کی نفی کر دی گئی تھی تو طلاق دخول سے پہلے دے دی گئی تو کپڑوں کا جوڑا دینا واجب ہے۔

دوسری بات یہ سمجھیں کہ معترض صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ میں اپنے ہی حضرات کے تراجم اور تفاسیر کو دیکھا جو اردو زبان میں ہیں کیونکہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ مولانا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرحوم نے پیروی کی ہے، یہ اعتراف حقیقت ہے جس کی وضاحت ابھی آتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ کا فقہی مسائل سے تعلق ہے جس کا اعتراف معترض صاحب نے برملا کیا ہے، لہٰذا فقہی مسائل کی تفسیر مدارک التنزیل کو دیکھیں، آپ نے اس طرح تفسیر کی، "وللمطلقات متاع" ای نفقة العدة کہ اس آیۃ کریمہ میں "متاع" سے مراد دوران عدت نان ونفقہ دینا ہے۔

اب یہ کہنا کہ ترجمہ چوتھی صورت کو شامل نہیں کہ وہاں عدت نہیں، یہ فقہی باریکی سے بے خبری ہے۔ یہ غلط ہے، بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر مدارک کے عین مطابق ہے تو جب یہ کہا جائے گا کہ کنز الایمان ایک طالب علمانہ تفسیر ہے تو اس سے یہ خود بخود لازم آئے گا کہ صاحب مدارک بھی ایک طالب علم کی حیثیت میں تھے اور ان کی تفسیر بھی طالب علمانہ ہے۔

پھر علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو اولیٰ (بہتر) قرار دیا ہے تو اس سے لازم آئے گا کہ تفسیر کبیر بھی ایک طالب علمانہ تفسیر ہے، پھر ملاجیون رحمہ اللہ نے بھی یہی معنی پسند فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تفسیرات احمدیہ بھی ایک طالب علمانہ تفسیر ہے۔

یہ تو سورج کے سامنے منہ چڑھانے کے مترادف ہے، بلکہ اپنی جہالت وحماقت کا اعتراف کرنا ہے۔ پھر اس آیۃ کریمہ میں بھی متعہ معنی لیا جائے تو تکرار لازم آئے، مختصر المعانی میں ایک شاندار ضابطہ مراد لیا گیا ہے "التاسیس اولیٰ من التاکید" نیا معنی لینا بنسبت پہلا معنی لینے کے زیادہ بہتر ہے، تکرار اور تاکید میں پہلا معنی ہی مراد ہوتا ہے، غیر تکرار میں نیا معنی مراد ہوتا ہے۔

تفاسیر کے مطالعہ سے تو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ کے ترجمہ کی فوقیت واضح ہوتی ہے، کیونکہ اس میں تکرار نہیں اور متعہ والا معنیٰ لینے میں تکرار ہے۔

پھر ''حقا'' کا معنیٰ وجوب ہے، اور چار صورتوں میں صرف ایک صورت میں وجوب ہے یعنی مہر مقرر نہیں تھا اور طلاق وطی اور خلوت صحیحہ سے پہلے دے دی گئی، اس صورت میں متعہ واجب ہے، باقی تمام صورتوں میں وجوب نہیں ،لہذا متعہ والا معنیٰ کرنے سے وجوب منسوخ ماننا پڑتا ہے لیکن نان ونفقہ والا معنیٰ کرنے سے وجوب منسوخ نہیں ماننا پڑتا۔

یہی وجوہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو فوقیت عطا کر رہی ہیں، لیکن جس شخص کے علم کا محور شیخ الہند کا تفسیری حاشیہ اور بیان القرآن اور تفسیر حقانی ہو وہ نہ سمجھ سکے تو کوئی اعتراض بھی نہیں، کیونکہ کم علم کو معذور ہی سمجھنا چاہئے، البتہ جہل مرکب کے حامل کو سمجھانا بھی ممکن نہیں، لیکن اگر ضد اور عناد کو چھوڑ کر حقیقت پسندی کی طرف آنا ہو تو معتبر تفاسیر کی عبارات کو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کی تائید کے لئے پیش کر رہا ہوں تاکہ حق نظر آئے اور محققین کو طالب علمانہ حیثیت دینے کی حماقت کرنے سے اجتناب کیا جائے، ورنہ ان مفسرین کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور اپنی حماقت ثابت ہو جائے گی۔

البحر المحیط میں ہے "وقیل المراد بالمتاع ھھنا نفقة العدة" اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''متاع'' سے مراد عدت کا نفقہ ہے۔

یہاں سے بھی پتہ چلا کہ ''نان نفقہ'' ترجمہ اعلیٰ حضرت کا ہی نہیں، بلکہ اس میں اور ارباب تفسیر بھی شریک ہیں الجامع لاحکام القرآن للقرطبی نے بھی اختلاف بیان کرتے ہوئے معترض صاحب کی چوتھی صورت کو ایک قول میں خارج کیا ہے۔ الجامع کی عبارت کو ملاحظہ کریں:

''وقال عطا بن رباح وغیرہ ھذہ الآیة فی الثیبات اللواتی قد جومعھن اذ تقدم فی غیر ھذہ الآیة ذکر المتعة للواتی لم یدخل بھن''. (قرطبی)

عطا بن رباح وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیۃ ان عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا ہو، ثیبہ ہوں، اس لئے کہ جن عورتوں سے دخول نہیں ہوا ان کے متعہ کا پہلی آیۃ میں ذکر آ چکا ہے۔

تفسیر مظہری میں ہے۔

"قیل المراد بمتاع فی هذاالآیۃنفقۃ ایام العدۃکماھو المرادفیما سبق من قوله تعالیٰ وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول بجامع ان المرأۃ فی کلا الصورتین الموت والطلاق محبوسۃ لحقوق الزوج فیجب الانفاق فی ماله"

متاع سے مراد زمانہ عدت کا نان ونفقہ مراد ہے، جیسا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کے قول "وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول" میں وفات کی عدت کے نان ونفقہ کا بیان ہے، دونوں صورتوں یعنی موت وطلاق میں وجہ جامع یہ ہے کہ عورت چونکہ دوران عدت اپنے آپ کو حقوقِ زوج میں پابند رکھتی ہے اس لئے خاوند کے مال سے اس کا نفقہ لازم ہے۔

اس طرح روح المعانی میں ہے۔

"وقیل المراد بالمتاع نفقۃ العدۃ"

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں "متاع" سے مراد دوران عدت نان ونفقہ دینا ہے۔

ناظرین کرام آپ نے مذکورہ بالا معتبر تفاسیر کی عبارات سے سمجھ لیا ہوگا کہ اس آیۃ کریمہ میں "متاع" کا ترجمہ "نان ونفقہ" کرنے میں اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ منفرد نہیں، بلکہ اکابرین مفسرین کرام کے اقوال بھی موجود ہیں، اب مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے جوشِ عناد کی وجہ سے جنبشِ قلم کی زد میں اکابرین مفسرین کرام کو لپیٹنا کہاں کا انصاف ہے۔

میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا، یہ کہنا "کہ ہوسکتا ہے کوئی ترجمہ ایسا ہو" اس سے پہلے تفاسیر کو دیکھ لیا جائے تاکہ بعد میں خود ہی صیاد اپنے دام میں نہ پھنس جائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ یہ ہے۔

"(طلاق والیوں کو) خرچ دینا ہے موافق دستور کے"

اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے ''اور طلاق والیوں کیلئے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے''

دونوں ترجمے ایک جیسے ہیں کیونکہ اعلیٰ حضرت نے ''نفقہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب نے اسی لفظ کا ترجمہ ''خرچ'' ذکر کیا ہے۔ اور اعلیٰ حضرت نے ''مناسب طور پر'' تحریر فرمایا اور شاہ عبدالقادر صاحب نے ''موافق دستور کے'' تحریر کیا ہے۔

جب ''مناسب نان ونفقہ'' اور ''خرچ دینا ہے موافق دستور کے'' ان میں کوئی فرق نہیں تو شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کی تعریف اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو مورد طعن و تشنیع بنانا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ایسا کوئی منصف شخص کر سکتا ہے؟ ایسا کوئی صاحب علم کوئی صاحب دانش کر سکتا ہے؟ نہیں نہیں ایسا کرنا صاحب انصاف، صاحب علم اور صاحب دانش سے تو نہیں ہو سکتا۔

(تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان)

☆☆☆☆☆

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ☆

(سورة البقرة آیت ۲۴۲)

☆۱☆

اللہ یونہی بیان کرتا ہے تمہارے لئے اپنی آیتیں کہ کہیں تمہیں سمجھ ہو۔

☆۲☆

اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو تاکہ تمہیں کامل عقل آجائے۔

كَذٰلِكَ: اسی طرح۔

"ای مثل ذلک البیان الواضح للاحکام السابقة"

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے احکام واضح طور پر بیان فرمائے۔

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ:

"الدالة علی ما تحتا جون الیه معاشا و معادا"

اسی طرح اللہ تعالیٰ واضح طور پر تمہارے لئے اپنی آیات بیان کرتا ہے یعنی وہ آیات جن کے تم دنیا اور آخرت میں محتاج ہو۔ (روح المعانی)

"کذلک" اشارة الی ماسبق من احکام الطلاق و العدة (یبین اللہ لکم آیاته) وعد بانه سیبین لعباده من الدلائل و الاحکام ما یحتاجون الیه معاشا و معادا. (مظهری)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح طلاق اور عدت کے احکام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں اسی طرح اپنے بندوں کے لئے دلائل واحکام بیان فرمائے گا جن کے وہ دنیا اور آخرت کی زندگی میں محتاج ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے واضح طور پر دلائل واحکام بیان کرنے کا وعدہ فرمادیا ہے۔

خیال رہے تفسیر مظہری کے مطابق "کذلک یبین اللہ لکم آیاتہ" کا ترجمہ یہ ہوگا "اسی طرح کھول کر بیان کرے گا اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کو۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے طلاق وعدت وغیرہ کے مسائل کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اسی طرح جن کاموں کا تمہیں حکم دیا ہے اور جن کاموں سے تمہیں روکا ہے ان کے حلال ہونے اور حرام ہونے کو اور ان کے فرض ہونے اور ان میں حدود لازم آنے کو واضح طور پر بیان فرماتا ہے، جن احکام کی تمہیں محتاجی ہوتی ہے ان کو رب تعالیٰ واضح طور پر بیان فرما دیتا ہے ان کو مجمل (غیر واضح) نہیں چھوڑتا۔ (صابونی)

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تمہیں کامل عقل آجائے۔

ان الفاظ مبارکہ کے علامہ شہاب الدین السید محمود احمد آلوسی رحمہ اللہ نے تین معانی بیان فرمائے،

﴿۱﴾ "لکی تکمل عقولکم"
تاکہ تمہاری عقلیں کامل ہو جائیں۔
اسی کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے "تاکہ تمہیں کامل عقل آجائے"

﴿۲﴾ "لکی تصرفوا عقولکم الیھا"
تاکہ تم اپنی عقلوں کو ان احکام کی طرف پھیر سکو۔

﴿۳﴾ "لکی تفھموا ما ارید منھا"
تاکہ تمہیں سمجھ آجائے، ان احکام کی جن پر عمل کرنے یا چھوڑنے کا تم سے ارادہ کیا گیا ہے۔

(روح المعانی)

☆☆☆☆☆